قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد اوّل

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خانؒ

(۱) مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًاحَسَنًا فَیُضَاعِفَہٗ لَہٗ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً (البقرۃ : ۲۴۵)
(۲) مَنْ ذَاالَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًاحَسَنًا فَیُضَاعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗ اَجْرٌ کَرِیْمٌ ٥ (الحدید: ۱۱)
(i) ''کوئی شخص ہے جو اللہ کو (اپنا مال بطور) قرضِ حسنہ دے تو اللہ اُسے بڑھا کر اُس کے لئے کئی گنا کر دے۔''
(ii) ''کوئی شخص ہے جو اللہ کو (اپنا مال بطور) قرضِ حسنہ دے تو اللہ اُس کے مال کو اُس کے لئے بڑھا دے (اِس کے علاوہ) اُسے شاندار اجر بھی ملے گا۔''

قرضِ حسنہ تب ہوگا جب اُس میں بقول علامہ آلوسی مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں:
(۱) مال حلال ہو (۲) اعلیٰ درجہ کی چیز ہو (۳) خود کو بھی اس کی شدید ضرورت ہو (۴) چھپ چھپا کر دے (۵) احسان نہ جتائے (۶) اذیت نہ پہنچائے (۷) مقصد صرف رضائے الٰہی ہو (۸) جتنا بھی خرچ کرے اُسے تھوڑا سمجھے۔

صبر و استقلال: اِس کے معنی یہ ہیں کہ کسی نیک مقصد کے حصول کی راہ میں اگر کوئی نقصان یا تکلیف اور مصیبت پہنچتی ہے' اُسے بغیر کسی شکوہ و شکایت کے اللہ کی رضا پر راضی رہتے ہوئے برداشت کیا جائے تاکہ خالق و مالک راضی ہو جائے۔ یہ بھی مطلب ہے کہ ہجومِ مشکلات کے وقت انسان چٹان کی طرح ثابت قدم رہے اور صراطِ مستقیم اور اعلیٰ اخلاقی اقدار پر غیر متزلزل طور پر گامزن رہے۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور تمام انسان (بالخصوص مؤمنین) امتحان دینے والے ہیں۔ اِس امتحان گاہ میں قرآنِ حکیم اکثر اپنے ماننے والوں کو صبر کرنے اور ثابت قدم رہنے کی ہدایت کرتا ہے کیونکہ یہ اخلاقی وصف اللہ کی نظروں میں نمایاں اہمیت کا حامل ہے:
(۱) یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ٥ (البقرۃ: ۱۵۳)
''اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد طلب کیا کرو' کچھ شک نہیں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

صبر کے وسیع مفہوم میں اپنے آپ کو غیر شرعی کاموں اور دنیا کی جھوٹی لذّتوں سے روکے رکھنا بھی شامل ہے۔ صبر کے یہ معنی نہیں کہ بشری تقاضوں کے اثرات کو بھی اپنے اوپر طاری نہ ہونے دیا جائے۔ بھوک کے وقت نڈھال ہونا' درد کی تکلیف سے کراہنا' رنج کے وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا' عزیزوں کی موت پر بے اختیار آنسو بہانا' اِن میں سے کوئی چیز بھی بے صبری میں داخل نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (کچھ شک نہیں کہ اللہ صابرین کے ساتھ ہے) بڑا ہی خوش آئند جملہ ہے۔ خطرہ کے وقت پولیس کے پہنچ جانے سے اور کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کو کیسی ڈھارس ملتی ہے' شدید بیماری کے وقت کسی نامور معالج کے آجانے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسے جڑ جاتی ہے۔ پھر جب دل کا ربط ہمہ بیں و ہمہ داں' ناصرِ حقیقی اور محافظِ حقیقی سے قائم ہو جائے تو بے چارے انسان کی تسکینِ قلبی کا کیا کہنا!

(۲) وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ٥ (ھود: ۱۱۵)

"صبر کرتے رہئے' کچھ شک نہیں کہ اللہ نیک کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔"

(۳) جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ۝ سَلٰمٌ" عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۝ (اَلرَّعْد : ۲۳،۲۴)

"ہمیشگی کے باغ جن میں وہ (خود بھی) داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو اُن کے باپوں' ان کے میاں بیویوں اور اُن کی اولاد میں سے جو جنت کے لائق ہوں گے اور فرشتے اُن کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہوں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) تم پر سلامتی ہو اِس کے صلہ میں کہ تم صبر کرتے رہے' سو (تمہارا) اِس جہان میں بہت ہی اچھا انجام ہے!"

مِنْ كُلِّ بَاب (ہر ہر دروازے سے) کے ایک معنی تو ظاہر ہیں کہ جنت کے ہر محل میں کئی دروازے ہوں گے اور یہ پیامِ مسرّت لانے والے ہر ہر طرف سے داخل ہوں گے۔ ایک اور معنی یہ بھی لئے گئے ہیں کہ مؤمن نے دُنیا میں جتنی قسم کی طاعتیں کی ہوں گی مثلاً نماز' روزہ' حُسنِ معاملت' سچائی' خلوص و دیانت وغیرہ اِن میں سے ہر ہر قسم کے لئے ایک ایک دروازہ قائم ہو جائے گا اور فرشتے اُس میں سے داخل ہوں گے۔ (تفسیر ماجدی اردو' ص ۵۱۸)

راستبازی: یعنی انسان نہ صرف اپنی گفتگو میں سچا ہو بلکہ اپنے افعال اور خیالات میں بھی سچا ہو۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر قسم کی آلائش' دھوکہ دہی اور بدی سے پاک ہو اور دوسروں کو نقصان نہ پہنچائے۔ صحابہ کرام کے پوچھنے پر ایک مرتبہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ:

"مؤمن بزدل تو ہو سکتا ہے لیکن جھوٹا نہیں ہو سکتا۔"

سورۃُ التَّوبَۃ کی آیت ۱۱۹ میں مؤمنین سے کہا گیا ہے کہ وہ نہ صرف خود راستی پر رہیں بلکہ راستباز لوگوں کی سنگت اختیار کریں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۴ میں کہا گیا کہ سچائی کے وصف سے محروم شخص منافق ہے جس کا ٹھکانہ جہنم کا نچلا ترین درجہ ہوگا جیسا کہ سورۃُ النساء کی آیت ۱۴۵ میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

عدل و انصاف: یہ راستبازی کی ایک شاخ (حصّہ) ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے معاملات اور قول و فعل میں بے رُو رعایت درست اور صحیح ہوں۔ عدل و انصاف کی یہ صفت اِس قدر اہم ہے کہ قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو اُن کے پکے دشمنوں کے ساتھ بھی بے انصافی کرنے کی اجازت نہیں دی (سورۃ المائِدۃ : ۸) اور اِس طرح انصاف اور صحیح معاملگی کو لازمی طور پر دوسری تمام مصلحتوں پر ترجیح ملنی چاہئے کیونکہ خالقِ حقیقی کا حقِ اطاعت دوسری مخلوقات سے کہیں زیادہ ہے نہ کہ دولتمند کی اُمارت سے مرعوب ہو کر یا

نادار کی غربت سے متاثر ہو کر انصاف کے دامن کو چھوڑ دیا جائے۔

اعتبار اور بھروسہ: وسیع طور پر اِس کے معنی ہیں کہ انسان اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کو ایمانداری اور خلوص سے سرانجام دے۔ ادائے امانت سے مراد صرف یہی نہیں کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں لوٹا دے بلکہ اس کا مفہوم وسیع تر ہے۔ عبادات بھی امانت ہیں جنہیں صحیح وقت پر شرائط و قیود کی پابندی کے ساتھ خلوصِ نیت سے ادا کرنا ادائے امانت میں شامل ہے۔ میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کی ساکھ اور امانتدار ہے (کہ بدکاری میں ملوث نہ ہوں)۔ حکومت کے عہدوں پر تقرر کے لئے کنبہ پروری اور دوست نوازی کی بجائے صرف اہلیّت و قابلیت کو معیار قرار دینا بھی اِس حکم کی تعمیل میں داخل ہے' مشاورت اور صلاح امانت ہے (جو خلوص اور شوق سے دیا جائے فرمایا اَلْــمُسْتَشَــارُ مُـؤْتَمَن'' یعنی مشورہ دینے والا امانتدار ہوتا ہے۔) کرسیِ اقتدار و حکومت پر فائز ہوتے ہوئے غریب و امیر' قوی و ضعیف میں مساوات قائم کرنا' عدل کے ترازو کو تمام مخالف رُجحانات کے باوجود برابر رکھنا ادائے امانت ہے۔ یہ کردار کا ایک اور قابلِ تحسین وصف ہے جس کے بارے میں قرآن حکیم نے یوں حکم دیا:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ اِلٰی أَھْلِھَا (اَلنِّساء : ۵۸)

''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اُن کے اہل کو ادا کرو۔''

سُورۃُ الشُّعراء کی مختلف آیات میں لفظِ اَمِیْن کی بار بار تکرار میں یہ بتایا گیا ہے کہ امانتداری تمام انبیاء علیہم السلام کا مشترکہ وصف رہی ہے۔

مظاہرِ قدرت میں تخلیق شدہ حُسن کا پیمانہ: اِس ضمن میں قرآن حکیم یوں فرماتا ہے:۔

(۱) قَدْجَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًاo (اَلطَّلاق : ۳)

''اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے ایک انداز مقرر کر رکھا ہے۔''

یعنی اِس نظامِ عالَم کا ادنیٰ سے ادنیٰ جزیہ ایک حکیمانہ قانون کا پابند اور اُسی سے وابستہ اور منسلک ہے۔

(۲) مَاتَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍo ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ''o (اَلْمُلْکُ : ۳)

''تو (خدائے) رحمٰن کی صنعت میں کوئی فتور نہیں دیکھے گا' سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھے خلل نظر آتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ' نگاہ (ہی آخر) ناکام اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔''

فَارْجِعِ الْبَصَرَ محققین نے کہا کہ یہ پہلی نظر عوام کی ہے جو صرف قدرت کا ظاہری حسن دیکھ کر اللہ کی کمال کاریگری کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَيْنِ اہلِ نظر نے کہا کہ یہ دوسری نظر اہلِ نظر و اہلِ حکمت کی ہے جو ہر ہر مخلوق کے مصالح کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ موجودہ نظامِ عالم سے بہتر ہونا محال ہے۔ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ عارفین نے کہا کہ یہ تیسری نظر خاص الخاص اہلِ حق کی ہے جو اپنی نظر پر خود نادم ہو کر اپنی بے بسی اور جہل کے معترف ہوتے ہیں۔ کَرَّتَيْنِ کا صیغہ تثنیہ (جو دو '۲' کے عدد کے لئے ہوتا ہے) محض اظہارِ تعدد کے لئے ہے۔ دو (۲) کا مقررہ عدد مراد نہیں (بیضاوی)

سنہرا یا جمالیاتی تناسب (GOLDEN RATIO) کیا ہے ؟ یونی فلسفی افلاطون نے اِس نظریے کو بیان کیا کہ اگر ایک لائن کے دو غیر مساوی حصے اس طرح کئے جائیں کہ

A:B=1.618:1

B C

A

(بالفاظِ دیگر A کو B سے وہی نسبت ہے جو B کو C سے ہے۔)

اگر اُن میں سے ایک حصہ بڑا ہو اور ایک چھوٹا' تو بڑے حصے کا تناسب پوری سطر کے ساتھ یہ ہوگا کہ اگر پوری سطر ۶۱۸ء ۱ انچ رفٹ رمیل ہو تو بڑا حصہ ایک انچ رفٹ رمیل ہوگا اِس طرح یہ GOLDEN RATIO (سنہرا تناسب) ہوگا۔ مختلف چیزوں میں یہ تناسب حسن و جمال کا مظہر بن جاتا ہے۔ اِس سنہرے تناسب کو الٰہیاتی تناسب (Divine Proportion) یا (Divine Section) کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اِس سنہرے تناسب کا نام Phi =1.618 ہے۔

انسانی جسم میں تقابلی نسبت: سنہرے تناسب کی بہترین مثال انسانی جسم ہے جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے کہ اوّل الذکر اور مؤخر الذکر کے مابین ایک تقابلی نسبت ہے :

انگلی کی پور اور کہنی کا درمیانی فاصلہ رکلائی اور کہنی کا درمیانی فاصلہ
شانے کی لکیر اور سر کی چوٹی کا فاصلہ رسر کی لمبائی
ناف اور سر کی چوٹی کا درمیانی فاصلہ رناف اور کندھے کی لکیر تک کا فاصلہ
ناف اور گھٹنے کا درمیانی فاصلہ رگھٹنے اور پاؤں کے آخر تک کا فاصلہ

انسانی ہاتھ: سوائے انگوٹھوں کے ہماری انگلیوں میں تین علیحدہ علیحدہ حصے ہیں۔ پہلے دو حصوں

تناسب انگلی کی پوری لمبائی تک ایک سنہرا تناسب ہے۔ اسی طرح درمیانی انگلی کا چھوٹی انگلی کے ساتھ ایک حسین تناسب ہے۔ ("The Golden Ratio in Nature/Science/Art" -- Mehmet Suat Bergil, p. 87) 1993

انسانی دانتوں میں سنہرا تناسب:

اوپر کے جبڑے کے دو دانتوں کی کل چوڑائی / اُن کی اونچائی میں ایک عمدہ تناسب ہے۔
پہلے دانت کی چوڑائی / دوسرے دانت کا وسطانیہ

انسانی چہرے میں سنہرے تناسب اس طرح ہیں:۔

چہرے کی اونچائی / چہرے کی چوڑائی
کہنی سے لے کر بڑی انگلی کے پور تک کا فاصلہ / کہنی سے لے کر کلائی تک کا فاصلہ
ہونٹوں کے درمیان کا فاصلہ اور جہاں بھنویں ملتی ہیں / ناک کی لمبائی
چہرے کی لمبائی / جبڑے کے کونے سے لے کر اور جہاں بھنویں ملتی ہیں' کا فاصلہ
منہ کی لمبائی / ناک کی چوڑائی
ناک کی چوڑائی / نتھنوں کا درمیانی فاصلہ
پتلیوں کے درمیان کا فاصلہ / بھنوؤں کے درمیان کا فاصلہ

پھیپھڑوں میں سنہرا تناسب: ۱۹۸۵ اور ۱۹۸۷ء کے درمیان امریکی ماہرین طبعیات بی۔ جے۔ وَیسٹ اور ڈاکٹر اے۔ آئی گولڈ برگر کو مطالعہ کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ پھیپھڑوں کی ساخت میں سنہرا تناسب موجود ہے۔ سانس کی نالی سے پھیپھڑوں تک جانے والی نالیوں کا جال جن سے پھیپھڑا بنتا ہے' سنہرے تناسب میں ہیں۔ مثلاً نرخرہ دو اہم نالیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے: اُن میں سے ایک (بائیں طرف کو) لمبی ہے اور دوسری (دائیں طرف کو) چھوٹی ہے۔ یہ متناسب تقسیم بعد کی نالیوں کی ذیلی تقسیم تک چلی جاتی ہے۔

("Morphometry of the Human Lung" -- E. R. Weibel) Academic Press, 1963).

یہ دریافت کیا گیا کہ چھوٹی نالی سے لے کر بڑی نالی تک تمام تقسیمات کا تناسب ہمیشہ ۱.۶۱۸ ہی ہے۔

ڈی۔ این۔ اے میں سنہرا تناسب: ڈی این اے (تعریف صفحہ ۴۷ ذیلی حاشیہ) کے سالمہ میں جس پر زندگی کا انحصار ہے' سنہرا تناسب پایا جاتا ہے۔ ''ڈی این اے ہمارے جسم کے اندر ہر ۱۰۰

ٹریلین خلیوں کے مرکزوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ انسانی جسم کی مکمل تعمیری منصوبہ بندی رکھتا ہے۔ کسی انسان کی تمام خصلتوں کے بارے میں معلومات' اُس کی جسمانی شکل وصورت سے لے کر اُس کے جسم کے اعضاء کی اندرونی ساخت تک کے بارے میں ایک خاص رمزی نظام (Coding System) ڈی این اے میں درج کر دیتا ہے۔''

''ڈی این اے میں درج معلومات چار خاص بنیادوں کی ترتیب کے اندر کوڈ یا رمزی شکل میں موجود ہوتی ہیں جو اُس سالمے کو بناتی ہیں۔ اِن بنیادوں کو اے' ٹی' جی' سی کا نام دیا گیا ہے جو ان کے ناموں کے پہلے حرف کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ لوگوں میں پایا جانے والا اختیاتی فرق اِن حروف کی ترتیب کے فرق پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کا ''ڈیٹا بنک'' ہوتا ہے جس کی تشکیل چار حروف سے ہوتی ہے۔''

''ڈی این اے میں اِن حروف کی ترتیب کسی انسان کے جسم کی ساخت کا پتہ لگاتی ہے اور اس میں وہ کسی حد تک تفصیلات کی گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ انسانی جسم کے خد وخال مثلاً قد' آنکھیں' بال اور جلد کی رنگت کے علاوہ ایک واحد خلیے کے ڈی این اے ۲۰۶ ہڈیوں' ۶۰۰ عضلات کی بناوٹ' ۱۰٬۰۰۰ سامعاتی عضلات کا نیٹ ورک' ۲ ملین بصری نسوں' ۱۰۰ بلین عصبی خلیوں' ۱۳۰ بلین میٹر لمبی رگوں اور ۱۰۰ ٹریلین خلیات ایک جسم کے اندر رکھتی ہے۔ اگر ہمیں اس معلومات کو تحریر میں لانا ہو جو ڈی این اے میں کوڈ یا رمزی شکل میں موجود ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں ایک بہت بڑی لائبریری تیار کرنا ہوگی جس میں انسائیکلو پیڈیا کی ۹۰۰ جلدیں ہوں گی اور ہر جلد کے ۵۰۰ صفحات ہوں گے۔ یہ ناقابلِ یقین حد تک ضخیم معلومات ڈی این اے کے اجزائے ترکیبی میں 'کوڈ' میں تحریر کر دی گئی ہے جسے ''جین Gene'' کہتے ہیں۔ (''نظریہ ارتقاء — ایک فریب'' — ہارون یحییٰ (اردو ترجمہ) ص ص ۱۳۷' ۱۳۸۔ اسلامک ریسرچ سنٹر پاکستان' دسمبر ۲۰۰۲ء)

برف کے گالوں میں سنہرا تناسب : صاف وشفاف ساخت کی چیزوں میں بھی سنہرا تناسب پایا جاتا ہے۔ اُن میں سے اکثر اتنے باریک ہوتے ہیں کہ اُنہیں خوردبین کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا۔ تاہم برف کے گالوں میں اِس سنہرے تناسب کو دیکھا جا سکتا ہے۔ مختلف بڑے اور چھوٹے برف کے گالوں میں یہ سنہرا تناسب پایا جاتا ہے۔ ("The Golden Ratio as a Mathematical Rule of Formal Harmony" -- Journal of Science and Technology, Jan., 1991, p. 16. Essayist : Emre Becer).

خلا میں سنہرا تناسب: کائنات میں بہت سی خلائی کہکشائیں ہیں جن کی ساخت میں سنہرا تناسب ہے۔

سنہرا تناسب ایک جانا پہچانا جمالیاتی اصول ہے جس کا استعمال فنکار لوگ کیا کرتے ہیں۔ ایسے فن پارے جن کی بنیاد Golden Ratio (1.618) پر ہو، جمالیاتی تخیل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ پودوں، کہکشاؤں، چھوٹے جرثوموں، معدنی پتھروں اور تمام جانداروں کو اس اصول کے تحت بنایا گیا ہے اور جن کی نقالی فنکار کیا کرتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ ترین کاریگری کی مثالیں ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اللہ بزرگ و برتر فرماتا ہے کہ ہم نے ہر چیز کی تخلیق ایک انداز اور پیمانے کے مطابق کی ہے۔ (سورۃ الفرقان: آیت ۲ ؛ سورۃ القمر: آیت ۴۹)

ڈارون کا قانونِ ارتقاء فطرت میں ہم آہنگی اور تناسب کی وضاحت سے قاصر ہے: ''وہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اور وہ وسیع و عریض کائنات جس میں زمین موجود ہے، دونوں میں عظیم ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ بادلوں، آسمانوں، پھولوں، جانوروں اور اسی قسم کی مثالوں میں مکمل ترتیب اور تناسب ظاہر ہے۔''

''جب ہم مناظرِ فطرت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہر پودے اور ہر جانور کا ایک مخصوص رنگ اور نمونہ ہے جو کسی اور میں نہیں پایا جاتا۔ مزید برآں یہ کہ یہ رنگ اور نمونے مختلف معانی کے حامل ہیں۔ اپنے ساتھی کو بلانا، غصّے کا اظہار، خطرے کی تنبیہ اور جانوروں میں اِس قسم کی دوسری باتیں رنگوں اور نمونوں کے ادراک ہی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔''

''نظریہِ ارتقاء جس کا دعوٰی ہے کہ یہ نظام جسے انسان اپنی تمام تر ذہانت، علم اور ٹیکنالوجی کے باوجود بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا ''اتفاقاً'' وجود میں آیا، نظامِ قدرت کی ہم آہنگی، کاریگری اور قسماں قسم کے رنگوں کی وجہ سے یہاں جواب دینے سے قاصر ہے۔ چارلس ڈارون جو اِس نظریے کا بانی ہے، کو بھی یہ اعتراف کرنا پڑا کہ کارخانہِ قدرت میں ایک سوچا سمجھا ڈیزائن ہے۔ ڈارون کا کہنا تھا کہ یہ بات اُس کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ تمام زندہ مخلوقات کے رنگوں کے مخصوص معانی کیوں ہیں۔ چنانچہ اُس نے Life and Letters کی جلد دوئم کے صفحہ ۲۷۵ پر برملا لکھا کہ:

''میری مشکل یہ ہے کہ میں سمجھ نہیں پایا کہ بعض اوقات تتلیوں اور پتنگوں کے اتنے خوبصورت رنگ اور ماہرانہ کاریگری کا نمونہ کیوں ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر کہ بہت سے رنگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ذریعے خطرے سے بچا جا سکتا ہے، میں بمشکل ہی اُن کے چمکدار رنگوں کو اُن کے طبعی حالات سے منسوب کر سکتا ہوں۔ اگر کوئی یہ کہے کہ نر تتلیوں کے رنگ جنسی انتخاب کے باعث خوبصورت ہوتے ہیں، تو پھر سوال یہ ہے کہ اُن کے لاروے خوبصورت کیوں نہیں؟ میں اس کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن

اپنے نظریے سے ہٹنے کو تیار بھی نہیں۔'' *

چارلس ڈارون یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اُس کا نظریہ بے شمار مسائل سے دوچار ہوگا جس کا اعتراف اُس نے اپنی کتاب "The Origin of Species by means of Natural Selection" کے جس باب میں کیا ہے' اُس کا عنوان ''نظریے کی مشکلات'' ہے۔

فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) : ''فطرت کا ایک عمل -- قدرتی انتخاب -- ڈارون سے پہلے ماہرینِ حیاتیات کے علم میں تھا۔ اُنہوں نے اِسے ''ایک ایسا میکانکی عمل بتایا جو جانداروں کو کسی بگاڑ اور خرابی سے گزرے بغیر غیر متبدّل رکھتا ہے''۔ ڈارون پہلا انسان تھا جس نے یہ دعوٰی کیا کہ اِس عمل میں ارتقائی قوت موجود ہے اور پھر اُس نے اپنے مکمل نظریے کی بنیاد اِسی دعوٰی پر اٹھائی۔

ڈارون کے عہد سے لے کر اب تک کوئی ایک بھی ثبوت ایسا نہیں مل سکا جس سے یہ ثابت ہو کہ فطری انتخاب جاندار چیزوں کو ارتقائی عمل سے گزارتا ہے۔ کولن پیٹرسن جو انگلستان کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں ایک سینئر ماہرِ قدیم حیاتیات ہے اور جو ایک نامور ارتقاء پسند بھی ہے' لکھتا ہے :

''آج تک کوئی بھی فطری انتخاب کے میکانکی عملوں کے ذریعے جاندار پیدا نہیں کرسکا۔ نہ کوئی اِس کے قریب تک بھی کبھی آیا ہے اور نوڈارونیت میں جو حالیہ دلائل ملتے ہیں' اُن کا تعلق اِسی سوال سے ہے۔''

("Cladistics" -- Colin Patterson : Interview with Brain Leek, March 4, 1982).

* ''نظریہ ارتقاء (ڈارونزم) وہ فلسفہ ''مادہ پرستی'' ہے جو ہمارے کیوں اور کیسے وجود میں آنے کے جوابات کے بارے میں غیر حقیقی نظریات کا حامل ہے۔ اِس فلسفے کی رُو سے مادہ پرستی میں سوائے مادہ کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور مادہ ہر شے کا جوہر ہے خواہ وہ نامیاتی ہو یا غیر نامیاتی۔ یہ فلسفہ ایک ایسے بزرگ و برتر خالق کے وجود سے انکار کرتا ہے جسے **اللہ** کہتے ہیں۔ ہر شے کو مادے کی سطح تک لانے سے یہ تصوّر انسان کو ایک ایسی مخلوق میں ڈھال دیتا ہے جو صرف مادے کی طرف توجہ دے اور اَخلاقی اقدار سے منہ موڑ لے۔ یہ اُن بربادیوں کی ابتدا ہے جو انسانی زندگی پر نازل ہوں گی۔ مادہ پرستی کے نقصانات صرف افراد تک ہی محدود نہیں بلکہ مادہ پرستی اُن بنیادی اَقدار کو منہدم کرنے کے درپے رہتی ہے جن پر کسی ریاست اور معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے بے رُوح اور بے حس معاشرے کو جنم دیتی ہے جو صرف مادے کی طرف توجہ دیتا ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے افراد چونکہ کبھی بھی مثالیت پسندانہ تصوّرات مثلاً اپنے ابنائے جنس سے محبت' عدل و انصاف' وفاداری' دیانتداری' جذبہِ ایثار و قربانی' عزت و توقیر اور اعلیٰ اخلاقی اقدار نہیں رکھتے اس لئے جس سماجی نظام کی تشکیل یہ افراد کرتے ہیں اُس کے مقدر میں بہت جلد بکھر جانا ہوتا ہے۔ اِن وجوہ کی موجودگی میں مادہ پرستی کسی قوم کے سیاسی و سماجی نظام کی بنیادی اقدار کے لئے شدید خطرات کا باعث بنتی ہے۔

کارل مارکس نے اس بات کو واضح کیا کہ نظریہ ڈارون نے مادہ پرستی کو ایک ٹھوس بنیاد فراہم کی جو اشتراکیت کے لئے بھی مضبوط بنیاد ثابت ہوئی۔ اُس نے اپنی کتاب ''داس کیپیٹا'' کا انتساب ڈارون کے نام کرتے ہوئے اُس سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

فطری انتخاب کا موقف یہ ہے کہ وہ جاندار چیزیں جو اپنی جائے پیدائش کے قدرتی مزاج سے زیادہ موافقت رکھتی ہوں وہ اولاد کے ذریعے زندہ رہ جائیں گی جبکہ وہ جو ناموافق ہوں گی' مٹ جائیں گی۔ مثلاً ہرنوں کے ایک ریوڑ میں سے جو جنگلی جانوروں کے خطرے میں گھرے ہوئے ہوں' قدرتی طور پر وہی بچ جائیں گے جو تیز دوڑ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن قطع نظر اس بات کے کہ یہ عمل کب تک جاری رہتا ہے' یہ ان ہرنوں کو دوسرے جانداروں میں تبدیل نہیں کر دے گا۔ ایسی ماہیتِ قلبی ممکن نہیں۔ ہرن ہمیشہ ہرن رہیں گے۔''

جب ہم اُن چند واقعات پر نظر ڈالتے ہیں جنہیں ارتقاء پسندوں نے ''فطری انتخاب'' کی مشاہدہ میں آنے والی مثالوں کے طور پر پیش کیا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں۔'' (نظریہ ارتقاء ۔۔ ایک فریب (اردو ترجمہ) ہارون یحیٰی ص ص ۳۱' ۳۲)

<u>ڈارونزم کی تردید</u>: ڈارون کا نظریہ ارتقاء اِس قدر غیر معقول اور غیر سائنسی ہے کہ ہر زمانے میں مختلف سکالرز نے اِسے معقول طور پر جھٹلایا ہے۔ مثلاً:

(۱) یونیورسٹی کالج آف ویلز کے شعبہ فلکیات اور اطلاقی ریاضی کے پروفیسر چندراوِکرماسنگھ تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

''بے جان مادّے سے زندگی کے خود بخود وجود میں آجانے کا امکان کسی تعداد کے بعد ۴۰،۰۰۰ صفر لگا دینے میں سے ایک ہے اور یہ اتنا بڑا ہے جس سے ڈارون اور اُس کے مکمل نظریہ ارتقاء کو دفن کیا جا سکتا ہے۔ عہدِ قدیم میں اِس سیارے پر یا کسی دوسرے سیارے پر کوئی ایسا شوربہ یا یخنی نہیں تھی جس سے ایسا ہو جاتا۔ اور اگر زندگی کا آغاز بے ترتیب نہ تھا تو پھر یہ یقیناً با مقصد ذہانت کی پیداوار تھی۔''

("Evolution from Space" -- Chandra Wickramasinghe, p. 148) New York 1984.

(۲) سر فریڈ ہائل اِن نامعتبر اعداد و شمار پر یوں تبصرہ کرتا ہے:۔

''بے شک یہ نظریہ (کہ زندگی ایک ذہانت کے ذریعے تشکیل دی گئی) اِس قدر واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اِسے وسیع پیمانے پر اظہر من الشمس کے طور پر تسلیم کیوں نہ کر لیا گیا۔ اِس بات کی وجہ سائنس کی نسبت زیادہ نفسیاتی ہیں۔'' (ایضاً صفحہ ۱۳۰)

(۳) نارمن میکبتھ جس نے اپنی کتاب (Darwin Retried) میں ڈارون کو جھٹلایا' لکھتا ہے:۔

''مسئلے کا اصل پہلو یہ ہے کہ کیا جاندار چیزیں واقعی ایک لامحدود مدّت تک ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں اور غیر متبدّل نوع دکھائی دیتی ہیں۔ ہم سب نے جانوروں کو پالنے والے ان مایوس لوگوں کے بارے میں سُن رکھا ہے جنہوں نے اپنا کام ایک خاص حد تک جاری رکھا تا کہ وہ یہ دیکھ سکیں کہ کیا جانور یا پودے تبدیل ہو کر واپس پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے اُنہوں نے آغاز کیا تھا۔ کیا وہیل مچھلی نے ریچھوں سے بذریعہ عملِ تغیر موجودہ شکل حاصل کی؟''

(۴) برطانوی ماہرِ آثارِ قدیمہ جے ہاکس اپنے مضمون "Nine Tenalizing Mysteries of Nature" میں جو نیو یارک ٹائمز ۱۹۵۷ میگزین میں چھپا تھا' قدرتی انتخاب کے بے معنی ہونے پر سوال کرتا ہے:۔

''مجھے یہ یقین کرنا مشکل لگتا ہے کہ پرندوں' مچھلیوں' پھولوں اور دوسرے جانداروں کی بے پناہ عظمتیں محض قدرتی انتخاب کے ذریعے تخلیق ہو گئیں۔ میرے نزدیک یہ بات بھی نا قابلِ یقین ہے کہ انسانی شعور بھی اِسی قسم کی تخلیق ہے۔ یقین نہیں آتا کہ انسانی دماغ جس نے شاندار تہذیب کو تخلیق کیا اور جس نے سقراط' شیکسپیئر' ریمبرانٹ اور آئن سٹائن کو نادر خیالات سمجھائے' حیاتیاتی دَور میں بقاء کی جدّ وجُہد سے شکاریوں کے جنگل میں جنگلی کھیل کھیلنے سے وجود میں آ گئے۔''

("Allah's Artistry in Colour" -- Harun Yahya, pp. 107-08)

''ماہرینِ ارتقاء کے اعترافات سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اُنہیں اس بات کا علم ہے کہ اُن کا نظریہ بُحران کا شکار ہے۔ ایسے نظریہ کا دفاع کرنا بعید از عقل ہے جس کے مطابق خُلیہ حادثاتی طور پر بارش اور آسمانی بجلی کے نتیجے میں وجود میں آ گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختلف رنگوں کی جاندار چیزوں میں بدل گیا۔ مثلاً اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک سائنسدان جرثومے کا ایک خُلیہ لے کر اپنی پوری کوشش اُس پر صَرف کرے اور لاکھوں سال اِس کوشش میں لگا رہے (اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے لیکن ہم فرض کر لیتے ہیں) تو آخر میں اُسے کیا ملے گا؟ کیا وہ کسی جرثومے کو چمکتے رنگوں والے مور کی شکل دے سکے گا یا چیتے میں بدل سکے گا جس کی جلد پر مکمل نمونے بنے ہوں یا گلاب کے پھول میں بدل سکے گا جس کی پتیاں سرخ مخمل کی سی ہوں؟ یقیناً ذہین لوگ ایسی بات کا نہ تو تصوّر کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایسا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اِس کے باوجود ارتقاء کے نظریے کا دعویٰ یہی ہے۔''

نظریہ ارتقاء میں رنگ کی پیچیدگی: آیئے ایک مثال سے یہ ثابت کریں کہ زندہ چیزوں کے رنگوں اور ''قدرتی انتخاب'' کے ذریعے رنگوں میں تبدیلی کے نظام کا ہونا ناممکن ہے۔ مثلاً گرگٹ ایک ایسا جانور ہے جو ماحول کے مطابق اپنا رنگ ڈھال لیتا ہے۔ جب وہ سبز پتے پر آرام کر رہا ہو' تو اُس کا رنگ سبز ہو جاتا ہے۔ جب وہ بھوری ٹہنی پر چل رہا ہو تو اُس کی جلد کا رنگ جلد ہی بھورا ہو جاتا ہے۔ آیئے مل کر سوچتے ہیں کہ

بہ مقابلہ کثیر الاصلی جین ۔ انسانِ اوّل کا مذہب ۔ ابتدا میں نوع انسان کے دینِ برحق پر ہونے کے دلائل ۔ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے اللہ کے تمام پیغمبر توحیدِ الٰہی لے کر آئے ۔ دین اور شریعت کا لغوی اور اصطلاحی معنی ۔ خود پسندی' خود ستائشی' مذہبی تنگ نظری وہ واحد رکاوٹیں ہیں جو صحیح رہنمائی کا راستہ تسلیم کرنے میں حائل ہوتی ہیں ۔ آباء پرستی کوئی معقول بات نہیں ۔ تقلید کی تعریف ۔ بدکار یومُ الحساب میں ایک دوسرے کو اُن کی بدعملیوں کی وجہ سے کوسیں گے ۔ سورۃ الاعراف کی آیات ۳۸ اور ۳۹' نیز سورۃ الانعام کی آیات ۱۲۶ اور ۱۲۷ کی وضاحت ۔ جنت کو دار السلام کہنے کی وجوہات ۔ حیاتِ طیّبہ کا مفہوم ۔ رب تعالیٰ کی پسندیدہ جماعت جسے دوسروں کی تہذیب کے لئے بھیجا گیا ۔ فضائلِ اُمّتِ محمدیہ ﷺ ۔ ڈارونزم (نظریہ ارتقاء) ۔ فطری انتخاب ۔ ڈارون کے نظریہ کی بے اثری ۔ بندر سے انسان کا ارتقاء ۔ ایک مکروہ نظریہ ۔ انسان کا بندر میں تبدیل ہونا محض اُن کی باغیانہ فطرے کی وجہ سے تھا ۔ سورۃ البقرۃ کی آیات ۶۵' ۶۶ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۶۶ کی توضیح ۔ انسان اور بندر میں مشابہت ایک داستانِ خیالی ہے ۔ اٹھانوے فیصد مشابہت ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے ۔ اگر انسان بندر سے بنا ہے تو بندر ابھی تک موجود کیوں ہیں؟ فوسل ریکارڈ نظریہ ارتقاء کو مسترد کرتا ہے ۔ حرکیات Thermodynamics کا دوسرا قانون نظریہ ارتقاء کو باطل قرار دیتا ہے ۔ نظریہ ارتقاء واضح نہیں کرسکتا کہ زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی ۔ جدید ڈارونی نظریہ اور متغیرات ۔ ڈارونزم کے برعکس قرآن مجید انسان کو باوقار مقام عطا کرتا ہے ۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰ کی تشریح ۔ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجوہ ۔ انسان اور فرشتوں میں کون افضل؟ انسانی تخلیق کے کیمیائی اور حیاتیاتی دونوں طریق ہائے عمل ۔ خدائی دانش وحکمت کی بلند ترین چوٹی کو چھوتے ہیں ۔ حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام کے درمیان وجوہِ مماثلت ۔ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی حکمتیں ۔ حضرت آدم علیہ السلام کے خاکی پُتلے سے کُن فَیکُون کے خطاب کی وضاحت ۔ انسان کو مٹی سے بنانا ۔ روح کا معنیٰ' روح پھونکنے کا محمل اور ہماری شریعت میں سجدۂ تعظیمی کا عدمِ جواز ۔ انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی توجیہات ۔ ایک اور حیاتیاتی عجوبہ تولید ۔ کیا خالق کا مقصدِ وحید تخلیق انسان ہی تھا اور اُس کے سوا کچھ نہ تھا؟ آسمان کی تخلیق پہلے ہوئی یا زمین کی؟ زمین کے فوائد ومنافع ۔

(۶) آثارِ قدیمہ (Archaeology) --- --- --- --- --- --- ۲۵۷

پاکستان میں ہڑپہ' موہنجوڈارو اور ٹیکسلا کی قدیم تہذیب پر آفتِ سماوی اور قوم عاد وثمود پر آفتِ سماوی میں مماثلت ۔ تہذیب قدیم کے کھنڈرات میں عبرت آموز سبق ۔ مختلف مقامات پر آثاریاتی جائزے اور کھدائیاں ۔ اہلِ سدوم پر عذابِ الٰہی ۔ قصرِ سلیمان علیہ السلام ۔ اصحابِ مدین اور اُن کی تباہی ۔ میدانِ صالح (حِجر) ۔ اصحاب الرّس ۔ ملکِ سبا ۔

رنگ کی تبدیلی کا یہ عمل کیسے وجود میں آتا ہے۔"

"ایک زندہ چیز اپنا رنگ انتہائی پیچیدہ عمل کے نتیجے میں تبدیل کرتی ہے جو اُس کے جسم میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔ انسان کے لئے اپنا یا کسی اور جاندار کا رنگ بدلنا ممکن نہیں کیونکہ انسانی جسم میں وہ خاص نظام ہے ہی نہیں جس کے ذریعے رنگ کو بدلا جاسکے۔ مختصر یہ کہ کسی زندہ چیز کے رنگ بدلنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کی تشکیل اِس طریق پر ہو کہ اُس میں رنگ بدلنے کا میکانزم موجود ہو۔"

"آیئے زمین پر پہلے گرگٹ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اگر اِس مخلوق میں رنگ بدلنے کی اہلیت نہ ہوتی تو کیا ہوتا؟ پہلی بات تو یہ کہ اُس کا آسانی سے شکار ہو جاتا کیونکہ وہ چھپ نہیں سکتا۔ دوم یہ کہ چونکہ اُس کی شناخت بہ آسانی ہو جاتی تو اُس کے لئے شکار کرنا مشکل ہو جاتا۔ تو اِس طرح اُس کے لئے اپنا دفاع کرنا ممکن نہ ہوتا۔ لہٰذا یا تو وہ مر جاتا یا فاقے کرتا اور کچھ عرصے کے بعد نا پید ہو جاتا۔ اِس کے باوجود دنیا میں اُس کا وجود اِس بات کا ثبوت ہے کہ اِس قسم کا واقعہ کبھی رُونما نہیں ہوا۔ اس لئے گرگٹ میں اُس وقت سے یہ نظام موجود ہے جب یہ زمین پر پہلی دفعہ ظاہر ہوا تھا۔"

"نظریہ ارتقاء کے ماہرین کا دعویٰ ہے کہ گرگٹ نے یہ نظام وقت کے ساتھ ساتھ از خود پیدا کیا ہے۔ اِس سے ذہن میں کئی سوالات اُبھرتے ہیں: (۱) گرگٹ نے رنگ بدلنے کا اتنا پیچیدہ نظام کیوں پیدا کیا جبکہ دفاعی نظام قدرے آسان بھی ہو سکتا تھا؟ (۲) اُس نے کئی دفاعی نظاموں کے ہوتے ہوئے رنگ بدلنے کا نظام ہی کیوں اپنایا؟ (۳) اِس قسم کا میکانزم جس میں کیمیائی عمل بھی ہے' آخر گرگٹ میں ہی کیوں ہے؟ (۴) کیا کسی رینگنے والے جانور کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ایسے نظام کے بارے میں سوچے اور اپنے جسم میں ایسا نظام پیدا کرے؟ (۵) علاوہ ازیں کیا کسی رینگنے والے جانور کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خفیہ معلومات جو رنگ بدلنے کے لئے ضروری ہیں' ڈی این اے کو دے جو اُس کے خلیوں میں ہے؟"

"یہ بات خارج از بحث ہے کیونکہ یہ ممکنات میں سے ہے ہی نہیں۔ مندرجہ بالا سوالات کے جوابات سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ایک ہی ہے کہ کسی بھی جاندار کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ کوئی ایسا پیچیدہ نظام بنائے جو اُسے اپنا رنگ بدلنے کی اہلیت دے دے۔"

"نہ صرف رنگ بدلنے کے نظام میں بلکہ مختلف رنگوں اور نمونوں میں جو جانداروں میں موجود ہوتے ہیں' اِن سب پر نظر مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ طوطوں کے چمکتے رنگ' مچھلیوں کے مختلف رنگ'

تتلیوں کے پروں میں تناسب' پھولوں کے مسحور کن نمونے اور دوسرے جانداروں میں ایسی چیزیں ازخود آ جائیں۔ ایسے مکمل نمونے' رنگ اور شکلیں جو جانداروں کی زندگی کے اہم مقاصد پوری کرتے ہیں' اُن کی تخلیق پا جانے کا قطعی اور واضح ثبوت ہیں (نہ کہ ارتقائی عمل کا)۔ ظاہر ہے کہ ہمارے اردگرد رنگوں کی تشکیل کرنے والی ایک ایسی ذات ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ ڈیزائننگ کر رہی ہے۔''

''آیئے اِسے ایک مثال سے واضح کریں: ایک چھوٹا سا مربّع بنانے کے لئے بھی ہمیں کچھ پیشگی تخمینہ لگانا پڑتا ہے اور یہ یقین کرنا ہوتا ہے کہ اُس کے چاروں اَضلاع ایک جیسے اور باہم مساوی ہیں اور یہ کہ اُس کے تمام اَضلاع کے زاویے ۹۰ درجے کے ہیں۔ ہم مربّع صرف اُس کے اَضلاع اور زاویوں کا صحیح تخمینہ لگانے پر ہی بنا سکتے ہیں۔ معلوم ہوُا کہ ایک چھوٹا سا مربّع بنانے کے لئے بھی کسی حد تک علم اور مہارت کی ضرورت ہے۔''

''آیئے اِسی استدلال کو اپنے اردگرد کے جانداروں پر لاگو کریں اور اُن پر غور کریں۔ جانداروں میں مکمل ہم آہنگی' ترتیب اور منصوبہ بندی ہے۔ ایک شخص جو ایک سادہ سے مربّع کے بنانے میں علم اور مہارت سے بے نیاز نہیں ہوسکتا' فوری طور پر سمجھ جائے گا کہ کائنات میں ترتیب' ہم آہنگی' رنگوں اور نمونوں کی آفرینش بھی لامحدود علم اور مہارت کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا اِس دعویٰ کی کوئی معقول یا سائنسی بنیاد نہیں کہ کائنات جیسا (محیر العقل) نظام اتفاقی اور حادثاتی طور پر معرضِ وجود میں آ گیا۔ اُس بے پناہ قوّت اور طاقت والے اللہ نے تمام کائنات کی تخلیق کی ہے۔ اللہ وہ واحد (لاشریک) ذات ہے جو جس چیز کو بھی بناتا ہے تو انتہائی خوبصورتی سے بناتا ہے۔'' ("Allah's Artistry in Colour" -- Harun Yahya, pp. 108, 110-112)

فطرت میں تناسب اتفاقی نہیں ہوسکتا: کائنات کی تخلیق میں ایک حیران کن نکتہ اُس کا تناسب ہے جو ہم آہنگی کا سبب ہے۔ ہر زندہ چیز کی ساخت میں تناسب ہے۔ بیج ہو یا پھل' پتہ ہو یا درخت' اُن کی ساخت میں ہمیں تناسب نظر آئے گا۔ پتوں والے پودوں کو دیکھئے: پتے پودوں کے گرد بل کھاتے ہوئے مرغولہ کی طرح بلند ہوتے ہیں۔ یہ ایک خاص قسم کا تناسب ہے۔ اِسی طرح ایک قابلِ مشاہدہ ترتیب بیج کے دانوں اور پتے کی رگوں کے نمونے میں ہے۔''

''تتلی کے پَر فطرت میں تناسب کی ایک اور مثال ہیں۔ تتلی کے دونوں پروں میں ایک ہی قسم کے رنگوں اور نمونوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایک پَر کا نمونہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ دوسرے پَر کا۔''

''اپنے اردگرد ہم تناسب اور حُسنِ توازن کی کئی اور مثالیں دیکھ سکتے ہیں۔ اُن میں سے کچھ کا خلاصہ اوپر دے دیا گیا ہے۔ تاہم ایک اہم بات یہ ہے کہ اِن تمام مثالوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمام جانداروں میں ایک بے مثال ترتیب ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ اِن تمام میں ایک شاندار کاریگری نظر آتی ہے اور ایک عظیم شہادت کہ کائنات کی یہ ترتیب اور کاریگری کسی بھی طرح حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آئی۔ پروفیسر سیمل یلدرم اِس حقیقت کو یوں بیان کرتا ہے اگرچہ وہ خود بھی ارتقاء کا حامی ہے :۔

''یہ بات ہرگز قائل کرنے والی نہیں کہ جانداروں میں ترتیب اور نظم کو جس کا ایک خاص مقصد ہے محض حادثہ یا اتفاق قرار دیا جائے۔''

(Quoted in Harun Yahya's "Allah's Artistry in Colour" p. 112)

نتیجہ: فہم وفراست کے حامل شخص کے لئے یہ دعویٰ انتہائی غیر معقول ہے کہ کائنات میں موجود اِس خوبصورت توازن وتناسب کو اتفاقی یا حادثاتی قرار دیا جائے۔ اِس ترتیب میں ہر تشکیل پانے والا ٹکڑا انتہائی اہم کردار انجام دے رہا ہے۔ جانداروں کے رنگ کائنات کی نظم وترتیب کا سب سے اہم جزو ہیں۔ جیسا کہ اوپر کی مثالوں میں دیکھا گیا کہ فطرت میں رنگوں، نمونوں یہاں تک کہ مخلوقات پر ثبت شدہ نقوش اور لکیریں بھی معانی سے خالی نہیں۔ رنگوں کو بعض اوقات رابطے کے لئے، بعض اوقات شکاریوں کو باخبر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہر بیں آنکھ بھی فوراً اِس حقیقت کو بھانپ لیتی ہے کہ فطرت میں ہر ہر چیز بالکل ویسی ہی ہے جیسے اُسے ہونا چاہئے اور یہ بھی کہ ہر چیز کو انسان کی خدمت کے لئے بنایا گیا (سورۃ الجاثیۃ : آیت ۱۳)۔ چرخِ نیلگوں کی عجب بناوٹ، مُہر بہ لب غنچوں کا تبسّم، پھولوں کی تازگی اور لطافت، لالہ ونرگس کی سرخی، سروِ چمن کی قد وقامت، لہلہاتے ہوئے مَرغزار، بہتی ہوئی آبشاریں اور چشمے، آفتاب کی تمازت ونور، ماہتاب کی رُوپہلی کرنیں سب اُس قادرِ مطلق کی صناعی کے عظیم مظاہر ہیں۔

حرفِ آخر: اِس حقیقت میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ خالقِ حقیقی کے حسن وجمال اور ماہرانہ کاریگری کا آئینہ دار ہے لیکن اُس کے حُسن وجمال اور اُس کی فیاضانہ عنایتوں کو اگر ایک ذات میں جمع دیکھنا ہو تو وہ ذاتِ مقدس ہمارے پیارے نبی ﷺ کی ہے جن کے حضور اُن کے ہم عصر شاعر جناب حسّان بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا نذرانۂ عقیدت یوں پیش کیا:

خُلِقتَ مُبَرَّأً مِّنْ کُلِّ عَیبٍ
کَأَنَّکَ قَدْ خُلِقْتَ کَمَا تَشَاءُ

''پیارے رسول! آپ ہر عیب اور خامی سے پاک پیدا کئے گئے۔ یوں لگتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو آپ کی منشا کے مطابق پیدا فرمایا۔''

(۲) علمِ زراعت ونباتات (Agriculture & Vegetation)

قرآنِ حکیم میں زراعت ونباتات کا نمایاں طور پر ذکر ہے جو ہماری روزمرّہ زندگی میں اُن کی اہمیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ عربی مصدر (ف'ل'ح) میں کاٹنے اور چیرنے کے بنیادی معنی ہیں۔ جب اس کا اطلاق زمین پر کیا جائے تو اس کا مطلب ''کیاری بنانا' ہل چلانا'' یا ''کاشت کرنا'' کا ہوتا ہے۔ لہٰذا فَلَاحَة ہل چلانے اور کاشتکاری کرنے کا فن ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے عرب کاشتکاری کے مسوّدوں میں اِس اصطلاح (فَلَاحَة) کو زراعت کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اس مصدر (ف'ل'ح) سے متعلق تمام حوالے اَفْلَحَ سے اخذ کئے گئے ہیں جس کا معنیٰ خوشحال ہونا' خوش بختی اور حالتِ مسرّت میں ہونا اور اپنی آرزو کا حاصل کرلینا ہے۔ ("A Dictionary and Glossary of the Koran" -- John Penrice, B.A., p. 112) N.Y. 1971.

قرآن مجید میں کاشتکاری سے متعلق دوسرے مصادر (ز'ر'ع) اور (ح'ر'ث) ہیں جو سُورَةُ الْواقِعَة کی آیات ۶۳' ۶۴ میں آئے ہیں: أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ٥ أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ٥ "یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اُسے تم اُگاتے ہو یا (اُس کے) اگانے والے ہم ہیں؟''

مصدر أثَ رَ (بمعنی کاشتکاری کرنا) سُورۃُ الرُّوم (۳۰) کی آیت ۹ میں أَثَارُوا الْأَرْضَ (اُنہوں نے زمین کو بویا' جوتا) کے الفاظ میں استعمال ہوا ہے۔

نباتات کے لئے عام استعمال ہونے والا عربی لفظ نَبات ہے جو قرآنِ حکیم کی سورة ۱۸ کی آیت ۴۵ اور سورۃ ۷۱ کی آیت ۱۷ میں استعمال ہوا ہے یعنی :

(۱) فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ (الکہف : ۴۵) (پھر برسات کے پانی کے ذریعے زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی)

(۲) وَاللهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا (نُوح : ۱۷) (اور اللہ نے تمہیں زمین ہی سے ایک خاص طور پر اگایا یعنی پیدا کیا)

ایڈورڈ لین نے نَبات کا مطلب ہر وہ چیز لیا ہے جو اللہ زمین میں اگاتا ہے' سبز بناتا ہے یا اُس میں سے چیر کر باہر نکالتا ہے۔ (انسائیکلو پیڈیا آف قرآن' جلد اوّل' ص ۴۰) برل' لیڈن' بوسٹن ۲۰۰۲ء

قرآنِ حکیم میں زراعت اور نباتات کے عام نظریات سے متعلق بالواسطہ اور بلا واسطہ جا بجا حوالے ہیں۔ سورۃ ابراھیم کی آیت ۳۷ میں بتایا گیا کہ جناب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو جو عربوں کے روایتی باپ ہیں' کعبہ شریف کے نزدیک وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ (بے زراعت میدان) میں آباد کیا۔

کھجوروں، اناروں، زیتون اور انگوروں (بحوالہ سورۃ الانعام: ۹۹، ۱۴۱ ؛ الرّعد: ۴ ؛ النحل: ۱۱) کے علاوہ اور بھی فصلیں ہیں۔ سورۃ ۱۸ (اَلْکَھْف) کی آیت ۳۲ میں انگوروں کے اُن دو باغوں کا حوالہ ہے جو کھجور کے درختوں اور کھیتی باڑی کئے گئے میدانوں سے گھرے ہوئے ہیں۔

الٰہیاتی معیشت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی مردہ زمین کا کھجوروں اور انگوروں کی بیل کے ساتھ اِحیاء (زندہ کرنا) ہے جنہیں چشموں سے بہتا پانی ملتا ہے اور وہ انسان کی خوراک کے طور پر پھل دیتے ہیں:۔
وَآیَۃٌ "لَّھُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَۃُ اَحْیَیْنٰھَا وَاَخْرَجْنَا مِنْھَا حَبًّا فَمِنْہُ یَاْکُلُوْنَ ۝ وَجَعَلْنَا فِیْھَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِیْھَا مِنَ الْعُیُوْنِ ۝ لِیَاْکُلُوْا مِنْ ثَمَرِہٖ وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ ۝ (یٰسٓ: ۳۳۔۳۵)
"اور اُن لوگوں کے لئے ایک نشانی مردہ زمین ہے، ہم نے اُسے زندہ کیا اور اُس میں سے غلّے نکالے سو اُن میں سے لوگ کھاتے ہیں۔ اور ہم نے اس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اس (زمین) میں چشمے جاری کردئے تاکہ لوگ اس (باغ) کے پھلوں سے کھائیں اور اس (سارے نظام) کو اُن کے ہاتھوں نے نہیں پیدا کیا، سو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟"

وَمَا عَمِلَتْہُ اَیْدِیْھِمْ کا ٹکڑا بہت ہی قابلِ غور ہے۔ ساری دنیا، خدائی قدرت وانتظام سے الگ ہو کر اگر مل کر بھی کوشش کر ڈالے کہ تخم ریزی و آبپاشی کے نتائج غلّہ، پھل وغیرہ ہی کی شکل میں ظاہر ہوتے رہیں تو کامیابی ناممکن ہے۔ یقینی طور پر اِن اسباب کو انہی نتائج کی صورت میں لانا صرف اور صرف قدرتِ خداوندی کا کرشمہ ہے۔ یہ ترجمہ مَا نافیہ کی صورت میں کیا گیا۔ اگر مَا کو موصولہ (بمعنی جو) مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اپنے پکے پکائے کھانے کو دیکھو تو اُس میں بھی حق تعالیٰ ہی کی ربوبیت کی جھلک پاؤ گے۔

قرآنِ حکیم نے بارونق، گنجان باغوں (حَدَائِق) کا بھی ذکر کیا ہے:۔
(۱) وَاَنْزَلَ لَکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِہٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَھْجَۃٍ (اَلنَّمل: ۶۰)
"اور اُس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا پھر ہم نے اُس کے ذریعے بارونق باغ اگائے۔"
(۲) وَحَدَآئِقَ غُلْبًا ۝ (عَبَس: ۳۰) "اور ہم نے گنجان باغ اگائے۔"

لفظ اَیْکَۃ لغت میں گھنے درختوں کی جگہ کو کہتے ہیں (اَیْکَۃ حضرت شعیب علیہ السلام کی بستی کا نام ہے جو مدین میں تھی جو بڑا ہی زرخیز اور گنجان آباد علاقہ تھا) اَیْکَۃ کا لفظ اِن سورتوں میں آیا ہے: اَلْحِجر: ۷۸؛ اَلشُّعَراء: ۱۷۶؛ صٓ: ۱۳؛ قٓ: ۱۴۔

ضَرِیْع (الغاشیة : ٦) ایک کڑوا پودا ہے جس کے بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں' شکل اور بُو میں قابلِ نفرت ہوتا ہے اور جس تک کوئی بھی جانور نہیں پہنچ پاتا۔ حجاز کے لوگ اِس کی خشک حالت سے متعارف تھے۔' سے سورة الغاشیة : ٦ میں جہنمیوں کی غذا کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

اَلـزَّقُّوْم کے درخت کا ذکر جس کا پھل شیطان کے سر کی طرح ہوتا ہے (اَلصَّافّات :٦٥) سورہ الصّافّات :٦٢؛ اَلدُّخان :٤٣؛ اَلْواقِعَة : ٥١ میں آیا ہے۔ اسے جہنمیوں کے مقدر کے طور پر بیان کیا گیا ہے اور اِسے عرب میں اس کے کڑوے ذائقے کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔

اِن میں سے کئی اصطلاحات اَب اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سیاق وسباق میں استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً لفظ حَـصِید جو سورہ یُونُس کی آیت ٢٤ میں آیا' اُن زرخیز میدانوں میں کھڑے مُڈھ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جنہیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تباہ وبرباد کر دیا' اُن کے مالکوں کی اِس خام خیالی کی پاداش میں کہ اُنہیں اِس کی پیداوار پر پورا اختیار ہے۔ لفظ حُطَام جو سورةُ الزُّمَر کی آیت ٢١' سورةُ الواقعة کی آیت ٦٥ اور سُـوره اَلحَـدِیـد کی آیت ٢٠ میں آیا' ایسے خشک تنکوں کے معنوں میں ہے جو چورا چورا ہو جائیں اور اُنہیں ہوا اُڑا کر لے جائے۔ لفظ حُطَام اِس بات کو بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زرخیز میدانوں کو آنِ واحد میں چورا چورا اور ملیامیٹ کرنے پر قادر ہے۔ پودے جن میں بیج (حَبَّة: سورة البقرة:٢٦١)' پھل (فـــاكِهة: سورہ اَلواقِعة :٣٢) اور جانور کا چارہ (أبّ: سورہ عَبَس:٣١) بھی شامل ہیں' اللہ تعالیٰ کی تخلیقات کے فائدے کی مثال ہیں (سورہ عَبَس:٢٤ تا ٣٢)۔ جو شخص اپنا مال اللہ کی رضا کی خاطر خرچ کرتا ہے' اُس بیج کی مانند ہے جو اناج کی سات بالیاں اُگاتا ہے اور ہر بالی میں ١٠٠ بیج ہوتے ہیں۔

کئی الفاظ اور کلمات جن میں پانی جیسی زندگی کی ناگزیر ضرورت کا حوالہ ہے' کا ذکر بھی یہاں ہونا چاہئے۔ بارش کے پانی کے لئے مندرجہ ذیل اصطلاحات ہیں:۔

غَیْث: (سورہ لقمان:٣٤ ؛ الشّورٰی :٢٨ ؛ سورہ اَلحدید:٢٠)

وَابِل : (سورہ اَلبقرة:٢٦٥۔ وَابِل شبنم کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے)

وَدْق : (سورہ اَلنّور:٤٣ ؛ سورہ اَلرّوم :٤٨) (انسائیکلوپیڈیا آف قرآن' جلد اوّل)

''پانی سے لدی ہوئی ہواؤں (اَلرِّیاح لَواقِح جن کا ذکر سورة الحِجر کی آیت ٢٢ میں ہوا) کو یہ

نام اس لئے دیا گیا کہ وہ بادلوں سے بھری ہوتی ہیں اور بارش برسانے کا سبب بنتی ہیں۔ زمیں دوز پانی چشموں (یَنبُوع: سورہ اَلا سراء: ۹۰؛ جمع یَنَابِیع: سورہ اَلزُّمَر: ۲۱؛ عَین: سورہ الغاشیۃ: ۱۲؛ تثنیہ عَینَان سورہ الرَّحمٰن: ۵۰؛۶۶؛ جمع عُیُون: سورہ اَلشُّعراء: ۵۸؛ سورہ اَلدُّخان: ۲۵ اور مَآءُ ھَا غَورًا (سورہ الکہف: ۴۱؛ سورہ اَلمُلک: ۳۰) جیسے الفاظ اور اصطلاحات میں ظاہر ہوتا ہے۔ بارش کے لئے سب سے زیادہ استعمال ہونے والا لفظ مَآء ہے جو قرآنِ حکیم میں جابجا استعمال کیا گیا ہے جیسے:

وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ''اللہ آسمان سے پانی نازل فرماتا ہے۔''

یہ جملہ ۲۶ مرتبہ قرآن میں آیا ہے اور نَو دوسرے مقامات پر لفظ مَآء (بمعنیٰ پانی) اِسی سیاق میں آیا ہے۔

مندرجہ ذیل آیت کو کلیدی آیت کے طور پر لیا جا سکتا ہے جو بارش کے معنیٰ کے ساتھ ساتھ پودوں کی دوسری اصطلاحات کو بھی شامل ہے:۔

وَھُوَالَّذِیٓ اَنزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخرَجنَابِہٖ نَبَاتَ کُلِّ شَیءٍ فَاَخرَجنَا مِنہُ خَضِرًا نُّخرِجُ مِنہُ حَبًّا مُّتَرَاکِبًا وَمِنَ النَّخلِ مِن طَلعِھَا قِنوَان'' دَانِیَۃ'' وَّجَنّٰتٍ مِّن اَعنَابٍ وَّالزَّیتُونَ وَالرُّمَّانَ مُشتَبِھًا وَّ غَیرَ مُتَشَابِہٍ اُنظُرُوٓا اِلٰی ثَمَرِہٖٓ اِذَآ اَثمَرَ وَیَنعِہٖ اِنَّ فِی ذٰلِکُم لَاٰیٰتٍ لِّقَومٍ یُّؤمِنُونَ O (الانعام: ۹۹)

''وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر ہم اُس کے ذریعے ہر قسم کی اُگنے والی چیز نکالتے ہیں، پھر ہم اُس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اور اُس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے نیچے جھکے ہوئے گچھے نکالتے ہیں، اور ہم انگوروں، زیتون اور انار کے باغات پیدا کرتے ہیں جو (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ۔ درخت کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل دار ہوتا ہے اور (دیکھو) اُس کے پکنے کو۔ بے شک اِس میں (اُس کی قدرتِ کاملہ کی) اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایمان کی تلاش و طلب رکھتے ہوں۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا پہچاننا مشکل نہیں۔ تمہارے اوپر اور نیچے، تمہارے دائیں اور بائیں میری مصنوعات اور تخلیقات کا جو مینا بازار سجا ہوا ہے اِسی میں غور کرو۔ ہر چیز یہ پکارتی ہوئی سنائی دے گی کہ وہ اپنی نیرنگیوں کے ساتھ خود بخود موجود نہیں ہوگئی بلکہ اُس کا ایک بنانے والا ہے جو بڑی ہی طاقتوں والا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی، بیج کا دانہ پھٹ رہا ہے۔ اُس میں سے ایک نرم و نازک بال نکل آئی ہے۔ اُسے آپ کمزور نہ سمجھے۔ یہ تو مٹی کی کئی انچ موٹی تہہ کو چیر کر نکلی ہے۔ یہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ وہ بال اب ایک تھے سے تنے میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ہوا کے تھپیڑوں کو برداشت کرنے کے لئے مناسب فاصلوں پر اُس میں گرہیں ڈالی جا

رہی ہیں۔ اب اُس کے سر پر ایک خوشہ سا ظاہر ہو گیا ہے۔ اب اُس کی جیبیں دانوں سے بھر گئی ہیں۔ یہ پودا جو پہلے ہرا بھرا اور نرم و نازک تھا' اب اپنا رنگ تبدیل کر رہا ہے۔ غور کرنے والی آنکھ خود فیصلہ کر لے کہ کیا یہ اندھے مادے کی کاریگری ہے یا علیم و قدیر پالنہار کی کاریگری کا اعجاز ہے؟ اُنظُرُوا کے معنیٰ سرسری دیکھنے کے نہیں بلکہ غور و فکر سے دیکھنے کے ہیں (تفسیر قرطبی)۔

مکئ' زیتون اور کھجور کے درختوں اور انگور کی بیلوں کو بالخصوص بیان کیا گیا ہے۔ سورہ اَلنَّحل اور سورہ عَبَس میں دو جگہ چار پودوں کو اُن کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے یکجا کر دیا گیا ہے:۔

(۱) يُنْبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ (اَلنحل: ۱۱)

''وہ اُسی (بارش کے پانی سے) تمہارے لئے کھیتی' زیتون' کھجور' انگور اور ہر قسم کے پھل اُگاتا ہے۔''

(۲) فَأَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّاo وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا o وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًاo (عَبَس: ۲۷۔۲۹)

''پھر ہم نے اُس میں غلّہ' انگور' ترکاری' زیتون اور کھجور اُگائی۔''

زراعت کی اہمیت: زراعت پودے کی زندگی کا منبع ہے جس کے غذائی فوائد حیاتِ انسانی کی بنیاد ہیں۔ پودوں کی طبّی قدر بھی ہے۔ یہ تکلیف اور بیماریوں کو رفع کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارا لباس جو ہماری عریانی کو چھپاتا ہے اور ہمارے جسموں کو سردی' گرمی کی شدت سے بچاتا ہے' کاشت کئے گئے پودوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلام زمین کی مناسب کاشت پر بہت زور دیتا ہے جسے پیداوار کا ایک اہم عامل سمجھا جاتا ہے۔ پیداواری عمل میں تمام قدرتی عوامل شامل ہیں یعنی زمین کی زرخیزی' زمین کی سطح' معدنیاتی ذرائع اور ہوا اور پانی کی خصوصیات وغیرہ۔ اسلام میں معاشی اخلاقیات کا بنیادی اصول جو فوز و فلاح کا ضامن ہے' یہ ہے کہ صرف اُن فوائد کی تخلیق ہو جو معاشرے کی اقتصادی فلاح کو زیادہ سے زیادہ بڑھا سکیں۔ قرآنِ حکیم بیکار اور بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے اور فرحت زا ثمردار باغات میں تبدیل کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہے' اُس میں پانی کا بندوبست کر کے پھلدار باغ اور اچھی فصلوں کے اگانے کا انتظام کیا جائے۔ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُوْنَo (الٓمّ السَّجدة: ۲۷)

''کیا اُنہوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم بنجر زمین کی طرف پانی پہنچاتے رہتے ہیں پھر اُس کے ذریعے کھیتی نکالتے ہیں جس سے اُن کے مویشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں۔ تو کیا وہ (یہ بھی) نہیں دیکھتے؟''

اِس مثال سے اِس امر کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے کہ تم اسلام کی ظاہری کمزوری دیکھ کر اُس کے مستقبل سے مایوس نہ ہو جاؤ۔ اگر بارش کے ایک چھینٹے سے چشمِ زدن میں بنجر زمین کی کیفیت بدلنے لگتی ہے اور وہاں چند روز کے بعد سرسبز کھیت لہلہانے لگتے ہیں' تو اس سے کوئی بعید نہیں کہ وہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر بھی اپنی نظرِ رحمت فرمائے اور چشمِ زدن میں اُن کی پستی کو بلندی سے' اُن کی پریشانی کو خوشحالی سے اور اُن کی شکست کو فتح سے بدل دے۔ اَلْجُرُز اُس زمین کو کہتے ہیں جو ہو تو زرخیز لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے بالکل سوکھ گئی ہو (قرطبی)۔

زرعی پیداوار بڑھانے کے لئے اسلام نے زراعت اور نباتات کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے۔ اِس ضمن میں اسلام مسلمانوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اُن کی زمینیں پانی کے دہانے پر ہوں تاکہ اُنہیں پانی ملتا رہے اور وہ اِس بات پر بھی تیار رہیں کہ جب اُن کی ضرورت پوری ہو جائے تو پانی کو دوسرے حصّوں کی طرف جانے دیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔
''زائد پانی کو مت روکے رکھو کہ اس سے نباتات کی افزائش میں رکاوٹ ہوگی۔'' (صحیح بخاری)

یہاں تک کہ عوام کے لئے کنواں کھدوانے کو بھی عظیم کارِ خیر سمجھا جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:۔
''جو کوئی روما کا کنواں کھدوائے گا' جنت کا مستحق قرار پائے گا۔'' (ایضاً)
تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے جو رسول اللہ ﷺ کے داماد تھے' اسے کھدوایا۔

''اسلام میں زمین کو پیداواری عامل کے طور پر اِس طرح استعمال کیا جائے کہ آخر کار متوازن پیداوار کا مقصد حاصل ہو جائے۔ جب لوگ دوسرے پیشوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک پیشے کے ہو کے رہ جائیں' جس سے بہ حیثیتِ مجموعی قوم کو نقصان پہنچے تو شریعت ریاست کو مداخلت کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ اِس طرح جب لوگ زرعی زمین حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کر دیں' کاشت کاری کو ہی اپنا پیشہ بنا لیں اور دوسرے پیشوں کو نظر انداز کر دیں جیسے صنعت یا سرمایہ کاری تو ریاست اِس یقین کے ساتھ اُصول وضع کر سکتی ہے کہ عوام اپنی دولت کو صحیح طور پر پھیلائیں اور ایسی تجارتوں یا صنعتوں میں سرمایہ کاری کریں جو بالآخر پورے معاشرے کے لئے مفید ہو۔'' اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو قوم اپنے آپ کو مکمل طور پر زراعت تک ہی منسلک کر دیتی ہے اور ترقی کی دوسری لائنوں کو نظر انداز کر دیتی ہے' کبھی ترقی کی منزلِ رفیع نہیں پا سکتی۔

ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ ہل اور کچھ زرعی آلات دیکھتے تو میں

اُنہیں یہ کہتے ہوتے سنتا: ''یہ جس گھر میں داخل ہوتے ہیں' اپنے ساتھ خوشحالی ہی لاتے ہیں۔'' (صحیح بخاری)

انسانی زندگی میں زراعت کی اہمیت اس حقیقت سے بھی ظاہر ہے کہ اسلام اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ زمین کو استعمال میں نہ لایا جائے۔نبیِ مکرّم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:
''جو شخص کسی ایسی زمین پر قبضہ کر لیتا ہے جو کسی کی ملکیت نہیں' تو اگر وہ اُسے مناسب طور پر استعمال نہیں کرتا تو قبضہ سے تین سال بعد اُس کا اُس زمین پر کوئی حق نہیں رہتا۔''

''زمین پر ملکیت کے نظریئے نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہِ خلافت میں زور پکڑا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے حضرت بلال بن حارث رضی اللہ عنہ سے وہ زمین واپس لے لی تھی جو نبیِ مکرّم ﷺ نے اُنہیں دی تھی محض اس لئے کہ جنابِ بلال نے اُن زمینوں کو استعمال نہیں کیا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا واپسی کرانے کا یہ عمل بنجر زمین کو کاشت میں لانے کے لئے ایک محرّک تھا۔

("Islamic Economics -- Theory and Practice" -- M.A. Mannan, p. 89)

سیّدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''جو کوئی اُس زمین کی کاشت کرتا ہے جو اُس کی ملکیت نہیں ہے' تو اُس زمین پر اُس کا حق فائق ہے۔'' (بخاری)

''اِس پالیسی کے پسِ پردہ حکمت آج بھی بالکل واضح ہے۔کیونکہ بہت سے مسلمان ممالک میں بہت سی زمینوں پر کاشت نہیں ہوتی اور سالہا سال سے وہ بنجر پڑی ہیں محض اس لئے کہ زمین پر قبضے کا نظام بہت خراب ہے جس سے جاگیردارانہ نظام وغیرہ جیسے قبیح نظاموں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔چونکہ زمین کے استعمال نہ ہونے سے زمین ضائع ہوتی ہے اور مالک اور معاشرہ بہ حیثیتِ مجموعی مفلس ہو جاتے ہیں' اسلامی حکومت مداخلت کر سکتی ہے اور اُنہیں ملکیتی حقوق سے محروم کر سکتی ہے۔ریاست اِس بے دخلی کے لئے صرف اس صورت میں معاوضہ ادا کرے گی جہاں زمین کو جائز طریق سے حاصل کیا گیا ہو' ناجائز طریقے سے نہیں۔ اگر اِس حکمتِ عملی کو اپنا لیا جائے تو وسیع کاشت کی وجہ سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔خوراک کا مسئلہ جس نے دنیا کے تمام مسلم ممالک کو پریشان کر رکھا ہے' بہت حد تک حل ہو جائے گا۔'' (ایضاً ص ۸۹'۹۰)

اسلام جہاں زمین کو مفید مقصد کے لئے استعمال کرنے پر زور دیتا ہے' وہاں وہ مالک پر یہ پابندی بھی

سدِّ مارب۔اصحابِ کہف کا غار (اَلرَّقیم)۔

(۷) تیراندازی اور شکاریات (Archery & Hunting) --- --- --- ۲۶۴

تیراندازی کی اہمیت۔ جنگ اور جہاد میں فرق۔سورۃ الانفال کی آیت ۶۰ میں لفظ قُوَّۃ کے معنی۔ اَلرَّمی کا قدیم و جدید معنی۔تیراندازی ازروئے احادیثِ مبارکہ۔نشانہ بازی بذریعہ غلیل کی ممانعت۔قرآن مجید میں بڑی و بحری شکاریات کے متعلق اشارات۔قرآنی لفظ بَحر سے مراد۔ شکاری کی تعریف۔شکاری سے متعلق شرائط۔شکار سے متعلق شرائط۔ سورۃ المائدۃ کی آیت چہارم کے چند باریک نکات۔ہتھیار سے شکار کھیلنا۔شکاری کتّوں وغیرہ کے ذریعے شکار کھیلنا۔ جب شکار مردہ حالت میں پایا جائے۔طیور بانی (پرندوں کو پالنے اور پرورش کرنے کا مشغلہ)۔حیوانوں اور پرندوں کی انسانوں سے مماثلت کی وجوہ۔ بلاضرورت کتّے رکھنا۔کتّے رکھنے سے متعلق سائنسی تحقیقات۔

(۸) فنِ تعمیرات (Architecture) --- --- --- --- --- --- ۲۸۰

قرآنِ حکیم اور سلیمان علیہ السلام کی انوکھی اور غیر معمولی تعمیرات۔لفظ صَرح قرآن مجید میں۔ فرعون نے اللہ کو دیکھنے کے لئے بلند و بالا عمارت بنوائی تھی کہ نہیں؟ فنِ تعمیر سے متعلق قرآنی اصطلاحات: قَریَة - مدینة - مَساکن - بَلَد - بیت - دِیار - قَصر - مسجد - محراب۔ مسجد بنانے کے تذکرہ میں ایمان بالرسول ذکر نہ کرنے کی توجیہات۔تعمیراتی منصوبوں اور ڈیزائنوں کی طرف قرآنِ حکیم کے براہِ راست اشارات۔ فساد فی الارض کا مفہوم۔ اَلْحِجر۔ متعدد منزلہ بلڈنگیں' خوبصورت عمارات' پلازے' شاپنگ سنٹر بنانے کی شرعی حیثیت۔ قومِ عاد اور قومِ ثمود کا تقابلی جائزہ۔محراب کے داخلِ مسجد ہونے کی تحقیق۔تصویروں کا شرعی حکم۔ویڈیو اور ٹیلیویژن کی تصاویر کی شرعی حیثیت۔حج و عمرہ کے لئے فوٹو کا جواز۔فنِ تعمیرات سے متعلق قرآن کی ایک اور اصطلاح کا مافوق الطبعیات سے تعلق۔قرآنی حوالہ جات کا تعمیراتی منصوبہ بندی پر اثر۔چند متعلقہ اصطلاحات اور نام قرآنِ حکیم کی روشنی میں۔مسجدوں میں کافروں کے داخلے کی شرعی حیثیت۔مسجدوں میں کافروں کے داخلے کا جواز مع دلائل۔اوّلیت کعبہ اور اس کی تعمیر۔ہدایت اور اس کا مفہوم۔معجزہ نبی کے اختیار میں ہوتا ہے کہ نہیں؟ مزدوری کا معاوضہ۔ چند مشہور عمارات: مسجد قرطبہ۔الحمرا۔تاج محل۔قصرِ زہرا۔سلیمانیہ مسجد۔بادشاہی مسجد۔لال قلعہ دہلی۔مقبرہ جہانگیر (لاہور)' مقبرہ بہاءالدین زکریا سہروردی' مقبرہ شاہ رکنِ عالم (ملتان)

(۹) فنونِ لطیفہ (ART) --- --- --- --- --- --- ۳۱۱

سلیمان علیہ السلام بطور سرپرست فنونِ لطیفہ۔ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام کی تحقیق۔ابراہیم

عائد کرتا ہے کہ وہ اسے مضر طریقے پر استعمال نہ کرے کیونکہ جب اُس کا استعمال دوسروں کے لئے مضر ہوگا تو یہ جارحیّت ہوگی جس کی قرآنِ حکیم میں سختی سے ممانعت کی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۰)۔

قرآن حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں زرعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی: ذیل میں چند اور قرآنی آیات درج ہیں جن میں زرعی اور نباتاتی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے:

(۱) وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ (الانعام : ۱۴۱)

"وہ وہی تو ہے جس نے ٹٹیوں پر چڑھائے ہوئے اور کچھ بغیر چڑھائے ہوئے باغات پیدا کئے اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ اُن کے کھانے کی چیزیں الگ الگ ہوتی ہیں اور زیتون اور انار (جو شکل میں) ایک جیسے اور (ذائقہ میں) مختلف۔"

یہ مماثلت اور عدمِ مماثلت رنگ، مزہ، خوشبو اور جسامت ہر لحاظ سے ہوسکتی ہے۔

(۲) وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ٥ (الحجر:۱۹)

"اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اُس میں محکم پہاڑ گاڑ دئے اور اُس میں ہم نے ہر چیز ایک معیّن مقدار سے اُگا دی۔"

یہاں الٰہیاتی میزانِ حکمت کے احساس کو جگایا جارہا ہے کہ ہر چیز کے لئے خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، نباتات ہو یا جمادات، سب میں معیّن مقدار اور مخصوص خاصیتیں رکھ دی ہیں جن میں کہیں رد و بدل دکھائی نہیں دے گا۔ انار کے پودے پر گندم کے دانے نہیں لگ سکتے، کوے کی جو شکل اور حجم مقرر ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی، شیر جیسے قوی جانور کے لئے بھی قد و قامت کا ایک خاص پیمانہ مقرر ہے جس سے وہ آگے تجاوز نہیں کر سکتا اور بڑھ کر ہاتھی کا حجم اختیار نہیں کرسکتا اور ہاتھی اپنے حجم کو گھٹا کر بلّی کی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ ہر چیز کے لئے ایسے مضبوط قوانین اور ایسے معیّن پیمانے مقرر ہیں جن میں تبدیلی ہو ہی نہیں سکتی۔

(۳) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ٥ فِيْهَا فَاكِهَةٌ *وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ٥ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ٥ (اَلرَّحْمٰن : ۱۰-۱۲)

"اور اُسی نے زمین کو مخلوق کے لئے پیدا کیا، اس میں میوے اور غلاف دار کھجور کے درخت ہیں، اور (اُس میں) اناج بھی بھوسہ والا اور خوشبودار پھول بھی ہیں۔"

اُکمام جمع ہے کِمّ" کی بمعنی وہ غلاف جو قدرتی طور پر پھلوں پر چڑھا ہوتا ہے تاکہ اُن کا رس اور نرم گودا ضائع

*اشتراکیوں نے یہاں اَنـام کو انسان کا ہم معنی قرار دیا اور کہا کہ اِس آیت سے ثابت ہے کہ زمین سب انسانوں کے لئے مشترک ہے اور چونکہ ہر ملک کی حکومت وہاں کے باشندوں کی نمائندہ ہوتی ہے اس لئے زمین کی ملکیت کے حقوق صرف حکومت کو حاصل ہیں۔ اِس طرح یہ لوگ قرآن پر زیادتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اَنام سے مراد انسان، حیوان، چرند، پرند، مور و ملخ سب جاندار چیزیں ہیں۔ (ضیاء القرآن: جلد پنجم، صفحہ ۶۸)

نہ ہو جائے' موسمی تغیرات اُسے خراب نہ کر دیں' مکھیاں اور مچھر اُسے نا قابلِ استعمال نہ بنا دیں۔ جس مولائے کریم نے تمہاری خوراک کے قدرتی اسباب کو اتنی خوبصورتی سے Pack کر دیا ہے اور اُنہیں ہر طرح کے بیرونی مضر اثرات سے بچا رکھا ہے تا کہ جب تمہارے منہ میں کھجور کا دانہ یا آم کی کوئی قاش پہنچے تو وہ بالکل پاک و صاف اور تازہ ہو' کیا اُس کی شانِ رحمانیت کا تم انکار کر سکتے ہو؟

اَلْحَبُّ: اناج کے دانے۔ اَلْعَصْف: گندم اور جَو کے پودے کے پتے جو بھوسہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ جس طرح غلہ انسان کی غذا ہے' بھوسی بھوسہ' گھاس وغیرہ جانوروں کی غذائیں ہیں اور اس طرح بالواسطہ وہ بھی انسان ہی کے کام کی ہیں۔ اَلرَّيْحَانُ: طرح طرح کے خوشبودار پھول۔ یعنی جو بھی جنس پیدا کی ہے' اُس کا کچھ حصہ تمہارے کھانے کے کام آتا ہے اور کچھ حصہ تمہارے جانوروں کی خوراک بنتا ہے اور کہیں رنگ برنگے پھول کھلے ہیں جو تمہاری اُداس طبیعت کو تازگی اور شگفتگی بخش رہے ہیں۔ الغرض جدھر بھی دیکھو' اُس کی عنایات کے جلوے ہی جلوے تمہیں نظر آئیں گے۔ اَلرَّيْحَان کا ایک ترجمہ غذا کی چیزیں بھی کیا گیا ہے جن سے مراد ہر قسم کی نباتات' میوہ جات' پھل پھلاری' ترکاریاں وغیرہ ہیں۔

دستِ قدرت نے اپنی مخلوقات کو پانی بھی بکثرت دیا ہے۔ وہ اسے بارش کی صورت میں آسمان سے بھیجتا ہے اور اُسے ندیوں میں بہاتا ہے تا کہ زمین جب مردہ ہو جائے تو اُسے اُس پانی کے ذریعے دوبارہ زندہ کیا جائے:

(۱) وَهُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَابِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ فَأَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّ غَيْرَ مُتَشَابِهٍ أُنْظُرُوْا إِلٰى ثَمَرِهٖ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ إِنَّ فِیْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ٥ (الانعام: ۹۹)

(۱) ''وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر ہم اُس کے ذریعے ہر قسم کی اُگنے والی چیز نکالتے ہیں' پھر ہم اُس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں اور اُس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں اور کھجور کے گابھے سے نیچے جھکے ہوئے گچھے نکالتے ہیں' اور ہم انگوروں' زیتون اور انار کے باغات پیدا کرتے ہیں جو (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ۔ درخت کے پھل کی طرف دیکھو جب وہ پھل دار ہوتا ہے اور (دیکھو) اُس کے پکنے کو۔ بے شک اِس میں (اُس کی قدرتِ کاملہ کی) اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایمان کی تلاش و طلب رکھتے ہوں۔''

(۲) هُوَ الَّذِیْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ٥ (اَلنَّحل: ۱۰)

''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اُسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو۔''

شَجَر سے یہاں مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین سے اگتی ہے۔ ابنِ قُتیبہ نے کہا کہ شَجَر سے مراد یہاں گھاس ہے۔

(۳) وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ٥ (الحج : ۵)
"اور تو دیکھتا ہے کہ زمین خشک پڑی ہے' پھر جب ہم اُس پر (بارش کا) پانی اتارتے ہیں تو وہ تر و تازہ ہو جاتی ہے' اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اگاتی ہے۔"

(۴) أَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَنْبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا (النمل: ۶۰)
"اور اُس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا' پھر ہم نے اُس پانی سے خوش منظر باغات اُگائے۔ تمہاری طاقت نہ تھی کہ تم اُن کے درختوں کو اُگاؤ۔"

وہ ہواؤں کو خوش کن بنا کر بھیجتا ہے جو بادلوں کو اُڑا لے جاتی ہیں اور اللہ کی مخلوق کے فائدہ کے لئے بیج بکھیرتی ہیں:۔

(۱) وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ وَمَآ أَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ٥ (الحجر: ۲۲)
"اور ہم ہی ہواؤں کو باردار بنا کر بھیجتے ہیں' پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں' پھر وہی (پانی) ہم تم کو پلاتے ہیں اور تم اُس کے جمع کرنے والے نہ تھے۔"

یعنی ہوائیں نر درختوں کے گابھوں کو لے کر مادہ درختوں کے گابھوں میں جا کر ڈالتی ہیں پھر اللہ تعالیٰ لَوَاقِح ہواؤں کو بھیجتا ہے جو درختوں کو باردار کرتی ہیں (تفسیر قرطبی)۔

حضرتِ انسان کو خبر تک نہیں ہوتی کہ اُس کے باغوں' کھیتوں' چراگاہوں اور جنگلوں میں اور نہ معلوم کہاں کہاں ہوائیں چپکے سے عملِ تلقیح (Pollination) انجام دے رہی ہوتی ہیں جن کے باعث درختوں کی ٹہنیاں رنگ برنگ خوشذائقہ پھلوں سے لد جاتی ہیں' پودوں پر خوشوں کے تاج سجائے جا رہے ہیں' اُنہیں دانوں کے موتیوں سے آراستہ کیا جا رہا ہے اور وہ جھک جھک کر اپنے خالق کی ربوبیت اور کبریائی کے گیت گا رہے ہیں۔

(۲) اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَإِذَآ أَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ إِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ٥ (الروم: ۴۸)
"وہی اللہ تو ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اٹھائے پھرتی ہیں پھر اللہ اُس کو جس طرح چاہتا ہے' آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تو مینہ کو دیکھتا ہے کہ اُس میں سے ٹپکنے لگتا ہے' پھر اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' پہنچا دیتا ہے تو بس وہ خوش ہونے لگتے ہیں۔"

یعنی ابھی تو مایوس ہو رہے تھے اور ابھی خوش ہو گئے۔ کاشتکار اور زراعت پیشہ کسی ملک وقوم کے بھی ہوں' جو لوگ اُن کی نفسیات سے واقف ہیں' قرآن مجید کے اس جملہ کی دل کھول کر داد دیں گے۔

(۳) وَلَئِنْ أَرْسَلْنَا رِيحًا فَرَأَوْهُ مُصْفَرًّا لَّظَلُّوا مِنْ بَعْدِهِ يَكْفُرُونَ ○ (الرّوم : ۵۱)
''اور اگر ہم (کوئی اور) ہوا چلا دیں' پھر یہ لوگ کھیتی کو زرد ہوتا دیکھیں تو وہ اُس کے بعد ناشکری کرنے لگیں۔''

یعنی ساری پچھلی نعمتوں کو بھلا کر۔ اس سے مقصود غافلوں کی بے حسی کو دِکھانا ہے۔ رِیحًا سے مراد کوئی دوسری قسم کی ہوا ہے جو زراعت کو نقصان پہنچانے والی ہو مثلاً بجائے پچھوا ہوا کے پُروا ہوا' یا بجائے پُروا کے پچھوا ہوا۔ غرض ایسی ہوائیں بھی ہیں کہ جب چلتی ہیں تو سرسبز و شاداب کھیت زرد ہو کر خشک ہونے لگتے ہیں۔

(۴) وَاللّٰهُ الَّذِي أَرْسَلَ الرِّيَاحَ فَتُثِيرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُورُ ○ (فاطر : ۹)
''اور وہی اللہ ہی تو ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے' وہ بادلوں کو اٹھالے جاتی ہیں' پھر ہم اُسے خشک خطہِ زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں' پھر ہم اس بادل (کے مینہ سے) زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کرتے ہیں' جی اٹھنا بھی اِسی طرح ہوگا۔''

زرعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
مَا مِنْ مُّسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا أَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَأْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ" أَوْ إِنْسَانٌ" أَوْ بَهِيمَةٌ" إِلَّا كَانَ لَهُ بِهِ صَدَقَةٌ" (صحیح بخاری: كتاب الحرث والمزارعة)
''مسلمان جو بھی درخت لگاتا ہے یا کھیتی بوتا ہے' پھر اُس میں سے پرندہ یا انسان یا چوپایہ کھاتا ہے تو یہ اُس کے لئے صدقہ (کارِثواب) ہے۔''

بعض علماء نے اِس حدیث سے یہ استدلال کیا ہے کہ سب کاروبار سے افضل کھیتی ہے' اس لئے کہ اس کا نفع انسان وحیوان سب کو عام ہے اور اس میں غیر اختیاری طور پر بھی ثواب مل جاتا ہے۔ یہی علامہ نووی کا قول ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی کمائی افضل ہے؟ فرمایا: ہاتھ سے کام کرنا اور ہر حلال بیع۔ اس حدیث سے اُن لوگوں کو اپنی اصلاح کرنا ضروری ہے جو بُنائی کے پیشے کو ذلیل سمجھتے ہیں۔

علامہ بدرالدین عینی نے فرمایا جب لوگ خوراک کے ضرورتمند ہوں اور خوراک کی کمی ہو تو

کاشتکاری افضل ہے۔ اگر ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کے ضرورتمند ہوں تو دستکاری افضل ہے اور جب کسی وجہ سے تجارت میں دشواری اور دقّت ہو تو تجارت افضل ہے۔(نُزْھَۃُ القاری شرح صحیح البخاری۔۔ مفتی محمد شریف الحق امجدی ج ۳،ص ۶۰۴)فرید بک سٹال ۳۸۔اردو بازار لاہور،ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ

علمائے کرام فرماتے ہیں:
"یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ وہ انسان کے مرنے کے بعد بھی چھ چیزوں میں اُس کے ثواب میں اضافہ کرتا رہتا ہے جیسا کہ اُس کی زندگی میں اُسے ثواب ملتا تھا : (۱) وہ صدقہ وخیرات جس کے فوائد جاری وساری ہوں (۲) وہ علم جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں (۳) نیک اولاد جو اُس کے لئے دعائے مغفرت کرے (۴) اُن درختوں کی وجہ سے جو اُس نے لگائے (۵) اُن فصلوں کی وجہ سے جو اُس نے بوئیں اور (۶) اُن علاقائی سرحدوں کی وجہ سے جن کی اُس نے حفاظت کی۔" [الحلال والحرام فی الاسلام (انگریزی ترجمہ) ص ۱۲۹۔۔ یوسف القرضاوی]

ایک مرتبہ ایک شخص کا گزر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا جو اخروٹ کا درخت لگا رہے تھے۔اُس شخص نے کہا: آپ اِسے لگا رہے ہیں جبکہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں؟ اِس درخت پر تو کئی سال تک پھل نہیں لگے گا تو اِس کا کیا فائدہ؟ آپ نے جواب دیا: دوسرے اِس کا پھل کھائیں گے اور مجھے اِس کا ثواب ملے گا۔

"**ممنوعہ فصلیں**: حشیش جیسے پودوں کی کاشت اور اُس کا کھانا حرام ہے۔اُس کا حرام کے سوا اور کوئی مصرف نہیں ہے۔تمبا کو اور اُس کے اُگانے کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے۔تمبا کو نوشی کسی بھی قسم کی ہو اِسی زمرے میں آتی ہے۔کسی مسلمان کے لئے حرام فصل کی کاشت کرنا اُسے غیر مسلموں کو فروخت کرنے کے لئے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان کو اِس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی حرام شے کی تشہیر میں فریق بنے۔ یہ تو بالکل ایسے ہی ہے کہ کوئی خنزیر کو عیسائیوں کے ہاں فروخت کرنے کے لئے پالے جو بالکل ناجائز ہے۔ یہاں تک کہ انگور جیسی حلال چیز بھی یہ جانتے ہوئے دوسروں کو نہیں بیچی جاسکتی کہ وہ اُس سے شراب بنائیں گے۔" (ایضاً ص ۱۳۰)

"**قابلِ کاشت زمین کا استعمال**: اگر کوئی قابلِ کاشت زمین کسی مسلمان کی ملکیت ہے تو اُسے اُس میں فصلیں کاشت کرکے یا درخت اُگا کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ایسی زمین کو استعمال میں نہ لانا اسلام کے خلاف ہے اور کفرانِ نعمت اور خداداد دولت کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔نبی مکرّم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔اِس ضمن میں زمیندار کے پاس کئی متبادل (اختیارات) ہیں:۔
(۱) زمین کی کاشت خود کرے: زمیندار کے لئے پہلا اختیار تو یہ ہے کہ وہ زمین خود کاشت کرے۔ یہ

بات قابلِ تحسین ہے اور اُس کے کھیت یا باغ کی پیداوار سے جو کچھ بھی انسان، چرند یا پرند کھاتے ہیں، اللہ اُس کا اجر دے گا۔ نبی اکرم ﷺ کے صحابہ کرام میں انصار کسان ہی تھے۔"

(۲) دوسروں کو زمین کاشت کے لئے مستعار دینا: اگر زمیندار زمین خود کاشت نہیں کر سکتا تو وہ اُسے کسی ایسے شخص کو عاریتاً دے دے جو اپنے آلات، ملازمین، بیج اور جانور استعمال کر کے اُس پر کاشت کرے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"اگر کسی کے پاس زمین ہے تو اُسے چاہئے کہ اُسے خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو کاشت کے لئے مستعار دے دے ورنہ اُسے اپنی ملکیت سے آزاد کر دے۔" (صحیح مسلم، مسند احمد)

"ابتدائی دَور کے کچھ علماء جو اِس حدیث کے ظاہری معنی لیتے تھے، اِس رائے کے حامل تھے کہ قابلِ کاشت زمین کو دو طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یا تو زمیندار اُسے خود استعمال کرے یا کسی اور کو کاشت کے لئے عاریتاً دے دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے۔ مؤخر الذکر صورت میں زمین مالک کی ملکیت رہتی ہے لیکن پیداوار اُس کی ملکیت ہے جو اُسے کاشت کرتا ہے۔"

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے مطابق حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ اگر کوئی زمین کو خود کاشت نہیں کرتا تو وہ اُسے کسی اور کو دے دے، حکم کے درجے میں نہیں ہے کہ اس پر ضرور عمل کیا جائے بلکہ ایک مستحسن فعل کے لئے سفارش ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ عمرو بن دینار نے کہا: میں نے طاؤس سے کہا (جو ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے بہت قریبی ساتھی تھے) کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ فصل کا حصّہ لینا چھوڑ دیں کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا تھا۔ طاؤس نے جواب دیا: 'اُن میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے (حضرت عباس) نے مجھے بتایا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے منع نہیں فرمایا بلکہ کہا: 'اپنے بھائی کو مفت مستعار دے دینا اس سے بہتر ہے کہ اُس سے ایک مقرر کردہ رقم لی جائے۔' (بخاری، مسلم)

ظاہر ہے کہ یہ اُن لوگوں کے لئے نصیحت تھی جن کے پاس وسیع زمین تھی جسے وہ خود کاشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ زمین کسی مزارع کو دی ہی نہ جائے۔

جنابِ جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ اکرم ﷺ کے عہد مبارک میں ہم قطعۂ ارضی پر کاشت کرتے اور جو کچھ بالیوں میں رہ جاتا، تو اُسے ہم لے لیتے بعد اس کے کہ اُنہیں بھوسے سے الگ کر دیا جاتا۔

(۳) فصل کا ایک متناسب حصّہ لینا: زمیندار کے پاس تیسرا متبادل یہ ہے کہ وہ زمین کسی ایسے شخص کو کرائے پر دے جو اپنے زرعی آلات' بیج اور جانور استعمال کرتے ہوئے اِس شرط پر اُس زمین کو کاشت کرے کہ وہ پیداوار کا ایک متناسب حصّہ لے گا۔ یہ کُل پیداوار کا نصف یا ایک تہائی بھی ہوسکتا ہے یا جو بھی فریقین کے درمیان طے پا گیا ہو۔ زمیندار بھی کاشتکار کو اپنے بیج' آلات یا جانور یا دیگر قسم کی امداد فراہم کرسکتا ہے۔ اِس قسم کے بندوبست کو''بٹائی میں حصّہ لینا'' (Share Cropping) کہا جاتا ہے۔

''صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرات ابنِ عمر' ابنِ عباس اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ آنجناب ﷺ نے خیبر کے لوگوں کو زمین کام کرنے اور کاشت کرنے کے لئے دی تھی جس کے عوض اُنہیں پیداوار کا نصف حصّہ ملتا تھا۔''

''وہ علماء جن کے نزدیک بٹائی میں حصّہ لینا جائز ہے' اپنے موقف کی تائید میں یوں کہتے ہیں :۔

''یہ بات مسلّمہ اور اچھی طرح متعارف ہے کہ رسول اللہ ﷺ اِس پر تادمِ آخر عمل پیرا رہے اور یہ کہ آپ کے بعد خلفائے راشدین اور اُن کے بعد آنے والے بھی اِس پر عمل پیرا رہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہنّ) نے بھی حضور ﷺ کے وصال کے بعد اِس عمل کو جاری رکھا۔ اِس عمل کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ منسوخ کردیا گیا کیونکہ اگر آپ نے کوئی عمل اپنے وصال تک جاری رکھا اور آپ کے بعد آپ کے جانشینوں اور تمام صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا اور کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی' تو پھر کوئی اُسے منسوخ کرنے کا مجاز کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اگر اسے حضور ﷺ کی حیاتِ طیّبہ میں منسوخ کردیا گیا تھا تو تنسیخ کے بعد آپ نے اس پر عملدرآمد کیوں جاری رکھا؟ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے قریب ترین صحابہ اور جانشین بھی تنسیخ سے بے خبر رہے جبکہ خیبر کی کہانی سے ہر کوئی بخوبی واقف تھا اور وہ خود اس پر عمل پیرا تھے۔ اس کے راوی کون تھے جن کے بارے میں کوئی بھی نہیں جانتا اور نہ کسی نے اُن کے بارے میں کچھ سنا۔'' (المغنی ۔۔ابنِ قدامہ' ج ۵' ص ۳۸۴)

بٹائی کا حصّہ لینے کی ممنوعہ شکل : رسول اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو بٹائی کی ایک ایسی شکل لینے سے منع فرمایا جو اُن دنوں عام تھی۔ زمیندار زمین کو اِس شرط پر کاشت کے لئے دیتا کہ وہ پیداوار کا ایک حصّہ خود لے گا اور باقی کاشتکار کا ہوگا جو شاید نصف حصّہ تھا' یا زمیندار اناج کا ایک خاص وزن یا پیمانہ خود حاصل کرتا اور باقی حصّہ کاشتکار کا ہوتا۔ لیکن بعض اوقات زمین کے ایک حصّے پر فصل ہوتی جبکہ دوسرے حصّے پر کچھ بھی نہ ہوتا۔ تو دو میں سے ایک کو کچھ بھی نہ ملتا یا بہت کم ملتا جبکہ دوسرا سب کچھ لے جاتا۔ اِسی طرح اگر کُل پیداوار خاص وزن یا پیمانے سے

تجاوز نہ کرتی تو زمیندار تو سب کچھ لے لیتا جبکہ کاشتکار منہ دیکھتا رہ جاتا۔''

''اس قسم کے لین دین میں خطرہ اور انتہائی غیر یقینی کی کیفیت ہے اور انصاف کی روح کے بھی خلاف ہے۔ رسولِ مکرّم ﷺ نے دیکھا کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں کو ہی کل پیداوار کا حصّہ طے شدہ تناسب کے مطابق ملنا چاہئے خواہ پیداوار زیادہ ہو یا کم۔ کل پیداوار کا تناسب اِس لئے مخصوص کر لینا چاہئے تا کہ اگر پیداوار بہت زیادہ ہو تو یہ ہر دو فریق کے لئے ہو اور اگر کم ہو تو بھی دونوں کے لئے ہو' اور اگر کچھ بھی پیدا نہ ہو تو دونوں میں سے کسی کو بھی کچھ نہ ملے۔ دونوں فریقوں کے لئے یہ منصفانہ تقسیم ہے۔''

''امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بیان کیا کہ رافع بن خدیج نے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں ہمارے پاس بہت سی زرعی زمین تھی اور ہم میں سے کوئی اپنی زمین اُس کی پیداوار کا ایک حصّہ اپنے لئے مخصوص کرتے ہوئے کرائے پر دے دیتا۔ بعض اوقات کوئی آفت اُس کے ایک حصّے کو نقصان پہنچاتی جبکہ دوسرا حصّہ محفوظ رہتا اور بعض اوقات دوسرے حصّے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔''

''امام مسلم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے رافع بن خدیج سے روایت کی کہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں زمین کرائے پر دے دیتے تھے اور اس کے بدلے میں یا تو وہ پیداوار کا ایک مقرر شدہ حصّہ لے لیتے تھے یا ندیوں کے کناروں یا کھیتوں کے کناروں پر اُگی ہوئی پیداوار لے لیتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ مخصوص طے شدہ حصّہ تباہ ہو جاتا جبکہ دوسرا کوئی حصّہ محفوظ رہتا یا کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا اور لوگوں کے پاس اس کے علاوہ سرمایہ کاری کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا رسولِ مکرّم ﷺ نے اس عمل سے منع فرمادیا۔''

''امام بخاری نے بارِ دگر حضرت رافع بن خدیج سے روایت کیا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم لوگ اپنی زرعی زمینوں کے ساتھ کیا کرتے ہو؟ تو اُنہوں نے جواب دیا کہ ہم پیداوار کے ایک چوتھائی حصّے کے عوض یا جَو یا کھجوروں کے پیمانے کے عوض زمینوں کو کرائے پر دے دیتے ہیں۔ آپ نے اُنہیں ایسا کرنے سے منع فرمادیا۔''

''جو بات یہاں بتائی گئی' وہ یہ ہے کہ زمیندار ایک طے شدہ مقدار ''بالائی اخراجات'' کے طور پر تو لے گا ہی اور باقی کے حصّے میں اُس کا حصّہ علیحدہ ہوگا۔ مثال کے طور پر کل پیداوار کا چوتھائی حصّہ اُس کے لئے مخصوص تھا' اس کے علاوہ باقی تین چوتھائی کا نصف حصّہ بھی اُسے ملے گا۔''

''اس تمام بحث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر ﷺ اپنے معاشرے میں مکمل انصاف قائم کرنے

کے خواہاں تھے کہ مؤمنین کی سوسائٹی میں خلفشار اور فتنہ وفساد پیدا نہ ہو۔ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ دو آدمی رسولِ اکرم ﷺ کے پاس زمین کا جھگڑا لے کر حاضر ہوئے تو آپ نے اُنہیں فرمایا:
''اگر تمہارے درمیان یہی کچھ ہونا ہے تو اپنی زمینیں کرائے پر مت دیا کرو۔'' (ابوداؤد)

لہٰذا زمیندار اور کاشتکار دونوں کو ایک دوسرے کے لئے کھلے دل کا اور عالی ظرف ہونا چاہئے:
زمیندار کو پیداوار میں سے بہت بڑے حصے کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے اور کاشتکار کو بھی زمین کی حفاظت اور بہتری کا خیال رکھنا چاہئے۔ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسولِ مکرّم ﷺ نے بٹائی میں حصہ دار بننے کی ممانعت نہیں فرمائی بلکہ زمیندار اور کاشتکار دونوں سے کہا کہ ایک دوسرے کا خیال رکھا کریں۔ اور جب کسی نے جنابِ طاؤس سے کہا کہ اے عبدالرحمٰن! آپ بٹائی میں حصہ لینا چھوڑ کیوں نہیں دیتے کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اِس سے منع فرمایا تھا؟ تو آپ یہی جواب دیتے کہ میں تو کاشتکاروں کی مدد کرتا ہوں اور اُن کے لئے وسائل فراہم کرتا ہوں۔ اُن کا مقصد اپنی زمین سے کچھ کمانا نہیں تھا اس سے قطع نظر کہ زمین پر متعیّن ملازمین کو کچھ ملتا ہے یا وہ بھوکے رہتے ہیں' بلکہ وہ تو اُن کی مدد کرتے تھے اور اُن کا خیال رکھتے تھے۔ یہ صحیح معنوں میں مسلم معاشرہ تھا۔''

''ایسا زمیندار بھی ہوسکتا ہے جو اپنی زمین کو بیکار پڑی رہنے اور اُس پر پھلدار درخت یا فصلیں کاشت نہ کرنے کو اِس بات پر ترجیح دے کہ اُسے کسی مزارع کو پیداوار کے معمولی تناسب لینے کی شرط پر دے دے اس اندیشہ سے کہ پیداوار کم ہوگی۔ اِسی چیز کے پیشِ نظر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے ایک حکمنامہ جاری کیا تھا جس میں تمام متعلقین سے کہا گیا تھا کہ اپنی زمینیں ایک تہائی' ایک چوتھائی' پانچویں یا دسویں حصے پر مستعار دے دو لیکن زمین کو بغیر کاشت کے مت چھوڑو۔'' (الحلال والحرام فی الاسلام۔۔ انگریزی ترجمہ ص ۲۸۰۔۸۲)

''حضور ﷺ کی وہ واضح حدیث جس میں اسی شرط کی وجہ سے بٹائی پر حصہ لینے سے منع کیا گیا ہے' میرے نزدیک فقہاء کے اجماع کی بنیاد ہے کہ ایسی شراکت داری صحیح نہیں ہے جس میں بہرحال ایک فریق کے لئے متعیّن منافع طے کرلیا گیا ہو' قطع نظر اس بات کے کہ سرمایہ کاری نفع بخش تھی یا نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض کریں کہ ایک شراکت دار یہ شرط عائد کرتا ہے کہ وہ منافع کا ایک خاص حصہ لے گا۔ اب اگر منافع اُس مقررشدہ رقم سے زیادہ نہیں ہے تو وہ تو اُسے مل جائے گا لیکن اس کے برعکس اگر منافع زیادہ ہوا تو اُسے دُکھ ہوگا کہ اُس نے یہ شرط کیوں عائد کی کہ وہ صرف اِتنا ہی منافع لے گا۔'' یہ استدلال اسلام کی روح کے عین مطابق ہے جو تمام انسانی معاملات کی بنیاد انصاف اور راستی کے اصولوں پر رکھتا ہے۔'' (ایضاً ص ۲۷۲)

''(۴) **زمین کرائے پر دینا** : مسلمان زمیندار کے لئے چوتھا متبادل یہ ہے کہ وہ اپنی زمین ایک متعیّن رقم، سونے یا چاندی کے عوض کرائے پر دے دے۔ کچھ نامور فقہاء نے اِسے جائز قرار دیا ہے جبکہ کچھ فقہاء اُن مستند احادیث کی بناء پر اِسے حرام قرار دیتے ہیں جو رقم کی صورت میں زمین کو کرائے پر دینے سے روکتی ہیں۔ اِن احادیث کے راویان اُن دو صحابہ کے علاوہ جنہوں نے جنگِ بدر میں حصّہ لیا تھا، حضرات رافع بن خدیج، جابر، ابو سعید، ابو ہریرہ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔ اُن سب کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے زرعی زمین کو رقم کی صورت میں کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے۔''

''اِس ممانعت سے استثناء فصل میں اُس شراکت داری کو حاصل ہے جس میں کل پیداوار کا ایک خاص حصّہ طے کر لیا جائے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا اہلِ خیبر کے ساتھ لین دین کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے اُنہیں کُل پیداوار کے نصف پر زمین کاشت کرنے کے لئے دی تھی اور اس عمل کو اپنے وصال تک جاری رکھا تھا۔ آپ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین نے بھی پیداوار کے حصّے کی بنیاد پر زمین کو کرائے پر دینے کو جاری رکھا۔''

''ابتدائی دَور کے فقہاء کا ایک گروہ اِسی رائے کا حامل ہے۔ طاؤس جو یمن کے فقیہ تھے اور عظیم ترین مسلمان علماء میں سے تھے، سونے چاندی کے عوض زمین کو کرائے پر دینے کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن پیداوار کے ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصّہ لینے کو جائز سمجھتے تھے۔ جب کسی نے اِس معاملے میں اُن سے بحث کی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو آپ جواب دیتے: ''معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جنہیں رسولِ اکرم ﷺ نے یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا، یہاں آئے اور اُنہوں نے پیداوار کے ایک تہائی اور ایک چوتھائی پر زمین کرائے پر دی اور ہم نے اب تک اِس عمل کو جاری رکھا ہوا ہے۔'' تو یوں اُن کی رائے میں سونے یا چاندی کی شکل میں زمین کو کرائے پر نہیں دیا جا سکتا لیکن بٹائی کے حصّے پر دینے کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۲۸۳، ۲۸۴)

قیاسی استدلال کہ رقم کی شکل میں زمین کرائے پر نہیں دی جا سکتی: اسلامی اصولوں اور ٹھوس اور واضح متن کی بنیاد پر قیاسی استدلال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین کو پیسوں کی صورت میں کرائے پر دینا مطلقاً حرام ہے:

(الف) رسولِ اکرم ﷺ نے پیداوار کی ایک خاص مقدار کے عوض زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے جیسے پیداوار کا ایک یا دو ٹن۔ لیکن فصل کے حصّے کے تناسب کی بنیاد پر جائز ہے جیسے پیداوار کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک خاص تناسب کی بنیاد پر جو منصفانہ اور مساویانہ ہے کیونکہ اگر زمین پیداواری ہے، تو دونوں فریق منافع میں حصّہ دار ہوتے ہیں اور نقصان کی صورت میں بھی اگر کوئی آفت فصلوں پر نازل ہو جائے۔ تاہم اگر ایک فریق کو منافع کی ضمانت دی جائے جبکہ دوسرے کو اُس کی محنت و مشقت کا کوئی صلہ نہ ملے، تو

علیہ السلام کے والد کے نام کی تحقیق پر متقدر علماء کی آراء۔ بعد کے فنی ادوار میں قرآنی آیات کا استعمال۔

(۱۰) الٰہی کرشمہ سازیاں(ARTISTRY OF ALLAH)--- --- --- ۳۱۷

ربّ ذوالجلال والاکرام کی اَن گنت نعمتیں۔ انسانی دماغ کی معجزانہ ماہیّت سے وحدانیت پر استدلال۔ مختلف طریقوں سے خالق کائنات کا حضرتِ انسان کو اپنی اور صرف اپنی بارگاہ میں بلانا۔

(الف) کائنات میں الٰہی کرشمہ سازیاں : درختوں میں۔ زرعی پیداوار میں۔ درختوں کے عملِ زیرگی(Pollination) میں۔ پودے کے پتوں میں ضیائی تالیف(Photosynthesis) کا عمل۔(ضیائی تالیف اتفاقی حادثہ نہیں ہوسکتا۔) انسانی تخلیق کے مراحل میں کرشمہ سازیاں۔ ماں کے دودھ اور جانوروں کے دودھ میں کرشمہ سازیاں۔ دودھ کی خِلقت میں حشر ونشر کے وقوع کی دلیل۔ پانی کی فراہمی میں کرشمہ سازیاں۔ عالَمِ حیوانات میں کرشمہ سازیاں۔ زمین کی تخلیق میں' لیل ونہار میں' کشتیوں اور جہازوں میں' انسان کے لئے سمندر کی تسخیر کے معنی۔ ہواؤں اور بادلوں میں کرشمہ سازیاں۔ مایوسی کے وقت مشرکوں کے رجوع الی اللہ سے استدلال۔ آسمانی اور فلکیاتی تزیین میں کرشمہ سازی۔ حرفِ آخر۔

(ب) انسانی جسم میں الٰہی کرشمہ سازیاں: انسانی جسم میں خلیے اور اُن کی اقسام۔ ایک عظیم پھیلا ہوا جال ہمارے جسم کو گھیرے ہوئے ہے۔ دانتوں کی مختلف شکلوں میں الٰہی حکمت۔ مفید بیکٹیریا ہماری زبان کی پشت پر موجود ہیں۔ نظامِ ہضم میں کرشمہ سازیاں۔ انہضامی مشین اپنا کام شروع کرتی ہے۔ دل: جسمِ انسانی کی موٹر۔ دل: ایک معجزاتی سیّال جس کی پیداواری تجدید میں کوئی ثانی نہیں۔ خون جو زخموں کو مندمل کرتا ہے۔ دماغ کیسے کام کرتا ہے؟ ہڈیوں پر مشتمل ڈھانچہ۔ ہڈیاں اپنے آپ کو خود سہارتی ہیں۔ شکستہ ہڈی کیسے صحت یاب ہوتی ہے؟ عضلاتی پٹھے : جسمِ انسانی کی خوردبینی موٹریں۔ عضلاتی پٹھے خوش آئند طور پر کام کرتے ہیں۔ ہاتھ جو ہر چیز کو پوری مہارت سے پکڑ لیتے ہیں۔ نان سٹاپ ایئر کنڈیشنر جو ہمارے جسم میں چل رہا ہے۔ نظامِ تنفّس (سانس لینے کا نظام) ہمارے شعوری اختیار میں نہیں۔ نظریہ ارتقاء کی سائنسی موت۔

(۱۱) علمِ نجوم (Astrology) --- --- --- --- --- --- --- ۳۵۴

علمِ نجوم کی تعریف اور اُس کی بنیاد۔ منطقۃ البروج اور اس کی علامات۔ آگ کی علامات۔ مٹی کی علامات۔ ہوائی اور آبی اثرات۔ بروج سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر استدلال۔ علمِ غیب کا معلوم کر لینا۔ غیب کی اَقسام۔ علومِ نبوّت۔ شیطان کی دست اندازی۔ اللہ کے نبی اور رسول کا مقامِ رفعت۔ ایک غلط فہمی کا ازالہ۔ نسیان کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام پر عتاب کیوں؟ اللہ رب العزت اور نبی کے علمِ غیب میں فرق۔ علمِ نجوم (ستاروں کی تاثیرات ماننے) کا شرعی حکم۔ سورۃ الصّٰفّٰت کی آیاتؑ

پورے لین دین کا مطلب قمار (جوا) بازی یا سُودی معاہدہ ہوگا۔ اگر ہم اِس کی روشنی میں زمین کو رقم کی شکل میں کرائے پر دینے کے معاملے پر غور کریں تو ہمیں دونوں بیان شدہ عوامل (یعنی پیداوار کے حصّے دینے اور رقم کی شکل میں کرائے پر زمین دینے) کے مابین فرق نظر آئے گا۔ دونوں صورتوں میں زمیندار کو پیسوں کی شکل میں اپنا حصّہ ملے گا اس سے قطع نظر کہ زمین کے ساتھ کیا ہوتا ہے جبکہ کرائے پر لینے والے کو اپنی محنت و مشقت کا جوا کھیلنا ہے یہ جانے بغیر کہ اُسے کچھ ملے گا یا اُسے نقصان ہوگا۔"

"(ب) جب کسی شے کو اُس کا مالک کسی کو کرائے پر دیتا ہے اور اُس کے استعمال کا کرایہ وصول کرتا ہے تو اُسے اِس حقیقت کے پیشِ نظر کرایہ وصول کرنے کا جائز حق حاصل ہے کہ اُس نے وہ شے بنائی ہی کرائے دار کے استعمال کے لئے تھی: جیسے جیسے وہ شے وقت کے ساتھ ساتھ کثرتِ استعمال سے خراب ہوتی چلی جاتی ہے' اُس کی قیمت میں کمی واقع ہوتی رہتی ہے تو مالک کو اِس بات کا حق ہے کہ اُس کے اِس نقصان کی تلافی ہو۔ لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مالک نے اُسے کس طرح کرائے دار کے استعمال کے لئے تیار کیا ہے کیونکہ یہ تو اللہ ہی ہے جو زمین کو کاشتکاری کے لئے تیار کرتا ہے' نہ کہ زمین کا مالک۔ پھر زمین کاشتکاری سے کیسے خراب ہو جاتی ہے یا اُس کی قیمت میں کمی واقع ہوتی ہے کیونکہ زمین کوئی عمارت یا مشینری تو ہے نہیں جس کی قیمت میں وقت کے ساتھ کمی واقع ہو جائے گی یا وہ کثرتِ استعمال سے خراب ہو جائے گی؟"

"(ج) ایک شخص جو کوئی مکان کرائے پر لیتا ہے تو اُسے اُس میں رہنے کا فوری طور پر فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح جو کوئی مشینری کرائے پر لیتا ہے تو اُسے اُس کے استعمال کا فوری طور پر فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن جو آدمی زمین کرائے پر لیتا ہے تو اُسے اُس کا فوری طور پر نہ تو کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی اُس کے فوائد کے بارے میں اُسے یقین ہوتا ہے۔ جب وہ اُسے کرائے پر لیتا ہے تو اُسے اس سے براہِ راست کوئی فائدہ نہیں ہوتا جیسا کہ مکان کرائے پر لینے والے کو ہوتا ہے لیکن وہ سخت محنت کرتا ہے' ہل چلاتا ہے' پودے لگاتا ہے اِس امید پر کہ اس سے فائدہ حاصل ہوگا اگرچہ بہت بعد میں۔ ہوسکتا ہے کہ اُس کی امید بر آئے یا یہ کہ اُس کی اُمیدیں ریت کا گھروندہ ثابت ہوں۔ لہٰذا اِن دو صورتوں (زمین کو کرائے پر دینا / مکان کو کرائے پر دینا) میں مشابہت تلاش کرنا غلط بات ہے۔"

"(د) صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پھلوں کی فروخت کو جب تک وہ بظاہر اچھی حالت میں نہ ہوں' روکا ہے اور اناج کی بالیوں کو بھی جب تک وہ پک نہ جائیں اور ہر قسم کی آفت سے محفوظ نہ ہو جائیں۔ آپ نے اِس ممانعت کی وجہ یہ کہتے ہوئے فرمائی: "ذرا مجھے یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ پھل کو روک لے تو کیا تم اپنے بھائی کی جائداد ہتھیا لوگے؟"

''وہ پھل جو اپنی اصلی حالت میں ظاہر تو ہو گئے ہوں لیکن اُن کی (آفاتِ ارضی وسماوی یا چوری چکاری وغیرہ سے) حفاظت کی ضمانت نہیں ہو سکتی تو اگر وہ کسی آفت سے تباہ ہو جائیں تو اُن کی فروخت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ کسی شخص کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ اُس قابلِ کاشت زمین کی پیداوار کی رقم لے لے جس میں ابھی ہل نہیں چلائے گئے یا پودے نہیں لگائے گئے؟ کیا یہ زیادہ مناسب نہیں کہ اُسے (مذکورہ بالا حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے) یہ کہا جائے کہ اگر اللہ پھلوں کو روک لے تو کیا تم اپنے بھائی کی جائداد ہتھیا لوگے؟''

''میں نے بذاتِ خود دیکھا ہے کہ کپاس کے کھیتوں کو ڈودہ نامی سُنڈی نے اِس قدر تباہ کیا کہ خالی خولی ڈنٹھلوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔ تاہم زمینداروں نے زمین کا کرایہ طلب کیا اور کرایہ دار (کاشتکار) کے پاس کرایہ کی ادائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا محض اس لئے کہ وہ اُس معاہدے کا پابند تھا جس پر اُس نے بحالتِ مجبوری دستخط کئے تھے۔ (اب ذرا بتلایئے تو کہ) وہ مساوات وانصاف کیا ہوئے جن کا اسلام متلاشی ہے؟''

''نتیجہ یہ نکلا کہ اِس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ انصاف صرف اِس صورت میں ممکن ہے جب اُس کی بنیاد بٹائی کا متناسب حصّہ ہو جس کی رُو سے نفع اور نقصان ہر دو فریق کو برابر کا ہوتا ہے۔''

''اگرچہ شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ زمین کو کرائے پر دینے کو حلال اور جائز سمجھتے ہیں تاہم وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ بٹائی میں حصّہ شریعت کے مبنی بر انصاف اصولوں کے زیادہ قریب ہے کیونکہ اِس صورت میں ہر دو فریق نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس زمین کو کرائے پر لینے دینے کی صورت میں زمیندار کو تو کرایہ ملتا ہے چاہے کرائے دار (کاشتکار) کو کٹائی میں کچھ ملے یا نہ ملے۔'' (الحسبة فی الاسلام لامام ابن تیمیہ ص ۲۱، بحوالہ یوسف القرضاوی)

''ایک اور عظیم مفکر ابنِ القیم اُس جور وجبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں جو اُن کے زمانہ کے حکمرانوں اور فوجیوں نے کسانوں پر روا رکھے تھے:۔

''اگر فوجی اور حکمران اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے وضع کردہ قوانین اور خلفائے راشدین کے طریق پر کسانوں کے ساتھ معاملات میں عمل کرتے' تو اللہ تعالیٰ اُن پر زمین وآسمان سے نعمتوں کی بارش برساتا' اُنہیں اُن کے سروں کے اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے کھانے کو ملتا اور پیداوار کے ایک چوتھائی سے کئی گنا زیادہ ملتا اِتنا زیادہ کہ وہ ظلم و تشدّد سے بھی حاصل نہ کر سکتے۔ لیکن اُن کی بے خبری اور حرص نے سوائے ظلم وتشدّد ڈھانے اور بے انصافی کرنے کے اُنہیں اور کچھ نہ سجھایا اور یوں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن پر اپنی عنایات وبرکات کے دروازے بند کر دیئے۔ یوں اِس دنیا میں عنایاتِ الٰہیہ سے محروم ہونے کے علاوہ وہ آخرت میں بھی عذابِ الٰہی کے مستحق ہوں گے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ اِس ضمن میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے قوانین کیا ہیں اور صحابہ کرام کا طرزِ عمل کیا تھا تاکہ اُس کی پیروی کی جائے؟ تو جواب یہ ہے کہ: فصل کی منصفانہ بٹائی وہ ہے جس میں زمیندار اور مزارع حقوق و فرائض میں برابر کے شریک ہوں اور اُن میں سے کوئی بھی ایسی مراعات سے فائدہ نہ اٹھائے جن کی بابت اللہ تعالیٰ نے کوئی سند نہیں اتاری۔ فوجیوں اور حکمرانوں کے وضع کردہ قوانین ملک کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں‘ لوگوں کو بدعنوان بنا رہے ہیں جس کے باعث ہم اللہ کی نصرت اور عنایت سے محروم ہو گئے ہیں۔ بہت سے حکمران اور فوجی حرام چیزوں کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اگر جسم کی پرورش حرام پر ہو تو نارِ جہنم ہی اُس کا مناسب ٹھکانہ ہے۔ ایسی منصفانہ پیداواری شراکت پر عملدرآمد نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں برابر رہا اور یہی عمل حضرات ابوبکرؓ عمرؓ عثمان اور علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اور اُن کے خاندان والوں کا اور دوسرے مہاجرین اور اُن کے خاندان والوں کا رہا۔ حضرات ابنِ مسعودؓ اُبی ابنِ کعبؓ زید بن ثابت رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے عظیم صحابہ کرام نے اِس مسئلہ میں حمایت کی ہے اور یہی رائے اُن فقہاء کی تھی جو حدیث پر اعتماد کرتے ہیں جیسے احمد بن حنبلؒ اسحاق بن راہوؒیہ اور ابوبکر بن نصر المروزی۔ اللیث بن سعدؒ ابن ابی یعلیٰ اور ابو یوسف جیسے علماء نے بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اہلِ خیبر سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ پھلوں اور فصلوں کے نصف پر زمین پر کام کریں گے‘ زمین کی تیاری اور بیج پر اپنی ہی رقم خرچ کریں گے۔ یہ معاہدہ آپ کی حیاتِ مبارکہ تک اور بعد کے زمانے تک قابلِ عمل رہا‘ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُنہیں خیبر سے جلا وطن کر دیا۔ اِسی طرح جو علماء یہ کہتے ہیں کہ بیج یا تو کاشتکار مہیا کرے یا دونوں فریق مل کر کریں‘ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں بیان کیا کہ حضرت عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو اِس معاہدے پر رکھا کہ اگر عمر نے اُنہیں بیج مہیا کئے تو وہ پیداوار کا نصف لیں گے اور اگر وہ بیج لائیں تو اپنے نصف حصے سے زیادہ لیں گے۔"

"اُن تمام معلومات میں جو رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کی ہم تک پہنچی ہیں‘ ہم دیکھتے ہیں کہ کاشتکار کا حصّہ کبھی بھی نصف سے کم نہیں ہوا اور کچھ صورتوں میں تو یہ نصف سے بھی زیادہ تھا۔ یہ تقسیم جس کے مطابق کاشتکار کا حصّہ نصف سے کم نہیں ہوتا تھا‘ نبیِ مکرّم ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کے لئے مقرر فرمایا تھا اور یہ ذہن کو قابلِ قبول لگتا ہے‘ کیونکہ یہ مناسب نہیں کہ زمین کا حصّہ جو بے جان ہے‘ انسان (یعنی کاشتکار) کے حصّے کی نسبت زیادہ ہو۔"

(الحلال والحرام فی الاسلام -- انگریزی ترجمہ -- یوسف القرضاوی ص ص ۲۸۴-۲۸۸)

''**جاگیرداری نظام اوراسلام** : زمین کی ملکیت کے بارے میں قرآن کا قانون بلا شک و شبہ کسان کی ملکیت کے حق میں ہے جس کے مطابق زمین میں تمام لوگوں کو شریک کیا جائے تاکہ انسانی معاشرے کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچایا جائے۔ لہٰذا زمین کی ایسی ملکیت اور کنٹرول جس کے فوائد چند لوگوں تک محدود ہوں اور اکثریت اُن فوائد سے محروم رہے' قرآنی قانون کی روح کے منافی ہے۔ اسلام میں کوئی بھی شخص زمین کی قطعی ملکیت کا دعویدار نہیں ہوسکتا کیونکہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ درحقیقت قرآنی قانون جاگیردارانہ نظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کی روح یہ ہے کہ تمام صحیح کاشتکاروں میں زمین کی تقسیم مساویانہ طور پر ہو۔ قرآن کہتا ہے:۔

(۱) قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَo (الاعراف : ۱۲۸)

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ ہی کا سہارا رکھو اور صبر کئے رہو' زمین اللہ ہی کی ہے' وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہے' اُس کا مالک بنادے اور اچھا انجام اللہ سے ڈرنے والوں ہی کے لئے مخصوص ہے۔''

یہاں یہ اہم حقیقت واضح ہوگئی کہ یہ ضروری نہیں کہ جو حاکم ہے وہ مقبول ہی ہو اور نہ یہ ضروری ہے کہ کہ جو مقبول ہے وہ حاکم ہی ہو۔ محکومیت' مقبولیت کے ساتھ جمع ہوسکتی ہے اور دونوں کے درمیان منافات نہیں۔

(۲) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِo فِیْهَا فَاكِهَةٌ'' وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِo وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُo (الرحمٰن : ۱۰۔۱۲)

''اور اُسی نے زمین کو مخلوقات کے لئے پیدا فرمایا کہ اُس میں میوے ہیں اور غلاف دار کھجور کے درخت ہیں اور (اُس میں) غلّہ بھی ہے بھوسے والا اور غذا کی چیز بھی۔''

سب کو رزق بہم پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے جو خالق ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں قادرِ مطلق اللہ کی ملکیت ہیں جو اُس نے تمام بنی نوعِ انسانی کے فائدہ کے لئے پیدا فرمائی ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

(۱) هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرۃ : ۲۹)

''وہ وہی تو ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے' سب تمہارے لئے پیدا فرمایا۔''

اب اے حضرتِ انسان! سوچنا تو نے ہے کہ تجھے کس کے لئے پیدا فرمایا۔ حدیثِ نبوی کا یہ ٹکڑا کہ اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاِنَّكُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ (دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے ہو) اِسی مفہوم کا ترجمان ہے اور بے شک خلیفۃ اللہ کی یہی شان ہونی چاہئے کہ سب کچھ اُس کے لئے ہے اور وہ اللہ کے لئے

ہو۔ وہ جس چیز کو جس طرح بھی چاہے اپنے تصرّف میں لائے اور اُس کا جوابدہ صرف اپنے مالک و خالق کے سامنے ہو۔ مرتبہ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام ہی کا قائم کردہ ہے۔۔۔۔ ڈارون کے ''ترقی یافتہ بندر'' غریب کو اِس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ!

(۲) وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ھُود : ٦)
''اور زمین پر کوئی جاندار ایسا نہیں کہ اللہ کے ذمّے اُس کا رزق نہ ہو۔''

آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اسبابِ رزق کی طرف سے غافل اور بے فکر ہو جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب پر بھروسہ نہ کرے، سبب کا مرجع اور مبداء اور منتہٰی اللہ ہی کو سمجھے رہے۔ اسباب کو اگر اس اعتقاد کے ساتھ اختیار کیا جائے کہ مُسبّب اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اعتقاد نہ رکھا جائے کہ اسباب کے بغیر رزق حاصل ہی نہیں ہوتا تو یہ توکّل کے منافی نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ بھروسہ و ربطِ قلب حق تعالیٰ کے ساتھ ہی ہونا چاہئے۔

(۳) وَجَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا فِي أَرْبَعَةِ أَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِينَ ۝ (حٰمٓ اَلسَّجْدَة : ۱۰)
''اور اُس نے (ہی) زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ بنائے ہیں جو اُس کے اوپر (اٹھے ہوئے) ہیں اور اُس میں بڑی برکتیں رکھی ہیں اور اس میں ہر نوع کے لئے غذائیں اندازہ سے مقرر کر دی ہیں۔ یہ سب چار مرحلوں میں پورے ہیں (ان کا حصول) طلب گاروں کے لئے یکساں ہے۔''

یعنی یہ رزق و نعمت کے خزانے کسی خاص طبقہ یا فرد کی اجارہ داری نہیں۔ جس میں طلب ہوگی، ہمّت اور حوصلہ ہوگا، ہنرمندی اور فہم و فراست کا جوہر پا جائے گا۔ اُسے اُس کی ہمّت اور حوصلہ کے مطابق اِن نعمتوں سے حصّہ دیا جائے گا۔ اس آیت سے سوشلسٹ نظام کی تائید کے لئے جو استدلال کیا جاتا ہے، بالکل بے محل ہے۔

اِس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی روزی کے ذرائع اِس طرح ترتیب دئے ہیں کہ ہر ایک کو اپنی محنت کے ذریعے اپنی روزی کمانے کی آزادی ہے اور خدائی قانون یہ ہے کہ ہر کسی کو اُس کی محنت کے مطابق ملے۔ جس طرح افراد اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں میں باہم مختلف ہوتے ہیں، اُسی طرح وہ روزی کمانے کی صلاحیت میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے فرمایا:۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ۝ (النَّحل : ۷۱)

''اور اللہ نے تم میں سے کسی کو کسی پر رزق کے معاملے میں فضیلت دے رکھی ہے' سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنے حصّہ کا مال اپنے غلاموں کو کبھی اِس طرح دینے والے نہیں کہ وہ سب اس باب میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا پھر بھی یہ لوگ اللہ کی نعمت سے انکار کرتے ہیں؟''

آیت سے اِس حقیقت پر پوری طرح روشنی پڑ گئی کہ مال و دولت میں عدمِ مساوات فطری وطبعی ہے اور تقسیمِ دولت میں مساوات کا دعویٰ بجائے خود بے بنیاد اور خلافِ فطرت ہے۔ فقہاء اور مفسرین نے آیت سے مالک اور غلام کے درمیان نفیِ مساوات صراحت کے ساتھ نکالی ہے۔ آیت جڑ کاٹ رہی ہے اہلِ باطل کے اُس نظامِ معاشی کی جس کا پرانا نام مزدکیت تھا اور جدید نام سوشلزم یا انتہائی صورتوں میں کمیونزم ہے۔

مندرجہ بالا آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:۔
''یہ بات واضح ہے کہ قرآنِ حکیم اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ روزی کمانے کی اہلیت میں سب لوگ برابر نہیں ہیں کہ کچھ کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے اور کچھ کی کم۔ لیکن قرآنِ حکیم ایسے معاشرے میں جس کے افراد ایک دوسرے کی بہتری چاہنے میں آپس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہوں' اِس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ کچھ کے پاس تو بہت کچھ ہو اور کچھ کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ لوگ مختلف شعبہ ہائے حیات میں کام کرتے ہیں اور اپنی اہلیت کے مطابق کم یا زیادہ کماتے ہیں اور اگرچہ اُن میں سے خوش حال لوگ اپنی تمام کمائی غرباء کو نہیں دے دیتے' تاہم وہ غرباء کی فلاح و بہبود سے اتنے لاتعلق بھی نہیں رہتے کہ وہ فاقہ کش رہیں۔ اگرچہ معاشرے کے ہر فرد کو اپنی کمائی کے تصرّف کا پورا حق حاصل ہے' تاہم اُنہیں غرباء کی بہتری کے لئے اپنی کمائی کا کچھ حصّہ مخصوص کرنا چاہئے تاکہ ناداروں کو زندگی کی بنیادی ضروریات مہیا ہو سکیں۔''

''مولانا ابوالکلام آزاد کی مندرجہ بالا وضاحت صاف طور پر یہ بتاتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی زمین کی زیادہ ملکیتی حیثیت کی وجہ سے دوسروں کو زمین پر اُن کے روزی کے حق سے محروم کرتا ہے تو قرآنی قانون کے مطابق اُس کی زمین کو ناجائز گردانا جائے گا۔''

<u>احادیث کی روشنی میں جاگیردارانہ نظام</u>: رسولِ اکرم ﷺ کی احادیثِ مبارکہ اور نامور مسلمان علماء کی تحریروں کے مطابق یہ بات بغیر کسی شک وشبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ اسلام جاگیردارانہ نظام کی حمایت نہیں کرتا' اوّلاً اس لئے کہ یہ نظام زمین پر قبضہ رکھنے کا نظام ہے اور یہ دولت کی مساویانہ تقسیم کی نفی کرتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ نظام زمین کے صحیح استعمال کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کیونکہ زمین کو استعمال نہ کرنا زمیندار کو اوزبہ

حیثیتِ مجموعی پورے معاشرے کو مفلس کر دیتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ نے خود اپنے صحابہ میں زمینوں کی تقسیم کی تھی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زمانہ قبل از اسلام میں یا بعد کے زمانوں میں جدید جاگیردارانہ نظام رہا ہو۔ اُس معاشرے میں ایک بھی زمیندار ایسا نہیں تھا جو مالدار ہو کیونکہ زمین کی صورتِ حال کچھ یوں تھی کہ بارشیں اور نظامِ آبپاشی نہ ہونے کی وجہ سے ہر طرف ریتلے صحرا تھے اور یہ صورتِ حال زمیندار کو اس کے حقِ ملکیت سے محروم کر سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کو کبھی بھی جاگیردارانہ نظام کا سامنا نہیں کرنا پڑا جو اَب اپنی تمامتر برائیوں کے ساتھ عہدِ حاضر میں پایا جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے مدینہ منورہ کے آس پاس جو زمینیں تقسیم فرمائیں' اس سے جاگیردارانہ برائیوں کے اُبھرنے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ یہ زمینیں جو کبھی یہودیوں کی تھیں' غریب مسلمانوں کو اور بالخصوص مہاجرین کو دی گئیں۔''

رسولِ اکرم ﷺ کا منشا اور مدّعا کبھی بھی یہ نہیں تھا کہ جاگیرداری نظام کی کسی بھی صورت میں حوصلہ افزائی کی جائے جو بہ حیثیتِ مجموعی معاشرے کے لئے نقصان دہ ہو۔ بلکہ آپ نے تو اپنے پیروکاروں کو زمین کو خود کاشت کرنے کی ترغیب دی۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا :۔

''جس شخص کے پاس قطعۂ زمین ہے' اُسے چاہئے کہ وہ خود اُسے کاشت کرے اور اُسے کاشت کے بغیر نہ رہنے دے۔ اگر وہ خود کاشت نہیں کرتا تو اُسے چاہئے کہ وہ کسی اور کو کاشت کے لئے دے دے۔ لیکن اگر وہ خود بھی کاشت نہیں کرتا اور کسی اور کو بھی کاشت کے لئے نہیں دیتا تو اُسے چاہئے کہ وہ زمین اپنے پاس ہی رکھے' ہمیں ایسی زمین کی ضرورت ہی نہیں ہے۔'' (صحیح بخاری)

''حدیث کے آخری جملہ میں ایسے رویّے پر خفگی اور ناراضی کا اظہار ہے۔ اس ارشادِ گرامی کا مقصد یہ تھا کہ ایک شخص اُتنی ہی زمین اپنے پاس رکھے جس کی وہ خود کاشت کر سکتا ہو۔''

''اِسی حدیث کو تھوڑے سے اضافے کے ساتھ صحیح مسلم میں بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی اور شخص اُسے لینے سے انکار کر دے تو مالک زمین کو یہ زمین اپنے ہی پاس رکھنی چاہئے۔ اگر وہ اسے کرائے پر دینا چاہتا ہے تو اُسے چاہئے کہ وہ کرائے پر دینے کی بجائے اُسے اپنے ہی پاس رکھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بڑی صراحت کے ساتھ زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ اِسی لئے حضرت عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں سنی جب سرمایہ داری نظام نے مسلمانوں میں اپنے قدم جمانے شروع کر دئے تھے' تو زمین کو کرائے پر دینے سے انکار کر دیا تھا۔''

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور حدیث اِس طرح بیان کی ہے :۔

''زبیر بن رافع نے رافع بن خدیج کو بتایا کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اُنہیں بلا کر پوچھا کہ تم اپنی زمینوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ وہ کل پیداوار کے چوتھائی پر کرائے پر دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ وہ کھجور اور جَو کی کچھ مقدار بھی وصول کرتے ہیں۔ رسولِ مکرّم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو۔ یا تو اُسے خود کاشت کرو یا پھر کسی اور کو (بغیر کرائے کے) کاشت کے لئے دے دو وگرنہ بغیر ہل چلائے اُسے ایسے ہی رہنے دو۔''

''اس کا یہ مطلب نہیں کہ ایک شخص اپنی زمین کو بغیر ہل چلائے ہمیشہ یونہی رہنے دے۔ کیونکہ زمیندار کے رویّے کی بابت قانونِ شریعت یہ ہے کہ اُسے زمین کو ہمیشہ استعمال کرتے رہنا چاہیے۔ زمین کو اگر استعمال نہ کیا جائے تو پیداوار نہیں ہوگی اور زمین بیکار ہو جائے گی۔ رسولِ اکرم ﷺ نے دیکھا کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی زمین پر کاشتکاری کی غرض سے قبضہ کر لیتا ہے جو کسی کی ملکیت نہیں ہے' اگر وہ قبضہ سے تین سال بعد تک اُس سے صحیح فائدہ نہیں اٹھاتا' تو اُس کا اُس زمین سے ملکیتی حق ختم ہو جائے گا۔ اِس ضمن میں رسولِ اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں آپ نے فرمایا :

''جو شخص مردہ زمین کو زندہ کرتا ہے (یعنی بنجر زمین کو کاشت کر کے اُسے پیداواری بناتا ہے) تو وہ اُس کا مالک ہے بشرطیکہ وہ کسی اور کی ملکیت نہ ہو۔''

''اگر کسی شخص کے پاس اتنی زیادہ زمین ہے کہ اُس کے لئے تمام پیداواری ذرائع کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا مشکل ہے تو اسلامی ریاست زمین کے صحیح استعمال کے ضمن میں مالک کے خلاف کوئی بھی قدم اٹھانے کی مجاز ہے۔ ابن عابدین کہتے ہیں :۔

''اگر قابلِ ٹیکس زرعی زمین سے اُس کا مالک فائدہ نہیں اٹھاتا یا اُس کی صحیح طور پر آبپاشی نہیں کی جاتی جبکہ اُسے آب رسانی کی ضرورت بھی ہے تو حکومت اُس زمین پر ٹیکس لگانے کے ساتھ ساتھ اُس میں سے حصّہ وصول کرنے کی بھی مجاز ہے۔ اگر مالک زمین کاشت نہیں کرتا تو حکومت کسی اور شخص کو زمین کا نگہبان مقرر کر سکتی ہے تا کہ حکومت اُس کا ٹیکس وصول کرے یا اُسے کرائے پر دے یا اُسے اپنے استعمال میں لے آئے۔ تو یوں ملکیتی حقوق کو غلط طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت بلال کو دی گئی زمین واپس لے لی تھی۔''

''مندرجہ بالا اصول جاگیردارانہ نظام کے رُجحانات کو بڑھنے سے روکنے کے لئے ایک مفید محافظ ہے۔

کیونکہ ایک شخص جو اتنی زیادہ زمین کا مالک ہے کہ اُس کا بندوبست وہ خود نہیں کر سکتا تو اُس کا موازنہ اُس سرمایہ دار سے کیا جاسکتا ہے جسے مزدور کا تعاون درکار رہتا ہے تاکہ اُس کے سرمایہ کو بروئے کار لایا جائے۔ تو یوں زمین کو پیداوار کے ایک خاص حصّے کے معاہدے پر کرائے کے لئے دینا' زرعی میدان میں سود کے مشابہ ہے اور یوں یہ ناجائز ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں طریق کار یہ تھا کہ مالک مزدوری اور سرمایہ کاری میں کچھ حصّہ ڈالنے کا پابند تھا تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ جو کچھ وہ وصول کرتا ہے' وہ محض عطیۂ خداوندی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ امام ابویوسف جو ہارون الرشید کے زمانے میں قاضی القُضاۃ تھے اور جن کے دَورِ حکومت کو بادشاہت کا عروج کہا جاتا ہے' کی مثال اِس نظریئے کی حمایت میں دی جاتی ہے کہ زمین کو کرائے پر دیا جاسکتا ہے' لیکن اجماعِ اُمّت کی رُو سے یہ ناپسندیدہ فعل ہے جس سے جاگیردارانہ نظام کو تقویت ملتی ہے۔ جن لوگوں نے اس نظام کی مذمّت کی' اُن میں امامِ اعظم ابوحنیفہ جو امام ابویوسف کے استاد تھے' شاہ ولی اللہ' مولانا عُبید اللہ سندھی کے اسمائے گرامی بالخصوص قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا عُبید اللہ سندھی جنہیں مسلم فقہ کا ایک نامور عالم سمجھا جاتا ہے اور جو شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کے زبردست حامی ہیں' حُجّۃُ اللہِ البالِغَۃ کی تفسیر میں لکھتے ہیں :۔

''ہم امام ابوحنیفہ کے پیروکار ہیں جنہوں نے زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے۔ اُن کے مطابق ایک شخص کے پاس اتنی ہی زمین ہونی چاہئے جس کی وہ خود کاشت کر سکے۔ دراصل کرایہ داری کی کوئی بھی شکل ہو' کرایہ دار یا مزارع کے لئے ناانصافی کا باعث بنتی ہے اور زمیندار وسیع رقبے پر اپنی گرفت بڑھاتے چلے جاتے ہیں اور وہ غریب مزارعوں سے گدھے اور بیلوں کی طرح کام لیتے ہیں۔ اُن کے دلوں میں بیچارے مزارعوں کے لئے کوئی نرم گوشہ نہیں ہوتا اور وہ اُنہیں فاقے کرنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔''

''مجھے بھی زمین کو کرائے پر دینے کا خیال پسند نہیں ہے کیونکہ یہ طریقہ معاشرے میں ایک سرمایہ دارانہ طبقہ پیدا کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے جس کا وجود اسلام کی بنیادی معاشی اخلاقیات کے لئے خطرہ ہے۔ سوائے چند ایک مستثنیات کے پوری اسلامی تاریخ میں قرآنی احکامات کی پابندی کبھی نہیں کی گئی۔ سرمایہ دار طبقے نے قرآنی قانون کی ایسی تشریح کی جو اُن کے مفادات کے مطابق تھی۔ وہ غریبوں کا استحصال کرنے سے کبھی باز نہیں رہے۔ آج بھی کئی مسلم ممالک ایسے ہیں جہاں ہم جاگیردارانہ نظام کو پنپتا ہوا دیکھتے ہیں: صرف مٹھی بھر لوگ زندگی کی جدید آسائشات سے لطف اندوز ہو رہے ہیں جبکہ عوام کی خاصی اکثریت ان آسائشات سے محروم ہے۔ اب سوچنے اور عمل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اسلام نے ہر دَور میں وقت کا مقابلہ کیا ہے۔''

("Islamic Economics -- Theory and Practice" --- M. A. Mannan, pp. 103-108)

''حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا زرعی زمین پر تصرف کی میعاد کا نظام :

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے زمین پر تصرف کی میعاد کا جو نظام متعارف کرایا' وہ اِس حقیقت کا کھلا ثبوت ہے کہ زمین پر قبضے اور تصرّف کے نظام کی بنیاد اسلام کی صحیح روح پر ہے' نہ کہ یہ کسی کی ذہنی یا تصوّراتی اختراع ہے۔ یہ فی الواقع قابلِ عمل ہے۔ درحقیقت زمین کا یہ نظام دنیا کی جدید مسلم ریاستوں کے لئے معنی خیز ہے جہاں بہت سے حالات میں زمین سے متعلق قرآنی قوانین کی عزت وتکریم تو کی جاتی ہے لیکن اُن پر عمل نہیں کیا جاتا۔''

''اگرچہ عرب زرعی ملک نہیں تھا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں عراق' شام' ایران اور مصر کی فتوحات کے نتیجے میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ زمین کا کوئی مستقل اور پائیدار نظام ہونا چاہئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مسلمانوں کو شام اور عراق کے مفتوحہ علاقوں میں زمینیں خریدنے سے روکنے کا انقلابی قدم آپ کے اس عزم کا ثبوت ہے کہ آپ اسلام کے سماجی ڈھانچے کو جاگیردارانہ نظام کی خرابیوں سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔ درحقیقت یہ بعد کے خلفاء ہی تھے جو فوجیوں پر بڑی بڑی جاگیریں اور زمینیں نچھاور کرنے کے اصل ذمہ دار تھے۔ چونکہ اُنہیں باقاعدہ تنخواہیں نہیں دی جاتی تھیں' لہٰذا اس کے عوض اُنہیں زمینیں دی جاتی تھیں۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دلیرانہ زرعی نظام کے بالکل برعکس تھا جس کا نتیجہ مسلم معاشرے میں جاگیردارانہ نظام کی برائیوں کی صورت میں ظاہر ہؤا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بابت بات کرتے ہوئے سیّد امیر علی کہتے ہیں:۔

''دُور بینی کے ساتھ جس کی بعد کے زمانے کے اکثر حکمرانوں میں کمی تھی' آپ نے محسوس کیا کہ ریاست کے استحکام اور اُس کی مادّی ترقی کا انحصار زرعی طبقے کی خوشحالی پر ہے۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے مفتوحہ علاقوں میں زرعی زمین کی فروخت کو ممنوع قرار دیا۔ عربوں کے غاصبانہ اقدام کے خلاف مزید تحفّظ کی خاطر آپ نے حکم دیا کہ بدوی قبائل سے تعلق رکھنے والے عرب' مقامی باشندوں سے زمینیں نہیں خریدیں گے۔ مفتوحہ علاقوں میں نظم وضبط کی خاطر دیہاتیوں کی ترقی اور تجارت کی ترقی پر مسلسل زور دیا گیا۔''

''فی الحقیقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت کے دوران اسلامی تاریخ میں بہت سے واقعات محفوظ ہیں جو زمینوں کے نظام میں آپ کے اقتصادی فلسفے کے غمّاز ہیں۔ عراق کی فتح کے بعد جب فوجیوں نے اپنے سپہ سالار حضرت سعد سے مفتوحہ علاقوں کی زمینیں اُن میں تقسیم کرنے کی درخواست کی تو حضرت سعد نے حضرت عمر کو لکھا جنھوں نے یہ جواب دیا: ''مجھے آپ کا مکتوب مل چکا ہے۔ لوگوں کا مطالبہ ہے کہ آپ اُن میں

۸۸ ۸۹ کی وضاحت۔علمِ نجوم کے حصول کے حرام ہونے کی وجوہ۔کچھ شرائط کے ساتھ علمِ نجوم کے حصول کا جواز۔ فرعون اور کاہن۔تعریض اور توریہ کی تعریفات اور اُن کے ثبوت میں احادیث۔ضرورت و مصلحت کے تحت جھوٹ بولنے کے متعلق فقہائے اسلام کی آراء۔

(۱۲) علم ہیئت (Astronomy) --- --- --- --- --- --- ۳۶۸

تعریف۔منطقۃ البروج کا ذکر قرآن مجید میں۔بُرج کا معنی۔اَفلاک۔کشش کی طاقت مادّے کی دُوری کے متناسب۔مظاہرِ فطرت (چاند' سورج' رات اور دن وغیرہ) کے انسان کے لئے مسخر ہونے کے معنی۔آسمانوں کے تہ بہ تہ (طِباق) ہونے کے معنی۔سورج کی روشنی (ضیاء) اور چاند کی روشنی (نور)۔آفتاب اور ماہتاب۔سورج گردش کرتا ہے۔سورج ختم ہو جائے گا۔بین النجوم (Interstellar) مادّہ۔کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے دھواں۔زمین و آسمان میں سے پہلے کس کی تخلیق ہوئی؟ تسخیرِ خلا اور تسخیرِ قمر کی پیشگوئی قرآن مجید میں۔تسخیرِ کائنات کے منکرین کے شبہات۔ چاند خلا میں ہے یا آسمان میں مرکوز ہے؟ مخالفین کے دلائل کی تردید۔معاہدۂ قمر۔کیا چاند پر رسائی کوئی قابلِ فخر کارنامہ ہے؟ ستارے۔چاند' سورج اور ستاروں کی تخلیق کا مقصد۔طارق اور نجم ثاقِب۔ شہابِ ثاقب سے مراد۔سیّارگان' اُن کی حرکت اور خصوصیات۔نظامِ شمسی۔سَماءُ دنیا (سورۃُ الصّٰفّٰت:۶' سورۃ حٰمٓ اَلسجدۃ: ۱۲) سے مراد۔نظامِ شمسی میں زمین کا مقام۔کائنات میں نظامِ شمسی کا مقام۔شمسی توانائی۔جوہری توانائی اور سورج کا جوہری ردِّ عمل۔فضا جو زمین کا تحفظ کرتی ہے۔روشنی مادّے سے ٹکراتی ہے۔آنکھ کے نور اور دیکھنے کی کیفیت سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال۔ پپوٹوں اور ابروؤں کے فوائد۔سورج اور چاند کے مدار۔اجرامِ فلکی کی گردش گھڑی کی دَوری حرکت کے مطابق (دائیں جانب)۔دن اور رات کی معیّن ترتیب۔مشرقَین اور مغربَین کے معانی۔کہکشائیں۔ فلکی طبعیات(Astrophysics): روزنِ سفید (White Holes .. Quasars)۔روزنِ سیاہ (Black Holes)۔ذاتِ الحُبُک (سورۃ الذّٰریٰت:۷) کا معنی۔آسمانی دروازے (سورۃ النّبا:۱۹)۔ تمام کائنات کی سیاہ روزن میں تبدیلی۔۔ایک ایسی قرآنی حقیقت جس سے آج کی سائنسی تحقیق بالکل ہم آہنگ ہے۔اُس وقت چاند کا بے نور ہونا۔سورج اور چاند کا جمع ہونا اور سورج کا چاند کو نہ پا سکنے (بحوالہ سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰) کے مابین ظاہری تضاد کی تطبیق۔سورۃ التکویر کی اوّل سات آیات کی تشریح۔سورۃ الانفطار کی اوّل دو آیات کی تشریح۔آسمان کا نوبت بہ نوبت ہونا۔ستاروں اور سیاروں میں فرق۔شہاب ثاقب اور شہابیے۔آسمان کیسے ایک محفوظ چھت ہے؟ (بحوالہ سورۃ الانبیاء:۳۲)۔فلکیاتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے خلاف تحفظ۔علمِ فلکیات کی اہمیت۔علمِ فلکیات (ہیئت) میں مسلمان سائنسدانوں کا حصّہ۔

جاگیریں اور دولت تقسیم کر دیں۔ آپ مسلمانوں میں دولت تقسیم کر دیں لیکن زمینیں اور نہریں حکومت کے پاس رہنے دیں کہ اُن کا مفاد مسلمانوں کو ملے۔ اگر اب ہم نے زمینیں تقسیم کر دیں تو ہمارے پاس آنے والی نسلوں کو دینے کے لئے کچھ نہیں ہوگا۔''

''یہی تنازعہ فتح مصر کے وقت بھی پیش آیا۔ جب لوگوں نے فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص سے زمین کی تقسیم کا مطالبہ کیا اور اُنہوں نے خلیفہ سے رہنمائی طلب کی۔ قاضی ابو یوسف کی فراہم کردہ تفاصیل سے ایک تنازعہ کا کھڑا ہونا معلوم ہوتا ہے کیونکہ حضرات عبدالرحمن بن عوف، بلال اور کچھ دوسرے صحابہ زمین کی تقسیم کے حق میں تھے۔ آخر کار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انصار میں سے دس معتبر آدمیوں کو بلایا اور اُنہیں ایک خطبہ دیا اور کہا:

''تم نے اُن لوگوں کو سنا ہے جو کہتے ہیں کہ میں اُنہیں اُن کے حق سے محروم کر رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسریٰ کی زمین کے بعد کوئی زمین بھی فتح کے لئے نہیں رہے گی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اُن کی جاگیر اور دولت عطا کی ہے۔ میں نے دولت تو مسلمانوں میں تقسیم کر دی ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ زمینیں اُن کے ہاریوں کے پاس ہی رہنے دی جائیں اور میں اُن پر خراج اور جزیہ عائد کروں گا جو وہ ہمیں ادا کریں گے تاکہ ہم اپنی فوج، مسلمانوں کے بچوں اور آنے والی نسلوں کے اخراجات پورے کر سکیں۔ آپ نے سرحدیں دیکھی ہیں۔ ہمیں اُن کے دفاع کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ آپ نے بڑے شہر دیکھے ہیں جن کی حفاظت کے لئے ایسی فوج کی ضرورت ہے جنہیں باقاعدہ تنخواہ دی جاتی رہے۔ اگر میں زمینیں تقسیم کر دوں تو تنخواہیں کیسے ادا کی جائیں گی؟''

حضرت بلال بن حارث سے زمین کا کچھ حصہ واپس لینے کے بعد جو اُنہیں رسولِ اکرم ﷺ نے دیا تھا، حضرت عمر نے جنابِ بلال سے کہا: ''رسول اللہ ﷺ نے یہ زمین آپ کو اس لئے نہیں دی تھی کہ آپ اس پر قبضہ جمائے رکھیں اور اُسے لوگوں سے دُور رکھیں۔ اُنہوں نے یہ زمین آپ کو اس لئے دی تھی کہ آپ اسے استعمال کریں۔ تو آپ صرف زمین کا وہ حصہ لیں جسے آپ فائدے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور باقی چھوڑ دیں۔'' اِس پالیسی کی حکمت و دانائی بالکل واضح ہے۔ مقصد یہ ہے کہ زمین سے مکمل فائدہ اٹھایا جائے کیونکہ زمینی ملکیت کو نظریاتی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ اور سماج کی ہے اور زمین کا مالک جو اُسے نہ تو اپنے لئے استعمال کرتا ہے اور نہ ہی معاشرے کے مفاد کے لئے، تو دراصل وہ اللہ کے بتائے ہوئے حکم کے خلاف کر رہا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے خیبر کی زمینیں مسلمانوں میں تقسیم کر دی تھیں۔ وہ زمینیں رقبہ میں اتنی چھوٹی تھیں کہ جاگیرداری نظام کے پھیلنے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن جو زمینیں عراق و شام کی فتح کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ لگیں، وہ علاقہ بہت زیادہ تھا اور اُن کی تقسیم سے مسلمان فوجیوں میں جاگیردارانہ نظام کی تمام برائیاں پھیلی تھیں۔''

''یہ واضح انحراف اِس حقیقت کا مظہر ہے کہ حدیثِ نبوی کی تشریح لغوی اور معنوی دونوں لحاظ سے ہونی چاہئے۔ وہ حالات جن کے تحت نبی مکرّم ﷺ نے زمین تقسیم فرمائی' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے حالات سے مختلف تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے خوب سوچ سمجھ کر رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی: آپ عقل اور منطق کو بروئے کار لائے جس پر قرآنِ حکیم نے بہت زور دیا ہے اور اُنہوں نے نتائج کے فوائد کو مکمل طور پر ملحوظِ خاطر رکھا۔ اُن کا یہ عمل آج بھی انسانی سوچ اور فکر کی غذا ہے کیونکہ آج کا انسان اسلام کو جدید زبان اور جدید اصطلاحات کی رُو سے سمجھنا چاہتا ہے۔۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آج کی مسلم دنیا کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جراُت مندانہ اِقدام سے سبق حاصل کرنا چاہئے جس میں اُن کی کوشش تھی کہ غریب ونادار لوگوں کے حالات بہتر ہو جائیں۔ زمین کی ملکیت کے ساتھ اگر تین سال کے حقوق کی شرط عائد کر دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس سے حوصلہ افزائی ہوگی اور زرعی پیداوار میں خاصا اضافہ ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ زراعت میں علومِ جدیدہ کو لاگو کرنے میں پاکستان کا بالعموم اور مسلم دنیا کا بالخصوص خوراک کا سالوں پرانا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مستقبل کی زرعی اصلاحات کی کسی بھی منصوبہ بندی کے لئے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔''

''یہ بات واقعی دلچسپ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اِس بات کے معترف تھے کہ زراعت کی بہتری اور پیداوار میں اضافے کے لئے زمین پر تصرّف کے میعاد کے نظام کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آپ نے زراعت کے میدان میں بہت سی اصلاحات متعارف کرائیں۔ اس حقیقت کے بارے میں علامہ شبلی نعمانی یوں لکھتے ہیں:۔

''مفتوحہ علاقوں میں آبپاشی کے لئے نہریں کھدوائی گئیں۔ بندوں کی تعمیر کے لئے ایک بڑے شعبے کا انتظام کیا گیا' تالابوں کی کھدائی کی گئی اور پانی کی تقسیم کے لئے ندیاں اور آب روک بنائے گئے۔ مقریزی کے مطابق صرف مصر میں اِن کاموں پر ایک لاکھ بیس ہزار مزدوروں نے روزانہ سال بھر کام کیا اور اُنہیں بیت المال سے تنخواہ ادا کی گئی۔ جوزاء بن معاویہ نے حضرت عمرؓ کی اجازت سے خوزستان اور اَہواز کے اضلاع میں بہت سی نہریں کھدوائیں جس سے کئی نئی زمینیں زیرِ کاشت آ گئیں۔ یوں سینکڑوں آبی گزرگاہیں بنائی گئیں جن کے بارے میں معلومات کتبِ تاریخ میں جابجا ملتی ہیں۔''

(''الفاروق''۔۔۔شبلی نعمانی)

عہدِ فاروقی میں زمین کو میعادی تصرّف پر دینے کا نظام

(۱) اِقطاع (زمین کی انفرادی ملکیت کا نظام) : اِقطاع کا معنی ہے کسی کو کوئی قطعہِ زمین ہبہ کر دینا

اصطلاح میں کوئی سرکاری زمین بطورِ جاگیر افراد کی ملکیت میں دے دینا اِقطاع کہلاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے مختلف اوقات میں اُن مختلف افراد کو اُن کی مالی حالت بہتر بنانے کے لئے اِقطاع کئے جو اپنے پیچھے یتیموں اور بیواؤں کو چھوڑ گئے تھے۔ بسا اوقات یہ اِقطاع ''تالیفُ القُلوب'' کے اصول کے تحت کئے جاتے تھے۔ فلسطین میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو اِقطاع کا دیا جانا ایسے ہی عطیے کا ثبوت ہے۔ اِقطاع میں زمین لینے والے افراد کو پورے حقوقِ ملکیت حاصل تھے اور وہ مالکان کی طرح جیسے بھی چاہتے، زمین پر حقوقِ مالکانہ کی بنیاد پر تصرّف کرنے کے مجاز تھے۔''

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے علاقوں کی فتح سے پہلے اِقطاع کا عمل جاری رکھا لیکن اجماعِ اُمّت یہ ہے کہ آپ نے اِس عمل میں اُنہیں حقوقِ ملکیت نہیں دئے کیونکہ یہ چیز جاگیرداری نظام کو ابھرنے کا موقع دے سکتی تھی۔ آپ نے اِس بات پر زور دیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی زمین کو تین سال کی مدّت میں کاشت نہیں کیا تو وہ اپنے حقوقِ ملکیت سے محروم ہو جائے گا۔''

''(۲) نظامِ حماس: اِس کا مطلب ایسی زمین ہے جو ایک یا ایک سے زائد قبائل کی ملکیت ہو اور اُن کی اجتماعی ضروریات کی تکمیل کے لئے کاشت کی جاتی ہو۔ حماس کی زمینوں پر عُشر (پیداوار کا دسواں حصّہ) لیا جاتا تھا۔ عُشر کی عدم ادائی کی صورت میں حقوقِ ملکیت سے محروم ہونا پڑتا۔ نظامِ حماس کے تجزیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروقِ اعظم کے عہدِ خلافت میں اجتماعی کاشتکاری کا تصوّر موجود تھا اور جہاں تک زرعی ترقی کا تعلق ہے، اجتماعی ملکیت کا تصوّر آج بھی مسلم دنیا کے لئے معنی خیز ہے۔''

''(۳) سرکاری زمینداری: مختلف ممالک کی فتح سے سرکاری زمینداری بھی پھلی پھولی۔ اس نظام کے تحت زمین ریاست کی ملکیت ہوتی اور کاشتکار اس کے مستاجر ہوتے جنہیں زمین کے حقوقِ ملکیت حاصل نہیں ہوتے تھے اور یوں وہ نہ تو زمین کو فروخت کرنے کے مجاز تھے اور نہ ہی زمین اُن کے نام منتقل ہو سکتی تھی۔ مزارعین (کرایہ داران) زمین کو کاشت کرتے اور سرکار کو بطورِ خراج ایک مخصوص رقم ادا کرتے۔ ایک غیر مسلم مستاجر کو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی خراج ادا کرنا پڑتا اگرچہ وہ جزیہ دینے سے مستثنیٰ ہو جاتا۔''

''(۴) فَے: اِس میں وہ زمینیں اور مالِ غنیمت شامل تھے جو رسول اللہ ﷺ کو دشمن کو مفتوح کرنے کے بعد حاصل ہوئے اور جن کے تصرّف کے آپ کُلّی طور پر مجاز تھے۔ فَے کا نظام دراصل نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے دورِ مبارک ہی میں شروع ہوا۔ پہلا فَے بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینیں تھیں۔''

"(۵) کسانی ملکیت : اِس نظام میں مالک خود زمین کی کاشت کرتا تھا۔عرب میں یہ نظام عام تھا خصوصاً اُن علاقوں میں جو قابلِ کاشت اور زرخیز تھے۔ ملکِ شام میں اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ چھوٹے درجے کے کسان کاشت بھی کرتے تھے اور زمینوں کے مالک بھی تھے۔"

("Islamic Economics -- Theory and Practice" --- M. A. Mannan, pp. 112-114)

چند زرعی اصطلاحات قرآن حکیم کی روشنی میں

(۱) زرعی کاروبار (Agribusiness) : قرآن حکیم فرماتا ہے :

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ" وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ ٥ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ" حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ ٥ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَىٰ بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ" رَّحِيمٌ "٥ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ٥ (اَلنَّحل:۵۔۸)

"اور اُسی نے چوپائے بنائے' اُن میں تمہارے لئے گرم لباس * بھی ہے اور دیگر فوائد بھی ہیں اور اُن میں سے تم کھاتے بھی ہو' اور اُن کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ (اُنہیں) شام کے وقت (گھر) لاتے ہو اور جبکہ اُنہیں صبح کے وقت (چرنے) چھوڑ دیتے ہو اور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم نفس کی سخت مشقت کے بغیر پہنچ نہیں سکتے۔"

فقہاء نے آیت ۵ مذکورہ سے استدلال کیا ہے کہ چوپایوں کی کھال' اون وغیرہ سے نفع حاصل کرنا' زندہ اور مُردہ دونوں حالتوں میں جائز ہے۔ محققین نے آیت ۶ مذکورہ کے ضمن میں لکھا کہ منافع ضروری کے بعد جَــــمَــــال کا ذکر لانا اس بات کی دلیل ہے کہ زینت' جمال وغیرہ کا ہونا بھی مُضر نہیں جبکہ مانعِ شرعی (مثلاً فخر وتکبّر) سے خالی ہو اور کوئی امرِ مباح مقصود ہو مثلاً حصولِ مسرّت۔ وَمَنَافِعُ اپنے اندر معانی کا ایک جہان رکھتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُن جانوروں کی اون سے بنے ہوئے ملبوسات سے تم حرارت حاصل کرتے ہو' اس کے علاوہ متعدد منافع تمہیں ملتے ہیں' اُن کا دودھ تم پیتے ہو' اُن کی ہڈیوں کو طرح طرح سے استعمال کرتے ہو' مزید برآں یہ کہ اُن کے گوبر اور پیشاب کو بطور کھاد استعمال کر کے اپنی زراعت کو چار چاند لگاتے ہو۔

(۲) علمِ زراعت وفلاحت (Agronomy) : قرآن مجید میں کاروباری اور تجارتی تلمیحات بکثرت ہیں زرعی اور کاشتکارانہ تلمیحات کی بھی یہاں کمی نہیں۔ مثلاً ذیل کی آیات ملاحظہ ہوں کہ کیسی جامعیت سے بات سمجھائی:۔

* یہاں سردی سے بچنے کے لئے گرم لباس کا ذکر ہے اور گرمی سے بچنے کا ذکر اِسی سورۃ النّحل کی آیت ۸۱ میں تَقِيكُمُ الْحَرَّ (جو تمہاری حفاظت گرمی سے کرتے ہیں) کے الفاظ میں ہے۔

(أ) مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ: ۲۶۱)

''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں' اُن کے مال کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک دانہ ہے کہ اُس سے سات بالیاں اُگیں' ہر ہر بالی کے اندر سَو دانے ہوں* اور اللہ جسے چاہے' بڑھاتا ہے۔''

فِيْ سَبِيْلِ اللهِ میں تمام مصارفِ خیر شامل ہیں۔ اس آیت سے اہلِ لطائف نے دو نادر نکات نکالے ہیں: (۱) اپنے مصارفِ خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہلِ زراعت ہی کی طرح کرتے رہنا چاہیے۔ ریا' نمائش' عُجب' تکبر' ایذا رسانی اور احسان جتلانے سے اُنہیں برباد نہیں کرنا چاہیے۔ (۲) جس طرح تخم ریزی' آبپاشی وغیرہ کے مختلف ہونے سے پیداوار محنت' قیمت اور نفع میں مختلف ہوتی رہتی ہے' اُسی طرح اجر اگرچہ مقدار میں برابر ہو' تاہم حسنِ قبول و قربِ درجات وغیرہ میں نیت و خلوص کے لحاظ سے کمی بیشی ہوتی رہے گی۔

اس آیت کے ضمن میں علامہ قرطبی نے لکھا کہ اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ زراعت کا پیشہ تمام پیشوں سے اعلیٰ ہے اور روزی کمانے کے ذرائع میں سے بہت باعزت ذریعہ ہے۔ ترمذی میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اِلْتَمِسُوا الرِّزْقَ فِيْ خَبَايَا الْأَرْضِ یعنی زمین کی تہوں سے اپنا رزق تلاش کرو۔ زراعت فروضِ کفایہ میں سے ہے۔ اگر لوگ اس کی طرف سے غفلت برتیں تو اسلامی حکومت کو چاہیے کہ لوگوں کو جبراً کاشتکاری کی طرف راغب کرے اور باغات اور درخت لگانے کا حکم دے۔ (علامہ قرطبی بحوالہ ضیاء القرآن' جلد اوّل' ص ۱۸۴)

(أأ) وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنفِقُوْنَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ '' فَاٰتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ '' فَطَلٌّ '' (البقرۃ: ۲۶۵)

''اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں اور اس لئے تاکہ اُن کے دل پختہ ہو جائیں' اُس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو' اُس پر زور کا مینہ برسا ہو تو وہ باغ دوگنا پھل لایا ہو اور اگر اس پر بارش نہ بھی برسے تو شبنم ہی کافی ہو جائے۔''

اِس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ عام سطحِ زمین سے بلند زمین بڑی زرخیز اور خوب پھلتی پھولتی ہے خواہ بارش کم ہی ہو اور دوم یہ کہ بااخلاص مؤمن کا صدقہ کم ہو یا زیادہ' اللہ تعالیٰ اُسے خوب بڑھاتا ہے۔

* آیت زرعی پیداوار' پھلوں اور پھولوں کی افزائش کا محرک ثابت ہوئی۔ اسی آیت کی وجہ سے انسان اب ہر بالی میں ۳۶' ۳۷ دانوں تک پیدا کرنے کے قابل ہوا ہے اور کوئی بعید نہیں کہ مستقبل قریب یا بعید میں وہ ہر بالی میں سے سَو دانے حاصل کرنے کے قابل ہو جائے جیسا کہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

(iii) وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِإِذْنِ رَبِّهٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَایَخْرُجُ اِلَّانَكِدًا (الاعراف:۵۸)
''اور ستھری زمین میں پیداوار اُس کے پروردگار کے حکم سے (خوب) نکلتی ہے اور جو خراب ہے' اُس سے پیداوار نکلتی بھی ہے تو بہت کم۔''

(iv) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِیْدِo وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِیْدٌo رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْیَیْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُo (ق: ۹۔۱۱)
''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا' پھر ہم نے اُس سے باغ اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوتے ہیں اُگائے' بندوں کو روزی دینے کے لئے اور ہم نے اُس کے ذریعہ سے مردہ زمین کو زندہ کیا' اسی طرح (روزِ حشر کو زمین سے) نکلنا ہوگا *۔''

اسلامی شریعت میں ایسی شہادتیں موجود ہیں جن میں بنجر زمینوں کو کارآمد بنانے کے لئے محرکات دیئے گئے۔ اِس ضمن میں مندرجہ بالا قرآنی حوالہ جات کے علاوہ ذیل میں کچھ احادیث دی جاتی ہیں۔ فرمایا گیا:۔
(i) ''جو کوئی ایسی زمین کاشت کرتا ہے جو کسی کی ملکیت نہیں ہے' تو اُس پر اُس کا حق فائق ہے۔''
(ii) ''ابنِ عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے خیبر کے یہودیوں کو اِس شرط پر (زمین) دی تھی کہ وہ اُس پر کاشت کریں تو اُنہیں پیداوار کا نصف حصہ ملے گا۔''

رسولِ اکرم ﷺ نے زرعی زمین کو بے کار چھوڑنے کو ناپسند فرمایا۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو' وہ اُس کی خود کاشت کرے وگرنہ اُسے چاہیے کہ اپنے بھائی کو کاشت کے لئے دے دے۔ (مسلم)

(۳) زرعی موسمیات (Agrometeorology) : (زراعت سے متعلق ماحولیاتی سائنس)

(i) وَهُوَالَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ (الاعراف: ۵۷)
''وہ وہی (خدا) ہے جو ہواؤں کو قبل اپنی رحمت (یعنی بارش) کے خوشخبری کے لئے بھیجتا ہے۔''

(ii) اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ كَیْفَ یَشَآءُ وَیَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَo وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِیْنَo (الروم:۴۸' ۴۹)
''وہی اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اٹھائے پھرتی ہیں پھر اللہ اُس کو جس طرح چاہتا ہے' آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تو مینہ کو دیکھتا ہے کہ اُس میں سے ٹپکنے لگتا ہے' پھر اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے' پہنچا دیتا ہے تو بس وہ خوشیاں منانے لگتے ہیں۔ جبکہ وہ لوگ اس سے پہلے کہ اُن پر بارش ہوتی' مایوس ہو چکے تھے۔''

(۴) اناج، غلّہ (Cereals) (کھانے کے لئے استعمال ہونے والی اجناس جیسے گندم، رائی، جو وغیرہ)

(i) أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَسُوقُ الْمَآءَ إِلَى الْأَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَأْكُلُ مِنْهُ أَنْعَامُهُمْ وَأَنْفُسُهُمْ أَفَلَا يُبْصِرُوْنَ ٥ (الٓمٓ السَّجدة : ۲۷)

"کیا اُنہوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم بنجر زمین کی طرف پانی پہنچاتے رہتے ہیں پھر اُس کے ذریعے کھیتی نکالتے ہیں جس سے اُن کے مویشی اور وہ خود بھی کھاتے ہیں۔ تو کیا وہ (یہ بھی) نہیں دیکھتے؟"

(ii) وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنٰهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُوْنَ ٥ (يٰسٓ : ۳۳)

"اور ایک نشانی اُن لوگوں کے لئے مردہ زمین ہے، ہم نے اُسے زندہ کیا اور اُس میں سے غلّے نکالے، سو اُن میں سے لوگ کھاتے ہیں۔"

(iii) وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَأَنْبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ٥ (قٓ : ۹)

"اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی اتارا پھر اُس سے باغات اور کھیتی کا غلّہ اُگایا۔"

(iv) وَأَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا ٥ لِّنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا وَّنَبَاتًا ٥ وَّجَنّٰتٍ أَلْفَافًا ٥ (النَّبا : ۱۴۔۱۶)

"اور ہم ہی نے بھرے بادلوں سے بکثرت پانی برسایا کہ اس کے ذریعہ سے غلّہ اور سبزی اور گنجان باغ پیدا کریں۔"

(۵) بھوسہ (Chaff) (اناج کا بیرونی حصّہ جسے آٹا بناتے وقت علیحدہ کر دیا جاتا ہے)

أَفَرَأَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ٥ أَأَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ أَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ٥ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ٥ إِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ٥ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ٥ (الواقعة : ۶۳۔۶۷)

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو، اُسے تم اُگاتے ہو یا اُس کے اُگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُس (پیداوار) کو (سوکھے ہوئے بھوسے کی طرح) ریزہ ریزہ کر دیں، پھر تم کفِ افسوس ملتے رہ جاؤ (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے۔"

(۶) فصل (Crop): خوب خیال رہے کہ قرآنِ مجید تجارتی، مالی، کاروباری اصطلاحات کے ساتھ ساتھ زراعت و فلاحت کی اصطلاحیں بھی کثرت سے لاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی آیت:

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ٥ (الشّورٰی : ۲۰)

"جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے اُس کی کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا طالب ہے ہم اُسے کچھ دنیا میں سے دیں گے اور آخرت میں اُس کا کچھ حصّہ نہ ہوگا۔"

(۷) کاشتکاری (Cultivation) :

(i) قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا (یوسف : ۴۷)

''یوسف علیہ السلام نے کہا کہ تم سات سال متواتر کاشتکاری کئے جاؤ۔''

(ii) أَفَرَأَیْتُمْ مَّاتَحْرُثُوْنَo أَأَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَہٗ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُوْنَo (اَلواقعۃ : ۶۳٬۶۴)

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو' اُسے تم اُگاتے ہو یا اُس کے اُگانے والے ہم ہیں؟''

(۸) پتّوں کا جھڑنا (Defoliation):

(i) اَلَمْ تَرَاَنَّ اللّٰہَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَکَہٗ یَنَابِیْعَ فِی الْاَرْضِ ثُمَّ یُخْرِجُ بِہٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰاہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَجْعَلُہٗ حُطَامًا (الزُّمَر : ۲۱)

''کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر اُسے زمین کے سوتوں میں داخل کر دیا پھر وہ اُس کے ذریعہ سے کھیتیاں پیدا کرتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے سو تو اُس کو زرد دیکھتا ہے پھر وہ اُسے ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔''

(ii) اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَالَعِبٌ'' وَّلَھْوٌ''وَّزِیْنَۃٌ'' وَّتَفَاخُرٌ'' بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ'' فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا (الحدید:۲۰)

''جان رکھو کہ دُنیوی زندگی محض ایک کھیل کود' (ظاہری) خوشنمائی اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا کرنا اور مال واولاد میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتلانا ہے' اُس بارش کی طرح کہ اُس کی پیداوار کاشتکاروں کو بھلی لگتی ہے' پھر وہ خشک ہو جاتی ہے' سو تم اُسے زرد دیکھتے ہو پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔''

دُنیوی زندگی کے دامن میں جو رنگین کھلونے ہیں' اُن میں سے ایک ایک کا ذکر کر دیا اور پھر انسان کو جھنجھوڑ کر اُس سے دریافت کیا کہ اِن کھلونوں میں سے کوئی کھلونا اتنا قیمتی ہے کہ اُسے اِس زندگی کا حاصل قرار دیا جا سکے؟ اگر نہیں تو پھر قرینِ دانشمندی یہ ہے کہ وہ اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کرے۔ فرمایا کہ دنیوی زندگی عبارت ہے لہو ولعب سے جو بچوں کا کام ہے' زینت وآرائش ہے جو عورتوں کا شیوہ ہے' تفاخر وتکاثر سے جس میں احمق ونادان ہی اپنے آپ کو مشغول رکھتے ہیں۔ سوائے بندۂ مؤمن! تیری زندگی بڑی قیمتی ہے۔ اُسے بچوں کی طرح کھیل کود میں برباد مت کر۔ تیری ذات خود بڑی ہی حسین وجمیل ہے' تجھے اِن عارضی آرائشوں کی کیا ضرورت ہے ع حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را (ضیاء القرآن' ج ۵)

(۹) جنگل کی کٹائی (Deforestation): (درختوں اور جنگلوں کو ایک جگہ سے ہٹا دینا)

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ أَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى أُصُوْلِهَا فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ o (الحشر: ۵)

" کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹے یا اُنہیں اُن کی جڑوں پر قائم رہنے دیا' سو یہ دونوں اللہ ہی کے حکم کے موافق ہیں اور تا کہ اللہ نافرمانوں کو رُسوا کرے۔"

واقعہ یہودی قبیلہ بنی نضیر کا حد درجہ خبثِ باطن اور شرارتوں کے باعث مدینہ منورہ سے جلاوطنی کا ہے۔

فَبِإِذْنِ اللّٰهِ یعنی شرعاً دونوں کی گنجائش تھی: دشمن کو تکلیف پہنچانے کے لئے درختوں کے کاٹ دینے کی بھی اور اپنے آئندہ نفع کے خیال سے اُن کے باقی رکھنے کی بھی۔

(۱۰) زرخیز کاری ۔۔ تولیدی عمل (Fertilization): (نر اور مادہ کے صنفی تخم کا ملاپ)

(i) وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ (الحجر: ۲۲)

"اور ہم ہی پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں' پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں پھر وہی پانی ہم تم کو پلاتے ہیں۔" (تشریح صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ ہو)

(ii) "وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ o (الحج: ۵)

"اور تو زمین کو خشک دیکھتا ہے پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے' پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے۔"*

(۱۱) پیوند کاری (Grafting): (ایک پودے کے ٹکڑے کا پیوند کسی اور پودے کو لگانا تا کہ پھل کی خصوصیت بہتر ہو اور پیداوار بھی زیادہ ملے)

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ أَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْأُكُلِ (الرعد: ۴)

"اور زمین میں (مختلف قسم کے) ٹکڑے ہیں جو قریب قریب ہیں' انگوروں کے باغات ہیں' کھیتیاں اور کھجوریں ہیں' کچھ ایک تنے سے پھوٹتی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے' ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے (اس کے باوجود) ہم بعض (درختوں) کو بعض پر ذائقہ اور بُو میں فضیلت دیتے ہیں۔"

* نباتات کے اُگنے کو زمین کے اُگانے کی طرف نسبت دینے میں اسنادِ مجازی ہے کہ اصل اُگانے والا تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

(۱۲) فصل کی کٹائی (Harvesting)

(i) كُلُوا مِنْ ثَمَرِه إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّه‘ يَوْمَ حَصَادِه (الانعام : ۱۴۱)

”اُس کے پھلوں میں سے کھاؤ جب وہ پھلدار ہو اور اُس کا حق (شرعی) اُس کے کاٹنے کے دن ادا کر دیا کرو۔“

(ii) ذٰلِكَ مِنْ أَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّه‘ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ٥ (هود:۱۰۰)

”یہ اُن بستیوں کی بعض خبریں ہیں جو ہم آپ سے بیان کر رہے ہیں، اُن میں سے کچھ قائم ہیں اور کچھ کٹ گئی ہیں۔“ *(حَصِیْد: وہ کھیتی جسے کاٹ دیا گیا ہو۔ یہاں وہ قوم مراد ہے جس کا کوئی نشان باقی نہ رہا ہو۔)

(۱۳) باغبانی (Horticulture):

قرآن مجید نے سورۃ الکہف کی مندرجہ ذیل آیات میں باغبانی سے متعلق کچھ نادر نکات بیان کئے ہیں :۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ٥ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ٥ وَّكَانَ لَه‘ ثَمَرٌ فَقَالَ لِصَاحِبِه وَهُوَ يُحَاوِرُه‘ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا ٥ وَدَخَلَ جَنَّتَه‘ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِه قَالَ مَا أَظُنُّ أَنْ تَبِيْدَ هٰذِه أَبَدًا ٥ وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ إِلٰى رَبِّيْ لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ٥ قَالَ لَه‘ صَاحِبُه‘ وَهُوَ يُحَاوِرُه‘ أَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًا ٥ لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّيْ أَحَدًا ٥ وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ إِنْ تَرَنِ أَنَا أَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ٥ فَعَسٰى رَبِّيْ أَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا ٥ أَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَه‘ طَلَبًا ٥ وَأُحِيْطَ بِثَمَرِه فَأَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَا أَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ أُشْرِكْ بِرَبِّيْ أَحَدًا ٥ وَلَمْ تَكُنْ لَّه‘ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَه‘ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا ٥ هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ٥ (الكهف : ۳۲۔۴۴)

”اور اِن سے اُن دو شخصوں کا حال بیان کیجئے جن میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دے رکھے تھے اور اُنہیں کھجور (کے درختوں) سے گھیر رکھا تھا اور ہم نے اُن دونوں کے درمیان کھیتی بھی لگا رکھی تھی۔ دونوں باغ اپنا پورا پھل دیتے تھے اور کسی کی پیداوار میں ذرا بھی کمی نہ رہتی اور ہم نے اُن دونوں کے درمیان ایک ندی جاری کر رکھی تھی اور اُس (شخص) کے پاس (باغوں کے علاوہ اور بھی) اموال تھے، سو اُس نے اپنے (اُس)

*جو بستیاں ملیامیٹ ہو گئیں اُن میں قومِ لُوط کا مسکن ایک مثال ہے۔ وہ بستیاں جن کی صرف آبادی ہلاک کی گئی لیکن اُن کا علاقہ اور زمین بدستور قائم ہیں مثلاً سرزمینِ مصر کہ فرعونی ڈبو دئے گئے لیکن اصل ملک بدستور موجود ہے۔

(۱۳) جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY) --- --- --- ۴۲۲

ایٹم کا تعارف۔ قرآنِ حکیم میں ایٹم کا تصوّر۔ ایٹم کی تقسیم۔ تابکار مادّے اور اُن سے خارج ہونے والی شعاعیں (Radioactivity)۔ ہیروشیما اور ناگاساکی پر بمباری' ریڈی ایشن (اِشعاع) کی ایک مثال۔ قومِ عاد کی تباہی بذریعہ پتھروں کی بارش۔ کافر و باغی لوگوں کو سزا دینے میں ربّ تعالیٰ کا مدّعا۔ اصحاب الفیل کی تباہی کی مثل جوہری بارش سے۔

(۱۴) حسابات کی جانچ پڑتال (AUDIT & ACCOUNTS) --- --- ۴۲۸

پڑتال اور محاسبہ۔ حسابات (Accounts)۔ یوسف علیہ السلام بطور وزیرِ محاصل و مال گزاری۔ چند متعلقہ اصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں: جواب دہی' بازپُرسی۔ حسابات۔ پڑتال اور محاسبہ۔ میزان میں وزن کرنے کی حکمتیں۔ محاسبے میں قانونِ مکافات (Law of Requital) کی مکمل ضمانت۔ آریہ دھرم کا ایک اعتراض اور اس کا جواب۔ سورۃ الصّٰفّٰت: ۲۴ اور سورۃ البقرۃ: ۱۷۴ کے مابین بہ ظاہر تضاد کا جواب۔ محاسبین (Auditors)۔ حسابات کا بند ہونا۔ کھاتے (Ledger) کی جامعیت۔ حسابات کی وضاحت۔ جِنّی اعضاء کا بولنا کیسا ہے؟ جینیٹک انجینیئرنگ اور انسانی خلیے۔ جِنّی اعضاء میں جلد کی اہمیت۔ صاف ستھرا لیکن غیر جانبدارانہ سخت محاسبہ۔ خدائی قانونِ مکافات (Law of Requital)۔ لَدُن اور عِندَ میں فرق۔ عملِ صالح اور برّ و تقویٰ میں فرق۔ متوازن اور بااُصول طریق کار۔ قوّتِ نظریہ اور قوّتِ عملیہ کا فساد۔ کوئی قائم مقامی (Proxy) اور کوئی تلبیس (Impersonation) نہیں ہوگی۔ روزِ قیامت بوجھ اُٹھانے' بوجھ نہ اُٹھانے کی آیات میں تطبیق۔ قرآن اور ذاتی ذمہ داری کا احساس۔ کفارۂ مسیح کے نیابتی اختیار کے عقیدے کی مذمّت۔ محاسبہ بہ عُجلتِ تمام (جلدی جلدی ہوگا)۔ کفار و منافقین کے لئے رعایتی نمبروں کی بجائے شدید عذاب۔ گنہگار مؤمن اور کافر کے جہنم واصل ہونے میں فرق۔ جہنم کے سات طبقات۔ منافق کے معنی۔ اِراقہ اور اِفاضہ میں فرق۔ سورۃ المُؤمِنون کی آیات ۱۰۳ تا ۱۰۸ کی تشریح۔ جن لوگوں نے اپنے حسابات کے کھاتوں کو پاک وصاف اور درست رکھا' اُن کے لئے الٰہی رحمتوں کا غیر منقطع سلسلۂ عنایت جاری رہے گا۔ جنّتِ عدن میں دیدارِ الٰہی (Theophany)۔ صبر کی تفسیریں۔ مِنْ کُلِّ بَاب (سورۃ الرَّعد: ۲۳) کے معنی۔ طُوبیٰ کا معنی۔ سورۃ الواقِعۃ کی آیات ۱۵ تا ۳۸ کی تشریح۔ سورۃ الدَّھر کی آیات ۱۱ تا ۲۲ کی تشریح۔ اللہ تعالیٰ کے شاکر ہونے کی توجیہ۔

(۱۵) ہوابازی (AVIATION) --- --- --- ۴۷۰

تعارف۔ فضائی دباؤ میں تبدیلی۔ اطلاقی برقیریات (Avionics)۔ پرندوں کی اُڑان اور انسان کی متجسّسانہ ہوابازی۔

ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں۔ اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا' کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ (سرسبز و باغ) کبھی برباد بھی ہوگا اور میں یہ بھی خیال نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور (بفرضِ محال) اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹایا گیا تو میں یقیناً اِس (باغ) سے بھی بہتر جگہ پاؤں گا۔ اُس کے ساتھی نے اُس سے دورانِ مباحثہ کہا: کیا تو اُس ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا فرمایا' پھر نطفہ سے' پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا۔ لیکن (میرا تو یہ عقیدہ ہے کہ) وہی اللہ میرا پالنہار ہے اور میں اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا ماشاءَ اللہ لَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ (اللہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور (کسی میں) بجز اللہ (کی مدد) کے کوئی قوت نہیں) اور اگر تو مجھے مال اور اولاد میں کمتر دیکھتا ہے تو عجب نہیں کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر دے دے اور اُس پر آسمان سے کوئی تقدیری مصیبت اتارے جس سے (باغ) ایک چٹیل میدان ہو کر رہ جائے یا اُس کا پانی زمین کی گہرائی میں جذب ہو جائے پھر تو تلاش کے باوجود اُسے نہ پا سکے۔ اور اُس (بددین) کی دولت کو (آفت نے) گھیر لیا پس وہ (اِس پر) اپنے ہاتھ مَلتا رہ گیا جو کچھ اُس نے اُس (باغ) پر خرچ کیا تھا اور وہ باغ (اب) اپنے چھپروں پر گرا پڑا تھا اور وہ (بددین) کہنے لگا اے کاش! میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا! اور کوئی جماعت اُس کے پاس نہ رہی تھی جو اللہ کے مقابلہ میں اُس کی مدد کرتی اور نہ وہ (ہم سے) بدلہ لے سکا۔ ایسے موقع پر کارسازی اللہ برحق ہی کا کام ہے' اُسی کا ثواب سب سے بہتر اور اُسی کا نتیجہ سب سے بہتر۔''

ایک شخص کے پاس باغ ہیں جہاں خوش ذائقہ انگوروں کی البیلی بیلیں اپنی بہار دکھا رہی ہیں۔ اِن باغوں کے اردگرد کھجوروں کے بلند قامت درخت کھڑے ہیں جو اُس باغ کو آندھیوں سے بھی بچاتے ہیں اور اپنے عمدہ اور شیریں پھل کے باعث بذاتِ خود بھی منفعت بخش ہیں۔ مزید برآں انگوروں کی بیلوں کی قطاروں میں جو جگہ بچ گئی ہے' وہ بھی بیکار نہیں بلکہ وہاں بھی کھیتی باڑی کی جاتی ہے اور کئی جنسیں کاشت ہوتی ہیں۔

علمِ زراعت و باغبانی کے جدید ماہرین جس چمن بندی کو آج مثالی قرار دے رہے ہیں' قرآنِ حکیم نے پہلے ہی اپنے ماننے والوں کو یہ نقشہ بتا دیا تھا۔ اُنہوں نے شام' مصر' اندلس وغیرہ میں باغ لگوائے اور اُن ویران علاقوں کو اپنی محنت اور ہنرمندی سے رشکِ ارم بنا دیا۔ قوم کے قوائے عمل کو راحت طلبی اور کم کوشی کا گھن لگا تو اُن کے دوسرے علوم وفنون کی طرح اُن کا فنِ باغبانی بھی اِس ہمہ گیر زوال سے نہ بچ سکا ورنہ مغلوں کے لگائے ہوئے باغات اور پیوند کاری کے ذریعہ سے ہر پھل اور جنس میں نئی اقسام کی اختراع کسے معلوم نہیں! صرف آموں کی مختلف قسمیں سینکڑوں سے اوپر ہیں۔

کار آمد نکات: (۱) مسئلہ سمجھانے کے لئے علمائے کرام کو وعظ و تقریر میں مناسبت والی مثالیں دینا جائز ہے' جیسا کہ وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ سے ظاہر ہے۔ (۲) قانونِ شریعت کے مطابق پیداوار اور پھل اُسی کو کہا جاتا ہے جو مکمل طور پر پختہ اور صحیح قابلِ استعمال ہو کر درخت یا کھیتی سے اُتر آئے اور اُس پیداوار کی تجارت اور خرید و فروخت جائز ہے۔ جب تک پیداوار پختہ اور قابلِ استعمال نہ ہو' اُس وقت تک نہ تو اُسے مال کہا جائے گا اور نہ ہی شرعاً اُس کی تجارت کرنا یا قیمت وصول کرنا جائز ہے۔ یہ مسئلہ آتَتْ أُكُلَهَا سے معلوم ہوا۔ کیونکہ أُكُل کا معنی ہی وہ چیز ہے جو کھانے اور استعمال کرنے کے قابل ہو' کچے بور کی شکل میں نہ ہو اور ناپختہ حالت میں جھڑ جانے کے خطرے سے محفوظ ہو۔ (۳) جس کی زمین میں درخت ہوں' اُن درختوں کا مالک زمین والا ہوتا ہے اگرچہ زمین کو خرید کرتے وقت درختوں کا نام خریداری میں شامل نہ کیا ہو اور اُن درختوں کے پتے' پھل پھول' شاخیں اور لکڑی خریدار کی ملکیت ہوں گے۔ یہ مسئلہ وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ" سے معلوم ہوا۔ یہ حکم کھیتی کا نہیں ہے۔ زمین کی خریداری میں کھیتی شامل نہیں ہو گی کیونکہ جب اُس شخص نے وہ باغ والی زمین اور کھیتی خریدی ہو گی تو درخت یقیناً کافی دیر پہلے کے لگے ہوں گے۔ (۴) مغرور اور متکبر شخص اپنی اس بری عادت کی وجہ سے اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ یہ ظَالِمٌ" لِّنَفْسِهِ کے الفاظ سے معلوم ہوا۔ (۵) الٰہی نعمتوں کا ذکر کرنا اچھا کام ہے لیکن تکبر و غرور' خود نمائی' اپنے کرّ و فر کے اظہار اور دوسروں کو ذلیل کرنے کے لئے اپنی دولتمندی اور صاحبِ اولاد ہونے کا چرچہ کرنا کفر اور ظلم ہے۔ یہ بات أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا کے الفاظ سے معلوم ہوئی۔ (۶) بدعملی کر کے اچھی جزا کی اُمید رکھنا طریقۂ کفار ہے جیسا کہ وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي کے الفاظ سے مستفاد ہے۔ (۷) کوئی بھی بندہ اپنے عمل کی وجہ سے رب تعالیٰ کی کسی نعمت کا حقدار نہیں بن سکتا۔ تمام نعمتیں جو وہ اپنی مخلوقات کو دے رہا ہے' وہ محض اُس کا فضل و کرم ہے نہ کہ کسی کا حق۔ لہٰذا کسی نعمت کو اپنا حق سمجھنا طریقۂ کفر ہے۔ یہ مسئلہ لَأَجِدَنَّ خَيْرًا سے مستنبط ہوا۔ (۸) کافر اور بدعقیدہ لوگوں سے مناظرہ و مکالمہ اور بحث مباحثہ کرنا اچھا اور کارِ ثواب ہے (بشرطیکہ علم میں پختگی حاصل ہو) چاہے کافر اور بدعقیدہ اُس مناظرے سے درست ہو یا نہ ہو۔ یہ فائدہ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ' سے حاصل ہوا۔ (۹) کسی بھی چیز کو بُری نظر لگ جانا بالکل برحق ہے (بحوالہ سورہ یوسف آیت ۶۷)۔ اس لئے نظر اتارنے کے طریقے اور دعائیں کرنی بالکل جائز اور ضروری ہیں یہ فائدہ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ --- الخ سے حاصل ہوا۔ (۱۰) قیامت' حشر و نشر اور اسلام کے دیگر عقائد کا انکار اس لئے بھی کفر ہے کہ وہ حقیقتاً رب تعالیٰ کا ہی انکار ہے۔ یہ مسئلہ أَكَفَرْتَ بِالَّذِي سے معلوم ہوا۔ (۱۱) ہر مؤمن کو اپنے ایمان کا بلکہ فرض عبادات کا بھی اعلان کرنا چاہئے کہ ان کا چھپانا سخت گناہ ہے۔ مساجد' اذانیں' جمعہ' عیدین و حج پر روانگی کی محافل سب اعلان ہی کی صورتیں ہیں اور بالکل درست اور ضروری ہیں۔ یہ مسئلہ لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي سے معلوم ہوا۔ (۱۲) مسلمان جب کسی چیز کو دیکھ کر خوشی محسوس کرے یا کسی سے بیان

کرے تو اُسے مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے کلماتِ طیّبات پڑھنے واجب ہیں تاکہ اُس میں تکبر اور غرور پیدا نہ ہو اور شکر کی عادت پیدا ہو۔ حدیث پاک میں ہے کہ جو شخص اپنی کسی چیز کو دیکھ کر مَاشَآءَ اللّٰهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ کے کلمات پڑھے گا تو اُس کی اُس چیز کو کبھی نقصان نہ ہوگا یا اُس کے سبب سے اُس شخص کا نقصان نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ --- الخ سے معلوم ہوا۔ (۱۳) بارگاہِ الٰہی میں اکڑ پھکڑ، سیاست، چالاکی اور فریب کاری نہیں چلتی، وہاں تو عجز و انکساری اور گڑگڑا کر رونے ہی سے کام چلتا ہے۔ یہ فائدہ وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ" فرمانے سے حاصل ہوا۔ (۱۴) مؤمن نورِ معرفت سے سنتا، دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ یہ فائدہ وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فرمانے سے حاصل ہوا۔ اُس بندۂ مؤمن ساتھی نے جو کچھ کہا تھا، کچھ دنوں بعد اُس کے بے دین ساتھی کے باغ و املاک پر ویسی ہی ناگہانی آفت عذابِ عبرت کی شکل میں آ کے رہی۔ (۱۵) کسی بھی ناگہانی آفت اور قدرتی مصائب، بیماریوں اور وباؤں کے آنے پر یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہم اُس کا مقابلہ کر کے اُسے روک دیں گے بلکہ خالقِ ہر جہاں کے حضور عجز و نیاز کے سجدے اور دعائیں، سابقہ گناہوں کی توبہ، آئندہ گناہوں سے بچنے کے وعدے ہونے چاہئیں۔ اُس کی بارگاہِ عالی میں بچوں کی طرح مچل مچل جانا ہی اصل شانِ بندگی ہے ورنہ اُس کا قانون یہ ہے کہ اکڑنے والوں کو وہ بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیتا ہے۔ یہ فائدہ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا فرمانے سے حاصل ہوا۔ (۱۶) ناشکری گناہِ کبیرہ ہے کہ اس سے خاندانوں، علاقوں بلکہ ملکوں اور سلطنتوں کی ہلاکت ہوتی ہے اور غربت و ذلت پھیلتی ہے جبکہ شکر گزاری سب سے بڑی عبادت ہے جس سے نعمت و عزت بڑھتی ہے (سورہ ابراہیم آیت: ۷) اور غربت دُور ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ فَعَسٰى رَبِّیْ --- الخ فرمانے سے مستنبط ہوا۔ (۱۷) توبہ کرنا رب تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے، سچی توبہ کی علامت ندامت اور پشیمانی ہے۔ یہ مسئلہ وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِیْ سے حاصل ہوا۔ (۱۸) توبہ کی قبولیت کی علامت یہ نہیں ہے کہ دنیوی مال و دولت دوبارہ مل جائیں کہ دولت کا واپس ملنا قبولیت کی دلیل نہیں۔ یہ مسئلہ فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا اور وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ" ---- الخ فرمانے سے مستنبط ہوا۔ (۱۹) آیات میں بندۂ مؤمن کی سیرت و کردار اور بندۂ فاسق و بے دین کے کردار کی خوب نقشہ کی گئی ہے کہ غریب و نادار مسلمانوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنے اور اپنے دنیاوی جاہ و جلال پر اکڑ پھوں کرنے والوں کا انجام بہ احسن طریق دکھایا گیا ہے۔ (۲۰) اُس بد باطن شخص نے کوئی مورتی یا بُت بنا کر اُس کی عبادت نہیں کی تھی کہ اُسے شرک کہا جائے لیکن اُس کا طرزِ عمل چونکہ اپنی نفسانی خواہش پر مبنی تھا اور نفسانی خواہش کی پیروی کو قرآن نے شرک ہی کہا ہے (سورہ الفرقان، آیت: ۴۳، سورۃ الجاثیۃ، آیت ۲۳) اور اپنی دولت و اولاد کی کثرت کے بل بوتے پر وہ ایک متقی اور خدا خوفی رکھنے والے شخص پر اپنی فوقیت ثابت کرنا چاہتا تھا اس لئے اسے شرک سے تعبیر کیا گیا، جیسا کہ اُس نے حسرت و یاس سے کہا تھا: يٰلَيْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا (۲۲) اگر ایمان کی چنگاری دل میں روشن ہو تو بندہ حق بات کہنے اور پہنچانے میں بیباک ہوتا ہے۔ (۲۳) فخر و غرور کا مزہ اللہ اسی دنیا میں چکھا دیتا ہے۔ اپنی جس نفری پر اُسے ناز تھا اور وہ فخر کے ساتھ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا کہتا تھا، اس کی حقیقت و بساط اُس نے یہیں اِسی دنیا میں دیکھ لی۔ (۲۴) مالدار لوگ اکثر خود غرض اور شیخی خورے ہوتے

ہیں۔ (۲۵) اسلام ذاتی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہی کیوں نہ ہو (یعنی روپیہ پیسہ، قیمتی اجناس، مکان وغیرہ) جیسا کہ مندرجہ بالا آیات کے متعلقہ حصوں [(۱) جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ (۲) أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا (۳) وَدَخَلَ جَنَّتَهُ (۴) دَخَلْتَ جَنَّتَكَ] سے ظاہر ہے۔

ذاتی ملکیت کے حق اور مخالفت میں دلائل

حق میں دلائل: متعدد قرآنی آیات سے ذاتی ملکیت کے ثبوت کا جواز ملتا ہے مثلاً:۔

(۱) وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (البقرة: ۱۸۸)

"اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر مت کھاؤ۔"

(۲) لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ (آل عمران: ۱۸۶)

"تم اپنے مالوں اور جانوں سے ضرور بالضرور آزمائے جاؤ گے۔"

(۳) وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا (النساء: ۵)

"اور اپنا وہ مال کم عقلوں کو نہ دو جسے اللہ نے تمہارے لئے مایہ زندگی بنایا ہے۔"

(۴) وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ○ (الذّٰریٰت: ۱۹)

"اور اُن کے مالوں میں سوالی اور محروم (سب) کا حق رہتا ہے۔"

(۵) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ (المنٰفقون: ۹)

"اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولادیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔"

(۶) لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا (المُجادلة: ۱۷)

"اُن کے مال اور اُن کی اولادیں اللہ (کے عذاب) سے اُنہیں ہرگز نہ بچاسکیں گے۔"

(۷) فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ○ أَنِ اغْدُوا عَلَىٰ حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ ○ (القلم: ۲۱، ۲۲)

"پھر وہ ایک دوسرے کو پکارنے لگے کہ اپنے کھیت پر سویرے چلو اگر تمہیں پھل توڑنا ہے۔"

ذاتی ملکیت کے خلاف دلائل اور اُن کا تجزیہ: ذاتی ملکیت کے خلاف دلائل دینے والے اشتراکی ذہن کے لوگ سورہ اَلرّحمٰن کی مندرجہ ذیل آیت اپنے موقف کی تائید میں بیان کرتے ہیں:۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ ○ (اَلرّحمٰن: ۱۰)

"اور اُس نے زمین کو مخلوقات کے لئے پیدا کیا۔"

وہ کہتے ہیں کہ اِس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زمین سب انسانوں کے لئے مشترک ہے اور چونکہ ہر ملک کی حکومت وہاں کے باشندوں کی نمائندہ ہوتی ہے اس لئے زمین کی ملکیت کے حقوق صرف حکومت کو

حاصل ہیں۔ دراصل اُنہوں نے عربی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اَنَـام کو انسان کا ہم معنیٰ قرار دیا حالانکہ اَنَـام میں انسان، حیوان، چرند، پرند، مور و ملخ سب جاندار چیزیں شامل ہیں۔ لہٰذا یہ آیت نہ تو زمین کی ذاتی ملکیت کی نفی کرتی ہے اور نہ ہی اجتماعی ملکیت کی موافقت کرتی ہے۔ اِس آیت کا سادہ سا نتیجہ یہ ہے کہ تمام جانداروں کو اپنی بقاء اور غذائی ضروریات کے لئے زمین کی پیداوار سے فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔

ذاتی ملکیت کے مخالفین یہ بھی دلیل دیتے ہیں کہ از روئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۴ (لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ) اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۸ (إِنَّ الْأَرْضَ لِلّٰهِ) چونکہ تمام زمین اللہ کی ملکیت ہے، لہٰذا کسی کو زمین کے کسی ٹکڑے پر ملکیت کا کوئی حق نہیں ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اُن کی منطق اِس مفروضے پر قائم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا زمین کا مالکِ کُل ہونا انسان کے ذاتی مالک نہ ہونے کے ہم معنیٰ ہے۔ یہ بات اسلام کی روح کے سراسر منافی ہے۔ درحقیقت سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۴ اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۲۸ مذکورہ کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے ہی نہیں بلکہ اُن کا تعلق تو زمین پر اللہ کی سیاسی اور حکومتی اقتدارِ اعلیٰ سے ہے۔

مخالفین کی طرف سے پیش کردہ ہر دو آیات سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ افراد کو زمین پر ملکیتی حقوق حاصل نہیں ہیں۔ اِسی طرح یہ نتیجہ بھی نہیں نکالا جا سکتا کہ زمین اور آسمانوں میں جو کچھ بھی ہے، قومی ملکیت میں ہونا چاہئے۔ اگر خدائی ملکیت سے انسانی ملکیت کو خارج کر دیا جائے تو پھر انفرادی اور قومی ملکیت کے حق کا کوئی جواز نہیں رہتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ زمین و آسمان میں موجود تمام چیزوں کا مالکِ حقیقی ہے اور انسان کو بہ حیثیت خلیفۃ اللہ اور اُس کا امین ہونے کے یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ امانت دار کے طور پر حقِ ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ تو انسان کو امانت کے تقاضا کے مطابق اُسے عوام الناس کی فلاح و بہبود اور معاشی اور سماجی انصاف اور آمدنی اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے لئے کام کرنا ہے۔ اِس ضمن میں قرآنِ حکیم بہ صراحت حکم دیتا ہے:۔

وَآتُوهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْ آتَاكُمْ (النور: ۳۳)

"اور اُنہیں اُس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے۔"

(۱۴) کیڑے مکوڑے : قرآن حکیم حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بارے میں فرماتا ہے:۔

فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَادَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖ إِلَّا دَآبَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنْسَأَتَهٗ، فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ أَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ الْغَيْبَ مَا لَبِثُوْا فِي الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ (سبا: ۱۴)

"پھر جب ہم نے (سلیمان علیہ السلام پر) موت کا حکم جاری کر دیا تو کسی چیز نے اُن کی وفات کا پتہ نہ بتایا سوائے ایک زمینی کیڑے کے کہ وہ اُن کے عصا کو کھا تا تھا، سو جب آپ نیچے آ رہے تب جنات پر حقیقت ظاہر ہوئی کہ اگر وہ غیب جانتے ہوتے تو اس ذلت کی مصیبت میں نہ رہتے۔"

اِس قرآنی آیت سے علمائے کرام نے بجا طور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کیڑے مکوڑے یا کوئی بھی چیز کسی پیغمبر کے جسم کو اُس کی وفات کے بعد نقصان نہیں پہنچاتی۔ تفسیر ابن کثیر اور تفسیر قرطبی کے بیان کے مطابق جناب سلیمان علیہ السلام نے اپنی وفات سے چار سال پہلے اپنی نگرانی میں جنّات سے بیت المقدس کی تعمیر شروع کرائی تھی۔ اسی دوران آپ کی روح پرواز کر گئی۔ اُدھر عصا میں گھن لگنا شروع ہوا اور جب گھن پوری طرح عصا کو کھا چکا تو عصا گر گیا جس سے آپ بھی زمین پر آ رہے۔ جنات آپ کو عصا کے سہارے کھڑا دیکھ کر ایک سال تک آپ کو زندہ سمجھتے رہے۔ اپنے کام میں وہ بدستور لگے رہے، یہاں تک کہ بیت المقدس کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ تب جنات کو اپنی غیب دانی کی حقیقت خوب روشن ہوئی۔

اِس آیت سے حسب ذیل چند مسائل معلوم ہوئے :۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ مبارکہ وفات کے بعد گلنے سڑنے اور بگڑنے یا Decompose ہونے سے محفوظ رہتے ہیں کہ سلیمان علیہ السلام کا جسم ایک سال تک موسمی تغیرات سے صحیح وسلامت اور محفوظ رہا۔ ذیل کی احادیثِ مبارکہ بھی اِس حقیقتِ ثابتہ پر شاہدِ عدل ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

(i) اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ (صحیح بخاری)

''یقیناً اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ (مبارکہ) کے کھانے کو حرام کر دیا ہے۔''

(ii) اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ فَنَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ (سنن ابن ماجہ)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے زمین پر انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ (مبارکہ) کو نقصان پہنچانے کو حرام کر دیا ہے۔ اللہ کا (ہر) نبی (اپنے مزار مبارک میں) زندہ ہوتا ہے، اُسے رزق دیا جاتا ہے۔''

(iii) لِاَنَّہُ الْاٰنَ حَیٌّ یُرْزَقُ فِیْ عُلُوِّ دَرَجَتِہٖ وَرِفْعَۃِ حَالَاتِہٖ (شرح شفا لعلی القاری ج ۲، ص ۷۰)

''نبی زندہ ہوتا ہے، اُسے رزق دیا جاتا ہے اور وہ اعلیٰ ترین مقام اور بلند ترین درجات میں ہوتا ہے۔''

(۲) انبیاء علیہم السلام کے اجسامِ شریفہ کو کیڑا دیمک وغیرہ نہیں کھا سکتے۔ سلیمان علیہ السلام کے عصا کو دیمک نے کھایا لیکن جسم کے کسی حصے کو گزند نہ پہنچایا۔

(۳) پیغمبر کا کفن بھی گلنے اور میلا ہونے سے محفوظ رہتا ہے۔ جناب سلیمان علیہ السلام کا لباسِ مبارک پورے ایک سال میں میلا نہ ہوا، ورنہ جنّات کو آپ کی وفات کا علم ہو جاتا۔

(۴) انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص شامل ہوتا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد بھی وہ اُن کی دنیاوی اور دینی حاجات پوری کرا دیتا ہے۔ سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد بھی رب تعالیٰ نے بیت المقدس کی تعمیر مکمل کرا دی۔

(۵) دینی ضرورت کی وجہ سے پیغمبر کے کفن و دفن میں تاخیر کرنا سنتِ الٰہیہ ہے کہ رب تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو ایک سال تک بغیر کفن دفن رکھا لہٰذا اصحابہ کرام کا تکمیلِ خلافت کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے کفن و دفن میں تاخیر کرنا اِسی سنتِ الٰہیہ کے تحت تھا۔

(۶) Heart Failure یعنی اچانک موت اللہ کے نیک بندوں کے لئے رحمت ہے کہ اللہ کے پیغمبر سلیمان علیہ السلام جیسی مقدس ہستی کی وفات اچانک ہوئی اس لئے رحمت تھی۔ اگر چہ غافل کے لئے عذاب ہے کہ اُسے توبہ کا وقت ہی نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حفظ و امان میں رکھے!

(۱۵) <u>زمین پر قبضے کا نظام ۔۔ذرائع کا ایک ہی جگہ مرکوز نہ ہونا</u>: قرآن اور سنت نے کچھ مثبت اور بنیادی اصول وضع کئے ہیں جن کی مدد سے زمین پر قبضے کا ایک ایسا نظام وضع کیا جانا ممکن ہے جو دنیا کے مختلف مسلم ممالک کی ضروریات سے ہم آہنگ ہو۔ قرآنِ حکیم کا قانون صراحت کے ساتھ کسانوں کے ملکیتی حقوق کا حامی ہے اور کسی طور بھی زمیندارانہ یا جاگیردارانہ نظام کی حمایت نہیں کرتا۔

زمینی ذرائع سے فائدہ اٹھانے میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں اور اُنہیں انسانی معاشرے کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود کے لئے استعمال کیا جانا چاہئے۔ اس لئے زمین پر قبضے اور ملکیت کا ایسا نظام جس سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچے اور اکثریت اس سے محروم رہ جائے' قرآنی روح کے بالکل منافی ہے۔ ''زمینی ذرائع کا مفاد سب کے لئے'' کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے:۔

(۱) هُوَالَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّافِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (البقرۃ : ۲۹)

''وہی اللہ ہی تو ہے جس نے جو کچھ بھی زمین میں ہے' سب تمہارے لئے پیدا فرمایا۔''

(۲) وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَا اَقْوَاتَهَا فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ○ (حٰمٓ السجدۃ : ۱۰)

''اور اُسی نے زمین پر پہاڑ بنادئے اور اُس (زمین) میں فائدہ کی چیزیں رکھ دیں اور اُسی میں اُس (پر رہنے والوں) کی غذائیں چار مرحلوں میں ایک انداز سے رکھ دیں۔ (اُن کا حصول) طلبگاروں کے لئے یکساں ہے۔'' (تشریح کے لئے دیکھئے صفحات ۱۲۵' ۱۲۶)

(۱۶) <u>قدرتی آفات (سیلاب' طوفان' زلزلے وغیرہ) انسان کا خدائی احکامات کے خلاف رویّے کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں</u>: مندرجہ ذیل آیات میں بیان شدہ تشبیہات اِس حقیقتِ ثابتہ سے پوری طرح پردہ اٹھاتی ہیں:۔

(۱) أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ O (البقرة : ۲۶۶)

"کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں (اور) اُس کے ہاں اُس باغ میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اُس کا بڑھاپا آ چکا ہو اور اس کے بچے کمزور و ناتواں ہوں۔ اس (باغ) پر ایک آتشیں بگولا آئے تو وہ (باغ) جل جائے؟ اس طرح اللہ تمہارے لئے نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر سے کام لو۔"

ذرا صورتِ حال کی حسرتناکی کا تصوّر کیجئے۔ ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک سرسبز و شاداب، خوب پھلا پھولا ہوا، ہر طرح کے میووں سے لدا ہوا باغ ہے۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے اور اب وہ کسی محنت کے قابل نہیں رہا۔ بچے موجود ہیں مگر کمزور و ناتواں جو بجائے اس کے کہ کسبِ معاش میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹائیں، الٹا اُس کے لئے بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ عین اُس وقت شدید ترین حاجتمندی کے وقت اچانک معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں آگ لگی اور سب کچھ جل کر خاک ہو گیا۔ باغ کے مالک کے غم و حسرت کا کوئی اندازہ کر سکتا ہے؟ اس سے کہیں لاکھ گنا بڑھ کر حالت اُس بدنصیب کی ہوگی جس کی آنکھیں زندگی بھر غفلت سے بند رہیں اور پہلی بار اُس وقت کھلیں گی جب عمل کی مہلت بالکل ختم ہو چکی ہوگی اور اب وہ دیکھے گا کہ کوئی چیز بھی اُس کے دفترِ عمل میں ایسی نہیں جو اُس کے کام آ سکے۔ لہٰذا اس دار العمل میں ایسے کام نہ کرو جو تمہارے لئے اُس دن حسرت و افسوس کا باعث بن جائیں۔

(۲) مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ O (آل عمران : ۱۱۷)

"وہ جو کچھ اِس دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں اُس کی مثال تو ایسے ہے جیسے ایک ہوا ہے جس میں سخت سردی ہے (اور) وہ ایسے لوگوں کی کھیتی کو لگ جائے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، پھر وہ ہوا اُس (کھیتی) کو برباد کر دے تو اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔"

آسان اور عام فہم مثال میں اُن لوگوں کے مال کے ضائع جانے کو بیان کیا ہے جو ایمان سے محرومی کی حالت میں اِس دنیا کے حصول کے لئے ریا و ناموری کے لئے اپنی دولت خرچ کرتے رہتے ہیں اور کفر اور بے دینی کر کے خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

(۳) لَقَدْ كَانَ لِسَبَإٍ فِيْ مَسْكَنِهِمْ آيَةٌ ''جَنَّتٰنِ عَنْ يَّمِيْنٍ وَّشِمَالٍ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ بَلْدَةٌ'' طَيِّبَةٌ'' وَّرَبٌّ'' غَفُوْرٌ''o فَأَعْرَضُوْا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنٰهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَّأَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍ o ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجٰزِيْ إِلَّا الْكَفُوْرَo وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَأَيَّامًا آمِنِيْنَ o فَقَالُوْا رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا وَظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنٰهُمْ أَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ o (سبا:۱۵-۱۹)

''قومِ سبا کے لئے اُن کے وطن ہی میں نشانی (موجود) تھی۔ دائیں اور بائیں باغ کی دو قطاریں تھیں۔ اپنے پروردگار کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اُس کا شکر ادا کرو' اتنا عمدہ شہر اور مغفرت والا پروردگار (اہلِ سبا! تمہاری خوش بختی کا کیا کہنا!) پھر اُنہوں نے سرتابی کی سو ہم نے اُن پر بند کا (تند وتیز) سیلاب چھوڑ دیا اور ہم نے اُن کے دو رویہ باغوں کے عوض دو ایسے باغ اور دے جو بدمزہ اور کڑوے تھے اور اُن میں جھاؤ کے بوٹے اور بیری کے چند درخت تھے۔ یہ ہم نے اُنہیں اُن کی احسان فراموشی کے سبب سزا دی اور ایسی سزا ہم بڑے ہی احسان فراموش کو دیا کرتے ہیں۔ اور ہم نے اُن کے اور اُن کی بستیوں کے درمیان جہاں ہم نے برکت رکھی تھی' (دُور سے) نظر آنے والی بستیاں آباد کر رکھی تھیں اور ہم نے اُن میں آنے جانے کی منزلیں مقرر کر رکھی تھیں' اُن میں رات اور دن (جب چاہو) امن وامان سے سیر وسیاحت کرو۔ پھر وہ بولے اے ہمارے پالنہار! ہمارے سفروں میں درازی کردے۔ (یہ کہہ کر) اُنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا' پس ہم نے اُنہیں قصۂ پارینہ بنادیا اور ہم نے اُن (کی جمعیت) کو پارہ پارہ کردیا۔ (سبا کی اِس داستان میں) بے شک ہر صابر وشاکر کے لئے نشانیاں ہیں۔''

ملکِ سبا وہی ہے جو عرب کے جنوب میں اب یمن کہلاتا ہے جس کا اکثر حصّہ کوہستانی ہے' وہاں کوئی دریا نہیں بہتا۔ علاقہ میں دو طرفہ باغات کا سلسلہ متصل چلا گیا تھا۔ بعض مؤرخین نے کہا کہ اُن باغوں کی وسعت ۳۰۰ مربع میل کی تھی اور یہ سارا رقبہ خوشبودار درختوں اور رنگا رنگ کے لذیذ میووں اور پھلوں سے پُر تھا۔ الغرض آب وہوا کے لحاظ سے بڑا عمدہ اور پاکیزہ' زمین زرخیز' پانی وافر' پھلے پھولے باغات اور لذیذ پھل' ہوا اتنی لطیف تھی کہ اُس کا ہر جھونکا نسیمِ بہار کی طرح غنچہ دل کو حیاتِ نَو دیتا۔ مکھی' مچھر وہاں نام کو نہیں تھے۔ مزے کی بات یہ کہ رب بڑا ہی بخشش کرنے والا کہ اگر بھولے سے کوئی گناہ سرزد ہو بھی جائے تو فوراً پکڑ نہیں کرتا۔ توبہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی دیر ہے' وہ بڑی فیّاضی سے بخش دیتا ہے۔ گویا اتنی دنیوی نعمتوں کا اجتماع تھا اور مطالبہ صرف ادائے حقوق کا تھا۔

کچھ عرصہ تو وہ صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور شکر بجالاتے رہے لیکن اُس کے بعد وہ سرکش اور بے راہرو ہونے لگے۔ وقتاً فوقتاً اللہ نے اُنہیں سمجھانے کے لئے اپنے نبی بھیجے لیکن اُنہوں نے اپنے مخلص ناصحین کے وعظ

ونصیحت کو سننے سے انکار کر دیا۔ جب اُن کے فسق و فجور کی حد ہو گئی تو مکافاتِ عمل کا قانون حرکت میں آیا۔ غضبِ الٰہی موسلا دھار بارش کی شکل میں ظاہر ہوا اور ایسے خوفناک سیلاب کی صورت اختیار کر لی کہ جب اُس کی موجیں اُس چٹانوں سے بنے ہوئے بند سے جا ٹکرائیں جس پر انہیں بڑا ہی ناز تھا' تو اُن کو لرزا کر رکھ دیا اور چند جھٹکوں کے بعد پانی کا تند ریلا بند کے بھاری بھرکم پتھروں کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گیا' شہر ملیا میٹ ہو گئے' باغات اجڑ گئے' درخت اکھڑ گئے اور لہلہاتے ہوئے کھیتوں کا تو نام ونشان تک کہیں باقی نہ رہا۔ اس طرح دستِ قدرت نے اُن فاسقوں اور ناشکروں کو بیخ وبُن سے اکھاڑ ڈالا اور وہ چمن بندیاں' وہ روشیں' وہ خیاباں اور پھولوں سے لدی ہوئی کیاریاں سب قصّہِ ماضی بن چکی تھیں۔ جہاں سیب' انار اور انگور تھے وہاں کڑوے اور تُرش پھل' جھاؤ کے درخت اور بیری کے چند بے رونق پودے نظر آتے تھے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا کہ فَأَعْرَضُوا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ اور ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِمَا كَفَرُوْا۔ الخ دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اطاعتِ الٰہی کو دنیوی نعمتوں کے حصول اور فسق و فجور کو اُن کے زوال میں بڑا دخل ہے۔

یہ تو اُن کے باغات کا حال ہوا اور اُن ناشکروں اور مغروروں پر کیا بیتی۔ ایک کثیر تعداد تو سیلاب میں بہہ گئی۔ جو بچ گئے وہ اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں تتّر بتّر ہو گئے۔ اُن کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ جہاں بھی گئے وہاں کی آبادی میں جذب ہو کر رہ گئے۔ نہ وطن رہا اور نہ وقار رہا۔ باقی تھا قوم کا نام' وہ بھی مٹ گیا۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ قبیلہ غسّان شام چلا گیا' انمار یثرب میں' جُذام تہامہ میں اور قبیلہ ازد عمان میں جا کر آباد ہوئے۔ (الکشّاف) رب فرما رہا ہے کہ ہم یوں ہی قوموں کو بلاوجہ تباہ و برباد نہیں کر دیتے بلکہ یہ اُن کے بداعمال ہیں جو اُنہیں اس ہولناک انجام تک پہنچا دیتے ہیں۔

جب وہ خوشحالی اور آرام کی زندگی بسر کر رہے تھے' اُس وقت اُس علاقہ کی چہل پہل کا یہ حال تھا کہ یمن سے لے کر شام وفلسطین تک کا سارا علاقہ آباد اور پُر رونق تھا۔ ایک شہر سے نکلتے تو دوسرے شہر کے اونچے اونچے مکانوں کی منڈیریں دکھائی دینے لگیں۔ ابھی ایک شہر کی چہل پہل ختم نہ ہوتی تو دوسری بستی کی دلچسپیاں مسافروں کی توجہ کو جذب کرنے لگتیں۔ قُرًى ظَاهِرَةً سے مراد وہ آبادیاں اور بستیاں ہیں جو کسی شاہراہ پر واقع ہونے کی وجہ سے مسافروں کو دُور سے نظر آنے لگتی ہیں۔ اُن میں سفر کی منزلیں رب نے مقرر فرما دی تھیں: کوئی شب باشی کے لئے تو کوئی دوپہر کا قیلولہ کرنے کے لئے۔ ہر جگہ ہر طرح کا سامان میسّر' آرام دہ سرائیں اور شاندار ہوٹل اپنے مہمانوں کے لئے چشم براہ تھے۔ دن کے اجالے میں سفر کرنا ضروری نہیں تھا' رات ہو یا دن' ہر مسافر امن وامان سے سفر جاری رکھ سکتا تھا۔ نہ دن کو کسی راہزن کا خطرہ اور نہ رات کو لُٹ جانے کا خوف۔ لیکن کچھ مدّت کے بعد وہ اِس آرام دہ زندگی سے اُکتا گئے اور فاصلوں کو طویل کرنے کی دعا کرنے لگے کہ ایک پڑاؤ دوسرے پڑاؤ سے کافی دُور ہو اور اُن کے درمیان وسیع وعریض سنسان صحرا اور غیر آباد ویرانے ہوں

اُنہیں چلچلاتی دھوپ جلائے، گرم لُو جھلسا ڈالے، پیاس کی شدت سے ہونٹ خشک ہوں، سفر کا مزہ تو جبھی آئے گا۔ یہ کیا کہ وطن اور مسافرت میں کوئی فرق ہی نہیں! یعنی اُن نعمتوں پر شکر کرنے کی بجائے اُنہوں نے نافرمانی کو اپنا وطیرہ بنالیا۔ وہ قوم جو فارغ البالی اور خوشحالی کے باعث پورے عالم میں رشک وحسد کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی اور جس کا آفتابِ اقبال بڑی بلندی پر چمک رہا تھا، جب ہم نے اُسے پکڑا تو اُسے قصۂ ماضی بنا کر رکھ دیا اور اب محض اُن کی کہانیاں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ اُن کی دردبھری داستان سے وہی لوگ عبرت حاصل کرسکتے ہیں جو صبر وشکر کی صفات سے پوری طرح متصف ہوں۔ بموجب روایات انصارِ مدینہ یعنی اوس اور خزرج کے قبائل اِنہی اہلِ سبا کی اولاد میں سے تھے (تفسیر ماجدی اردو ص ۸۶۳ حاشیہ نمبر ۳۲)

اسی سے مشابہ کہانی باغ کے اُن مالکوں کی ہے جنہیں پتہ چلا کہ اُن کی املاک راتوں رات تباہ ہوگئیں۔ تب اُنہیں احساس ہؤا کہ اُنہوں نے اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اِن آیات میں قیمتی چیز کے نقصان یا نقصان کے خطرے کے وقت اشیاء کی فراہمی اور ضرورت کے مابین عمدہ توازن کو ظاہر کیا گیا ہے:۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ o وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ o فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ o فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ o فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ o اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ o فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ o اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ o وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ o فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ o بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ o قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ o قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ o فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ o قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ o عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ o كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ o (القلم: ۱۷-۳۳)

"بے شک ہم نے اُن (مشرکینِ مکّہ بالخصوص اُن کے خوشحال اور خوش عیش طبقہ) کی آزمائش کردی ہے جیسا کہ ہم نے باغ والوں کی آزمائش کی تھی، جبکہ اُنہوں نے قسم کھائی تھی کہ ہم اُس کا پھل صبح چل کر ضرور توڑ لائیں گے اور اُنہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا تھا۔ سو اُس (باغ) پر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک پھرنے والا (عذاب) پھر گیا اس حال میں کہ وہ سو رہے تھے۔ تو وہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہوگیا۔ پھر وہ ایک دوسرے کو صبح سویرے پکارنے لگے کہ اپنے کھیت کی طرف سویرے سویرے چلو اگر تمہیں پھل توڑنا ہے۔ سو وہ چل پڑے اور ایک دوسرے کو چپکے چپکے کہتے جاتے کہ آج وہاں کوئی محتاج تم تک ہرگز نہ آنے پائے اور (یہ سمجھتے ہوئے) تڑکے چلے کہ وہ اِس ارادہ پر قادر ہیں۔ پھر جب (باغ) کو دیکھا تو بول اُٹھے کہ ہم تو یقیناً راستہ بھول گئے، نہیں نہیں بلکہ ہماری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اُن میں جو دانا تھا، بولا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم (اُس کی) تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ وہ بولے: ہمارا پروردگار پاک ہے، بے شک ہم ہی قصوروار ہیں۔ پھر ایک دوسرے کو الزام دیتے ہوئے باہم مخاطب ہوئے اور کہنے لگے: ہائے ہماری شامت کہ ہم ہی

سرکشی کرنے والے تھے۔ شاید ہمارا پروردگار ہمیں اس سے بہتر (باغ) بدلہ میں دے دے' ہم تو (اب) اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عذاب اِسی طرح (ہوا کرتا ہے) اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے' کاش یہ لوگ (اسے) جان لیتے!''

قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ جو غافل لوگ اپنی تدبیروں پر نازاں اور اہلِ حقوق کی حق تلفی میں لگے رہتے ہیں وہ بالآخر خود ہی خسارے میں رہتے ہیں۔ وَلَا یَسْتَثْنُوْن (اُنہوں نے انشاءاللہ بھی نہ کہا) یعنی اُنہیں اپنے صبح کے پروگرام پر اس قدر یقین تھا کہ اُنہوں نے شب کی تجویزوں میں حق تعالیٰ کے ارادہ کا خیال ہی نہ آنے دیا۔ خدافراموشی اور آخرت فراموشی کے ساتھ ساتھ یہ باغ والے مسکینوں اور محتاجوں کے حصّہ کے بھی روادار نہ تھے۔ لَوْلَا تُسَبِّحُوْن (تم اُس کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟) یعنی توبہ واستغفار سے اپنی غلطی کا تدارک کیوں نہیں کرتے؟ تسبیح کے عموم میں توبہ واستغفار سب شامل ہیں (تفسیر مدارک) کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ پچھلے گناہ کی معافی اور آئندہ کے لئے احتیاط کی فکر کرو۔ اَوْسَطُهُمْ اُن میں سے سیانا۔ یہ وہ شخص تھا جس کا عقیدہ تو صحیح تھا لیکن عملاً یہ بھی اُن لوگوں کا شریکِ حال ہوگیا تھا۔ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا صحابی حضرت عبداللہ ابنِ مسعود کا قول ہے کہ بہتر باغ اُنہیں دنیا ہی میں مل گیا اور مجاہد تابعی سے بھی ایسا ہی منقول ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اے کاش! بندوں کو اِس حقیقت کا علم ہوتا اور ہر وقت یہ بات ذہن میں رہتی کہ نافرمانی اور گناہ کی پاداش میں جو عذاب اِس دنیا میں کبھی کبھار ہوتا رہتا ہے' جب اُس کا نمونہ یہ ہے تو کفروانکار پر عذاب جس کا پورا ظہور آخرت میں ہی ہوگا' ظاہر ہے کہ وہ اس سے کس درجہ بڑھا ہوا ہوگا۔

سورۃ الشّوریٰ کی مندرجہ ذیل آیت (۲۰) آخرت کی زندگی میں اُس کھیتی کے کاٹنے کا وعدہ کرتی ہے جو اِس دنیا میں بوئی گئی اور اِس آیت کا پیغام بھی وہی ہے جو اوپر کی آیات میں بیان ہوا:۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ (الشوریٰ: ۲۰)

''جو کوئی آخرت کی کھیتی کا طالب ہے' ہم اُسے اُس کی کھیتی میں ترقی دیں گے۔''

(۱۷) مستقبل کے لئے پس انداز کرنے اور قومی ضرورت کے لئے ذخیرہ اندوزی کرنے کا جواز:

قلت اور قحط کے زمانے کے لئے اناج کو ذخیرہ (سٹور) اور محفوظ کر لینا جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال سے ثابت ہے' عوام الناس اور انفرادی معیشت کے لئے ایک رہنما اصول ہے:

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ۝ (یوسف:۴۷)

''یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ تم سات سال متواتر کاشتکاری کئے جاؤ پھر جو فصل کاٹو اُسے اُس کی بالی ہی میں لگا رہنے دو سوائے تھوڑی مقدار کے کہ اُسی کو کھاؤ۔''

خواب کی تعبیر میں جناب یوسف علیہ السلام نے گایوں کو سالوں سے' فربہ گایوں کو خوشحالی اور غلہ کی فراوانی کے سالوں سے اور دُبلی گایوں کو خشک سالی اور قحط کے سالوں سے تعبیر کیا۔ پھر اُنہیں معیشت کی اصلاح کا طریقہ بتایا کہ وہ خوشحالی اور غلہ کی فراوانی کے سالوں میں ضرورت سے زیادہ غلّہ خرچ نہ کریں اور بے تحاشا خرچ کر کے ضائع نہ کریں بلکہ مستقبل میں آنے والے قحط کے سات سالوں کے لئے غلّہ بچا کر رکھیں۔ اس واقعہ میں یہ دلیل ہے کہ مستقبل کے لئے مال کو بچا کر رکھنا از روئے مصلحت ضروری ہے اور بناوٹی صوفیوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ صبح کھا لو تو شام کے لئے بچا کر نہ رکھو' جس نے صبح کھانے کو دیا ہے' شام کو بھی وہی دے گا۔ نیز اس میں یہ بھی دلیل ہے کہ قومی ضرورت کے وقت ذخیرہ اندوزی جائز ہے۔ منع اِس صورت میں ہے جب لوگ بھوکے مر رہے ہوں اور تاجر اپنا نفع بڑھانے کے لئے غلّہ کو گوداموں میں چھپا کر رکھیں اور بازار میں فروخت کے لئے نہ لائیں۔

سورۃُ الانعام کی آیت ۱۳۶ میں مویشیوں اور بیج کی پیداوار میں اللہ کے حصّے کو علیحدہ کر دینے کا ذکر ہے جو ذخیرہ (سٹور) کرنے کا حوالہ بھی ہوسکتا ہے :۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ○

"اور اُن لوگوں نے کھیتی اور مویشیوں میں سے جو اللہ ہی نے پیدا کئے ہیں کچھ حصّہ اللہ کا مقرر کر رکھا ہے اور اپنے خیال کے مطابق کہتے ہیں کہ یہ (حصّہ) اللہ کا ہے اور یہ (حصّہ) ہمارے دیوتاؤں کا اور پھر جو حصّہ اُن کے دیوتاؤں کے لئے ہوتا ہے وہ تو اللہ کی طرف پہنچتا نہیں اور جو حصّہ اللہ کا ہوتا ہے' وہ اُن کے دیوتاؤں کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ کیسی بری ہے اُن کی تجویز!" (سورۃُ الانعام : آیت ۱۳۶)

کفار کی مختلف جہالتوں میں سے ایک جہالت یہ بھی تھی کہ وہ اپنی زرعی پیداوار اور مویشیوں میں سے کچھ حصّہ اللہ تعالیٰ کے لئے اور کچھ حصّہ اپنے بتوں کے لئے مخصوص کر دیتے اور اپنے زعمِ فاسد کے مطابق کہتے کہ یہ حصّہ اللہ کا ہے اور یہ بتوں کا ہے۔ یہ اُن کا محض جھوٹ تھا اس لئے کہ اُنہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کے دو حصّے کئے: ایک اللہ کا اور ایک بتوں کا حالانکہ سب کچھ اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے اور سب اُسی کی ملکیت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو حصّہ اُن کے شرکاء کے لئے ہے وہ اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو حصّہ اللہ کے لئے ہے وہ اُن کے شرکاء کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ حسن نے کہا کہ اگر بتوں کے لئے رکھے ہوئے حصّہ میں سے کوئی چیز خراب ہو جاتی تو اُس کے بدلہ میں اللہ کے حصّہ میں سے اُتنی چیز اٹھا کر بتوں کے حصّہ میں رکھ دیتے اور اگر اللہ کے رکھے ہوئے حصّہ میں سے کوئی چیز خراب ہو جاتی تو اُس کے بدلہ میں بتوں کے حصّہ میں سے کوئی چیز نہ اٹھاتے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ لوگ کیسا برا فیصلہ کرتے ہیں! اِس فیصلہ کے برے ہونے کی یہ وجوہ ہیں :۔

(۱) پھلوں اور غلّہ کی حفاظت میں اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حصّہ پر بتوں کے حصّہ کو ترجیح دی۔

(۲) اُنہوں نے از خود کچھ حصّہ بتوں کے لئے اور کچھ اللہ کے لئے مخصوص کیا جبکہ سب اللہ کا پیدا کیا ہوا تھا۔

(۳) حصّوں کی یہ تقسیم اُنہوں نے بغیر کسی عقلی اور شرعی دلیل کے کی جو سرا سر اُن کی جہالت ہے۔
(۴) پھلوں اور مویشیوں کی پیدائش میں بتوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے تو پھر بتوں کے لئے پھلوں اور مویشیوں میں سے حصّہ رکھنا اور اُس کی حفاظت کرنا محض اُن کی جہالت ہے۔
(تبیان القرآن جلد۳' ص ۶۶۱' از علامہ غلام رسول سعیدی)

(۱۸) مویشیوں کو چرنے کے لئے چراگاہ میں چھوڑنا: زمین میں چراگاہیں (مَرْعٰی) اللہ نے مویشیوں کے چرنے کے لئے بنائیں:۔

(i) هُوَالَّذِیْ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ٥ (النحل : ۱۰)
''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی برسایا جس سے تمہیں پینے کو ملتا ہے اور اُسی سے سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم مویشی چراتے ہو۔''

شَجَر کے عموم میں پودے' درخت' جھاڑیاں' گھاس سب داخل ہیں۔ یہاں مراد چراگاہیں ہیں (کشاف)

(ii) أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَا بِهٖ أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ٥ كُلُوْا وَارْعَوْا أَنْعَامَكُمْ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي النُّهٰى ٥ (طٰهٰ : ۵۳' ۵۴)
''اُس نے آسمان سے پانی اتارا' پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف قسم کے طرح طرح کے نباتات پیدا کئے۔ کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو چراؤ' بے شک اِس (سارے نظام) میں اہلِ عقل کے لئے دلیلیں موجود ہیں۔''

(iii) فَأَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ٥ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ٥ وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ٥ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ٥ وَّفَاكِهَةً وَّأَبًّا ٥ (عبس: ۲۷۔۳۲)
''پھر ہم نے اس میں اگایا غلّہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارے۔''

(iv) سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ٥ ---- ٥ وَالَّذِیْ أَخْرَجَ الْمَرْعٰى ٥ (الاعلیٰ : ۱' ۴)
''(اے محبوب!) آپ تسبیح کیجئے اپنے عالیشان پروردگار کے نام کی۔۔۔۔ جس نے چارہ (زمین سے) نکالا۔''

جنت کی طویل تعریف میں مُدْهَآمَّتٰنِ کا لفظ ایک دفعہ سورہ الرحمن کی آیت ۶۴ میں آیا ہے' جس کے معنی ہیں پانی سے بھرے دو انتہائی گھنے باغ۔ اِس دنیا میں کاشت کئے گئے باغوں کے لئے یہ اصطلاح عموماً استعمال نہیں کی جاتی تھی۔

(۱۹) پودوں کی افزائش اور توالد وتناسل : کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے:۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (البقرۃ : ۲۶۱)

''اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں' اُس دانے کی سی ہے جو سات بالیاں اگاتی ہے' ہر ہر بالی کے اندر سَو دانے ہوں۔'' *

(۲۰) عملِ زیرگی (POLLINATION): ہواؤں کا نر درختوں کے زردانوں کو لے کر مادہ درختوں کے گابھوں میں منتقل کرنا عملِ زیرگی کہلاتا ہے جس کے بعد باروری (fertilization) کا عمل شروع ہو جاتا ہے' جس کے نتیجے میں باغوں اور کھیتوں میں درختوں کی ٹہنیاں رنگ برنگ خوش ذائقہ پھلوں سے لد جاتی ہیں۔ حیاتیاتی دنیا میں زیرگی کے عمل کے بارے میں کچھ قرآنی اشارے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:۔

(i) وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ (الحجر : ۲۲)

''اور ہم ہواؤں کو باردار بنا کر بھیجتے ہیں۔''

قرآن پاک نے جدید سائنسی تحقیق سے پہلے ہی پردہ اٹھا دیا تھا کہ نر مادہ کا وجود صرف جاندار مخلوق میں ہی نہیں بلکہ ہر قسم کی نباتات کی افزائشِ نسل کے لئے یہی طریقہ مقرر کیا ہوا ہے :۔

(ii) وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍo (الحج : ۵)

''اور تو زمین کو خشک دیکھتا ہے پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اگاتی ہے۔''

(iii) اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍo (الشُّعراء : ۷)

''کیا اُنہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اُس میں کس قدر عمدہ قسم کی بوٹیاں اُگائی ہیں۔''

(iv) وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍo (لُقمٰن : ۱۰)

''اور ہم نے آسمان سے پانی برسایا پھر اُس (زمین) میں ہر طرح کی عمدہ اقسام کی نباتات اُگائی۔''

صرف یہی نہیں بلکہ چٹانوں' معدنی پتھر اور بجلی میں بھی نر اور مادہ کا وجود کارفرما ہے۔

(۲۱) دریا (نہریں)' بند اور چشمے :

(i) وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَo (ابراهیم : ۳۲)

''اور اُس نے تمہارے (فائدہ کے لئے) دریاؤں کو مسخر کر دیا۔''

* تشریح کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۳۵ مع ذیلی حاشیہ (Footnote)؛ زراعت کی اہمیت کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۰۸ تا ۱۱۱۔

یعنی تا کہ تم دریاؤں کے پانی اپنی ہر انفرادی واجتماعی تمدنی ضرورت کے کام میں لاؤ‘ کشتیاں چلاؤ‘ آبپاشی کرو‘ اُن سے نہریں کاٹو‘ پن چکیاں چلاؤ‘ بجلی پیدا کرو وغیرہ وغیرہ۔

(ii) وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ (اَلنَّحل : ۱۴)

''اور وہ وہی اللہ ہے جس نے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے۔''

یعنی دریا اور سمندر بھی اُسی کے قانونِ تکوینی کے محکوم ومسخر ہیں۔ عربی میں بَحْر کا مفہوم وسیع ہے۔ سمندر اور دریا دونوں اس کے تحت میں آجاتے ہیں۔

(iii) فَأَعْرَضُوْا فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ سَيْلَ الْعَرِمِ وَبَدَّلْنَاهُمْ بِجَنَّتَيْهِمْ جَنَّتَيْنِ ذَوَاتَيْ أُكُلٍ خَمْطٍ وَّأَثْلٍ وَّشَيْءٍ مِّنْ سِدْرٍ قَلِيْلٍo (سَبا : ۱۶)

''سو انہوں نے سرتابی کی تو ہم نے اُن پر بند کا سیلاب چھوڑ دیا اور ہم نے اُن کے دو رویہ باغوں کے عوض دو باغ اور دئے جو بدمزہ پھل‘ جھاڑ جھنکار اور قدرے قلیل بیری والے تھے۔''

سدِّ مآرب ایک مشہور تاریخی بند ہے جو پہاڑوں کے پانی کے ذخیرہ کے لئے بنایا گیا تھا۔ مآرب ملکِ سبا کا دارالسلطنت تھا جو موجودہ شہر صنعاء سے کوئی ساٹھ میل مشرق میں اور سطحِ سمندر سے کوئی ۳۹۰۰ فٹ بلند تھا۔ اس کا طول ۱۵۰ فٹ اور عرض ۵۰ فٹ تھا۔ قومِ سبا ایک بڑی متمدّن قوم تھی۔ اس کا یہ کئی میل لمبا چوڑا بندسبا کے انجینیروں کی کاریگری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ یہ عظیم الشان بند ظہورِ اسلام سے قبل تخمیناً ۵۴۲ عیسوی میں ٹوٹا*۔ اس کی تباہ کاریوں کے آثار صدیوں بعد تک قائم رہے چنانچہ ایک سیاح نے ۸۴۸ء میں اُن کا معائنہ کیا۔ (تفسیر ماجدی اردو‘ ص۸۶۲)

''آنحضرت ﷺ کے سالِ ولادت میں مکّہ مکرّمہ کے خلاف ابرہہ کی مہم کی ناکامی کے بعد ایرانی فوجوں نے ملکِ سبا پر قبضہ کرلیا جو ۳۸ سال تک رہا۔ ۶۲۸ء میں چوتھے ایرانی وائسرائے باذان نے اسلام قبول کر کے سَبا کا علاقہ آنحضرت ﷺ کے سپرد کردیا اور اُس زمانہ سے لے کر آج تک مآرب میں اللہ ہی کا نام لیا جاتا ہے۔ یہاں کے قدیم دیوتاؤں کو لوگ بھول گئے اور اُن کے معبد ویران ہو گئے جن میں سے بیشتر ریت سے پٹے پڑے ہیں جو ہر جگہ پھیل چکی ہے۔'' (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ‘ ج ۱۸‘ ص ۲۲۸‘ دانش گاہ پنجاب لاہور ۱۹۸۵ء)

(iv) وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِo (يٰس : ۳۴)

''اور ہم نے اُس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اُس میں چشمے جاری کردئے۔''

---

*Concise Encyclopaedia of Islam میں اس کے ٹوٹنے کی تاریخ ۵۸۰ء دی گئی ہے۔

(۷) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهٗ (الزُّمَر : ۲۱)

''کیا تو نے اِس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر اُسے زمین کے چشموں سے جاری کر دیا پھر اُس کے ذریعے وہ فصلیں اُگاتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں۔''

اَلسَّمَآء کی وسعتِ مفہوم کا کوئی لفظ اردو میں موجود نہیں۔ بارش کے سلسلہ میں جہاں جہاں یہ لفظ قرآن میں آیا ہے، وہاں بادل کے معنی بلا تکلف لئے جا سکتے ہیں۔ عربی میں سَمَآء ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے اوپر واقع ہو، یہاں تک کہ مکان کی چھت بھی۔ (تفسیر ماجدی اردو، ص ۹۲۲)

(۲۲) بنی نوع انسان کا رشتہ زمین سے: اِس باب میں دی گئی تمام قرآنی آیات بنی نوع انسان کے زمین کے ساتھ نمایاں رشتے کے فلسفے کو ظاہر کرتی ہیں۔

(۲۳) زمینی سائنس (زمین اور پانی کا باہمی تعلق):

(i) وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰى إِذَا أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَأَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (الاعراف : ۵۷)

''اور وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے قبل بطور خوشخبری کے بھیجتا ہے چنانچہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادل کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک بستی کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے پانی نازل کرتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم (اس سے) نصیحت حاصل کرو۔''

(ii) وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ (الحجر : ۲۲)

''اور ہم پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ پھر ہم ہی آسمان سے بارش برساتے ہیں، پھر وہی پانی ہم تمہیں پلاتے ہیں۔''

(iii) وَاللّٰهُ الَّذِيْ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ إِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَحْيَيْنَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝ (فاطر : ۹)

''اور اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادل کو اٹھاتی ہیں پھر ہم اُسے خشک خطۂ زمین کی

طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر ہم اس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی خشکی کے بعد سرسبز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح جی اٹھنا ہوگا۔"

(۲۴) زمین کی اقسام:

وَالْبَلَدُالطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُه‘ بِاِذْنِ رَبِّه وَالَّذِىْ خَبُثَ لَايَخْرُجُ اِلَّانَكِدًا (الاعراف : ۵۸)
"اور ستھری بستی میں پیداوار اُس کے پروردگار کے حکم سے (خوب) نکلتی ہے اور جو (بستی) خراب ہے' اُس کی پیداوار نکلتی بھی ہے تو بہت کم۔"

اس کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ (۱) یہ ایسے شخص کی مثال ہے جس پر وعظ ونصیحت اثر کرتے ہیں اور ایسے کی بھی جس پر اُن کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ (۲) جس طرح بارش برسنے سے اچھی زمین رشکِ جناں بن جاتی ہے اور ردّی اور شور یلی زمین میں تھور اور سیم کا اضافہ ہو جاتا ہے اور خاردار جھاڑیاں اُگ آتی ہیں' اسی طرح نبوّت کے فیضِ تربیت سے اچھی استعداد والے فائدہ اٹھا کر صدّیقیت وفاروقیت کے مناصبِ رفیعہ پر فائز ہو جاتے ہیں جبکہ بدطینت اور خبیث فطرت اس ابرِ کرم کی برکت سے محروم رہتے ہیں اور اُن کی شر پسندی' خبثِ باطن جو مصلحت اور فریب کے نقابوں میں چھپا ہوتا ہے بے نقاب ہو جاتا ہے اور اُن کی اخلاقی پستی اور گندی ذہنیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(۲۵) زمین دوز آبپاشی کا نظام:

قرآن مجید میں اکثر مقامات پر جنّت "تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" (ایسے باغات جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں) کا ذکر ہے مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵؛ سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۹۵' ۱۹۸ ؛ سورہ النّساء کی آیت ۱۳ ؛ سورہ المائدہ کی آیت ۱۲ ؛سورۃ التّوبۃ کی آیات ۷۲' ۸۹' ۱۰۰ ؛ سورۃ الرّعد کی آیت ۳۵ ؛سورۃ الحدید کی آیت ۱۲ ؛ سورۃ المجادلۃ کی آیت ۲۲ ؛ سورۃ التّغابن کی آیت ۹ اورسورۃ البیّنۃ کی آیت ۸ وغیرہ سے یوں لگتا ہے کہ یہ تمام حوالہ جات کسی زیرِ زمیں نظامِ آبپاشی سے متعلق ہیں۔

(۲۶) دانوں کو بھوسہ سے الگ کرنا:

(ہوا کا چلنا کہ دانے بھوسے سے الگ ہو جائیں)

لِيَاْكُلُوْامِنْ ثَمَرِه وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ (یٰسٓ : ۳۵)
"تاکہ لوگ اس (باغ) کے پھلوں سے کھائیں اور اُسے بھی جو اُن کے ہاتھ بناتے ہیں۔"

"جو اُن کے ہاتھ بناتے ہیں" میں اشارہ دانے کو بھوسہ سے الگ کرنا لیا جاسکتا ہے۔

(۲۶) زمین کی حیات پذیری کا راز: اِس ضمن میں سورہ یٰسٓ کی آیت ۳۳ ہماری رہنما ہے :

وَآيَةٌ لَّهُمُ الْأَرْضُ الْمَيْتَةُ أَحْيَيْنَاهَا وَأَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَأْكُلُونَ ۝

''اور اُن لوگوں کے لئے ایک نشانی مُردہ زمین ہے' ہم نے اُسے زندہ کیا اور اُس میں سے غلّے نکالے' سو اُن میں سے لوگ کھاتے ہیں ۔''

گندم بہترین اناج ہے' نصف دنیا کی بنیادی غذا ہے' اس کا مزاج گرم درجہ اول اور مائل بہ اعتدال ہے' گندم خون اور گوشت پیدا کرتی ہے' ہڈیاں بناتی ہے' قبض دُور کرتی ہے اور جسم کو فربہ بناتی ہے ۔ اس میں ۹۰ ۔ ۶۰ فیصد نشاستہ ہوتا ہے (اس لئے ذیابیطس کے مریضوں کے لئے مضر ہے) ۔ اس کے غذائی اور کیمیاوی اجزاء کی تفصیل حسبِ ذیل ہے :۔

سو گرام آٹا جس سے میدہ اور سوجی وغیرہ نہ نکالی گئی ہو' اس میں ۳۱۸ حرارے' ۲. ۱۳ گرام پروٹین' ۲ گرام چکنائی' ۶. ۹ گرام ریشہ' ۳۵ ملی گرام کیلشیم' ۳۵ ملی گرام کیلشیم' ۴ ملی گرام فولاد' ۳۴۰ ملی گرام فاسفورس' ۴۶. وٹامن ب' ۸. ملی گرام وٹامن ب۲' ۵۰. ملی گرام ب۶' ایک ملی گرام وٹامن ای ہوتا ہے ۔

دماغ کی طاقت کے لئے فاسفورس اور گلوکوز بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور سب سے زیادہ فاسفورس اور گلوکوز گندم سے حاصل ہوتا ہے' اس لئے دماغ کی توانائی کے لئے گندم سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں ہے اور یہ سب چیزوں سے ارزاں اور سہل الحصول ہے ۔ گندم کے یہ فوائد اُس وقت حاصل ہوتے ہیں جب اُس سے بھوسی نہ نکالی جائے' اسی لئے رسول اللہ ﷺ اَن چھنے آٹے کی روٹی تناول فرماتے تھے ۔ (تبیان القرآن' ج ۹' ص ۷۵۹ ۔ ۔ ۔ مولانا غلام رسول سعیدی)

روٹی کی تعظیم و تکریم کے متعلق احادیث : (۱) عبداللہ بن بُریدہ اپنے والد رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ روٹی کی تعظیم کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے آسمان کی برکتوں سے نازل فرمایا ہے اور اُسے زمین کی برکتوں سے نکالا ہے ۔ (الجامع الصغیر: ۱۴۲۵)

(۲) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ میں نے اپنی والدہ فاطمہ بنتِ رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی خراب جگہ سے کوئی لقمہ یا روٹی کا ٹکڑا اٹھایا اور اُس سے گندگی کو دُور کیا اور اُسے اچھی طرح صاف کر کے اُسے کھالیا تو اُس کے پیٹ میں پہنچنے سے پہلے اللہ تعالیٰ اُس کی مغفرت فرما دے گا (مسند ابویعلیٰ : ۶۷۵۰ ؛ مجمع الزوائد ج ۵' ص ۳۴)

(۳) امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن حرام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جس نے دستر خوان پر گرے ہوئے روٹی کے ٹکڑے کو کھالیا تو اس کی مغفرت کردی جائے گی۔ (الجامع الصغیر: ۱۴۱۶)

اِس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے صغیرہ گناہ معاف ہو جائیں گے کیونکہ کبیرہ گناہ صرف توبہ یا شفاعت یا اللہ کے فضلِ محض سے معاف ہوں گے۔ (فیض القدیر' ج ۳' ص ۱۲۹۹ مع التوضیح مکتبہ نزار مصطفی الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ)

(۴) روٹی کی تکریم میں سے یہ بھی ہے کہ اُس کے اوپر کوئی نامناسب چیز نہ رکھی جائے۔ سفیان ثوری رضی اللہ عنہ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں کہ روٹی پیالہ کے نیچے رکھی جائے (سنن الترمذی ج ۳' ص ۴۲۶' بیروت)

(۵) روٹی کی تکریم میں سے یہ بھی ہے کہ آٹا چھانے بغیر روٹی پکائی جائے۔

(۶) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ ایک عابد کے دوست کے پاس چند روٹیاں لائی گئیں۔ وہ اُنہیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اُن میں سے جو سب سے اچھی روٹی ہو' اُسے نکال کر کھالے۔ عابد نے اُسے کہا یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ جس روٹی سے تم نے اِعراض کیا ہے اُس میں کتنی حکمتیں ہیں اور اس روٹی کو وجود میں لانے میں کتنی چیزوں کے عمل کا دخل ہے: اس روٹی کے حصول کے لئے اللہ نے بادلوں سے پانی اتارا' زمین کو سیراب کیا' زمین میں بیج ڈالا گیا' پھر اس سے غلّہ پیدا ہوا' زمین میں معدنیات رکھی گئیں' ان سے لوہا نکالا گیا' اُس لوہے سے مشینیں بنائی گئیں' اُن مشینوں میں اس غلّہ کو پیسا گیا اور درختوں' کوئلوں اور لکڑی سے ایندھن تیار کیا گیا' پھر اُس آٹے کی روٹی پکائی گئی تو سوچو کہ اس ایک روٹی کے حصول کے لئے اللہ نے کتنی چیزیں پیدا کیں۔ یہ زمین' آسمان' ہوائیں' سورج کی حرارت' چاند کی کرنیں' دریاؤں کا پانی سب اِس روٹی کو تم تک پہنچانے کے لئے اپنا رول ادا کر رہے ہیں۔ (تبیان القرآن' ج ۹' ص ۷۵۸)

(۷) امام مالک بن اَنس رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ اُنہیں یہ حدیث پہنچی ہے کہ حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام فرماتے تھے: اے بنی اسرائیل! تم تازہ پانی اور خشکی کی سبزیاں اور جَو کی روٹی کھایا کرو اور گندم کی روٹی سے اجتناب کرو کیونکہ تم اُس کا شکر ادا نہیں کر سکتے۔ (مؤطا امام مالک: ۱۷۷۹)

''زندگی کے رواں دواں رہنے کے اصول کو آیت ۳۳ مذکورہ کے دوسرے حصّے میں بیان کیا گیا ہے کہ زمین پر زندگی کے آغاز کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے پودوں کی تخلیق کی جو بنیادی ساخت کے مواد کے حامل ہیں

کچھ مؤلّف کے بارے میں

خالقِ کون و مکاں نے اس رنگیلی کائنات کے دولھا حضرتِ انسان کو دیگر نعمتوں کے علاوہ سوجھ بوجھ، عقل و فہم، دانش و فراست اور بصیرت بھی عطا کیں اور اِس عطا میں اپنی ایک خاص حکمت کو برقرار رکھا یعنی کسی پر کم اور کسی پر زیادہ فیضان ہوا۔

اکثریت ہم جیسے عام لوگوں کی ہے لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کے کچھ نیک بندے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ کی عنایتِ خاص کی وجہ سے اُن کی ظاہری آنکھوں کے علاوہ اُن کی قلبی آنکھیں بھی کھلی ہوتی ہیں جن کی بدولت وہ روحانیت کے میدان میں بہت آگے بڑھ جاتے ہیں اور دوسروں سے سبقت لے جاتے ہیں۔ ربِّ ذوالجلال والاکرام لوگوں کے قلوب واذہان کو بھی کم یا زیادہ قلبی بصیرت عطا فرماتا ہے جس سے اُن کے عرفانِ حق میں اضافہ ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہر چھوٹی بڑی بُرائی سے نفرت اور ہر چھوٹی بڑی نیکی سے والہانہ محبت اُن کی نہاد میں رس بس جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنی وجدانی سپرٹ (Intuitive Spirit) اور بہترین فراست کی بدولت اپنے ابنائے جنس کی راہ نمائی کے لئے ہراول دستے کا کام کرتے ہیں۔ عام عقل و فہم رکھنے والے لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں بھی اِن خداداد صلاحیتوں کے حامل ہستیوں کے شاملِ حال رہتی ہیں۔ میری مراد ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' کے مؤلّف جناب پروفیسر حافظ اشفاق احمد خان کی ذات سے ہے۔

گوشۂ خمولت (گم نامی) میں شاداں و فرحاں، سادگی پسند، خوش اَخلاق و خوش طبع، خوش شکل و خوش سیرت، اعلیٰ خاندانی شرافت و نجابت کے حامل جناب پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلّف انسائیکلوپیڈیا) سے میرے ذاتی مراسم گیارہ سال قبل اُس وقت شروع ہوئے جب میں اُنہیں سننے کے لئے گاہے گاہے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ذکر کی مجلسوں، جمعہ کے خطابات اور نمازِ تراویح کے بعد درسِ قرآن کی رُوح پرور محافل میں حاضر ہوتا اور اپنی جھولی کو ایمان و ایقان کی طراوت و تازگی سے بھر کر اُٹھتا۔

پروفیسر موصوف 1939ء کے اوائل میں ملتان کے ایک معزز و نجیب بلوچ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ خوش بختی یہ کہ ساڑھے آٹھ برس کی عمر میں اُنہوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور نو برس کی عمر میں اپنے ہونے والے سسر اور ماموں جناب حافظ محمد اسلم خان مرحوم جو ملتان کے جانے پہچانے، چوٹی کے وکلاء میں سے تھے، کی راہ نمائی میں پہلا مصلّیٰ سنایا۔ اللہ سبحانہ، وتعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس وقت سے لے کر تا حال (بہتّر تہتّر برس کی عمر تک) بلا ناغہ وہ محض رضائے الٰہی کی خاطر تراویح پڑھاتے چلے آ رہے ہیں جس میں کوئی مالی طمع یا مادّی منفعت نام کو نہیں ہوتے جو ایک ایسی صفت ہے جو آج کے مادّی دَور میں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اُن کے والدِ محترم اور نانا جانِ مکرّم ۔۔ رحمت اللہ خان ۔۔ جو ہم نام تھے، دونوں ملتان کے سربر آوردہ مشیرانِ قانون تھے۔

اور جو دوسری نامیاتی زندگی کے لئے ضروری ہیں۔"

("The Holy Koran and the Facts of Science" ... Dr. Haluk Nurbaki, p. 91)

قرآنِ حکیم میں چند مفید زرعی نکات

: (۱) سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا :

(۱) وَ مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَیْنِ فَاِنْ لَّمْ یُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ (البقرۃ:۲۶۵)

"اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں اور اس لئے تاکہ اُن کے دل پختہ ہو جائیں، اُس باغ جیسی ہے جو ایک بلند زمین پر ہو، اُس پر زور کا مینہ برسا ہو تو وہ باغ دوگنا پھل لایا ہو اور اگر اس پر بارش نہ بھی برسے تو شبنم ہی کافی ہو جائے۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے قرآن مجید نے ایک تشبیہ کے ذریعے ایک بہت ہی نازک اور مفید زرعی نکتہ بیان کیا ہے جس کے تحت زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ نکتہ یہ ہے کہ بلند سطح پر واقع زمینیں میدانی علاقوں میں واقع زمینوں کی نسبت زیادہ زرخیز ہوتی ہیں لہٰذا اُن کی پیداوار نسبتاً بہت زیادہ ہوتی ہے اور اُن کی کوالٹی بھی بہت بہتر ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے لفظ رَبْوَۃ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سطح اتنی بلند ہو کہ اُسے پانی بھی نہ ملے بلکہ مطلب یہ ہے کہ زمین ڈھلوان یا اُتران کی طرف نہ ہو جہاں نالیاں گرتی ہوں کہ جس سے پوری زمین بری طرح آلودہ اور سیم زدہ ہو جائے۔ رَبْوَۃ کا مطلب اعلیٰ درجہ کی ایسی ہموار زمین ہے جو دریا کے سیلابوں اور شہر کے گندے پانیوں سے محفوظ رہے جس کے درخت خوشنما اور پھل لذیذ و بکثرت ہوں۔ نمی کی زیادتی کی بناء پر دوسری زمینوں سے حاصل شدہ پیداوار غیر معیاری اور غیر صحتمند ہوتی ہے۔ (تفسیر نعیمی، ج ۳، ص ۶۰)

(۲) فضائی اثرات زمینی پیداوار میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر فضائی ماحول زمین کی زرخیزی سے ہم آہنگ ہے تو زمین کی پیداوار، مقدار اور کوالٹی دونوں لحاظ سے بہت اچھی ہوگی ورنہ نتیجہ اس کے برعکس ہوگا۔ اس حقیقت کو سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیا گیا ہے:۔

اَیَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهٗ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّیَّةٌ ضُعَفَآءُ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِیْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ۠ (البقرۃ: ۲۶۶)

"کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں (اور) اُس کے ہاں اُس باغ میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اُس کا بڑھاپا آ چکا ہو اور اس کے

بچے کمزور و ناتواں ہوں۔ اس (باغ) پر ایک آتشیں بگولہ آئے تو وہ (باغ) جل جائے؟ اس طرح اللہ تمہارے لئے نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر سے کام لو۔"

آیت کے الفاظ اِعْصَار" فِیْہِ نار" (آتشیں بگولہ) میں فضائی اثرات کا تصور موجود ہے۔

(۳) زمینی پیداوار کا تمام تر انحصار بارش پر ہوتا ہے۔ اِس حقیقت کو سورۃ الاعراف کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے :۔

وَ هُوَالَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًابَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓی اِذَآاَقَلَّتْ سَحَابًاثِقَالاً سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ٥ (الاعراف : ۵۷)

"اور وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے قبل بطور خوشخبری کے بھیجتا ہے چنانچہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادل کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک بستی کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے پانی نازل کرتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم (اس سے) نصیحت حاصل کرو۔"

"ہوائیں اچھی خبر کے نقیب کی طرح ہراول دستے کے طور پر اوپر جاتی ہیں جن کے پیچھے ہواؤں کی بہت ساری فوجیں بھاری بادلوں کو اپنے آگے دھکیلتے ہوئے لا رہی ہوتی ہیں۔ اللہ ان سب کا سپہ سالار ہوتا ہے جو اُنہیں خشک علاقے کی طرف بھیجتا ہے جس پر اللہ کی رحمت کے بادل اپنی خوش کُن برساتی بوچھاڑ کرتے ہیں اور اس طرح وہ مردہ زمین کو زندہ، زرخیز اور خوشنما زمین میں بدل دیتے ہیں اور یوں بھرپور فصل ہوتی ہے۔"

آیت سے اخذ کردہ نکات :(ا) اگرچہ کنوؤں، دریاؤں اور جھیلوں سے حاصل شدہ پانی زمینی پیداوار حاصل کرنے میں معاون ضرور ہوتا ہے لیکن بارش کا پانی اُس کے لئے شرطِ لازم ہے۔ یہ بات بالعموم مشاہدے میں آئی ہے کہ زمینی پانی سے چراگاہیں اور کھیت تازہ اور سرسبز رہتے ہیں اور خشک اور خزاں رسیدہ نہیں ہوتے لیکن اِس کے باوجود وہ نہ تو پھلتے پھولتے ہیں اور نہ ہی خاطر خواہ پیداوار دیتے ہیں۔ حقیقت بہرحال یہی ہے کہ جھیلوں، نہروں اور دریاؤں میں پانی بارش ہی سے آتا ہے اور اگر بارشیں نہ ہوں تو ایک سال بعد دریا اور جھیلیں خشک ہو کے رہ جاتے ہیں۔

(۲) اچھی پیداوار حاصل کرنے کے لئے صرف بارش، بیج اور عمدہ بُوائی ہی کافی نہیں ہوتے کیونکہ یہ تو

پیداوار حاصل کرنے کا محض ذریعہ ہیں۔ اصل میں تو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ آدمی کو پیداوار کی بہتری کے لئے بھرپور کوشش کرنی چاہئے لیکن وہ نظر مسبب الاسباب پر رکھے۔ یہ نکتہ فَأَنْزَلْنَا کے بعد فَأَخْرَجْنَا فرمانے سے حاصل ہوا۔

(۳) ہوا خود بادل نہیں بن جاتی بلکہ سمندر کا پانی بھاپ بن کر طبقہ زمہریر میں پہنچتا ہے پھر ہواؤں کے ذریعے وہ دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے۔ یہ نکتہ أَقَلَّتْ سَحَابًا سے حاصل ہوا۔

(۴) بھاپ میں وزن ہے کیونکہ بادل جمی ہوئی بھاپ ہی تو ہے جسے قرآن مجید نے بھاری فرمایا۔ یہ نکتہ سَحَابًا ثِقَالًا سے حاصل ہوا۔

(۵) ہر چیز کی موت اور زندگی علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جسم کی موت بے جان ہونا اور اُس کی زندگی جاندار ہونا ہے۔ روح کی موت بے ایمان ہونا اور اُس کی زندگی ایمان والا ہونا ہے۔ دل کی موت غفلت اور اُس کی زندگی بیداری ہے۔ زمین کی موت خشکی اور اُس کی زندگی روئیدگی اور سرسبز ہونا ہے۔

(۶) علمِ زراعت سے آخرت پر ایمان قوی اور مضبوط ہوتا ہے اور اپنے محاسبے کا ڈر رہتا ہے۔ یہ نکتہ کَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى (اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے) سے حاصل ہوا۔

(۶) قیاس برحق ہے یعنی دیکھی ہوئی چیز کے حالات دیکھ کر اَن دیکھی چیز کے حالات معلوم کرنا بالکل درست ہے۔ بارش اور اُس کے نتیجے ہماری دیکھی چیزیں ہیں لیکن قیامت اور وہاں کے حالات اَن دیکھے ہیں۔ بارش کے ذریعے قیامت کا پتہ لگانے کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا مجتہدین علماء کا شرعی قیاس بھی برحق ہے۔

ایک ضروری نوٹ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بادل بھاری اور بوجھل ہوتے ہیں مگر ہوائی جہاز بادل میں سے گزر جاتے ہیں اور اُنہیں کوئی بوجھ محسوس نہیں ہوتا تو اِس کا جواب یہ ہے کہ بوجھ ہونا اور ہے اور اُس کا محسوس ہونا اور ہے۔ بارش کے پانی کا وزن کریں تو اُس کا بوجھ صاف ثابت ہو جائے گا۔ پانی کے حوض میں بیٹھنے سے پانی کا وزن قطعاً محسوس نہ ہوگا لیکن اگر وہی پانی گھڑا بھر کر سر پر رکھ لیں تو بوجھ ضرور محسوس ہوگا۔ آج سائنس نے بتایا کہ ہوا میں بوجھ ہے۔ ہمارے سر پر ہزاروں من ہوا لدی ہوئی ہے جسے ہم اُٹھائے پھرتے ہیں مگر ہمیں بوجھ محسوس نہیں ہوتا کیونکہ ہم ہوا کے اندر رہتے ہیں۔ اگر ٹیوب اور ٹائر میں ہوا بھر کر وزن کریں تو یقیناً بوجھ معلوم ہوگا۔ یہی مثال ہوائی جہاز کے بادلوں میں سے گزرنے کی ہے۔

(۴) بارش زمین اور بیج کو بارآور کرتی ہے جس سے قسما قسم کی پیداوار حاصل ہوتی ہے۔ فصل پکنے پر کاٹی جاتی ہے جس پر انسانی اور حیواناتی زندگی قائم ہے۔ پودے خزاں رسیدہ ہو کر خشک ہو جاتے ہیں اور چورا چورا ہو جاتے ہیں۔ آنے والے دوسرے موسم میں اسی طرح یہ چکر جاری رہتا ہے۔ یہ تمام گردشی سلسلہ اہلِ عقل و دانش کے لئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا منہ بولتا ثبوت ہے جس کے متعلق قرآنِ حکیم نے فرمایا:۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَلَكَهُ يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ٥ (الزُّمَر : ۲۱)

" کیا تو نے اِس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر اُسے زمین کے چشموں سے جاری کر دیا پھر اُس کے ذریعے وہ فصلیں اُگاتا ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں' پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے' سو تو اُسے زرد دیکھتا ہے' پھر وہ اُسے چورا چورا کر دیتا ہے۔ اِس (نمونۂ قدرت) میں اہلِ عقل و دانش کے لئے بڑی (سبق آموز) نصیحت ہے۔"

آیت کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو چاہئے کہ وہ اپنے حال کو زمین کی پیداوار کے حال پر قیاس کرے کہ حیاتِ انسانی کے آغاز و انجام کا ایک کھلا ہوا نمونہ اُس میں مل جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اِس زمینی پیداوار کا انسان مشاہدہ کرتا رہتا ہے کہ بیج سے کیسے ایک ننھی سی کونپل نکلتی ہے' پھر وہ سرسبز پودا بن جاتی ہے' پھر اُس میں پھول کھلتے ہیں' پھر اُس میں غلّہ پکتا ہے اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ بالکل اِسی طرح انسان نُطفہ سے عَلَقہ (جما ہوا خون) اور مُضغَہ (گوشت کا ٹکڑا) بنتا ہے' پھر اللہ اس گوشت کو ہڈیاں پہناتا ہے' پھر اُس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ شکمِ مادر میں اس بچہ کو جَنِین کہتے ہیں' پیٹ سے باہر آنے پر وہ وَلِید کہلاتا ہے' دودھ پیتا ہو تو رَضِیع اور ٹھوس غذا کھانے لگے تو فَطِیم کہلاتا ہے۔ کھیلنے کودنے کی عمر میں صَبِی اور آٹھ نو سال کی عمر میں غُلام کہلاتا ہے۔ قریب البلوغ ہو تو مُراہِق ہوتا ہے۔ نوجوان کو فتٰی اور شابّ" کہتے ہیں۔ جوان رَجُل اور اَدھیڑ عمر کَہُول کہلاتا ہے۔ ۴۰ سال کی عمر کو پہنچنے پر شَیخ اور ساٹھ سال کے بعد شَیخ فانی کہلاتا ہے۔ جب عمرِ طبعی پوری کر کے مر جائے تو اُسے مَیّت کہتے ہیں۔

تو جس طرح زمین کی پیداوار وقفہ وقفہ سے بدلتی رہتی ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ مُردہ ہو جاتی ہے' یہی حال انسان کا ہے۔ وہ بھی ایک حال سے دوسرے حال کی طرف متغیر ہوتا رہتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ وہ مر جاتا ہے۔ سو جس طرح یہ زمین اور اُس کی پیداوار فانی ہے اسی طرح انسان بھی فانی ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہئے کہ وہ اِس فانی دنیا سے دل نہ لگائے ورنہ وہ بھی فنا کے گھاٹ اُتر جائے گا' بلکہ اُس ذات کے ساتھ دل لگائے جو باقی ہے تاکہ وہ بھی باقی رہے۔

زراعت اور جنگل بانی کا علم : حیاتیات کے علم نے زراعت اور جنگل بانی کو ترقی دینے میں مدد دی ہے جس کا نتیجہ پیداوار میں اضافہ اور بنی نوع انسان کی بہتر رہائش اور بہتر لباس کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ بیماریوں کے سدِّ باب اور صحت کی بہتری میں حیران کن ترقی ہوئی اور اِس ترقی سے انسان کو یہ بھی سبق ملا کہ اُس کا تعلق حیوانوں، پودوں اور ماحول سے کیسا ہونا چاہئے اور اِس تعلق میں بہتری کیسے پیدا کی جائے۔

روٹی، کپڑا اور مکان انسان کی بنیادی ضروریات ہیں جو پودوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ حاصل کئے جاتے ہیں۔ جب تک دنیا کی آبادی کم تھی، پودوں اور جانوروں سے حاصل شدہ قدرتی پیداوار سب کے لئے کافی تھی۔ لیکن جونہی آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہوا، انسانی فکر کو انتہائی مرغوب پودوں کی کاشت کرنے اور انتہائی پسندیدہ جانوروں کو پالنے کا شوق دامنگیر ہوا۔

علمِ حیاتیات کے استعمال نے فصلوں کی پیداوار بڑھانے اور پھلوں اور سبزیات کے معیار کو بہتر کرنے میں سائنسدانوں کی مدد کی ہے۔ پودوں کی افزائش کی تکنیکوں کے ذریعے گندم، چاول، اناج، گنا اور کپاس کی نئی نئی اَقسام معرضِ وجود میں آئی ہیں۔ کیلا، امرود، آم، سیب، آلوچہ اور ناشپاتی جیسے موجودہ قسما قسم کے درختوں اور ٹماٹر، گاجر، آلو اور کدو جیسی سبزیات کے معیار میں حیاتیات کے اصولوں کے استعمال سے بہتری ہوئی ہے۔ فصلوں پر حد درجہ تحقیق و تدقیق کے نتیجہ میں سورج مُکھی اور سویا بین جیسی تیل آور فصلیں ترقی پذیر ہوئی ہیں۔ علاوہ ازیں زراعت میں کھادوں کے استعمال کے بہتر علم، کاشتکاری کے بہتر طریقوں اور فصلوں کی گردش نے پیداوار کے اضافے میں مدد دی ہے۔

جنگل انسانی ماحولیات کا جزوِ لاینفک اور اٹوٹ انگ حصّہ ہوتے ہیں جو انسان اور کئی دوسرے حیوانات کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ جنگلی درختوں کے پھل کئی جانوروں کی خوراک کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جنگل ندیوں میں پانی کی روانی کو باقاعدگی بخشتے ہیں، زمینی فرسودگی کو روکتے ہیں اور ماحول کو خوشگوار بناتے ہیں۔ وہ عمارتی لکڑی، ایندھن کی لکڑی، دیگر مختلف ضروریات، آسائش و آرام اور انسانی خوشی ومسرت کے سامان مہیا کرتے ہیں۔ اونچے درجے کے بارانی علاقے (اوسطی بارانی علاقے سالانہ ۲۰ اِنچ یا اس سے زیادہ) درختوں کے اُگانے کے لئے موزوں ہوتے ہیں جو موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے زمین کی فرسودگی کو روکتے ہیں۔ علمِ حیاتیات کی ترقی نے اُن جنگلی درختوں کے اُگانے میں انسان کی مدد کی ہے جو علاقے کے موسمیاتی حالات کے موافق ہوتے ہیں۔ آنے والی نسلوں کے لئے غیر کاشت شدہ زمینوں پر جنگل لازماً اُگائے جانے چاہئیں تاکہ عمارتی لکڑی کی بکثرت فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔

زرعی اصلاحات اسلام کے تناظر میں : ذوالفقار علی بھٹو کے دَورِ حکومت میں جن زرعی اصلاحات کا نفاذ کیا گیا' اُن کے تحت زمین کی ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۵۰ ایکڑ مقرر کی گئی جس کا پُر تپاک خیر مقدم کیا گیا اور کچھ طبقوں کی جانب سے خوشی و مسرّت کا اظہار کیا گیا۔ اِن زرعی اصلاحات کا اعلان کرتے ہوئے بھٹو نے کہا تھا :

''ملکیت کی حد بندی کنبے کی بنیاد پر یا انفرادی بنیاد پر کئے جانے کے مسئلہ پر مکمل غور کیا گیا۔ چونکہ یہ مسئلہ اسلامی فقہ سے متعلق ہے' اس لئے ہم نے اس کے حل میں صحیح رہنمائی کے لئے ممتاز دینی علماء اور فقہاء سے رجوع کیا اور جو نتیجہ سامنے آیا وہ یہ ہے کہ اسلام چونکہ انفرادی حقوق کو تسلیم کرتا ہے اور عائلی ملکیت کے نظام کو تسلیم نہیں کرتا' لہٰذا بحیثیت مسلمان کے ہم کسی ایسے نظام کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رُجحانات کی مخالفت میں ہو۔ دریں حالات یہ اصلاحات افراد کی بنیاد پر کی جارہی ہیں' نہ کہ کنبے کی بنیاد پر۔'' (روزنامہ ڈان کراچی ۳ مارچ ۱۹۷۲)

جملہ ''ہم کسی ایسے نظام کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے جو اسلامی رُجحانات کی مخالفت میں ہو'' لائقِ تحسین ہے لیکن یہ بات ناقابلِ فہم ہے کہ وہ کون سے اربابِ اختیار تھے جنہوں نے متعلقہ اسلامی تقاضوں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے جاگیرداروڈیروں کے لئے عقبی دروازہ کھولا جس سے وہ حد بندی کے قانون سے صاف بچ کر نکل گئے۔

اصلاحات کا اعلان ہوا اور اُن کا نفاذ عمل میں لایا گیا لیکن ماضی کا یہ معرکۃ الآراء سوال ابھی تک جوں کا توں ہے کہ کیا یہ ''اصلاحی اِقدام'' جاگیردار وڈیروں کی جانب سے اُن کے بیکس و بے بس' غریب' اور محروم القسمت مزارعین اور کسانوں پر ظلم و تشدد ختم کرنے میں مؤثر ثابت ہوا؟ یہ وڈیرے مزارعین کو اپنا زر خرید غلام سمجھتے ہیں اور اِن اصلاحات کی تشکیل میں فرمودۂ خداوندی لَاتَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر کسی کا ظلم ہوگا : سورۃ البقرۃ آیت ۲۷۹) کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

جسٹس محمد تقی عثمانی نے بیماری کی صحیح تشخیص کی جب اُنہوں نے یہ لکھا کہ :

''ہمارے زرعی نظام کے نقائص ایسے پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں کہ ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد ۱۵۰ ایکڑ مقرر کرنے سے اُن کا حل نکلنا ناممکن سا ہے۔ دراصل ملکیت کی حد بندی کوئی ایسی راہ نہیں جس

سے زرعی طبقے کے حقیقی مسائل کو بہ آسانی حل کیا جا سکے۔ چور بازاروں اور نوسر بازوں کے لئے دروازے اب بھی کھلے ہیں۔ ۱۹۵۹ میں نافذ شدہ حد بندی کے قانون میں یہ ہمارا تجربہ ہے اور مائل بہ اصلاح نہیں ہو سکتا۔"

"علاوہ ازیں تمام زمینداروں کے لئے ۱۵٬۰۰۰ یونٹ کی خاص رعایت اور ۳٬۰۰۰ یونٹ کی رعایت اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے دسمبر ۱۹۷۱ سے پہلے ٹیوب ویل لگوائے تھے یا ٹریکٹر خرید کئے تھے، یہ ساری بات اصلاحات کو بے اثر اور بے معنیٰ بنا کے رکھ دیتی ہے۔ یہ بات کہ حدّ ملکیت افراد کی بنیاد پر ہے نہ کہ کنبے کی بنیاد پر، بہت سے رخنوں کو جنم دیتی ہے اور اب بھی کئی زمیندار ہزاروں ایکڑ زمین کے مالک ہیں۔"

"انہی وجوہ کی بناء پر اسلام نے حدّ ملکیت پر پابندی کو روا نہیں رکھا بلکہ اپنے نظام کو جائز و ناجائز کی بنیاد پر قائم کیا اور انصاف کو سستا اور ہر شخص کے لئے قابلِ رسائی بنا دیا۔ اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو صرف یہی طریقہ ظلم وتشدد کو روکنے میں کارگر ہو سکتا ہے۔ زمین کے رقبہ سے قطع نظر تمام ناجائز ذرائع سے حاصل کردہ زمینیں ضبط کر لی جائیں اور جائز ذرائع سے حاصل شدہ زمینوں کی ہر طرح حفاظت کی جائے۔"

"اسی طرح وہ زمیندار جو اپنے مزارع پر کسی بھی قسم کا تشدد نہیں کرتا خواہ وہ کتنی ہی زیادہ زمین کا مالک کیوں نہ ہو، وہ تنقید کا نشانہ بننے یا اسلامی سزا دئے جانے سے خارج ہے۔ لیکن وہ زمیندار جو اپنے قول یا فعل سے تشدّد کا مرتکب ہے یا اپنے مزارع کو باہمی معاہدوں میں اپنے برابر کا انسان نہیں سمجھتا اور اُسے حقیر و ذلیل سمجھتا ہے یا مزارع کی مزدوری صحیح نہیں دیتا، مجرم ہے اور سزا کا مستحق ہے اگرچہ وہ کتنی ہی کم زمین کا مالک کیوں نہ ہو۔"

("Our Socio-Economic Order"....
-- Justice Mufti Muhammad Taqi Usmani, pp. 78-79) LHR 2001.

مزارعین کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناب تقی عثمانی مندرجہ ذیل طریقوں کو اپنانے کی تجویز دیتے ہیں:

(۱) حدّ ملکیت قائم کئے بغیر ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ تمام زمینیں ضبط کر کے اُنہیں اُن کے اصل مالکوں کے سپرد کر دیا جائے اور اگر اصل مالکوں کا سراغ نہیں ملتا تو وہ زمینیں اُن لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں جن کے پاس زمینیں نہیں ہیں۔

(۲) اسلامی قوانینِ وراثت کو عملاً اور آہنی قوّت کے ساتھ نافذ کیا جائے اور نئی ضروریات کے تحت خشک اور بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانے سے متعلق نئے قوانین شریعت کے مطابق بنائے جائیں۔

(۳) زمینداروں کے پاس تمام رہن شدہ زمینیں قبضہ میں کر کے اُنہیں قرضداروں کو لوٹا دیا جائے۔

(۴) پیداوار میں شراکت کے قوانین ایسے بنائے جائیں جن سے ارتکازِ دولت کا خاتمہ یقینی ہو اور جو متوازن معیشت کا سبب بنیں۔

(۵) پیداواری شراکت کی شرائط میں ناجائز شرائط کی سزا مقرر ہو اور ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے فریقین کو باہم مساوی درجہ حاصل ہو۔

(۶) دلالوں اور اِس قسم کے تمام بیچ کے لوگوں کو ختم کر دیا جائے یا اگر یہ نہیں تو اُن کی کارکردگی کو ایسے ڈھالا جائے کہ کسان/مزارع بغیر کسی قسم کے دباؤ کے اپنی پیداوار کو آزادانہ طور پر فروخت کر سکے۔

(۷) ایسے بینک قائم کئے جائیں جو سود سے پاک قرضے جاری کریں اور جو مزارعین اور کسانوں کو اس قابل بنائیں کہ وہ زرعی آلات آسان اقساط پر خرید کر سکیں۔

(۸) وسیع اختیارات والی ایسی مخصوص عدالتیں قائم کی جائیں جو عوام کے لئے قابلِ رسائی ہوں' بالخصوص جبکہ فریقِ مخالف بڑا زمیندار اور بااثر جاگیردار ہو' تو اس صورت میں بیچارہ ایک غریب' محروم القسمت اور مظلوم انسان عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے تک کی جرأت نہیں کر سکتا۔''

(ایضاً ص ص ۷۹' ۸۰)

(۳) ہلکی اور تیز ہوا (Air & Wind)

قرآنِ حکیم میں ہوا کا ذکر دو مقامات پر دو مختلف ناموں سے آیا ہے: (۱) سورۃ ابراھیم کی آیت ۴۳ میں (أَفۡئِدَتُهُمۡ هَوَآء") ؛ (۲) سورۃُ النَّحل کی آیت ۷۹ میں جَوّ کے نام سے (فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ) آندھی کے لئے عمومی لفظ (رِیۡح اور اس کی جمع رِیَاح) تیس سے زائد مقامات پر آیا ہے۔ خاص قسم کی آندھیوں کے لئے کچھ اور اضافی الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' ص ۵۱)

(الف) ہوا (AIR)

سورۃُ النَّحل کی آیت ۷۹ میں جَوّ فضا کے معنی میں آیا ہے اور یہ استعمال لفظا ہے:۔

أَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیۡ جَوِّ السَّمَآءِ

''کیا اُن لوگوں نے پرندوں کی طرف نظر نہیں کی کہ وہ آسمان کی فضا میں (قدرت کے) مسخر ہیں؟''
جَوّ آسمان اور زمین کے درمیان وہ مقام ہے جہاں پرندے اُڑان کرتے ہیں۔

اس کا دوسرا استعمال تشبیہا ہے جو سورہ ابراھیم کی آیت ۴۳ میں ہوا ہے:۔
وَأَفۡئِدَتُهُمۡ هَوَآء" (اور اُن کے دل بدحواس ہوں گے)
یوم حشر کی ہولناکی اور دہشت انگیزی میں جو حال اللہ کے باغیوں کا ہوگا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن' اُسے تشبیہا یہاں هَوَآء کے لفظ سے بیان کیا جا رہا ہے۔

(ب) تیز ہوا (Wind)

دوسرے مظاہر قدرت کی طرح ہوا بھی (اپنی ہر شکل میں) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر مختلف پیرایوں میں ہوا ہے: آرام و آسائش میں یہ برساتی بادلوں کو کھیتوں اور زرعی زمینوں کی طرف لاتی ہیں' خطرات میں یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مظہر ہوتی ہیں۔ ہواؤں کا چلانا جس شکل میں ہی ہو (تَصۡرِيۡفُ الرِّيٰح)۔۔۔خواہ انسان کے فائدے کے لئے یا اُس کے نقصان کے لئے ہو۔ تمام تر اللہ تبارک وتعالیٰ کے اختیار میں ہے اور جس کا انتظام وہ انسانوں کو جزا یا سزا دینے کے لئے کرتا ہے۔ وہ ہوا کو بادلوں اور بحری جہازوں کے چلانے میں استعمال کرتا ہے اور اس کا کنٹرول وہ جسے چاہے عطا کرتا ہے۔

تین مقامات پر یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا:۔

۱۷۰ (ہلکی اور تیز ہوا)

(۱) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِىْ بِأَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (الانبیاء : ۸۱)

''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے زوردار ہوا کو (تابع) کر دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔''

یعنی ملکِ شام کی طرف کہ وہ جب کبھی باہر جاتے تو واپس ہوا کے ذریعہ سے آتے تھے۔ یاد رہے کہ سلیمان علیہ السلام کے والدِ ماجد جناب داؤد علیہ السلام کے معجزہ جبال (پہاڑوں کے معجزہ) کا ذکر اس سے قبل آیت ۷۹ میں ہو چکا ہے اور یہاں آیت ۸۱ میں اُن کے فرزند سلیمان علیہ السلام کے معجزہ تسخیر ہوا کا ذکر ہے۔ امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باریک نکتہ خوب بیان کیا کہ باپ کا مسخّر کثیف ترین جسم (پہاڑ) کیا گیا اور بیٹے کا مسخّر لطیف ترین جسم (یعنی ہوا) کیا گیا۔

(۲) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا : ۱۲)

''اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو (مسخر) کر دیا کہ اس کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی اور اس کی شام کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی۔''

یعنی تیز رَو گھوڑسوار جتنا فاصلہ مہینہ بھر میں طے کرتا، ہوا اُسے صبح یا شام کے وقت طے کر لیتی۔

(۳) فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِىْ بِأَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (صٓ : ۳۶)

''ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کر دیا کہ وہ اُن کے حکم سے جہاں وہ چاہتے، نرمی سے چلتی۔''

ہوا کے حوالہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو سورۃ الشُّورٰی: ۳۳ میں یوں بیان کیا گیا:

اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ

''اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ جہاز سطحِ سمندر پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔''

قرآن مجید میں چار مقامات پر یہ لفظ فاعل کے فعل کے طور پر استعمال ہوا ہے :۔

(۱) جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ (یونس : ۲۲) (ایک تند و تیز تھپیڑ ہوا کا آتا ہے)

(۲) اِشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (ابراھیم : ۱۸) (تیز آندھی کے دن زوردار ہوا چلے)

(۳) تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (الکھف : ۴۵) (ہوا اُسے اُڑائے اُڑائے پھرے)

(۴) تَهْوِىْ بِهِ الرِّيْحُ فِىْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ (ہوا نے اُسے کسی دُور دراز جگہ جا پھینکا)

میٹرک سے لے کر ایم اے تک پروفیسر موصوف کا تعلیمی ریکارڈ قابلِ رشک رہا اور بورڈ/ یونیورسٹی کے ہر امتحان میں اعلیٰ فرسٹ ڈویژن نمایاں امتیاز کے ساتھ حاصل کرتے رہے۔1962ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی نمایاں امتیاز میں پاس کرنے کے بعد اُنہوں نے اڑھائی برس تک ولایت حسین اسلامیہ ڈگری کالج' ملتان میں بطور لیکچرار (عربی وعلوم اسلامیہ) تدریسی خدمات انجام دیں اور مئی 1966ء میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے سرکاری ملازمت ملنے پر گورنمنٹ ڈگری کالج ڈیرہ اسمٰعیل خان (صوبہ سرحد) میں بطور لیکچرار اِن عربک تعینات ہوئے۔انہوں نے دوسرا ایم اے علومِ اسلامیہ میں پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ طور پر 1966ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔گورنمنٹ کالج علی پور اور گورنمنٹ کالج مظفر گڑھ دونوں کالجوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سال بطور عربی لیکچرار خدمات انجام دیں۔1969ء میں اُن کا مظفر گڑھ سے گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان میں تبادلہ ہوا جہاں اُن کا عرصہ قیام ساڑھے ستائیس برس کا ہے۔اُسی کالج سے اُنہوں نے مئی 1997ء میں بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر گریڈ 20 میں ڈیڑھ سال قبل از وقت (Pre-mature) ریٹائرمنٹ لی۔

لسانِ عربی پروفیسر موصوف کا شروع ہی سے انتہائی پسندیدہ اور دلچسپی کا مضمون رہا ہے۔اپنے طالب علمی کے زمانہ ہی سے اُن کی دلی آرزو تھی کہ اَحْکَمُ الْحَاکِمِین کے آخری نسخۂ بے بہا۔قرآنِ مبین۔۔کے نوادرات وعجائبات کو طشت از بام کیا جائے اور بھولی بھٹکی انسانیت کو ایک نئی جہت سے مشعلِ راہ دکھائی جائے۔ملازمت کے دوران کچھ گھریلو ذمہ داریوں اور دیگر مسائل نے اُن کی اِس آرزو کو شرمندۂ تعبیر ہونے کا موقع نہ دیا لیکن بندے میں جذبہ صادق اور پُرخلوص لگن ہو تو دستِ غیب خود مدد فرماتا ہے۔ریٹائرمنٹ کے بعد قدرت نے موقع دیا اور اُس وقت (1997ء) سے لے کر اب تک وہ اسی کام کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں۔بحمدہٖ تعالیٰ حصّہ انگریزی کی پانچ جلدیں چھپ کر منصّۂ شہود پر آ چکی ہیں اور اُس کی آخری جلد (ششم) نظرِ ثانی کے مراحل میں ہے جو انشاء اللہ چند ماہ تک قارئین کے ہاتھوں میں ہوگی۔موجودہ حصّہ اردو جو حصّہ انگریزی کا ترجمہ ہے' بھی اُسی کاوش کا ایک حصّہ ہے۔

فاضل پروفیسر اشفاق احمد خان کو اپنا مخلصانہ خراجِ تحسین پیش کرنے میں میرا ریشِ قلم کانپتا ہے اور خوشی و شادمانی سے صفحۂ قرطاس جھوم جھوم اٹھتا ہے کیونکہ وہ درویش منش بندۂ خدا ''عشقِ رسول'' اور ''عشقِ قرآن'' کی مستی میں سرشار' دنیا کی ہوا و ہوس سے کوسوں دُور اور نام و نمود اور شہرت سے نفور و بیزار ہے۔اُنہوں نے قرآن مجید کی حقانیت اور عظمتِ رسول ﷺ کو جس مدلّل انداز میں منوایا ہے' وہ کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے راقم الحروف پروفیسر موصوف کی صحت' ایمان کی سلامتی' طول العمری' اُن کے خانہ اور اہلِ خانہ کی خیر و برکت کے لئے دعا گو ہے اور یہ کہ اللہ رب العزت اُن کی اس کاوش کو اپنی بارگاہِ عالیہ میں شرفِ قبول بخشے اور اِسے اُن کے اور اُن کے والدین کے لئے سرمایۂ نجات بنائے!! آمین بہ طفیل سیّد المرسلین ﷺ۔

۷ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

یکم مارچ 2012ء

محمد رمضان چوہدری (انجنیئر)

۱۷۱ (ہلکی اور تیز ہوا)

بعض اوقات لفظ اَلرِّیح روزمرّہ کے عام استعمال (یعنی نرم یا تیز ہوا کے معنیٰ) سے ہٹ کر وسیع معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل دو مقامات پر یہ لفظ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا:

(۱) وَلَاتَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ (الانفال : ۴۶)

''اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ کم ہمت ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔''

(۲) اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ (یوسف : ۹۴)

''(یعقوب علیہ السلام نے کہا) مجھے تو یوسف کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔''

بعض اوقات لفظ رُوح جو اُسی مصدر (ر۔ی۔ح) سے ہے، متحرک ہوا کی طرح سانس کی ایک مخصوص کیفیت کو ظاہر کرتا ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے اُن میں روح پھونکنے سے زندگی ملی (سورۃ الحجر:۲۹ ؛ سورۃ حٰمٓ السجدۃ : ۹ ؛ سورہ صٓ:۷۲ ؛ سورۃُ التّحریم:۱۲) اور مریم سلام اللہ علیہا میں اللہ تعالیٰ کے روح پھونکنے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے (سورۃ مریم : ۱۷ ؛ سورۃ الانبیاء : ۹۱)

رِیح کے علاوہ قرآن مجید میں متعدد الفاظ ہوا کی مختلف اقسام کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً

عاصِف (سورۃ یونس:۱۰) یا عاصِفَۃ (سورۃ الانبیاء : ۸۱) (بمعنیٰ تیز و تند ہوا)

قَاصِف (سورۃ الاسراء : ۶۹) (بمعنیٰ طوفانی جھکڑ)

رُخَآء (سورۃ صٓ : ۳۶) (بمعنیٰ نرم و لطیف ہوا)

حَاصِب (سورۃ القمر : ۳۴) (بمعنیٰ شدید آندھی کا بگولہ)

ان کے علاوہ کئی اور ایسے الفاظ بھی ہیں جو ہوا کی صفت یا کیفیت کو بیان کرتے ہیں۔ مثلاً :

(۱) صَرْصَرٌ (سورۃ حٰمٓ اَلسَّجدَۃ:۱۶ ؛ سورۃ القمر:۱۹ ؛ سورۃُ الحآقّۃ :۶) اگر اس کا مصدر صِرٌّ'' (سورہ آلِ عمران : ۱۱۷) مانا جائے (بمعنیٰ تباہ کن تیز و تند ٹھنڈی ہوا)

اگر اس کا تعلق صَرَّۃٍ (سورۃ اَلذّٰرِیٰت:۲۹) سے مانا جائے تو معنیٰ ہیبت ناک شور و غوغا ہوگا۔

(۲) عَاتِیَۃ (سورۃُ الحآقّۃ :۶) (بمعنیٰ پُر تشدّد)

(۳) عَقِیْم (سورۃ اَلذّٰرِیٰت:۴۱) (بمعنیٰ بانجھ، نامبارک اور دم گھٹنے والی)

سورۃُ التّکویر (۸۱) کی آیت ۱۸ میں فعل تَنَفَّسَ (بمعنیٰ سانس لینا) سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہوا کی لرزاں و خیزاں سرسراہٹ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

<u>ہوا بطور نعمتِ الٰہیہ</u>: ہوا رحمتِ الٰہیہ کی حامل ہوتی ہے اور اِس لحاظ سے خدائے رحیم و کریم کی

طرف سے انتہائی قابلِ قدر عطیہ ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت (یعنی بارش) کو عام اور منتشر کرنے کے لحاظ سے اس کا کردار سورۃ الاعراف، سورۃ الفرقان اور سورۃ النمل میں بالترتیب یوں اجاگر کیا گیا ہے:

(i) وَ هُوَالَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًابَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰۤی اِذَآاَقَلَّتْ سَحَابًاثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ٥ (الاعراف : ۵۷)

''اور وہ وہی تو ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت (بارش) سے قبل بطور خوشخبری کے بھیجتا ہے چنانچہ جب وہ (ہوائیں) بھاری بادل کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اُسے کسی خشک بستی کی طرف ہانک لے جاتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے پانی نازل کرتے ہیں پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر طرح کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم مُردوں کو نکال کھڑا کریں گے تاکہ تم (اِس سے) نصیحت حاصل کرو۔''

(ii) وَ هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًابَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَامِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا٥ لِّنُحْیِ۟ـیَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًاوَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآاَنْعَامًاوَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا٥ (اَلفُرقان : ۴۸، ۴۹)

''اور وہ وہی ہے جو اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ خوش کر دیتی ہیں اور ہم آسمان سے خوب پاک وصاف کرنے والا پانی برساتے ہیں تاکہ ہم اس کے ذریعہ سے مردہ بستی میں جان ڈال دیں اور اپنے پیدا کئے ہوؤں میں سے بکثرت مویشیوں اور انسانوں کو سیراب کر دیں۔''

پانی کے اِس وصفِ مخصوص سے فقہاء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حکمی نجاستوں کے ازالہ اور طہارت کا کام صرف آبِ خالص ہی دے سکتا ہے۔ آبِ غیر خالص مثلاً عرقِ کیوڑہ، عرقِ گلاب، شربتِ انار گو کیسے ہی لطیف ہوں، صرف طاہر (پاک) ہیں، مطہّر (پاک کرنے والے) نہیں۔

(iii) مَنْ یُّرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًابَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ (اَلنَّمل : ۶۳)

''کون ہے جو دلوں کو خوش کرنے کے لئے ہواؤں کو بارش سے پہلے بھیجتا ہے؟''

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہوا کے لئے آٹھ قرآنی اصطلاحات ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل چار اصطلاحات سزا اور عذاب کے لئے ہیں:۔

(۱) عاصِف (سورۃ یونس: ۱۰) یا عاصِفَة (سورۃ الانبیاء : ۸۱) (بمعنیٰ تیز وتند ہوا)

(۲) قَاصِف (سورۃ الاسراء : ۶۹) (بمعنیٰ طوفانی جھکڑ)

(۳) صَرْصَرٌ (سورۃ حٰمٓ اَلسَّجدَة: ۱۶ ؛ سورۃ القمر: ۱۹ ؛ سورۃُ الحآقّة : ۶) (تیز وتند ٹھنڈی ہوا)

(۴) عَقِیم (سورۃ الذّٰریٰت: ۴۱) (بمعنیٰ بانجھ' نامبارک اور دَم گھٹنے والی)

اور چار ہوائیں رحمتِ الٰہی کی علامت ہیں :
(۱) مُبَشِّرَات (سورۃ الرُّوم : ۴۶) بمعنیٰ پیش رَو' خوش کُن
(۲) اَلذّٰرِیٰت (سورہ اَلذّٰرِیٰت : ۱) بمعنیٰ اُڑانے والی ہوائیں
(۳) اَلْمُرْسَلَات (سورہ اَلْمُرْسَلَات : ۱) بمعنیٰ بھیجی جانے والی ہوائیں
(۴) اَلنّٰشِرَات ((سورہ اَلْمُرْسَلَات : ۳) بمعنیٰ بادلوں کو پھیلانے والی ہوائیں

قرآن مجید میں ہوا کے وصف اور کردار کے بیان کردہ مختلف پہلو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:
(۱) یہ بادلوں کو بارور کرتی ہیں:
وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (اَلحِجر: ۲۲) [اور ہم ہی پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں]

(۲) یہ بارش لاتی ہیں :
اَللّٰهُ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَیَبْسُطُهٗ فِی السَّمَآءِ کَیْفَ یَشَآءُ وَ یَجْعَلُهٗ کِسَفًا فَتَرَی الْوَدْقَ یَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِه (اَلرُّوم: ۴۸)
''وہی اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں بھیجتا ہے تو وہ بادلوں کو اُٹھائے پھرتی ہیں' پھر اللہ اُسے جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے پھر تو بارش کو اس کے اندر سے نکلتے ہوئے دیکھتا ہے۔''

(۳) ہوائیں دوبارہ جی اُٹھنے کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں:
وَاللّٰهُ الَّذِیْ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰی بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا کَذٰلِكَ النُّشُوْرُ٥ (فاطر: ۹)
''اور اللہ وہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے پھر وہ بادلوں کو اُٹھاتی ہیں' پھر ہم اُسے خشک خطہ زمین کی طرف ہانک کرلے جاتے ہیں' پھر ہم اُس کے ذریعہ سے زمین کو اس کی خشکی کے بعد سرسبز کر دیتے ہیں۔''

(۴) اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ کا اظہار ہواؤں کے ادل بدل کرنے سے بھی کرتا ہے :
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ٥ (الجاثیة: ۵)

''اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور اُس رزق میں جسے اللہ نے آسمان سے اتارا' پھر اُس کے ذریعے زمین کو اُس کے خشک ہونے کے بعد تروتازہ کیا اور ہواؤں کے ادل بدل کرنے میں اہلِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔''

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اِن تینوں آیات (۳'۴'۵) کے ختم پر تین مختلف لفظ آئے ہیں: پہلے لِلْمُؤْمِنِیْنَ پھر لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ پھر لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ۔ اِن میں ایک خاص ترتیب ہے۔ گویا مخاطبین سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اگر تم ایمان والے ہو تو خود ہی اِن دلائل کو سمجھ جاؤ گے لیکن اگر ایمان سے محروم ہو تب بھی حق کے طالب تو ہو گے لہٰذا تب بھی انہیں سمجھ سکتے ہو اور اگر یہ نہ بھی ہو تو آخری درجہ میں بہر حال صاحبِ فہم تو ہو ہی' اسی فہم سے کام لو۔

(۵) یہ بحری جہازوں/لانچز کو سمندر میں چلاتی ہیں:

حَتّٰٓی اِذَا كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا (یونس: ۲۲)

''جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ (کشتیاں) لوگوں کو ہوائے موافق کے ذریعہ سے لے کر چلتی ہیں اور وہ لوگ اس سے خوش ہوتے ہیں۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ میں الٰہی نشانیوں کی عظیم الشان تصویر کشی کی گئی ہے اور مصنوعات میں غور وفکر سے صانع پر استدلال ہے:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور جہازوں کے چلنے میں جو سمندر میں اُن چیزوں کے ساتھ چلتے ہیں جو لوگوں کو نفع پہنچاتی ہیں اور اُس پانی میں جسے اللہ نے آسمان سے اتارا' پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہونے کے بعد جلا اُٹھایا اور اس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دئے اور ہواؤں کے ادل بدل کرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مقید ہیں' (ان سب میں) عقل رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

(۶) ہوا بطور خدائی عذاب کے: گزشتہ صفحہ میں امام رازی نے تیز وتند ہوا میں عذابِ الٰہی کی جو چار قسمیں بیان کی ہیں' اُنہیں بھی اِس ذیلی عنوان میں شامل کرلیا جائے۔ اِس ضمن میں کچھ اور آیات درج ذیل ہیں:۔

(i) یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ آمَنُوا اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَآءَتۡکُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ رِیۡحًا وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡھَا (الاحزاب : ۹)

''اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کا انعام یاد کرو جب تم پر کئی لشکر چڑھ آئے تھے، پھر ہم نے اُن پر آندھی بھیجی اور ایسی فوج جو تمہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔''

(ii) فَاَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡۤ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیۡقَھُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡیِ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَلَعَذَابُ الۡاٰخِرَۃِ اَخۡزٰی (حٰمٓ السّجدۃ : ۱۶)

''ہم نے اُن پر ایسے دنوں میں اُن پر تیز آندھی بھیجی جو (اُن کے حق میں) منحوس تھے کہ ہم اُنہیں (اِسی) دُنیوی زندگی میں رسوائی کے عذاب کا مزہ چکھا دیں اور عذابِ آخرت تو رُسوا تر ہوگا۔''

(iii) وَفِیۡ عَادٍ اِذۡ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمُ الرِّیۡحَ الۡعَقِیۡمَ ٥ (الذّٰریٰت : ۴۱)

''اور قومِ عاد (کے قصہ) میں بھی عبرت ہے جب ہم نے اُن پر نامبارک آندھی بھیجی۔''

(iv) اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡھِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا فِیۡ یَوۡمِ نَحۡسٍ مُّسۡتَمِرٍّ ٥ (القمر : ۱۹)

''ہم نے اُن پر ایک دائمی نحوست کے دن تُند و تیز ہوا مسلّط کی۔''

(v) وَاَمَّا عَادٌ فَاُھۡلِکُوۡا بِرِیۡحٍ صَرۡصَرٍ عَاتِیَۃٍ ٥ (القلم : ۶)

''اور رہی قومِ عاد تو وہ ایک تیز و تُند ہوا سے ہلاک کی گئی۔''

(۷) ہوا بطور خدائی تنبیہ کے:

(i) اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ یُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ وَکِیۡلًا ۝ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ یُّعِیۡدَکُمۡ فِیۡہِ تَارَۃً اُخۡرٰی فَیُرۡسِلَ عَلَیۡکُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّیۡحِ فَیُغۡرِقَکُمۡ بِمَا کَفَرۡتُمۡ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَکُمۡ عَلَیۡنَا بِہٖ تَبِیۡعًا ٥ (الاسراء: ۶۸، ۶۹)

''کیا تم اس سے بے فکر ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے یا تم پر کوئی تُند ہوا بھیج دے تو تم کسی کو (بھی) اپنا کارساز نہ پاؤ۔ کیا تم اس سے بے کھٹکے ہو گئے ہو کہ وہ تمہیں ایک بار پھر اِسی (یعنی سمندر کی) طرف لے جائے اور تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے پھر تمہیں تمہارے کفر کے باعث غرق کر دے اور تمہیں اِس بات پر ہمارا کوئی پیچھا کرنے والا نہ ملے۔''

(ii) أَمْ أَمِنتُم مَّن فِي السَّمَآءِ أَن يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا (الملک : ۱۷)
"کیا تم اس سے نڈر ہو گئے ہو کہ جو آسمان میں ہے وہ تمہارے اوپر ہوائے تُند بھیج دے۔"

(iii) فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّن رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُونَ ۝ (القلم : ۱۹)
"سو اُس (باغ) پر آپ کے پروردگار کی طرف سے ایک پھرنے والا عذاب پھر گیا جبکہ وہ سو رہے تھے۔"

(۸) ہوا بطور سبق آموز حکایت :

(i) مَثَلُ مَا يُنفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوٓا أَنفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ (آل عمران:۱۱۷)
"وہ جو کچھ اِس دنیوی زندگی میں خرچ کرتے ہیں، اُس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہوا ہے جس میں سخت سردی ہے اور وہ ایسے لوگوں کو لگ جائے جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، پھر وہ (ہوا) اُس (کھیتی) کو برباد کر دے تو اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔"

یہود، منافقین اور مشرکین نبیِ اکرم ﷺ کی عداوت میں آپ کو نقصان پہنچانے کی خاطر مال خرچ کرتے تھے اور اپنے اس عمل پر فخر کرتے تھے۔ رب تعالیٰ نے آسان اور عام فہم مثال میں اُن لوگوں کے مال کے ضائع جانے کو بیان کیا جو ایمان باللہ اور ایمان بالرّسول سے محرومی کی حالت میں دنیوی اغراض کی خاطر اور اپنے نفس کی تسکین کے لئے اپنی دولت خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اگر وہ مال کو غریبوں، یتیموں اور بیواؤں وغیرہ پر خرچ کرتے بھی ہیں تو لوگوں کو دکھانے، سنانے، شہرت اور فخر کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی مرضی کے خلاف اِس خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جس طرح ظالموں کے کھیت پر سخت سرد جلا دینے والی ہوا پہنچے اور اُس کھیت کو جلا ڈالے۔ ان لوگوں نے کفر اور بے دینی کی راہ اختیار کر کے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جانوں پر ظلم کیا کہ مال کو بے محل اور مرضیِ مولیٰ کے خلاف خرچ کیا۔ اللہ نے اُن پر ظلم نہیں کیا کہ اُن کے صَرفِ مال کو خواہ مخواہ لا حاصل اور ضائع کر دیا۔

آیت سے حاصل شدہ چند مفید نکات : (۱) اعمال کی قبولیت ایمان کی درستی پر موقوف ہے۔ (۲) سرداروں کی بے ایمانی اُن کے ماتحتوں کا بھی بیڑا غرق کر دیتی ہے کہ ظلم تو کیا کھیت والے نے اور عذاب آنے کی صورت میں اُس کے اہل و عیال، نوکر چاکر بلکہ جانور بھی مصیبت میں آ گئے کہ کھیت اجڑ جانے سے سبھی بھوکوں مریں گے۔ لہٰذا سرداروں کو زندگی بہت احتیاط سے گزارنی چاہئے۔ علماء، صوفیاء، اُمراء اور بادشاہوں سب کے لئے یہ آیت باعثِ عبرت ہے۔ (۳) نیکیوں کی مکمل بربادی کفار کے لئے ہے، مؤمن خواہ کتنا ہی گنہگار رہو، انشاء اللہ اُس کی اصل نیکی برباد نہ ہو گی۔ ثواب کی کمی اور چیز ہے اور بالکل بربادی اور چیز ہے۔ (۴) برباد کرنا اور ہلاک

کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے سخت سردی والی برفانی ہوا کی طرف منسوب کیا۔ معلوم ہوا کہ نسبتِ مجازی درست ہوتی ہے۔ اس نسبتِ مجازی کی ایک اور مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اِس قول میں ہے کہ میں مادرزاد اندھے کو بینا کرتا ہوں اور کوڑھی اور برص دار کو شِفایاب کرتا ہوں (سورہ آلِ عمران: ۴۹) حالانکہ شِفا دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اسی طرح جبریل امین نے جنابِ مریم سے کہا تھا کہ میں تمہیں ایک صاف ستھرا بچہ دینے آیا ہوں (سورہ مریم: ۱۹) حالانکہ دینے والا رب تعالیٰ ہے۔ (۵) انسان کے فسق و فجور کی وجہ سے بعض اوقات کھیتیاں برباد، رزق میں کمی اور بلاؤں کا نزول ہوتا ہے۔

(ii) مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا (ابراھیم: ۱۴)

"جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے رہتے ہیں، اُن کے اعمال کی حالت یہ ہے کہ جیسے راکھ جسے تیز آندھی کے دن ہوا تیزی سے اُڑا لے جائے، جو کچھ اُنہوں نے کیا دھرا تھا اُنہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔"

نکتہ: کافر کے کسی اچھے کام کو نیکی نہیں کہنا چاہئے خواہ اُس کے کسی کام سے عوام کو کتنا ہی فائدہ پہنچتا ہو۔ اسی طرح کسی کافر کو نیک اور ایماندار بھی نہیں کہنا چاہئے (کہ ایمان تو اُس میں ہے ہی نہیں)۔ اَلبتہ بوقتِ ضرورت اُسے اچھا، عقلمند اور نرم دل کہہ سکتے ہیں۔ یہ نکتہ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا (جو کچھ اُنہوں نے کیا دھرا تھا اُنہیں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا) کے جملے سے حاصل ہوا۔

(iii) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (الکھف: ۴۵)

"(اے نبی!) آپ اُنہیں دنیوی زندگی کی مثال بیان کیجئے کہ وہ ایسی ہے جیسے ہم نے آسمان سے پانی برسایا ہو، پھر اُس کے ذریعہ سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہوگئی ہو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے کہ ہوائیں اُسے اُڑائے اُڑائے پھریں۔"

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دُنیا کو پانی کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ دُنیا اور پانی میں چند وجوہ سے مناسبت ہے:

(۱) پانی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا اسی طرح دنیا بھی ایک کیفیت اور ایک حالت پر برقرار نہیں رہتی۔
(۲) کوئی بھی شخص پانی میں داخل ہونے پر بھیگنے سے بچ نہیں سکتا، اسی طرح کوئی بھی شخص دنیا میں داخل ہونے پر اس کے فتنوں اور اس کی آفات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔

(۳) جب پانی کو باغات اور کھیتوں میں بقدرِ ضرورت ڈالا جائے تو وہ اُن کے لئے فائدہ مند ہے اور اُن کی روئیدگی کو بڑھانے والا ہے لیکن جب اُن میں ضرورت سے زائد پانی ڈالا جائے گا تو وہی اُن کے لئے تباہی کا سبب ہوگا جیسا کہ دریاؤں کے سیلاب میں اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح جب دنیا کے مال ومتاع کو بہ قدرِ ضرورت لیا جائے گا تو وہ انسان کے لئے مفید اور نفع بخش ہوگا اور جب انسان دنیا کو اپنی ضروریات سے زیادہ لے گا تو وہ اُس کے لئے فتنہ اور فساد کا سبب بن جائے گا۔

(iv) وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْتَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ٥ (اَلْحَجّ : ۳۱)

"اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے تو جیسے وہ آسمان سے گر پڑا پھر پرندوں نے اُسے جھپٹ لیا' یا ہوا نے اُسے کسی دُور دراز جگہ جا پھینکا۔"

(۹) ہواؤں کی قسمیں کھانا : قرآن مجید کا ایک پُر اثر اور قابلِ ذکر پہلو وہ قسمیں ہیں جو ربّ ذوالجلال مختلف مقامات پر مختلف مخلوقات کی کھاتا ہے۔ اُن میں سے ایک قِسم ہواؤں کی قسمیں کھانا ہے جس کا مقصد اپنے پیغام کو پُر اثر بنانا ہوتا ہے۔ نمایاں عمدگی اور حُسن وجمال کی حامل سورۃ الذّٰریٰت کی آیات ۱ تا ۴ اور سورۃ المُرسَلات کی آیات ۱ تا ۶ ہیں۔

ابن القیم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے مظاہر ونشانات کی قسم اِس لئے کھاتا ہے کہ وہ چیزیں (یعنی مقسم بہ) اللہ تعالیٰ کی ذاتِ مقدّسہ اور صفات کی مظہر ہیں اور اللہ تعالیٰ کا اُن کی قسم اٹھانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیاں ہیں' اور اس سے غرض اوّلاً مخاطبین کو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت' اور اُس کی وحدانیت کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے اور ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صداقت اور قرآن مجید کے منزّل من اللہ ہونے اور حساب وجزا کے برحق ہونے کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

عبدالرحمٰن حسن فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں مظاہرِ کائنات کو مقسم بہ بنانے سے مقصود اللہ تعالیٰ کے عالیشان مُحکم نظام کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ جب مقسم بہ مظاہرِ کائنات ہوں تو قسم کے مخاطب اوّل اُس وقت غیر مسلم ہوتے ہیں کیونکہ انہی کو ہی اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ اُن کی فکر کو خدائی آثار کی طرف متوجہ کیا جائے۔ (قواعد التّدبُّر الامثل ۔۔ عبدالرحمٰن حسن)

(۴) فضائی حملہ (AIR RAID)

انسانی تاریخ میں سب سے پہلا فضائی حملہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی جانب سے ۵۷۰ عیسوی میں اصحاب الفیل پر کیا گیا جو ہمارے پیارے نبیِ اکرم ﷺ کی ولادتِ پاک سے تقریباً دو ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ اِس معجزاتی، غیر مثالی واقعہ کا ذکر سورۃُ الفیل (۱۰۵) میں یوں کیا گیا ہے:۔

اَلَمۡ تَرَ کَیۡفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِیۡلِ ؕ اَلَمۡ یَجۡعَلۡ کَیۡدَهُمۡ فِیۡ تَضۡلِیۡلٍ ۙ وَّ اَرۡسَلَ عَلَیۡهِمۡ طَیۡرًا اَبَابِیۡلَ ۙ تَرۡمِیۡهِمۡ بِحِجَارَةٍ مِّنۡ سِجِّیۡلٍ ۙ فَجَعَلَهُمۡ کَعَصۡفٍ مَّاۡکُوۡلٍ

"(اے نبی!) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ کیا ہم نے اُن کا داؤ بالکل اُلٹ نہیں دیا اور اُن پر جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بھیج دئے، وہ اُن پر کھنگر کی کنکریاں پھینکتے تھے، سو اللہ نے اُنہیں کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح کر دیا۔"

واقعہ یوں ہے کہ والیِ یمن ابرہہ نے صنعاء نامی شہر میں ایک کلیسا بنوایا تھا کہ عرب کے لوگ کعبہ کو چھوڑ کر اِس عبادت خانے میں حج اور طواف کیا کریں۔ اہلِ مکّہ کے قبیلہ بنو کنانہ کے ایک شخص کو جب اس بات کا علم ہوا تو اُس نے غضب ناک ہوتے ہوئے اُس گرجا میں جا کر ٹٹی پیشاب کر دیا۔ اس پر ابرہہ سخت برہم ہوا اور وہ ساٹھ ہزار جنگجو سپاہیوں کے ساتھ خانہ کعبہ پر چڑھائی کی غرض سے نکلا۔ اُس کی فوج میں نو یا بارہ جنگی ہاتھیوں کا دستہ بھی تھا جو عرب میں بالکل نئی چیز تھی۔ وہ مکّہ مکرّمہ سے دو میل کے فاصلے پر ٹھہرا اور اپنے ایک کارندے کو حکم دیا کہ مکّہ کے لوگوں سے چھیڑ چھاڑ کرے۔ وہ کارندہ قریش کے اونٹ اور دوسرے مویشی چھین کر لے آیا جن میں دو سو اونٹ حضرت عبدالمطلب کے بھی تھے۔ اس کے بعد ابرہہ نے حضرت عبدالمطلب کو بلوا بھیجا۔ ابرہہ نے آپ کی بہت عزت کی اور بذریعہ ترجمان آپ سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: تم میرے اونٹ واپس کر دو۔ ابرہہ نے تعجب سے کہا: تمہیں اونٹوں کی فکر ہے اور کعبہ کی کوئی فکر نہیں جسے میں گرانے آیا ہوں؟ حضرت عبدالمطلب نے بڑی سادگی سے جواب دیا: اِنِّیۡ اَنَا رَبُّ الۡاِبِلِ وَاِنَّ لِلۡبَیۡتِ رَبًّا سَیَمۡنَعُه، (میں اونٹوں کا مالک ہوں، اُن کی حفاظت میری ذمہ داری ہے۔ خانہ کعبہ کا مالک اللہ ہے، وہ اپنا گھر خود بچائے گا۔) اس گفتگو کے بعد حضرت عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر گھر لوٹ آئے اور قریش سے کہا کہ تم لوگ شہرِ مکّہ سے نکل جاؤ اور پہاڑوں کے درّوں میں پناہ لے لو۔ آپ خود چند آدمیوں کے ساتھ خانہ کعبہ میں گئے اور وہاں یہ دعا کی: اے اللہ! ہر شخص اپنا گھر بچاتا ہے، تو بھی اپنا گھر بچا، ایسا نہ ہو کہ اُن کی صلیب اور اُن کی تدبیر، تیری تدبیر پر غالب آ جائے اور اگر تو ہمارے کعبہ کو اُن پر چھوڑنا چاہتا ہے تو تو جو چاہتا ہے وہ کر۔

حضرت عبدالمطلب اِس دعا کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہاڑوں کے درے میں پناہ گزین ہو گئے۔

دوسری صبح ابرہہ کعبہ کو گرانے کے لئے اپنی فوج اور ہاتھیوں کو لے کر روانہ ہوا۔ جب اُس نے ہاتھی کا رخ ملّہ کی طرف کیا تو وہ بیٹھ گیا اور بہت کوشش کے باوجود بھی نہ اٹھا۔ پھر اُس نے ہاتھی کا رخ دوسری طرف کیا تو وہ تیز بھاگنے لگا۔ الغرض اگر اُسے کسی اور سمت چلنے کا اشارہ کیا جاتا تو وہ فوراً چلنے لگتا لیکن ملّہ کی طرف چلنے کا اشارہ کیا جاتا تو بیٹھ جاتا۔ انہی حالات میں فضا میں چھوٹے چھوٹے پرندوں کے غول ظاہر ہوئے جن میں سے ہر ایک نے اپنی چونچ میں ایک سنگریزہ اور ایک ایک اپنے دونوں پنجوں میں پکڑا ہوا تھا۔ ان سنگریزوں کی مقدار چنے یا مسور کے دانے کے برابر تھی۔ ہر سوار پر ایک ایک پرندہ ایک کنکر مارتا تھا جو اُس کے فولادی خَود' آہنی زرہ اور اُس کے جسم کو چیرتا ہوا زمین میں دھنس جاتا تھا۔ لشکر کا اکثر حصّہ تو وہیں تباہ و برباد ہو گیا۔ ایک مختصر سی تعداد جن میں ابرہہ بھی تھا' وہاں سے بھاگ نکلی لیکن اُن کے جسموں میں اتنی زبردست خارش پیدا ہو گئی کہ وہ ہر وقت کھجلاتے رہتے جس سے زخم نمودار ہوئے' زخموں سے پیپ اور لہو بہنے لگا' گوشت سڑ کر گرنے لگا۔ کئی راستہ ہی میں ہلاک ہو گئے۔ ابرہہ صنعاء پہنچ گیا لیکن اُس کا سارا جسم ناسور بنا ہوا تھا اور وہ گرانڈیل جوان چوزے کی مانند دبلا پتلا ہو گیا تھا۔ یہ تکلیف بڑھتی گئی یہاں تک کہ اُس کا سینہ شق ہو گیا اور وہ دم توڑ گیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی۔ وہ دشمن جسے اپنی قوّت اور لشکر کی کثرت پر بڑا ناز اور گھمنڈ تھا' اُسے چھوٹے چھوٹے پرندوں کی سنگباری سے فنا و برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو کسی اور ذریعہ سے بھی اُنہیں تباہ و برباد کر سکتا تھا لیکن اُس کی حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ دشمن کو حرم خلیل تک پیشقدمی کی مہلت دے اور تمام لوگوں کے سامنے اپنی قوّتِ قاہرہ کا مظاہرہ کرے تاکہ قیامت تک کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اِس سال کو اہلِ عرب عام الفیل کہتے ہیں۔

اِس تاریخی واقعہ کا ذکر فلپ کے۔ ہٹّی نے اس طرح کیا ہے :-

"اِس واقعہ کا وقوع پیغمبر (علیہ السلام) کی ولادت کے سال (۵۷۰ یا ۵۷۱ء) میں بتایا جاتا ہے اور اِس سال کو عامُ الفیل (ہاتھیوں کا سال) کہا جاتا ہے کہ جس میں ابرہہ نے شمال کی طرف اپنے لشکر کے ساتھ پیشقدمی کی اور جس واقعہ سے حجازی عرب بہت متاثر ہوئے جنہوں نے ہاتھی کبھی نہیں دیکھے تھے۔ حبشہ کی فوج چیچک (Smallpox) کے مرض سے تباہ ہو گئی' اُن چھوٹی چھوٹی کنکریوں (Small pebbles) سے جنہیں قرآن نے سِجّیل کہا ہے۔"

کچھ صفحات آگے وہ ابرہہ اشرم کا تعارف یوں کراتا ہے :

تقریظ

تمام حمد وثنا اور تمام تر تعریفیں اُس قادرِ مطلق اللہ کے لئے ہیں جو تمام عالم کا روزی رساں ہے اور جس نے بنی نوع انسان پر اپنی اَن گنت نوازشات نچھاور کی ہیں جن میں عظیم ترین نوازش اور انعام قرآن مجید ہے جو ایک اَبدی اور دائمی معجزہ ہے اور جو ہمارے پیارے نبی ﷺ پر نازل کیا گیا۔ کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کا نزول چودہ صدیاں پہلے ہوا لیکن اُس کی تعلیمات ایسی ہیں کہ اُنہیں تا قیامت چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ شاید قرآن مجید دنیا کی وہ واحد کتاب ہے جو حیاتِ انسانی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ اس کتابِ مقدس کی صداقت اور سند کو ثابت کرنے کے لئے سینکڑوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ قرآن مجید پر لکھی گئی یہ کتب محض وضاحت' تاویلات' تبصروں یا تفسیر کا درجہ رکھتی ہیں لیکن ''قرآنک انسائیکلوپیڈیا'' (جو آپ کے ہاتھوں میں ہے) اس لحاظ سے بے مثل اور یگانہ ہے کہ یہ دنیا میں پائے گئے تمام مختلف علوم کا جامع نظریہ پیش کرتا ہے۔

پروفیسر اشفاق احمد خان نے جو عربی زبان وادب اور علومِ اسلامیہ کے ممتاز عالم و فاضل ہیں' نے بڑی جانفشانی سے انسائیکلوپیڈیا کی تالیف کی ہے اس حقیقت کو ثابت کرنے میں کہ قرآن مجید کی تعلیمات تمام دنیا کے تمام انسانوں کے لئے راہ نمائی کا دائمی منبع ہیں۔ قرآن مجید کے بیانات کو جدید سائنسی مطالعہ کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ مطالعہ قرآن مجید کے اُن پہلوؤں پر نئی روشنی ڈالتا ہے جو اَب تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کو معلوم نہ تھے۔

پروفیسر موصوف کے کام کا نمایاں اور باوثوق پہلو یہ ہے کہ تمام فرقے' نسلیں اور تمام مذاہب اور گروہِ انسانی اُن علوم اور تعلیمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو اِس انسائیکلوپیڈیا میں موجود ہیں۔ قرآن مجید جہاں ایک طرف اسلام کو بطور آفاقی مذہب متعارف کراتا ہے تو دوسری طرف روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کو صراطِ مستقیم کی طرف لے جاتا ہے جیسا کہ قرآن مجید وقتاً فوقتاً بتلاتا رہتا ہے۔

میری نظر میں مؤلف نے یہ قابلِ قدر کام انجام دے کر آخرت میں اپنا ایک مخصوص و معزز مقام بنا لیا ہے۔ فاضل مؤلف نے سسکتی ہوئی انسانیت کو جو امن وشانتی کے حصول میں سرگرداں ہے' ایک راہ دکھائی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عملِ صالح اور نفیس عزائم سے آراستہ کریں تا کہ قربِ الٰہی نصیب ہو سکے جو حیاتِ انسانی کا اصل مقصد ہے۔

اُمید ہے کہ یہ انسائیکلوپیڈیا عالمی سطح پر ہر لائبریری کے لئے ایک صحیح مقام حاصل کر لے گا۔

پروفیسر عبدالعزیز بلوچ (ایم ایس سی جغرافیہ۔ ایم ایڈ)
چیئرمین۔ سرگودھا ثانوی تعلیمی بورڈ۔ سرگودھا

26 فروری 2012ء

''اِس ابر ہہ نے صنعاء کے مقام پر اُس زمانے کا ایک عظیم الشان گرجا گھر بنوایا تھا جسے عرب مصنّفین القلیس کہتے ہیں۔ یہ گرجا گھر جس کے کچھ نشانات باقی ہیں' قدیم مآرب کے کھنڈرات کے ملبہ سے تیار کیا گیا تھا۔'' (''ہسٹری آف دی عربز''۔ فلپ کے۔ ہٹی' ص ۸۲)

''اس واقعہ سے دو سبق حاصل ہوئے : (۱) اے مشرکینِ قریشِ مکّہ! اگر تم ہمارے پیغمبر علیہ السلام کو نشانہ اذیت بناؤ گے تو وہ اللہ جس نے کعبہ کی حفاظت فرمائی اور جو خانہ کعبہ سے بھی کہیں عظیم تر ہے' کیا اپنے پیغمبر کی حفاظت نہیں فرمائے گا؟ (۲) قیامت تک کے ہر اُس انسان کے لئے درسِ عبرت ہے جو اپنے نشۂ پندار میں مست' جاہ وحشم اور ظاہری اسباب پر پھولا نہیں سماتا' اللہ کی قوّتِ قاہرہ کے سامنے حقیر وعاجز اور بے بس ہے۔ اللہ کے خلاف اُس کا کوئی مکر وفریب کام نہیں آئے گا اور وہ اُلٹا منہ کی کھائے گا۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۶۲۷۵)

ابو نُعیم لکھتے ہیں کہ حملہ آور فوج نصاریٰ کی تھی۔ وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے پیروکار اور انجیل کو ماننے والے تھے۔ اہلِ مکّہ کا اُس وقت مذہب بت پرستی تھا۔ تین سو ساٹھ بُت کعبہ شریف میں رکھے ہوئے تھے۔ ابرہہ اگرچہ عیسائی تھا اور دُنیائے عیسائیت میں حضرت عیسٰی علیہ السلام اور اُن کی والدہ ماجدہ کے مجسموں کی پرستش بڑے دھڑلے سے کی جاتی تھی' اس لئے عقیدے کے لحاظ سے مشرکینِ مکّہ اور ابرہہ میں اگر کوئی فرق تھا تو محض برائے نام۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اِن مشرکین اور بُت پرستوں کے مقابلہ میں ابرہہ کی مدد کی جاتی اور کعبۂ خلیل کو صنم کدہ بنانے والوں کو عبرتناک سزا دی جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا جس کی حکمت یہ ہے کہ اب کعبہ کو آباد کرنے والے' اُسے نورِ توحید سے روشن کرنے والے کی آمد کا وقت قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی ولادت کے سال میں اہلِ مکّہ پر ایسا فضل وکرم فرمایا جس کا شکر یہ وہ تا قیامت ادا نہیں کر سکتے۔

<u>اَصحابُ الفیل سے انتقام لینے میں نبی ﷺ کی فضیلت کے پہلو</u> : امام رازی لکھتے ہیں کہ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ نے یا رَب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ بلکہ فرمایا کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا کیا؟ مطلب یہ کہ میں آپ کا رب ہوں اور آپ کا حامی وناصر ہوں۔ دوسرا اشارہ یہ کہ میں نے اصحاب الفیل سے جو انتقام لیا' وہ محض آپ کے اعزاز واکرام کے لئے لیا ہے۔ پس جب میں نے آپ کی آمد سے پہلے آپ کی تعظیم وتکریم کی ہے تو آپ کے ظہور کے بعد میں آپ کی حمایت ونصرت کیوں نہ کروں گا۔ چنانچہ اِس نکتہ میں یہ اشارہ ہے کہ میرا نبی ضرور فتح مند اور کامیاب ہوگا اور اس کے دشمن ملیا میٹ ہو کے رہیں گے۔

<u>ابرہہ کے لشکر کا ہاتھیوں سے بھی کم درجہ ہونا</u> : آیت میں اَصحابُ الفیل فرمایا ہے نہ کہ

اَربابُ الفِیلِ (ہاتھیوں کے مالک) کیونکہ اَصحاب جب کسی چیز کی طرف مضاف ہو تو وہ مضاف الیہ کی جنس سے ہوتا ہے۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ ابرہہ اور اُس کا لشکر ہاتھیوں کی جنس سے تھا یعنی جس طرح ہاتھی حیوان اور بے عقل ہیں' اُسی طرح ابرہہ اور اُس کا لشکر بھی حیوانوں کی طرح بے عقل تھے ورنہ وہ اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کے گھر کو گرانے کے لئے نہ آتے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جب دو شخصوں میں مصاحبت ہو تو اُن میں سے ادنیٰ کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ کا صاحب ہے' جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا صاحب کہا جاتا ہے' یہ نہیں کہ رسول اُن کے صاحب ہیں اور جو لوگ آپ کی صحبت میں رہے اُنہیں صحابہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ابرہہ اور اُس کے لشکر کو اَصحابُ الفیل فرمایا یعنی وہ ہاتھیوں سے بھی ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ کیونکہ جب اُنہوں نے ہاتھیوں کو مکّہ کی طرف چلانا چاہا تو ہاتھی بیٹھ گئے اور ہزار کوشش کے باوجود وہ مکّہ کی طرف ایک قدم بھی نہیں چلے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہاتھیوں کو یہ معرفت حاصل تھی کہ خالق کی نافرمانی اور اُس کے خلاف بغاوت میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جاسکتی اور ابرہہ اور اُس کا لشکر اِس معرفت سے بیگانہ تھے۔

<u>کعبہ میں بُت پرستی کرنے والوں کو فوراً عذاب نہیں دیا تو ابرہہ کے لشکر کو فوراً عذاب کیوں دیا؟</u>

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ کعبہ میں بُت پرستی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے حق میں کمی کے مرتکب تھے اور کعبہ گرانے میں مخلوق کے حق میں کمی اور تعدّی (حد سے بڑھ جانا) تھا اور بعض اوقات مخلوق کے حق میں کمی اور تعدّی کو برداشت نہیں کیا جاتا جیسے ڈاکو' باغی اور قاتل خواہ وہ مسلمان ہوں' اُن کو قتل کر دیا جاتا ہے اور جہاد میں جو کافر بوڑھا' اندھا' بچہ یا عورت ہو تو اُسے قتل نہیں کیا جاتا کیونکہ وہ مخلوق کو ضرر نہیں پہنچاتے۔

مولانا غلام رسول سعیدی کے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ کعبہ میں بُت پرستی کرتے تھے' وہ اگرچہ مشرک تھے لیکن بیت اللہ کی تعظیم کرتے تھے اور اُس کا طواف کرتے تھے اور چونکہ اُن کی نیت بیت اللہ کی تعظیم کی تھی اس لئے اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے عذاب کو آخرت میں رکھا اور دنیا میں مؤخر کر دیا جبکہ ابرہہ اور اُس کے لشکر کی نیت بیت اللہ کی توہین اور اس کی تخریب کی تھی' اس لئے اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں ہی اُنہیں پرندوں سے ہلاک کرادیا۔

شروع سورہ میں فرمایا کہ (اے نبی!) کیا آپ نے نہیں دیکھا؟ حالانکہ یہ واقعہ آپ کی بعثت سے ۴۰ سال پہلے کا ہے' تو جو واقعہ آپ کی پیدائش سے پہلے رونما ہوا اُسے آپ کیسے دیکھ سکتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ تواتر سے ثابت تھا اور اس کا علم عرب میں ہر کس و ناکس کو ہو چکا تھا۔ لہٰذا فرطِ شہرت و تواتر سے مثل مشاہدہ کے تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سِجِّیل کا لفظ فارسی میں سنگ و گل کا مجموعہ ہے یعنی وہ کنکریاں مٹی کی بھی تھیں اور پتھر کی بھی تھیں (جامع البیان رقم الحدیث: ۲۹۳۹۸)

(۵) علم نوعِ انسان (ANTHROPOLOGY)

''علم نوع انسان' انسان کا مطالعہ ہے۔ یہ موضوع بہت پیچیدہ ہے اور اس کا دائرۂ بحث یہ ہے: عالمِ حیوانیات میں انسان کا مقام' اُس کی طبعی' ذہنی اور اخلاقی خصوصیات' اُس کی تاریخ' ترقی' زبان کی ابتدا اور ترقیاتی مراحل' اخلاقیات' مذہب اور سماجی ادارے' اُس کی قوموں اور ذاتوں میں نسل در نسل تقسیم اور وہ تمام سرگرمیاں جن کا انسان اہل ہے۔'' (Everyman's Encyclopaedia, Vol. 1, p. 358)

''نوعِ انسان کا علم حیاتیاتی اور ثقافتی دونوں کے تناظر میں انسان کا مطالعہ ہے۔ نوعِ انسان کے اُس علم کو جس کا تعلق انسان کی حیوانی جہت سے ہے ''طبعی علمِ نوعِ انسان'' کہلاتا ہے۔ وہ حصّہ جس کا تعلق معاشرے میں رہتے ہوئے انسان سے ہے' کو ''ثقافتی علمِ نوعِ انسان'' کہتے ہیں۔ کوئی بھی ماہرِ بشریات اِس تعریف کا امکانی حد تک احاطہ نہیں کرسکتا' تاہم بشریاتی تحقیق میں انسان اس کا محور و مرکز ہے۔'' (Encyclopedia Americana, Vol. II, p. 43)

یونانی زبان میں Enthropos کا مطلب انسان ہے جبکہ Logos کا لفظ سائنس کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے Anthropology انسان کی فطری تاریخ کا نام ہے۔ اِس لفظ کو سب سے پہلے آٹو کیسمین نے ۱۵۹۴ء میں استعمال کیا تھا لیکن نوعِ انسان کے علم نے سائنسی شکل اُس وقت تک اختیار نہیں کی جب تک نظریہ ارتقاء متعارف نہیں ہوا اور یہ اُنیسویں صدی کے دوسرے نصف میں ہوا۔ (Hutchinson 20th Century Encyclopedia, p. 57)

(A) طبعی علمِ بشریت (PHYSICAL ANTHROPOLOGY)

اسے دو ذیلی عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نسلِ انسانی کے ارتقاء کو سمجھنے اور پھر ڈارونزم کی تردید کے لئے یہ دونوں عنوان برابر کی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) پہلے انسان (آدم) کی تخلیق جو کیمیائی عمل سے ہوئی۔
(۲) آدم کی رفیقہ حیات حضرت حوا اور اُن کی اولاد جن کی تخلیق حیاتیاتی عمل سے ہوئی۔

صفر مقدار اور تخلیق انسانی : قرآنِ حکیم انسان کو اُس کی ابتدا پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہ کہ اس کا وجود کہاں سے اور کیسے آیا؟

(۱) قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَّكَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا○ قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا○ (مریم: ۸، ۹)

''(زکریا) بولے: اے میرے پالنہار! میرے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی انتہا کو پہنچا ہوا ہوں! (اللہ نے) فرمایا (نہیں بلکہ) اِسی طرح (اے زکریا!) تمہارے پروردگار کا قول ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور میں نے ہی تمہیں پیدا کیا درآنحالیکہ تم کچھ نہ تھے۔''

انبیائے کرام علیہم السلام کی یہ ایک خصوصی شان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کام پر بطور سوال و جواب عرض ومعروض کے عاجزانہ طریقے پر رب تعالیٰ سے پوچھ لیتے ہیں کہ یہ کیسے ہے اور کیسے ہوسکتا ہے۔ رب تعالیٰ اِس استفساری سوال و جواب پر ناراض نہیں ہوتا بلکہ کمال محبت سے تسلی بخش جواب عطا فرماتا ہے جیسا کہ اِن آیات سے معلوم ہورہا ہے۔ یہ اعزازی جرأت کسی اور کو حاصل نہیں یہاں تک کہ کوئی مقرّب فرشتہ بھی ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔ محبوبیت کی یہ عظیم دلیل ہے۔ (تفسیر نعیمی ج ۱۶، ص ص ۱۳۴، ۱۳۵۔ از مفتی اقتدار احمد خان نعیمی)

(۲) أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا○ (مریم: ۶۷)

''کیا انسان کو یہ یاد نہیں کہ ہم ہی اِس سے پہلے اُسے پیدا کرچکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔''

انسان نام ہے جسم اور روح کے باہم ملاپ کا۔ موت بھی فقط جسم پر وارد ہوتی ہے نہ کہ روح پر۔ روحیں عالمِ ارواح میں کروڑوں سال پہلے سے تھیں اس کے باوجود فرمایا گیا وَلَمْ يَكُ شَيْئًا (جبکہ وہ کچھ بھی نہ تھا) موت کے بعد بھی روحیں بنفسہ موجود مگر انسان کو فنا۔ ثابت ہوا کہ جسم کی فنا انسان کی فنا اور موت ہے۔

(۳) هَلْ أَتٰى عَلَى الْإِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا○ (الدّھر: ۱)

''بے شک انسان پر زمانہ میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے کہ وہ کوئی قابلِ ذکر چیز ہی نہ تھا۔''

قرآن مجید خود اِس سوال کا جواب دیتے ہوئے انسان کو یاد دلاتا ہے کہ اُس کے خالق کا اُس پر کیا حق ہے:

يٰٓأَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ○ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ○ فِيْ أَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ○ (الانفطار: ۶۔۸)

''اے انسان! تجھے (آخر) کس چیز نے اپنے پروردگار سے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے۔ (وہ پروردگار) جس نے تجھے پیدا کیا، پھر تجھے درست کیا، پھر تجھے اعتدال پر بنایا، (اور) جس صورت میں بھی چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔''

انسان کی خِلقت وترکیب اور پھر اُس کے متضاد قویٰ میں ترتیب وتناسب' صفاتِ قدرت وصنعت و حکمت کا بہترین نمونہ ہے۔ سوال سے مقصود غیرت دلانا ہے کہ اِن نعمتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ تو ادائے شکر کرتا' نہ کہ ناشکری۔ مَا شَآءَ میں اشارہ یہ ہے کہ انسان کی صورت وسیرت تمام تر اللہ کے اپنے ارادہ کا نتیجہ ہے۔ باہر سے کوئی قوت اُس کے ارادہ کو مجبور یا متاثر کرنے والی نہیں۔

پہلے انسان کی تخلیق کیمیائی عمل کے ذریعے: سب سے پہلے رب تعالیٰ نے واحد انسان یعنی آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا۔ آدم سے اُس نے اُن کی رفیقہ حیات حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ پھر اُن دونوں کے ملاپ سے لاتعداد مردوں اور عورتوں کو (زمین میں) پھیلا دیا۔ اس ضمن قرآن مجید کہتا ہے:۔

(۱) يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْرًا وَّنِسَآءً (النساء : ۱)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا پیدا کیا اور اُن دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیئے۔''

وحدتِ نوع انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دُور رَس نتائج کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ قرآنِ حکیم انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کرتا ہے اور ہر اُس نظریہ اور عقیدہ کی تردید کرتا ہے جو انسان کی تخلیق کے منافی ہے۔ رِجَالاً كَثِيْرًا (بہت سے مرد) سے معلوم ہوا کہ مردوں کی کثرت محسوس ہے اور عورتوں کی کثرت غیر محسوس ہونی چاہئے کہ اُن کی کثرت اُن کے پردہ کی وجہ سے غیر محسوس ہے۔ ورنہ عورتوں کی کثرت کو بھی بیان کیا جاتا۔

(۲) هُوَالَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَالِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف:۱۸۹)

''وہ وہی تو ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اُس سے تسکین حاصل کرے۔''

نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے معلوم ہوا کہ اولاد باپ کی ہوتی ہے اور اُسی سے اولاد کا نسب چلتا ہے۔ لہٰذا اگر باپ سیّد ہو اور ماں غیر سیّد تو اولاد سیّد ہوگی اور اگر ماں سیّدانی ہو مگر باپ سیّد نہ ہو تو اولاد بھی سیّد نہ ہوگی۔

آدم بطور خلیفۃ اللہ: آدم علیہ السلام کا جسدِ خاکی بنانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ارادے کو فرشتوں پر ظاہر کیا کہ وہ آدم کو پیدا کرنے والا ہے جو زمین پر اُس کا نائب ہوگا:۔

(۱) وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (البقرۃ: ۳۰)
"اور وہ وقت یاد کیجئے جب آپ کے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین پر اپنا نائب بنانے والا ہوں۔"

اِذْ ظرفِ زماں ہے اور کسی گزشتہ واقعہ کی یاد دلانے کے لئے آتا ہے جبکہ اِذَا کسی مستقبل کے واقعہ پر آتا ہے۔ بعض نے اس سے پہلے اُذْکُرْ محذوف مانا ہے (بمعنیٰ "یاد تو کیجئے۔") (تفسیر کبیر)۔ خلیفہ نائب یا قائم مقام کو کہتے ہیں۔ جب اصل شخص خود کارِ حکومت انجام نہ دے سکے تو اُس کا خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے' یا اصل شخص کہیں چلا جائے تو اُس کی جگہ عارضی طور پر کام کرنے کے لئے خلیفہ مقرر کرتے ہیں یا اصل شخص فوت ہو جائے تو اُس کی جگہ خلیفہ مقرر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہیں جانے یا فوت ہونے سے پاک ہے تو پھر اُسے خلیفہ کی کیا ضرورت تھی؟ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہ تھی بلکہ بندوں کو ضرورت تھی کیونکہ انسان اپنی مادّی کثافت اور عدمِ قرب کے حجابات کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست فیض حاصل نہیں کرسکتا تھا اور اُس سے احکام وصول نہیں کرسکتا تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے اور انسانوں کے درمیان ایک خلیفہ بنایا اور اُس کا نام نبی اور رسول رکھا اور انبیاء علیہم السلام کو ایسی صلاحیّت اور استعداد بخشی کہ وہ فرشتوں کے واسطے سے یا بلا واسطہ اللہ تعالیٰ کے احکام حاصل کرسکیں۔ عام انبیاء اور مرسلین کی طرف فرشتے بھیجے جاتے ہیں اور مقربین سے اللہ تعالیٰ خود بھی کلام فرماتا ہے' جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام بمقام میقات اور ہمارے نبی اکرم ﷺ بموقعہ معراج۔

خلیفہ کا ایک معنیٰ یہ ہے کہ جو اللہ کا نائب اور اُس کا خلیفہ ہو اور اللہ سے احکام حاصل کر کے بندوں تک پہنچائے۔ یہ معنیٰ نبی اور رسول کے ہم معنیٰ ہے۔ خلیفہ کا دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ جو نبی اور رسول کا نائب اور اُس کا خلیفہ ہو' وہ نبی کی بیان کی ہوئی شریعت کو لوگوں پر نافذ کرے اور منہاجِ نبوّت پر حکومت چلائے' جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے بارے میں سورہ صٓ میں ذکر ہوا۔ آیت مذکورہ میں خلیفہ کا یہی دوسرا معنیٰ مراد ہے کہ آدم* اور اُن کی اولاد اللہ کی دھرتی پر اللہ کی توحیدِ خالص کو نافذ کریں گے۔

آدم علیہ السلام کا مقام اعلیٰ اور فرشتوں پر اُن کی برتری: تخلیقِ آدم کی تکمیل کے بعد اللہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں' جس کے پسِ پردہ حکمت یہ تھی کہ بہ حیثیت خلیفۃ اللہ' آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری کو واضح کر دیا جائے' چنانچہ قرآن فرماتا ہے:۔

فَاِذَا سَوَّیْتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَہٗ سٰجِدِیْنَ ۝ (اَلْحِجر: ۲۹؛ صٓ: ۷۲)
"سو جب میں اُسے پورا بنا چکوں اور اُس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔"

* آدم کو اُن کے گندمی رنگ کی وجہ سے آدم' جسم کی ظاہری وضع' چہرے اور جلد کی ساخت کے لحاظ سے بشر اور حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے انسان فرمایا۔

رُوح کی اپنی طرف اِضافت اُس کی تعظیم و تکریم کی وجہ سے ہے جیسا کہ یہ آیات: وَطَهِّرْ بَیْتِیَ یعنی میرے گھر کو پاک رکھنا [الحج: ۲۶] اور یَا عِبَادِیَ (اے میرے بندو!) [العنکبوت: ۵٦] اِن آیات میں اللہ تعالیٰ نے بیت اور بندوں کے شرف اور اُن کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے اپنی طرف اِضافت کی ہے کہ یہ میرا گھر ہے اور یہ میرے بندے ہیں۔ اسی طرح اِس رنگ رنگیلی کائنات کے دُولہا حضرتِ انسان کی قدر و منزلت کے اظہار کے لئے فرمایا گیا کہ جب میں اپنی طرف سے رُوح اُس میں پھونک دوں۔ امام رازیؒ نے کہا کہ (۱) آیت میں رُوح کو اپنی جانب نسبت دے کر اِس امر کو ظاہر کیا ہے کہ روح ایک شریف و معظم جوہر ہے۔ (۲) آیت سے معلوم ہوا کہ خلقتِ انسانی کی تکمیل دو اُمور پر موقوف ہے: تسویہِ جسد (جسم کا متناسب بنانا) اور نفخِ روح (روح کا اُس میں پھونکا جانا)۔

آدم کی قدر و منزلت اور مرتبہ عالیہ کو اُجاگر کرتے ہوئے رب تعالیٰ نے ابلیس سے پوچھا تھا کہ تو اُس کے آگے سجدہ ریز کیوں نہ ہوا جسے میں نے اپنے دستِ خاص سے تخلیق کیا:۔

مَامَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص: ۷۵)

يَدَيَّ (دونوں ہاتھ) کے صیغہ تثنیہ کی توجیہ میں بعض صوفیہ نے کہا کہ مراد صفاتِ جمال و جلال ہیں، جو اُمّ الصفات ہیں۔ اس کی ایک تعبیر قوائے ملکوتی اور قوائے حیوانی سے بھی کی جا سکتی ہے، جو بالترتیب صفتِ لطف و صفتِ قہر بھی ہو سکتی ہیں۔

<u>آدم علیہ السلام کی پیدائش خاص</u>: قرآن مجید فرماتا ہے:

(۱) وَإِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ "بَشَرًامِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُونٍ" ٥ (الحجر: ۲۸)

"یاد تو کیجئے اُس وقت کو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں لَسدار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔"

(۲) إِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ "بَشَرًامِّنْ طِينٍ" ٥ (ص: ۷۱)

"یاد تو کیجئے اُس وقت کو جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں گیلی مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔"

اِن آیات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری یہ مادّی دُنیا تخلیقِ آدم اور اُس میں روح پھونکے جانے سے بہت پہلے بنائی گئی تھی۔ علمِ ارضیات بھی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اِس سیارے پر انسان کی آمد کافی دیر سے ہوئی۔ (عبداللہ یوسف علی، نوٹ: ۴۲۲٦)

سورۃُ البقرۃ کی آیت ۳۱ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَآءَ كُلَّهَا (اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو سب کے سب نام سکھا دئے) اِس حقیقت سے پردہ اٹھاتی ہے کہ آدم کے آنے سے بہت پہلے چیزیں زمین پر موجود تھیں۔

(الف) انسانی تخلیق کے کیمیائی مراحل

قرآن مجید انسانی تخلیق کے کیمیائی اور حیاتیاتی دونوں مرحلوں کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ انسانی زندگی اپنے آخری مرحلے میں پہنچنے سے پہلے کئی کیمیائی مراحل سے گزری اور اِس سارے عمل کو کیمیائی تخلیق کا نام دیا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے یہ کیمیائی مراحل صدیوں پہلے بتا دئے تھے جبکہ جدید سائنس نے صدیوں کی تحقیق کے بعد اِن کا پتہ اب لگایا ہے۔ قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ انسانی زندگی اپنی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے مندرجہ ذیل سات مراحل سے گزرتی ہے:۔

(۱) غیر نامیاتی (Inorganic) مادّہ : هُوَالَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَاب (المؤمن : ۶۷)
''وہ وہی تو ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔''
آیتِ بالا کے مندرجہ ذیل حصّہ میں حیاتیاتی ارتقاء کے مراحل کو بھی بیان کیا گیا ہے:۔
ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلاً (المؤمن : ۶۷)
''پھر نطفہ سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر تمہیں بچہ کر کے نکالتا ہے۔''

(۲) پانی : انسانی زندگی کی کیمیائی تخلیق کا دوسرا مرحلہ پانی ہے جس کے متعلق قرآن نے فرمایا:۔
(i) وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ أَفَلاَ يُؤْمِنُوْنَ٥ (الانبیاء : ۳۰)
''اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے' کیا پھر بھی یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ؟''

پانی سے نطفہ مراد لینا صحیح نہیں کیونکہ ہر چیز نطفے سے نہیں بنی۔ ملائکہ' جنّات' خود آدم علیہ السلام' حضرت حوّا' حور و غِلمان یانی یعنی نطفے سے نہ بنائے گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ آیت میں خلقتِ اوّل کا ذکر ہے کہ ہر چیز (زمین' آسمان' ملائکہ' جنّات) پانی سے بنی۔ اس طرح کہ پانی کے جھاگ سے زمین' اُس کے بخارات سے آسمان' پانی سے نطفہ اور نطفے سے تمام حشرات' حیوانات' پانی سے شجرات' شجرات سے نار' نار سے جنّات' پانی سے ہوا اور ہوا سے نور اور نور سے ملائکہ وغیرہ بنے۔ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ خطاب کفار سے ہے' اس لئے حَیّ سے وہی جاندار اشیاء مراد ہیں جنہیں یہ لوگ دیکھ سکتے ہیں' وہ چیزیں مراد نہیں جنہیں یہ دیکھ نہیں سکتے۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ لفظ کُل محاورہ میں تقریباً کل یا بہت بڑی اکثریت کے ہم معنی

مستعمل ہے۔ اس لئے اگر کسی جاندار کی پیدائش کا استثناء اِس قاعدے سے ثابت ہو جائے تو یہ عمومِ قانون کے منافی نہیں۔

جدید ماہرینِ علم الحیات کی تحقیق یہ ہے کہ ہر جاندار کی ترکیب میں عنصر اصلی پروٹو پلازم (نخرمایہ) کا ہوتا ہے۔ اگر اسی کو صحیح مان لیا جائے تو اس جوہر میں بھی حصّہ غالب (۸۰ تا ۸۵ فیصد) پانی ہی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کے اس ایک بیان سے قوتِ حیات (VITALITY) کے نظریہ کو اتنی وسعت مل جاتی ہے کہ یہ وائرس اور (DNA) مالیکیول وغیرہ کا مکمل احاطہ کر لیتی ہے۔ اس طرح ایک سائنسی حقیقت کو چودہ صدیاں قبل ہی انسانیت کو بطور پیشگی بتا دیا گیا۔

''یہ آیت اُن سائنسدانوں کے لئے دعوتِ ایمان ہے جو انسان اور زمین کے مختلف ارتقائی مراحل کی تحقیق میں مصروف ہیں۔'' ("Creation of Man"--Prof. Dr. Tahir-ul-Qadri, p. 39)

''اس حوالے سے پانی سے مراد بجا طور پر پروٹو پلازم لیا جا سکتا ہے جسے کچھ سال پہلے ہکسلے نے زندگی کی اصل بنیاد قرار دیا تھا۔ یہ پروٹو پلازم تمام جاندار چیزوں میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔''
("Collected Essays"--- Huxley, Vol. 1, p. 131 w.r.t. Tafsir Majidi English)

''یہ وہ اٹوٹ انگ مواد ہے جس سے تمام جاندار مخلوقات بنتی ہیں۔ یہ پروٹو پلازم تقریباً آبی شکل میں ہے کیونکہ پانی مادۂ حیات کا سب سے اہم اور اکثریتی جزو ہے۔'' (انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا' جلد ۱۸' ص ۶۱۷)

''ہزاروں ممکنہ مائعات میں سے پانی کے علاوہ شاید ایک بھی ایسا مائع نہیں جو کسی طور پر بھی زندگی کے لئے مددگار ہو۔ علاوہ ازیں ہر جاندار نامیہ کی بافت میں پانی کا فیصد حصّہ بہت زیادہ ہوتا ہے جو اس کی ترکیب میں بہت ہی اہم جزو ہوتا ہے۔ ہمیں یہ تصوّر کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر پانی کو الکوحل' نشاستہ اور تیل سے خارج کر دیا جائے تو اُن کے متبادل کا ملنا ناممکن ہو جائے گا۔''
("Biology and Christian Belief" ... Greenwood, p. 180)

(ii) وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا وَ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا۝ (الفرقان : ۵۴)
"اور وہ وہی ہے جس نے انسان کو پانی سے پیدا کیا پھر اُسے خاندان والا اور سسرال والا بنا دیا اور آپ کا پروردگار بڑی ہی قدرت والا ہے۔"

اسلام نے سارے انسانی معاشرہ کی بنیاد خاندان ہی پر رکھی ہے اور سسرال کو بھی خاندان ہی کا ایک جزو ٹھہرایا ہے۔ انسان کو اپنی ذات میں غور و فکر کی دعوت دی جا رہی ہے کہ ذرا دیکھ' ہم نے تجھے پانی کی ایک بوند سے پیدا کیا ہے۔ کہاں وہ قطرۂ آب اور کہاں یہ تیرا حسین و جمیل سراپا' یہ رخسارِ گلگوں اور یہ زیبا قامت کس کی حکمتِ کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ ذرا مزید غور کرو' خلاقِ عالم نے صرف ایک صنف ہی (مرد یا عورت) پیدا نہیں کی بلکہ دونوں کو پیدا فرمایا۔ دونوں کے ظاہری اعضاء میں واضح فرق ہے' اُن کے ذہنی رُجحانات اور قلبی احساسات و جذبات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن اس واضح فرق کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے جزوِ لاینفک ہیں۔ مرد اپنی ساری قوتوں کے باوجود نامکمل ہے اور عورت اپنی تمام تر لطافتوں کے باوجود ادھوری ہے۔ دونوں مل کر ایک مکمل وحدت بنتے ہیں۔ یہ وحدت بانجھ نہیں بلکہ کثیر التعداد وحدتوں کا سرچشمہ ہے۔ ان کے ہاں بچیاں بھی ہوں گی اور بچے بھی۔ کسی کے یہ سسرال بنیں گے اور کوئی ان کے بچوں کے سسرال ہوں گے' باہمی رشتے ہوں گے' قرابتیں بڑھیں گی اور اس طرح ایک انسانی معاشرہ وجود میں آئے گا' جس کا ہر فرد دوسرے افراد سے محبت و پیار' شفقت و احترام کے رشتوں سے بندھا ہؤا ہوگا۔ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا (آپ کا پروردگار بڑی ہی قدرت والا ہے) فرما کر انسانی فکر کو اپنی قدرتِ مطلقہ کے ماننے پر مجبور کر دیا کہ بظاہر کیسی بے حقیقت چیز سے کتنے عظیم الشان اور دُور دراز کے تعلقات قائم کر دیئے!

(۳) مٹی: انسانی زندگی کی تخلیق کا تیسرا کیمیائی مرحلہ مٹی ہے جس کے متعلق یوں ارشاد ہؤا :۔

هُوَالَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِيْنٍ (الانعام : ۲)

''وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔''

طِین اور تُراب کے مابین فرق قائم کرنے کے لئے ہم طِین کا ترجمہ خشک مٹی سے اور تُراب کا ترجمہ گرد و غبار والی مٹی سے کرتے ہیں۔

(۴) چپکتی ہوئی مٹی: انسانی زندگی کی تخلیق کا چوتھا کیمیائی مرحلہ چپکتی ہوئی مٹی کا ہے۔ قرآن شریف میں اللہ تبارک و تعالیٰ اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ ٥ (اَلصَّافّات : ۱۱)

''بے شک ہم نے اُن لوگوں کو چپکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔''

یہ چپکتی ہوئی مٹی ایسی معمولی اور کمزور ہے کہ نہ قوت میں کوئی امتیاز رکھتی ہے اور نہ صلاحیت میں۔

اعترافات (منجانب مؤلف انسائیکلوپیڈیا)
(ACKNOWLEDGEMENTS)

سب سے پہلے راقم الحروف اپنے والدین مرحومین کا نہاں خانۂ دل سے ممنونِ احسان ہے جنہوں نے مجھ ناچیز کو قرآن کی نعمتِ غیر مترقبہ سے مالا مال کیا۔ بندے کا رُواں رُواں اور ہر ہر سانس اُن کی مغفرت اور جنات الفردوس میں مقامِ ارفع واعلیٰ کے لئے ربّ ذوالجلال کے حضور فریاد کناں رہتا ہے۔

اپنے روحانی استادِ مکرّم جناب حافظ گل محمد صاحب مرحوم اور بالخصوص مولانا منظور احمد خان پٹیالوی رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت اور ترقی درجات کے لئے بھی دعا گو ہوں جنہوں نے قرآن مجید صحیح مخارج حفظ کرانے کے ساتھ ساتھ بندۂ پُر خطا میں حُبُّ اللہ و حُبُّ الرّسول کی لو سلگائی اور وقتاً فوقتاً اُس لو کو تیز سے تیز تر کرتے رہے۔

استادِ محترم جناب احمد نواز خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی مغفرت اور بلندیِ درجات کے لئے ربّ العالمین کے حضور دست بہ دعا رہتا ہوں جنہوں نے اپنی بے لوث اور بے غرض محنت سے بندے میں حصولِ علم کی لگن اور تڑپ پیدا کی جس کی بدولت میں اپنے خالقِ رحیم وکریم کا اَبدی پیغام انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اُس کے بندوں تک پہنچانے کے قابل ہوا ہوں۔

یوں تو راقم الحروف کو تعلیمی دُنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر قابل ترین اساتذہ ملتے رہے لیکن اُن میں سے کچھ ایسے ہیں جن کے طرزِ حیات نے اُس کے دل ودماغ پر اَن مٹ' مثبت نقوش چھوڑے ہیں۔ اس طویل تفصیل میں سرِ فہرست میرے سکول کے عربی ٹیچر جناب عبدالمجید مرحوم' کالج کے عربی پروفیسر جناب منظور احمد مرحوم اور یونیورسٹی لائف میں جناب ڈاکٹر پروفیسر صوفی ضیاء الحق صاحب مرحوم ومغفور ہیں۔ اللہ ربّ العزت میرے سب اساتذہ کرام اور والدین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے! آمین بجاہ خاتم النّبیین ﷺ

اپنے انتہائی محترم دوست اور بھائی جناب پروفیسر (ر) حنیف بیگ صاحب جو کالج میں میرے رفیقِ کار بھی رہے ہیں' کا بہ صمیمِ قلب شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کمال شفقت اور محبت سے انسائیکلوپیڈیا کے ابتدائی کچھ حصّوں کا مجھے اردو میں ترجمہ کر کے دیا۔ اللہ ربّ العزت اُنہیں اس کی جزائے خیر عطا فرمائے! آمین۔

انتہائی ناقدر شناسی ہوگی اگر اس موقع پر اپنے سابق رفیقِ کار اور تلمیذ پروفیسر شیخ محمد منیر زید مجدہ' کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے کمال فیاضی سے اپنی لائبریری میں سے بڑی نادر کتب میرے ہاں استفادہ کے لئے

یہ چپکتی ہوئی لیسدار مٹی طِیــن کی اگلی شکل ہے اور اس مرحلے میں مٹی کی موٹائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب پانی کا بہاؤ مٹی سے رک جاتا ہے تو یہ لیسدار چپکتی مٹی بن جاتی ہے۔ یہ تھوڑی سی سخت ہو جاتی ہے اور چپکنے لگ جاتی ہے۔

(۵) طبعی اور کیمیائی طور پر تبدیل شدہ گارا: انسانی تخلیق کا یہ پانچواں کیمیائی عمل ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ○ (اَلْحِجر : ۲۶)

''اور بالیقین ہم نے انسان کو لس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔''

صَلْصَال: وہ خشک مٹی جسے آگ نے نہ چھوا ہو، جس میں انگلی مارنے سے بجنے کی آواز آئے اور جب اُسے آگ پر گرم کر لیا جائے تو وہ ٹھیکرا (فَخّار) بن جائے۔

حَمَا: سیاہ بدبودار مٹی

مَسْنُوْن: وہ چیز جو متغیر ہو گئی ہو یعنی سڑ گئی ہو (المفردات) جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۹ میں ہے: لَمْ یَتَسَنَّهْ (وہ کھانا سڑا گلا نہیں ہے)

تو انسانی تخلیق کے کیمیائی مراحل یہ ہوئے کہ پہلے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر گارے سے، پھر سیاہ سڑے ہوئے بدبودار گارے سے، پھر ٹھیکرے کی طرح بجنے والی خشک مٹی سے۔

(۶) سوکھی ہوئی اور کھنکھناتی خالص مٹی :

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ کَالْفَخَّارِ ○ (اَلرَّحْمٰن : ۱۴)

''اُس نے انسان کو (ایسی مٹی سے) پیدا کیا جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔''

جب جلنے کا عمل مکمل ہو جاتا ہے تو مٹی خشک ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ شکل کو صَلْصَالٍ کَالْفَخَّار کہا گیا ہے۔ اس تشبیہ میں دو حوالہ جات موجود ہیں :۔

(۱) جلنے کے بعد مٹی کا خشک ہو کر ٹھیکری ہو جانا۔

(۲) میل مٹی اور گندگی سے نکالنے کے بعد وہ خالص بن جائے۔

لفظ فَخَّار کا مصدر ف۔خ۔ر' ہے جس کے معنیٰ ترجیح کے ہیں۔ عام طور پر پانی کے پیالے کو بھی فَخَّار

کہتے ہیں۔ آگ میں پکانے سے وہ ٹھیکری بنتا ہے اور اتنا سخت ہو جاتا ہے کہ اُس کی آواز آتی ہے۔ اِسی وجہ سے اس کا تعلق فَخَّار سے ہے (بمعنیٰ فخر کرنے والا)۔ لفظ فَخَّار کا ایک معنیٰ شائستگی اور خوش ذوقی بھی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ اِس نکتے کی وضاحت کر رہے ہیں کہ انسان کی تخلیق کے دوران مٹی کو اتنا جلایا گیا کہ وہ خشک ہوگئی۔ اِس مٹی کو تمام تر آلودگی سے پاک کیا گیا تو یہ نفیس اور اعلیٰ شکل کی ہوگئی۔ اور جب یہ مٹی صَلۡصَالٍ کَـالۡفَخَّار کے مرحلے میں پہنچی تو یہ ٹھیکری کی طرح سخت ہوگئی اور اس نے نفاست کے تمام مراحل سے گزرنے کے بعد ایک خوبصورت شکل اختیار کر لی۔ اب یہ صاف ستھرا' خالص مواد انسان کا ڈھانچہ بنانے کے لئے تیار تھا۔ انسان اور جن کی تخلیق میں فرق یہ ہے کہ جن کی تخلیق آگ سے ہوئی جبکہ انسان کے معاملے میں نفاست' صفائی اور پاکیزگی کو قائم رکھنے کے لئے آگ کو استعمال کیا گیا۔ جنات کی تخلیق کی طرح آگ کو انسان کا حصہ نہیں بنایا گیا۔

(۷) <u>خالص مٹی کا کشید (عرق)</u> : زندگی کی کیمیائی تخلیق کا ساتواں مرحلہ خالص مٹی کا نچوڑ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں :-

وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ o (المؤمنون:۱۲)

''اور بالیقین ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔''

''لفظ سُلٰلَة کا ماخذ سَلَّ ہے جس کا معنیٰ کسی چیز کو گندگی سے صاف کرنے کا ہے۔ لہٰذا سُلٰلَة اُس وقت وجود میں آتا ہے جب ہم کسی چیز کو بہت حد تک صاف کر کے اُس کی گندگی کو نکال دیتے ہیں اور اس کے نچوڑ کو خالص شکل میں لے آتے ہیں۔ اِس طرح سُلٰلَة کسی چیز کی بہت ہی خوبصورت اور نفیس شکل ہے اور اُسے اس چیز کا نچوڑ کہا جاتا ہے۔'' ("Creation of Man" ... Prof. Dr. Tahir-ul-Qadri, pp. 38-45)

(ب) <u>انسانی تخلیق کے حیاتیاتی مراحل</u>

انسانی تخلیق کے کیمیائی اور حیاتیاتی ہر دو عوامل کی وضاحت میں سب سے اہم چیز جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ اللہ نے انسان کو مختلف مراحل میں تخلیق کیا ہے' جیسا کہ سورہ نُوح کی آیت ۱۴ میں ارشاد ہوا :-

وَقَدۡ خَلَقَكُمۡ أَطۡوَارًا o (اور اُس نے تمہیں مرحلہ وار پیدا فرمایا)

اِن مراحل کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) جنسی تولیدی عمل : اس عمل میں دو قسم کے صنفی بالغ تخم خلیے (زواجے) کارفرما ہوتے ہیں: نر کا تخلیقی مادہ (نطفہ) اور مادہ کا تخلیقی مادہ (بیضہ)۔ عام حالات میں جب کوئی بیضہ نطفہ سے بارور ہوتا ہے تو ایک نیا فرد وجود میں آتا ہے۔ ("The New Book of Popular Science", Vol. V, p.318)

قرآنِ حکیم اِس تولیدی عمل کو یوں بیان کرتا ہے :۔

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلاً خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِه (الاعراف : ۱۸۹)

"پھر جب مرد اُسے ڈھانپ لیتا ہے تو اُسے ہلکا سا حمل رہ جاتا ہے، پھر وہ اُسے لئے ہوئے چلتی پھرتی ہے۔"

تَغَشّٰهَا میں کنایہ مباشرت سے ہے (قرطبی، کبیر)۔ جماع اور صحبت اگرچہ فریقین کا کام ہے مگر فاعل مرد اور مفعول عورت ہوگی کیونکہ چھا جانے اور ڈھانپنے کا عمل مرد کی طرف منسوب کیا جا رہا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ابتدائی مراحل میں ترقی پذیر بیضہ کو جو باروری کا نتیجہ ہوتا ہے، آنے والے بچے سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ یہ خوردبین سے مشاہدہ کیا جانے والے خلیوں کا محض ایک دھبہ ہوتا ہے، ہر خلیے کا ایک مرکزہ ہوتا ہے جو تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتا ہے اور آخرکار حتمی افزائش کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ بچہ والد اور والدہ کے جنسیاتی خلیوں کے موروثی خصوصیات کا نتیجہ ہوتا ہے۔

(۲) باروری : جماع کے نتیجے میں جب مادہ منویہ اندامِ نہانی میں ٹھہر جاتا ہے، تو نطفہ اپنی حرکات اور رِحم کے سکڑنے کے عمل سے ہوتا ہوا اپنا راستہ بناتا ہے۔ پھر (نر اور مادہ کے) یہ دونوں مادّے بیضہ دانی سے ہوتے ہوئے رِحم میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر اِس وقت اُن دونوں میں سے کسی ایک میں بھی پختہ بیضہ موجود ہو تو مادہ منویہ بیضے میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسا ہونے پر نر اور مادہ بیضے آپس میں مل جاتے ہیں۔ اس سے باروری کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اب وہ خلیہ جفتہ (Zygote) کہلاتا ہے (یعنی نر کا نطفہ + مادہ کا بیضہ = جفتہ)۔ اب اس میں لونیے (Chromosomes) کا پورا کوٹہ ہوتا ہے، نصف بیضے سے حاصل شدہ اور نصف نطفے سے حاصل شدہ۔ تو یوں دونوں طرف سے نسل (کو بڑھانے والے) مادے آپس میں مل جاتے ہیں اور موروثیت کا میکانی نظامِ حرکت میں آ جاتا ہے۔ جیسے جیسے نامیے کی افزائش ہوتی ہے، خلیہ تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرتا رہتا ہے۔

قرآنِ حکیم باروری کے اس عمل کو کئی مقامات پر بیان کرتا ہے۔ مثلاً:

(i) ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَه، مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ٥ (السّجدة : ۸)

"پھر اُس کی نسل نچڑے ہوئے بے قدر پانی سے چلائی۔"

(ii) أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ٥ (اَلْقِيٰمة : ۳۷)
"کیا یہ شخص (محض) ایک قطرۂ منی نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا۔"

نطفہ اُس قلیل پانی کا نام ہے جو مرد کی پشت اور عورت کے سینہ کی پسلی کے درمیان ہوتا ہے اور اُسے مرد عورت کے رِحم میں ڈال دیتا ہے۔ اس آیت میں انسان کی تحقیر و تذلیل کی طرف اشارہ ہے کہ انسان اُس منی سے پیدا کیا گیا ہے جو نجاست کے مخرج سے نکلتی ہے' جو اگر انسان کے جسم پر لگ جائے تو جسم ناپاک اگر اس کے لباس پر لگ جائے تو وہ لباس ناپاک ہو جاتا ہے۔ سو جب انسان ایسی حقیر چیز سے پیدا کیا گیا ہے تو پھر اُسے اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے اکڑنا اور اُس کی عبادت کرنے میں عار محسوس کرنا کیسا!

(iii) اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ (اَلدَّهر : ۲)
"بے شک ہم نے ہی انسان کو مخلوط نطفہ سے پیدا کیا۔"

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مرد کا پانی گاڑھا سفید اور عورت کا پانی پتلا پیلا ہوتا ہے۔ اِن دونوں پانیوں سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اِن میں سے جس کا پانی غالب یا سابق ہو' بچہ اُسی کے مشابہ ہوتا ہے۔
(صحیح مسلم؛ سنن نسائی؛ سنن ابن ماجہ)

نطفہ کے اختلاط سے مراد یہ ہے کہ نطفہ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف اور ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ حسن بصری رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ نطفہ حیض کے خون کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے کیونکہ جب عورت کے رِحم میں مرد کا پانی داخل ہوتا ہے اور عورت حاملہ ہو جاتی ہے تو اُس کا حیض آنا بند ہو جاتا ہے' تو پھر مرد کا نطفہ حیض کے خون کے ساتھ مخلوط ہو جاتا ہے۔

(iv) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ٥ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ٥ يَّخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ٥ (اَلطَّارق : ۵-۷)
"سو انسان کو دیکھنا چاہئے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ وہ ایک اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پُشت اور پسلیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔"

اس آیت کی تفسیر میں علامہ قرطبی لکھتے ہیں :
"ہم مانتے ہیں کہ نطفہ بدن کے تمام اجزاء سے نکلتا ہے' اسی وجہ سے انسان اپنے والدین کے بہت مشابہ ہوتا ہے اور خروجِ منی کے بعد تمام جسم کے غسل کی بھی یہی حکمت ہے۔ بہت زیادہ جماع کرنے والے آدمی کی کمر میں

درد بھی اِسی وجہ سے ہوتا ہے کہ جو پانی کمر میں جمع ہوتا ہے وہ بہت زیادہ نکل گیا ہوتا ہے۔'' (الجامع لاحکام القرآن' جز۲۰' ص۸' دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

مادہ منویہ اگرچہ خصیتین پیدا کرتے ہیں اور کیسہِ منویہ میں مادہ جمع ہو جاتا ہے مگر اُس کے اخراج کا مرکزِ تحریک صُلب اور تَرائِب کے درمیان واقع ہے۔ دماغ سے اعصابی رَو جب اس مرکز کو پہنچتی ہے تو اس مرکز کی تحریک سے کیسہِ منویہ سکڑتا ہے اور اس سے ماءِ دافِق پچکاری کی طرح نکلتا ہے۔ قرآنِ کریم کا بیان علمِ طب کی جدید تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ (تفسیر بیضاوی' تفسیر مظہری' ضیاء القرآن ج۵' ص ۵۳۷-۵۳۶)

رحم بطور جنین * (Embryo) کا گھر: اِسی اثناء میں رحم کے مخاطی پردے میں ممکنہ بارور بیضے کی آمد کی تیاری کے لئے کچھ نمایاں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ ہارمون کے عمل کے ذریعے مخاطی پردے کی ایک نرم بافت بن جاتی ہے جس کی رسد خون کی نالیوں سے بے تحاشا ہوتی ہے۔ یہ نئی بننے والی بافت Decidua کہلاتی ہے جنین اس Decidua میں پیوندکاری کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔

قرآن مجید بیضے کی پیوندکاری کے متعلق یوں کہتا ہے:

ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ o (المؤمنون: ۱۳)

''پھر ہم نے اُسے ایک محفوظ مقام میں نطفہ بنا دیا۔''

''جنین کی تاریخ میں سب سے بنیادی مرحلہ ہاروے (۱۶۵۱ء) کا بیان تھا کہ ''تمام زندگی ابتدائی طور پر بیضے سے ہوتی ہے۔'' تاہم آج جبکہ نوزائیدہ سائنس نے (پیشِ نہادہ موضوع کے بارے میں) خوردبین کی ایجاد سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے' لوگ اب بھی بیضے اور جرثومہ منویہ کے کردار کی بات کرتے ہیں۔ عظیم ماہرِ حیوانات و نباتات بفن اُن لوگوں میں سے ایک تھا جو بیضوی نظریئے کے حق میں تھا لیکن بونیٹ نے تخموں کے نظریئے کی حمایت کی کہ اُنہیں اکٹھا کیا گیا ہے۔ یہ نظریہ کہ نسلِ انسانی کی ماں حضرت حوّا (سلام اللہ علیہا) کی بیضہ دانی میں تمام نوعِ انسانی کے تخم موجود تھے' اٹھارویں صدی میں مقبول ہوا۔۔ قرآنِ حکیم کے بیانات اُس اساسی اہمیت کو سادہ ترین الفاظ میں بیان کرتے ہیں جسے تلاش کرنے میں انسان نے صدیاں صَرف کر دیں۔'' ("The Bible, the Qur'an and Science" --- Maurice Bucaille, p. 207)

جنین کی تہیں: اِسی اثناء میں جنین جنیاتی خول سے متوازن پرورش پاتا رہتا ہے۔ اس کے خلیے جلد ہی دو تہیں بناتے ہیں: ایک بیرونی تہہ جسے بیروں ادمہ (Ectoderm) اور ایک اندرونی تہہ جسے دروں

* انڈے سے بچہ نکلنے یا ماں کی بچہ دانی سے خارج ہونے سے پہلے اپنی نشوونما کے ابتدائی مراحل پر کوئی سا بھی جانور یا انسان۔

ادمہ (Endoderm) کہتے ہیں۔ ایک اور اندرونی تہہ میان ادمہ (Mesoderm) نامی اِن دونوں تہوں کے درمیان بڑھتی ہے۔ جسمِ انسانی کی ہر قسم کی ساخت کی اُٹھان اِنہی تینوں تہوں سے ہوتی ہے۔

("The New Book of Popular Science", Vol. V, p. 320)

قرآنِ حکیم میں اِن تینوں تہوں کا اِس آیت میں واضح طور پر ذکر ہے :

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ (الزُّمَر:٦)

''وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر تین تین تاریکیوں میں بناتا ہے۔''

نطفہ کے رِحم میں قرار پکڑتے ہی تخلیق و تکمیل کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ وہ قطرۂ آب بلکہ ایک ننھا سا جرثومہ مختلف مرحلوں سے گزر کر کامل انسان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اُس کے ہر ہر عضو میں جو باریکیاں' لطافتیں اور پیچیدگیاں ہیں' یہ سب دن کی روشنی میں انجام پذیر نہیں ہوتیں بلکہ تہہ در تہہ اندھیروں میں یہ تکوینی عمل جاری رہتا ہے۔ اِن تین تاریکیوں میں سے ایک تاریکی پیٹ کی ہوتی ہے' دوسری رِحم کی اور تیسری تاریکی اُس جھلّی کی ہوتی ہے جس میں بچے کی تخلیق مکمل ہوتی ہے۔

جسمِ انسانی کی تشکیل : بیروں ادمہ (Ectoderm) سے جلد' اعصابی نظام' ناک کی لکیریں' حواسِ خمسہ کے اعضاء کے بیرونی حصّے' آنکھ کا عدسہ' غدہ نخامیہ' منہ کے غدود اور دانتوں کی چمک تشکیل پاتے ہیں۔ دروں ادمہ (Endoderm) سے نظامِ تنفّس' غذا بخش نالیاں' مختلف قسم کی غدودیں' لبلبہ اور جگر کے خفیہ خلیے تشکیل پاتے ہیں۔ میان ادمہ (Mesoderm) سے ڈھانچہ' پٹھے' دل' خون اور خلط مائی کی نالیاں' گردے' حالب (وہ نالی جس کے ذریعے پیشاب گردے سے مثانے تک پہنچتا ہے)' مثانہ' بیضہ دان (یا فوطے) اور اُن کی نالیاں بنتی ہیں۔ ("The New Book of Popular Science", Vol. V)

سورۃُ المؤمنون کی مندرجہ ذیل آیات میں انسانی ڈھانچے کی تشکیل کا عمل کچھ یوں دیا گیا ہے:۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ٥ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ٥ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ٥ (المؤمنون : ۱۲-۱۴)

''اور بالیقین ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا' پھر ہم نے اُسے ایک مقررہ مقام میں نطفہ بنا دیا۔ پھر ہم نے نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا' پھر ہم نے خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا' پھر ہم نے بوٹی کو ہڈی بنا دیا' پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا' پھر ہم نے اُسے دوسری ہی مخلوق

بنا دیا' تمام صنّاعوں سے بڑھ کر اللہ کیسی شان والا ہے!''

مٹی کے خمیر سے جو جوہر نکلا اُس سے آدم علیہ السلام کا جسمِ پاک تیار ہوا۔ پھر آپ سے جو انسانی نسل چلی' اُس کے لئے نطفہ اصل قرار پایا جو زمین سے اُگنے والی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے۔ اِس لئے جنسِ انسانی کی تخلیق کے لئے فرمایا کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا گیا۔ وہ پانی کی بوند رحمِ مادر میں قرار پکڑنے کے بعد مختلف تبدیلیوں کے مراحل سے گزرتی ہے۔ لیکن اب تک انسان اور دیگر حیوانات کے جنین یکساں قسم کے تھے۔ جو تبدیلیاں یہاں وقوع پذیر ہوتی ہیں' بعینہٖ اُن کے نطفوں میں بھی ظاہر ہوتی ہیں لیکن ایک منزل پر پہنچ کر یکا یک مصوّرِ فطرت نے اپنے موئے قلم سے کوئی ایسی رنگ آمیزی کر دی کہ اُسے دیگر حیوانی جنینوں سے بالکل ممتاز کر کے رکھ دیا۔ پہلے وہ بے جان تھا' اب اُس میں زندگی کی لہر دوڑ گئی ہے لیکن یہاں صرف روحِ حیوانی کی آفرینش سے حیاتِ حیوانی کا آغاز نہیں ہوا بلکہ نفسِ ناطقہ نے اُسے بالکل ایک جدید قسم کی مخلوق کا رُوپ بخش دیا ہے۔ عقل و فہم کی قوّتیں' غور و فکر کی صلاحیتیں' تسخیرِ کائنات کے حوصلے اور حکمرانی کی اُمنگیں سب کچھ اِس عمدگی سے یہاں جمع کر دی گئی ہیں جنہیں دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے اور یہ راز سمجھ میں نہیں آتا کہ ابتدائی مرحلوں میں بالکل یکساں ہونے کے باوجود کس طرح ایک کا رُخ ایک طرف اور دوسرے کا رُخ ایک بالکل ہی نئی منزل کی طرف موڑ دیا گیا اور پھر اُس منزل کو پا لینے کے لئے جن قابلیتوں' صلاحیتوں' اعضاء اور وسائل کی ضرورت تھی وہ سب مہیّا کر دیئے گئے ہیں تو زبان پر بے ساختہ آ کر رہتا ہے فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ (تمام صنّاعوں سے بڑھ کر اللہ کیسی شان والا ہے!)

اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ: ظاہر الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیدا کرنے والے تو بہت سے ہیں البتہ سب سے بہتر پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے' حالانکہ صرف وہی خالق ہے اور کسی کو تخلیقِ کائنات میں اُس کا حصّہ دار بنانا توحید کے بالکل منافی ہے۔ علمائے کرام نے اِس شبہ کا ازالہ اس طرح فرمایا ہے کہ خَلْق کا لفظ دو معنوں میں آتا ہے: کسی چیز کو کسی موجود مادّے اور سابقہ مثال کے بغیر پیدا کرنا (المفردات امام راغب) اس معنیٰ کے لحاظ سے یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جا سکتی۔ اِس کا دوسرا معنیٰ سابقہ مادّہ سے کسی چیز کو کسی موجودہ مثال کے مطابق بنا لینا ہے' یہ اللہ تعالیٰ کے سوا اوروں میں بھی پایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آیت مذکور میں یہ لفظ اپنے دوسرے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (ضیاء القرآن' ج ۳' ص ص ۲۴۸' ۲۴۹)

تفسیر ابن جریر میں حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ سے مروی یہ قول ہے کہ خَالِقِيْن یہاں صَانِعِين کے معنیٰ میں ہے اور عربی میں ہر صانع کو خالق بھی کہا جاتا ہے۔

افزائش کا کنٹرول اور کچھ اعضاء کا متناسب اور غیر متناسب ہونا: یہ بات معلوم ہے کہ جنیناتی افزائش کے دوران کچھ اعضاء بالکل غیر متناسب لگتے ہیں جبکہ کچھ متناسب ہوتے ہیں۔ یہ بات یقیناً مندرجہ ذیل قرآنی آیت کے الفاظ مُخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (سورۃ المؤمنون:۵) کی موافقت میں ہے:۔

اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ

''یقیناً ہم نے ہی تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر مادہ منویہ سے' پھر خون کے لوتھڑے سے' پھر بوٹی سے کہ بعض کی تخلیق مکمل ہوتی ہے اور بعض کی نامکمل۔''

سب انسانوں کے مٹی سے پیدا کئے جانے کی وجہ یا تو یہ ہے کہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کی تخلیق مٹی سے ہوئی یا یہ کہ مادّۂ منویہ جن غذاؤں سے بنتا ہے وہ سب زمین سے اُگتی ہیں۔ مُخَلَّقَة سے مراد ہے جو نقصان اور عیب سے پاک ہو اور جس کے اعضاء اور حواس صحیح سالم ہوں۔ غَيْرِ مُخَلَّقَة سے مراد ہے جس کی خِلقت میں کوئی عیب اور نقص ہو اور ناقص الاعضاء ہو۔

نر اور مادّہ کی تشکیل کی بابت قرآن حکیم یوں فرماتا ہے:۔

(۱) وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا (فاطر: ۱۱)

''اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر نطفہ سے' پھر اُس نے تمہیں جوڑے جوڑے بنا دیا۔''

(۲) خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ (اَلنَّجم: ۴۵، ۴۶)

''اُسی نے نر اور مادہ دونوں جنسوں کو نطفہ سے پیدا کیا جب وہ ڈالا جاتا ہے۔''

(۳) اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ (اَلقیٰمة: ۳۷-۳۹)

''کیا یہ شخص محض قطرۂ منی نہ تھا جو ٹپکایا گیا تھا' پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا' پھر اللہ نے اُسے انسان بنایا' پھر اُس کے اعضاء ٹھیک کئے' پھر مرد اور عورت میں اُس کی دو قسمیں کر دیں۔''

نیو بک آف پاپولر سائنس کے مطابق ''بے شمار خلیے جو بچے کی تشکیل میں مائل بہ عمل ہوتے ہیں' حیرت انگیز طور پر نظم وضبط میں باہم جُڑے ہوتے ہیں۔ محض ایک واحد خلیہ سے جو بارور بچہ دانی میں ہوتا ہے' ایک خاص ترتیب سے انتہائی نمایاں خلیے ظہور پذیر ہوتے ہیں یعنی ہڈیوں کے خلیے' جلد کی سطح کے باریک خلیے اور اعصابی خلیے۔ پورے نظامِ قدرت میں نشوونما کے اِس حیرت انگیز نظام سے زیادہ اور کوئی چیز غیر معمولی نہیں۔'' (جلد پنجم' صفحہ ۳۲۸)

انسان کا تعلق زمین اور مٹی سے : قرآن مجید اِس تعلق کو کئی مقامات پر بار بار بیان کرتا ہے مثلاً :

(۱) خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَاب (فاطر : ۱۱) [اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا]

(۲) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَإٍ مَّسْنُوْنٍ o (اَلْحِجْر : ۲۶)

''اور یقیناً ہم نے انسان کو لسدار گارے کی کھنکناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا۔''

(۳) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ إِذَا أَنْتُمْ بَشَرٌ '' تَنْتَشِرُوْنَ o (اَلرُّوم : ۲۰)

'' اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہیں مٹی سے پیدا فرمایا' پھر یکا یک تم (سب) آدمی بن کر زمین میں پھیل گئے۔''

طبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وہ انسان جسے مٹی سے تخلیق کیا گیا ہے' زمین کے دُور ترین کونے تک پھیلا ہوا ہے۔ (عبداللہ یوسف علی' نوٹ :۳۵۲۴)

(۴) اَلَّذِیْ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ o (الٓمٓ السجدة : ۷)

''وہی جس نے جو بھی چیز بنائی' خوب ہی بنائی اور انسان کی تخلیق اُس نے مٹی سے شروع کی۔''

''**جراثیم کی تہوں کی تشکیل**: تخم ریزی کے تین ہفتے بعد حمل کی نشو ونما تیزی سے شروع ہو جاتی ہے اور جراثیم کی تہیں بننے لگتی ہیں جنہیں ابتدائی دھاری (Primitive Streaks) کہا جاتا ہے۔ اِس ابتدائی دھاری کے ساتھ کچھ زائد خلیے بھی مل جاتے ہیں جو اُس کی بیضوی شکل کو طوالت دے کر ناشپاتی کی شکل کی طرح بنا دیتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اِسے کئی مقامات پر (مثلاً سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ اور سورۃ العَلَق کی آیت ۲ میں) عَلَقَة کہتا ہے۔ عَلَقَة کا ترجمہ کسی ایسی چیز سے کیا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز سے چپک جائے جیسے خون چوسنے والی جونک۔ دراصل یہ لفظ ۷ تا ۲۴ دنوں کے انسانی جنین کے لئے مناسب ہے اور اِس مرحلے پر یہ جونک کی طرح لگتا ہے جیسے کچھ لٹک رہا ہو۔ جیسے جونک کسی کا خون چوستی ہے' اُسی طرح انسانی جنین حاملہ رِحم کی آنتوں سے خون حاصل کرتا ہے۔ عملِ نفوذ کے ذریعے جھلّی کی تھیلی سے ماں کا خون حاصل کیا جاتا ہے۔''

ہڈیوں اور لحمیاتی اجزاء کی تشکیل: تیسرے ہفتے کے اختتام سے پانچویں ہفتے کے آغاز تک جنینی میان ادمہ (Mesoderm) پر مکعب نما اینٹوں سے ملتا جلتا مواد ظاہر ہونا شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے کو قرآن مُضْغَة کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کا معنیٰ ہے چبائی ہوئی گلٹی۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو گوشت کی بوٹی کے لئے استعمال کیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ جنین میں ہڈیوں کی سطح بے قاعدہ ہوتی ہے۔

ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنْشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ (المؤمنون : ۱۴)

''پھر ہم نے نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا' پھر ہم نے خون کے لوتھڑے کو (گوشت کی) بوٹی بنا دیا' پھر ہم نے بوٹی کو ہڈی بنا دیا' پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا' پھر ہم نے اُسے دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔''

''پانچویں ہفتے کے اختتام تک ہڈیوں کے ۴۴ جوڑے ہو جاتے ہیں اور یہ دانتوں کے نشانات جیسے ہوتے ہیں۔ دانتوں کے یہ نشانات ریڑھ کی ہڈی کے مُہرے کے آغاز کی علامت ہوتے ہیں۔''

("Creation of Man" ---Prof. Dr. Tahir-ul-Qadri, pp. 67-68)

کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ خشک مٹی (تُراب) یا غیر نامیاتی مادے سے نخر مایہ (Protoplasm) یعنی نرم مٹی اور نامیاتی مادہ بنایا جائے' پھر اُس سے ایک نئی حیوانی (یعنی انسانی) زندگی کا آغاز ہو' جس میں اہلیت بھی ہو اور ذمہ داریاں بھی۔ انسان اپنے اندر اللہ کی دانائی اور قوّت کی نشانیاں لئے پھرتا ہے اور وہ اُنہیں اپنی اردگرد کی کائنات میں بھی روزانہ دیکھ سکتا ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۲۸۷۴)

جنین کی افزائش (۴ تا ۶ ہفتوں میں) : چوتھے ہفتے تک جنین تقریباً سیدھی حالت میں ہو جاتا ہے۔ ۲۶ ویں یا ۲۷ ویں دن اوپر کے اعضاء کی شناخت ممکن ہو جاتی ہے اور اندرونی کانوں کے ابتدائی حصے بھی صاف نظر آنے لگتے ہیں۔ آنکھ کے عدسے جو بعد میں بننے ہوتے ہیں' ممکنہ حد تک نظر آنے لگتے ہیں۔ ۳۳ سے ۳۶ دنوں تک سر کی طشتری اور ناک کے گڑھے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ چالیس دنوں میں پاؤں بننے لگتے ہیں اور پردہ چشم پر رنگت نظر آنے لگتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی درج ذیل مستند حدیث میں اِن مراحل کی ترتیب ملتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ جنین اپنے لٹکتے ہوئے مرحلے سے گزر کر ایک ٹھوس بوٹی (مُضْغَة) کی شکل اختیار کر چکا ہے:۔

إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِي بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ " أَوْسَعِيدٌ " (صحیح مسلم : اربعین نووی)

''(تمہاری پیدائش کی تفصیل اِس طرح ہے کہ) ماں کے پیٹ میں نطفہ چالیس روز (منتشر رکھ کر ایک جگہ) جمع کر دیا جاتا ہے۔ اور جمع کر کے اسے جمے ہوئے خون کی شکل دے دی جاتی ہے جسے عَلَقَة کہتے ہیں' پھر اس کے بعد چالیس روز عَلَقَة رہ کر گوشت کی بوٹی (مُضْغَة) بن جاتا ہے' پھر چالیس روز میں وہ بوٹی آدمی کی صورت بنا دی جاتی ہے (جس میں اعضاء و جوارح ناک' کان' آنکھ وغیرہ بنا دیئے جاتے ہیں) اس کے بعد اللہ تعالیٰ اُس کے پاس (روح پھونکنے والے) فرشتہ کو بھیجتا ہے جو اُس میں

چھوڑیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اس کا اجرِ جزیل عطا فرمائے! آمین

جناب نوروز خان صاحب (ہیڈ لائبریرین' اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد) کا بھی ممنون احسان ہوں کہ انہوں نے ہر بار کمال فراخدلی سے میری علمی راہ نمائی فرمائی اور اپنی وسیع وعریض لائبریری سے استفادہ کرنے کا بھرپور موقع عطا کیا۔

آخر میں اپنے اُن سب کرم فرماؤں اور احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے انسائیکلوپیڈیا کے انگریزی حصے کو اردو میں لانے کا شوق دلایا اور اس ضمن قدمے' سخنے بندے کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔

۱۵ مارچ ۲۰۱۲ء

خاک پائے صالحین
اشفاق احمد خان

روح پھونک دیتا ہے اور اُس فرشتے کو چار باتوں کا حکم دیا جاتا ہے: اُس کا رزق لکھنے کا' اُس کی عمر لکھنے کا' اُس کا عمل لکھنے کا' اور یہ لکھنے کا کہ بد بخت ہوگا یا خوش بخت۔

<u>جنین کی افزائش</u> (۶ تا ۸ ہفتوں میں) : اس تیز ترین نشو ونما کا ذکر جس میں جنین ایک نئی (انسانی) شکل اختیار کرتا ہے' سورۃ المؤمنون کی اس آیت میں ملتا ہے:۔

ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ٥ (المؤمنون : ۱۴)

''پھر ہم نے اُسے دوسری ہی مخلوق بنا دیا' سو وہ کیسی شان والا ہے تمام صناعوں سے بڑھ کر۔''

شاید یہ وہی مرحلہ ہے جس میں آنے والے انسان کے حواس اور آنتیں بنتے ہیں' جن کے بارے میں قرآن یوں فرماتا ہے:۔

وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ (الٓمٓ السجدة : ۹)

''اور اُس نے تمہیں کان' آنکھ اور دل دیئے*۔''

اِس مرحلے کو سَــــوِّہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا۔ پہلے آٹھ ہفتوں تک یا اس کے لگ بھگ شکمِ مادر میں پلنے والے بچے کو جَنین (Embryo) اور اُس کے بعد اُسے کچا بچہ (Fetus) کہا جاتا ہے۔

Maurice Bucaille نے بڑی بے باکی سے اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے:

''انسانی جنین کے ارتقاء کے حقائق کا مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں بیان شدہ مختلف مراحل اور اعداد و شمار جدید جنیناتی سائنس کے عین مطابق ہیں اور جدید سائنس اور وہ قرآنی آیات جو اِس موضوع سے متعلق ہیں' ان میں مکمل طور پر ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔''

<u>کچے بچے (Fetus) کا ارتقاء اور پیدائش</u> : جنیناتی مطالعہ کے مطابق اگر بچہ چھبیس ہفتوں کے بعد پیدا ہو' تو وہ زندہ رہ سکتا ہے بشرطیکہ اس کی بہت زیادہ نگہداشت کی جائے۔ اس مرحلے پر پھیپھڑے <u>اِس حد تک نشو ونما پا چکے ہوتے ہیں کہ وہ سانس لینے کے قابل ہوتے ہیں۔ اعصابی نظام بھی پروان چڑھ چکا</u>

*اس آیت کے متعلق امریکہ کے ایک نامور سرجن (Keith Moore) نے کہا تھا کہ قرآن میں جب بھی اِن اعضاء کا ذکر آیا ہے' بالکل اِسی ترتیب سے آیا ہے اور یہ ترتیب موجودہ سائنسی تحقیق کے عین مطابق ہے کہ شکمِ مادر میں سب سے پہلے کان' پھر آنکھیں اور آخر میں دل و دماغ بنتے ہیں۔ اور اس حقیقت کی روشنی میں میں یہ کہنے میں مجبور ہوں کہ یہ معلومات اُس ناخواندہ (اُمّی) شخص کو اللہ کے ہاں سے مل رہی ہیں اور یہ بھی کہ قرآن کسی انسان کی کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ کا کلام ہے۔

ہوتا ہے اور عملِ تنفّس اور جسم کے ماحول کو کنٹرول کرنے کے قابل ہو چکا ہوتا ہے۔'' (انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا' جلد ۱۶' صفحہ ۶۷۷)

اِس ضمن میں قرآن مجید کے بیانات ملاحظہ ہوں :۔

(۱) حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ (لُقمٰن : ۱۴)

''اُس کی ماں نے ضعف پر ضعف اُٹھا کر اُسے پیٹ میں رکھا۔''

(۲) حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصٰلُهُ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا (الاحقاف : ۱۵)

''اُس کی ماں نے اُسے بڑی مشقت کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور بڑی مشقت کے ساتھ اُسے جنا' اور اُس کو پیٹ میں اُٹھانا اور اُس کا دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہو پاتا ہے۔''

یہ تیس مہینے (= اڑھائی سال) حمل اور دودھ پلانے کی مجموعی مدّت ہے۔ دودھ پلانے کی مدت سُورۃُ البَقَرۃ کی آیت ۲۳۳ میں دو سال ہے جس میں فرمایا: وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں) دودھ چھڑانے کی مدّت سورہ لقمٰن کی آیت ۱۴ میں دو سال بیان ہوئی (وَفِصٰلُهُ فِيْ عَامَيْنِ)۔ اس کے بعد چھ ماہ بچتے ہیں اور یہ حمل کی کم از کم مدّت ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِس میں کیا حکمت ہے کہ قرآنِ کریم نے دودھ پلانے کی تو زیادہ سے زیادہ مدّت بیان کی اور حمل کی کم سے کم مدّت؟ اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ عورت سے ہر قسم کی تہمت کا سدِّ باب کیا جا سکے اور ضرر رَسانی اور فحاشی کا قلع قمع ہو سکے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اِس کتاب کے ہر کلمہ میں ہزاروں حکمتیں اور لطافتیں رکھ دی ہیں جن کے احاطے سے عقل عاجز ہے۔ (تفسیر کبیر)

ماں کا بچے کو بڑی مشقّت کے ساتھ پیٹ میں رکھنے اور اُسے جننے کی کیفیات سے متعلق چند نامور سکالرز کے بیانات ملاحظہ ہوں :۔

''قدرت ماں کے جسم میں بڑھتے ہوئے بچے کے لئے ایک بے رحم قسم کی آمریت قائم کر دیتی ہے اور اِس چھوٹے سے گومڑ کی حفاظت کے لئے جس میں اب جان پڑ چکی ہے' ماں کی تمام تر قوّتوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہے۔ وہ ماں سے شدّت کے ساتھ اِس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات کی تمام بافتوں اور اعضاء کے سکون کی نفی کرتے ہوئے سب کچھ آنے والے بچے کے لئے کرے اور ماں کے لئے متلی' دانت کے درد اور قسما قسم کی جسمانی بے آرامی کے سوا کچھ نہ ہو۔''

("Biological Tragedy of Woman" --- Nemilov, p. 72)

''اُس حمل میں بھی جو آسان اور تکلیف بغیر ہو' عورت اپنے آپ کو کبھی بھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں سمجھتی۔ حاملہ عورت کو کئی غیر متوقع بیماریاں اور وہ علامات نظر آتی ہیں جو اُس پیچیدہ جسمانی عمل کا نتیجہ ہیں جو اُس کے بدن کی بافتوں میں جاری ہے۔ ماں کے نامیاتی جسم کی توانائی صرف اِس بات میں ہے کہ اُس کے ترقی پذیر جنین (یعنی ہونے والے بچے کو) کو سازگار ماحول ملے۔ حاملہ کے جسم میں ہمیں ایسی بے قاعدگیاں نظر آتی ہیں کہ اگر وہ حمل کے دوران نہ بھی ہوں یا کسی مرد میں ہوں' تو اُسے مکمل طور پر مریض سمجھا جائے گا۔'' (ایضاً ص ص ۱۵۴۔۱۵۵)

''رابرٹ بینڈا کی تفصیلی تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ حمل کے دوران اور بالخصوص دوسرے نصف عرصے میں اور بچے کی پیدائش کے دوران عورت کے اندرونی نظام میں کئی قسم کی تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں جو اُسے تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہیں اور جو طبّ جدید میں انتہائی اہمیت اور توجہ کی حامل ہیں۔ رابرٹ بینڈا کے مطابق عورت کے نامیاتی عناصر کی مضر اثرات کے خلاف جدّ وجہد حمل پر مکمل طور پر اثر ڈالتی ہے۔'' (ایضاً ص ۱۵۷)

''وسیع طور پر بات کریں تو (کچا) بچہ اپنی ماں کے خون پر ایسے ہی پلتا ہے جیسے کسی جانور کی تمام بافتیں اُس جسم کے خون پر پلتی ہیں جس کا وہ حصّہ ہوتی ہیں۔''

("Text-book of Physiology" --- Foster, p. 676)

''شروع سے لے کر آخر تک بار بار پیدائش کا عمل والدین کی قربانی کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی تکمیل کے لئے ذاتی قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔''

("Conduct and its Disorders" ... Mercier, p. 288)

''بچے کی پیدائش (Parturition) : حمل کے اختتام کے قریب ماں میں ہارمون (مہیجہ یعنی اعتدال پیدا کرنے والا مادّہ جو خون یا رطوبت کے ذریعے کسی عضو میں سرایت کر کے خلیوں کو فعّال بناتا ہے) کی سطح بہت تیزی سے تبدیل ہوتی ہے۔ اس سے بچہ دانی میں پٹھے سکڑنا شروع ہو جاتے ہیں اور یہ دردِ زِہ کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسے جیسے بچے کا سر عنقِ رِحم (رحم کی گردن) سے نکلنے کے لئے زور لگانا شروع کرتا ہے' سکڑنے کا عمل زیادہ تواتر سے اور زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ جلد ہی بچہ' اندامِ نہانی کے راستہ سے رِحم سے باہر آ جاتا ہے اور یوں ماں کے جسم سے نکل آتا ہے۔''

(Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science" Vol. 17, p. 1433)

ربّ کریم کی بے پایاں رحمت اِس موقع پر کارسازی کرتی ہے اور اپنی بندی کی تکلیف کو آسانی میں بدل دیتی ہے، جس کے متعلق قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ ﴿سُورہ عَبَس : ۲۰﴾

"پھر اُس کے لئے اُس نے راستہ آسان کر دیا۔"

بوقتِ ولادت ماں کے پیٹ میں بچے کا سر نیچے اور اُس کی ٹانگیں اوپر ہوتی ہیں۔ تنگ راستہ سے بچے کا زندہ نکل آنا اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا عجیب نمونہ ہے!

حمل کے نو ماہ کے دوران افزائش اور نشو و نما کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اِس عرصہ میں ماں کے جسم میں کئی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ شاید اُن تبدیلیوں میں سب سے اہم یہ ہے کہ چھاتیاں بڑی ہو جاتی ہیں اور اِن چھاتیوں میں واقع خاص غدود دُودھ بنانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔"

(Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science" Vol. 17, p.1433)

قرآنِ حکیم اس حقیقت کے بارے میں یوں کہتا ہے:۔

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ ﴿اَلْبَلَد : ۱۰﴾

"اور ہم نے اُسے دو نمایاں راستوں کی طرف راہ یاب کر دیا۔"

اگر ماں اپنے بچے کو چھاتی سے دودھ پلاتی ہے تو یہ غدود تقریباً دو سال تک دودھ بناتے رہتے ہیں ورنہ کچھ ہفتوں میں یہ غدود دودھ بنانا بند کر دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم ماؤں کو اُن کے بچوں کے مفاد کی خاطر ترغیب دیتا ہے کہ وہ اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے بچوں کو دودھ پلائیں۔ چنانچہ فرمایا :۔

(۱) وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (البقرۃ : ۲۳۳)

"اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔"

(۲) وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ (لُقمٰن : ۱۴)

"اور اُس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہے۔"

انسانی جنین (Embryo) کے ارتقائی مراحل

چار ہفتے کا جنین

چھ ہفتے کا جنین

سات ہفتے کا جنین

آٹھ ہفتے کا جنین

پندرہ ہفتے کا جنین

چھ ماہ کا جنین

"ENCYCLOPEDIA AMERICANA" Vol. 10, p.295 (1973 US Edn.)

نظامِ قدرت کی جانب سے حفاظتی نگہداشت اور انسان کی تشکیل میں خوبصورت تناسب:

انسان کی افزائش کا ہر مرحلہ ایک خوبصورت تناسب اور تنظیم کی عکاسی کرتا ہے۔ رِحم میں واقع ہونے والے مختلف مراحل کے بارے میں ایک واضح نظام اور دَورانیہ برقرار رکھا جاتا ہے۔ ہر مرحلہ کی ضروریات خود بخود پوری ہوتی رہتی ہیں اور ہر مرحلہ خود بخود مکمل ہوتا رہتا ہے۔ انسانی جسم آنے والے دَور کی تمام ضروریات' حالات اور مقاصد کے مطابق کام کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ترقی کے یہ تمام مراحل صحیح طور پر پہنچتے ہیں بلکہ رحمِ مادر میں یہ مکمل طور پر محفوظ بھی ہوتے ہیں۔ قرآن مجید انسانی تخلیق کے چار مراحل بیان کرتا ہے:-

(۱) تخلیق (۲) ترتیب (۳) تعیّن کرنے والے اِقدامات (۴) رہنمائی

(۱' ۲) تخلیق و ترتیب (تخلیق اور تسویہ): گزشتہ صفحات میں جفتہ (Zygote) سے خَلقًا آخر تک کے ارتقائی مراحل میں اِس عنوان کو زیرِ بحث لایا جاچکا ہے۔ ہر مرحلے کا اپنا ایک ٹائم ٹیبل ہے جس کے دوران کچھ ترقیاں ہوتی رہتی ہیں اور ایک مرحلے کی ترقی دوسرے مرحلے تک پہنچا دیتی ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:-

وَهُوَالَّذِیْ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّ مُسْتَوْدَعٌ (الانعام : ۹۸)

"وہ وہی تو ہے جس نے تم انسانوں کو ایک جان سے پیدا کیا' پھر تمہارے لئے (تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں) ٹھکانہ بنایا اور (تمہارے باپوں کی پشتوں میں) جائے امانت بنائی۔"

انسانی تخلیق کا پہلا مرحلہ باپ کے مادہ منویہ کا ماں کے بیضہ سے ملنے کا ہے۔ یہاں خالق کا حیرت انگیز نظام مشاہدے میں آتا ہے کہ جونہی بیضہ مادہ منویہ کے پہلے قطرہ سے بارور ہوتا ہے' تو باقی تقریباً چالیس کروڑ منویہ جرثومے جو مرد سے خارج ہوتے ہیں' اُنہیں بیضہ کے ساتھ ملنے سے روک دیا جاتا ہے۔ یہ بارور جفتہ مختلف تخلیقی مراحل سے گزرتا ہوا چھ تا آٹھ ہفتوں میں انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر نظامِ اعصاب اور ڈھانچے کی ترقی کے ساتھ تخلیقی عمل مکمل ہو جاتا ہے اور اس کی وہی شکل بن جاتی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔ اس طرح خَلق سے لے کر تَسویہ تک تبدیلی کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے:-

وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى أَجَلٍ مُّسَمًّى (الحج : ۵)

"اور ہم رِحم میں جسے چاہیں' ایک مدّتِ مقررہ تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔"

یہ بھی ایک جانی پہچانی جنینی حقیقت ہے کہ بہت سے جنین زچگی کے پہلے ہی ہفتے میں ضائع ہو جاتے ہیں اور صرف تیس فیصد جفتے (زائیگوٹ) ترقی کر کے کچے بچے (فیٹس) کے مرحلے تک پہنچتے ہیں جو پیدائش کے وقت تک زندہ رہتے ہیں جیسا کہ آیتِ بالا بتاتی ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ تمام جنین زندہ رہیں

بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر منحصر ہے کہ کونسا جنین شکمِ مادر میں ایک مقررہ مدت تک زندہ رکھنا ہے۔

تعین کرنے والے اقدامات (تقدیر): یہ تَسْوِیہ (ترتیب) اور بعد میں تصویر (شکل) اور انجام کار ایک خاص شکل کا ظاہر ہونا جو مخصوص نقوش کی حامل ہوتی ہے' یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم پر تقدیر کے اصول پر متعین ہوتے ہیں' جیسا کہ فرمایا:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ٥ (اَلْفُرْقان : ۲)

''اور اُس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا پھر مکمل و مفید اندازوں سے ٹھیک ٹھیک بنایا۔''

نطفے میں' بیج میں' پھول و پھل میں' جسم و حجم میں' عضو و عمر میں' نسل و اَصل میں' خوراک و غذا میں' عادات و خصائل' ثمرات و لذّات' رنگ و بُو' تاثیر و تعمیر' قد کاٹھ' شکل و شباہت' ترقی و تفضّل' جنسیت و صنفیت' جن و انس' مَلَک' نباتات' جمادات' حیوانات' فلکیات' ارضیات' معدنیات' موسمیات کہ ازلِ حادث سے ابدِ فانی تک ایک محور و حد میں چل رہے ہیں' نہ کوئی تغیر و تبدّل اور نہ کوئی گڑبڑ' نہ فساد و فتنہ' نہ انڈے والے سے بچے نکلے اور نہ بچے والے سے انڈہ نکلے' نہ آم سے گلاب ظاہر ہوا اور نہ گلاب سے کیلا پیدا ہو۔ کیسا نظم و نسق ہے کہ نہ کوئی بدل سکے اور نہ بگاڑ سکے۔ مناسبت ایسی شاندار کہ ذرّہ بھر کمی بیشی سے تباہی آ جائے۔ موافقت ایسی پیاری کہ جس کو جو بنا دیا' اُسی میں اُس کی بقا۔ جس کو جو کھلا دیا' اُسی میں اُس کی صحت و غذا۔ اِن ایمان افروز حقائق میں اہلِ یقین و ایمان ہی غور و فکر کرتے ہیں۔

''اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی رُوح کو ایک واحد خلیے میں بنایا ہے جس کی تصدیق علمِ جینیات (نسلی توارث کا علم) نے کر دیا ہے۔ جدید تحقیق نے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ تمام بنی نوعِ انسان کی خصوصیات اور استعدادی صلاحیتوں کو ماں کے بیضہ اور باپ کے مادہ منویہ میں موجود DNA کے ذرّات پر ایک پہلے سے طے شدہ کمپیوٹر پروگرام کے مطابق تحریر کر دیا گیا ہے۔ یہ جینز وجود' شکل و شباہت' جسامت' اعمال' نشو و نما کا دورانیہ اور اس کی تکمیل کا تعین کرتے ہیں۔ تخلیق اور مذکورہ تقدیر کا ایک اور حوالہ درجِ ذیل آیات میں بھی ملتا ہے:۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ٥ مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ٥ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ٥
ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ٥ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ٥ (عَبَس : ۱۸ ـ ۲۱)

''اللہ نے اُسے کس (حقیر) چیز سے پیدا کیا؟ اُسے نطفہ سے پیدا کیا' پھر اُسے اندازِ مناسب سے بنایا' پھر اُس کے لئے راستہ آسان کر دیا' پھر اُسے موت دی' پھر اُسے قبر میں لے گیا' پھر جب چاہے گا اُسے دوبارہ زندہ کر دے گا۔''

أَقْبَــرَہٗ' سے مراد انسان کا قبر میں لے جایا جاتا ہے۔ اس کے مصداق کے لئے ظاہری تدفین ضروری نہیں۔ آگ میں جل کر' پانی میں ڈوب کر' درندوں پرندوں کی غذا بن کر ہر حال میں اور ہر صورت میں انسان جاتا قبر ہی میں ہے' جس طرح کہ عذابِ قبر کے لئے ظاہری لحد میں جانا ضروری نہیں (حوالہ عذابِ قبرِ فرعون: سورۃ المؤمن کی آیت ۴۶: اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّعَشِیًّا: وہ لوگ صبح و شام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں)

<u>حمل کے دوران ربِّ کریم کی رحمت کا اظہار</u>: جب رحم میں بچہ مختلف مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے' تو اللہ تبارک و تعالیٰ کا نظامِ رزّاقیت اُس کی ضروریات کی تکمیل کر رہا ہوتا ہے۔ مندرجہ ذیل چار ضروریات یا انتظامات پر تھوڑا سا غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام کس قدر مکمل اور ہمہ گیر ہے جو ہر عقلمند کی سوچ کو مہمیز لگاتا ہے:۔

(۱) غذائیت (۲) تحفظ (۳) حرکات (۴) درجہ حرارت کا کنٹرول

("Creation of Man"... Prof. Dr. Tahir-ul-Qadri, pp. 75-79)

''مستقبل میں بننے والے بازوؤں اور ٹانگوں کے لئے دو کونپلیں اپنے مختلف عناصر کو مناسب ترتیب میں لئے اپنے صحیح وقت اور صحیح جگہ پر کیوں نمودار ہوتی ہیں؟ کہنی' کولہے' گھٹنے اور ٹخنے اتنے مکمل طور پر کیسے نشو و نما پاتے ہیں؟ وہ سب صحیح حصّوں میں صحیح ہڈیوں سے کیسے خود کو جوڑ لیتے ہیں؟ اعضاء کیسے رگیں حاصل کرتے ہیں اور مرکزی اعصابی نظام میں وہ کیسے متحرک ہو جاتے ہیں؟ اِن جیسے ہزاروں سوالات کئے جا سکتے ہیں۔''

''بچہ دانی میں جنین (بچے) کی نشو و نما ابھی تک ایک راز ہے۔ تاہم علمِ میراث اِن عوامل کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد دیتا ہے۔ ہم اپنے علمِ میراث کے علم کی بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کرتے ہیں کہ بارور بیضہ میں وہ تمام میلانات و رجحانات مکمل طور پر موجود ہوتے ہیں جو ہم پچھلی نسلوں سے حاصل کرتے ہیں اور نشو و نما اِن رُجحانات کو کام میں لانے کا نام ہے۔ ہم یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ موروثی قوّتیں ایک فرد کی زندگی کے آخر تک اپنے کام کرنے کا عمل جاری رکھتی ہیں۔'' {"The New Book of Popular Science" Vol. 5, p. 328)

<u>بچے کی پیدائش سے پہلے اُس کا نام رکھنا جائز ہے</u>: جیسا کہ زکریا علیہ السلام کی مثال سے ظاہر ہے:۔

یٰزَکَرِیَّآ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ۨ اسْمُہٗ یَحْیٰی لَمْ نَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ قَبْلُ سَمِیًّاo (مریم: ۷)

''اے زکریا! ہم تمہیں ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں' اُس کا نام یحیٰی ہوگا' ہم نے اِس سے پہلے کسی کو (اُس کا) ہم نام نہیں بنایا۔''

نوٹ: تمام انبیائے کرام کے نام ربّ تعالیٰ خود ہی رکھتا ہے نہ کہ اُن کے والدین' جیسا کہ آیت کے آخری حصّے سے ظاہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی زمینی یا آسمانی مخلوق انبیاء علیہم السلام سے افضل نہیں۔

بچے کی پیدائش کے فوراً بعد بھی اُس کا نام رکھنا جائز ہے: جیسا کہ مریم سلام اللہ علیہا کی مثال سے ظاہر ہے:
فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَ لَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ o (آلِ عمران:۳۶)
"پس جب حنّہ نے مریم کو جنا تو بولی: اے میرے پروردگار! میں نے تو لڑکی جنی اور اللہ تو خوب جانتا تھا کہ اُس نے کیا جنا ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں ہو سکتا' اور میں نے اِس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اُسے اور اُس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔"

نوٹ: اِس آیت سے معلوم ہوا کہ لڑکی لڑکے سے افضل ہے جبکہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۲۸ اور سورۃ النساء کی آیت ۳۴ میں فرمایا: وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ "(اور مَردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے) اور اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ (مرد عورتوں پر قوّام ہیں) تو اِن دو مختلف بیانات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نوعِ مرد نوعِ عورت سے افضل ہے لیکن بعض عورتیں بعض مَردوں سے افضل ہیں یعنی مرد ہونا عورت ہونے سے بڑھ کر ہے کہ نبوّت' سلطنت اور امامت مَردوں کے لئے خاص ہیں اور آیت میں نوعیت کا ذکر ہے۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ کسی نے حضرت رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہا کے سامنے مَردوں کی فضیلت بیان کی تو آپ نے فرمایا کہ عورتوں کو بُرا نہ جانو اس لئے کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی کان ہیں۔ بعض نبی بن باپ کے پیدا ہوئے لیکن کوئی پیغمبر بن ماں کے (صرف باپ سے) پیدا نہیں ہوا۔

آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ: (۱) حضرت حنّہ کو لڑکی پیدا ہونے کا رنج ہوا جبکہ حدیثِ نبوی بتاتی ہے کہ لڑکی کی پیدائش پر رنج کرنا طریقہِ کُفّار ہے نیز سورۃُ النّحل کی آیت ۵۸ میں بھی ایسا ہی مضمون ہے (اور جب اُن میں سے کسی کو بیٹی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے تو اُس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ (دل ہی دل میں) گھٹتا رہتا ہے) تو حضرت حنّہ سے یہ فعل کیوں سرزد ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لڑکی سے نفرت اور صرف لڑکے سے محبت کرنا واقعی بُرا ہے۔ اُنہیں رنج اس بات کا تھا کہ چونکہ بیٹے کی اُمید تھی اور خلافِ اُمید لڑکی ہوئی اب (اُسے بیت المقدس کی خدمت کرنے میں وقف کرنے کی) میری منّت کیسے پوری ہوگی' اس پر اُنہیں قدرے ملال ہوا۔ (۲) والدہ مریم (حضرت حنّہ) اللہ سے اُمید لگائے ہوئے تھیں کہ لڑکی کا سلسلہِ نسل چلے گا۔ (۳) ماں کو اولاد کے نام رکھنے کا حق ہے اگرچہ باپ نہ رکھے۔ یاد رہے کہ حضرت مریم کے والد جناب عمران بن یصہر اُن کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے

تھے۔ (۴) اولاد کے نام اچھے رکھنے چاہئیں کہ اکثر ناموں کا اثر کام اور کردار پر پڑتا ہے جیسا کہ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ سے معلوم ہوا (مریم بمعنیٰ عابدہ)۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے کچھ ناپسندیدہ ناموں کو اچھے ناموں سے بدلا ہے۔

(B) ثقافتی علمِ بشریت (علم الملل Ethnology)

یہ علمِ بشریت کی وہ شاخ ہے جو پوری دنیا میں انسانوں کی نسلوں کی خصوصیات، تقسیم، اُن کے ثقافتی حالات اور کارناموں سے متعلق ہے۔ (Huthinson 20th Century Encyclopedia, p. 470) 7th Edn., 1986

۱ (الف) **مخصوص وحدتِ انسانی** : قرآنِ حکیم نے اُس حقیقت کو کئی مقامات پر واضح کیا ہے کہ تمام نسلِ انسانی ایک ہی مشترک جدِّ امجد آدم علیہ السلام سے نکلی ہیں، یہ نہیں کہ مختلف قوموں، نسلوں اور قبیلوں کے مورثِ اعلیٰ بھی الگ الگ ہوں۔ اس طرح مخصوص وحدتِ انسانی کو ظاہر کیا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا:

(۱) يَأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (النسآء : ۱)

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔''

(۲) هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (الاعراف : ۱۸۹)

''وہ وہی تو ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔''

(۳) خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (الزُّمَر : ۶)

نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ انسانوں کے تمام قبائل، سیاہ ترین سے لے کر گورے ترین تک، انتہائی جنگلی اور وحشی سے لے کر انتہائی تہذیب یافتہ تک، اُن کے جسموں کی ساخت اور اُن کے ذہنوں کی کارکردگی میں ایسی مشترک مشابہت ہے جس کے پیشِ نظر اِس حقیقت کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اُن سب کا جدِّ امجد ایک ہی ہے اگرچہ زمانے کا فاصلہ کتنی ہی دُوری کا کیوں نہ ہو۔'' (E.B.Taylor in the "Hastings' Encyclopaedia of Religion & Ethics" Vol. V, p. 522)

اِس بات کا ماتم کیوں کیا جائے کہ ''تہذیبِ انسانی کو نسلی فسادات سے خطرہ لاحق ہے اور اس سے زیادہ سنجیدہ بُرائی اخلاقی زوال ہے جو رنگ و نسل کے تعصب کا نتیجہ ہے'' (انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا، ج ۵، ص ۵۷۱) کاش کہ دنیائے جدید نے اِس بنیادی صداقت کو ذہن میں رکھا ہوتا کہ تمام انسان ایک ہی نوع سے متعلق ہیں اور یہ کہ انسان اور انسان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے!!

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ وَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرا

تعارف (انسائیکلو پیڈیا)

__قرآن اور سائنس کے باہمی تعلق پر دو متضاد آراء__ : قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی رُشد و ہدایت کی آخری کتاب ہے جس کا مقصد وحید جبینِ انسانیت کو اغیار کی ناصیہ فرسائی سے ہٹا کر ایک خدائے واحد کے حضور جھکا دینا ہے۔ قرآن مجید اِس رُشد و ہدایت تک رسائی کے لئے ایک طریقہ یہ بھی بتاتا ہے کہ حضرتِ انسان اپنے آس پاس کی رنگارنگی کائنات اور اس کے نوادرات پر غور کرے کہ اُن کا خالق کون ہے تاکہ وہ مظاہرِ فطرت کے مطالعہ سے اُن کے خالق تک پہنچے اور اس طرح ایمان وایقان کی دولتِ عظمیٰ کو حاصل کرلے۔ قرآن مجید نے اس غور و فکر کے لئے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً فرمایا : اَفَلاَ یَتَدَبَّرُوْنَ۔ اَفَلاَ تَذَکَّرُوْنَ۔ اَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ۔ اَفَلاَ تُبْصِرُوْنَ۔ اَفَلاَ تَسْمَعُوْنَ۔ اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا۔ اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا۔ قَلِیْلاً مَّا تَذَکَّرُوْنَ۔

قرآن مجید کے اِن الفاظ کے بار بار لانے سے کچھ جدید مفکرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ قرآن مجید سائنس کی کتاب ہے' لٰہذا اُن کے نزدیک اسلام بنیادی طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دین ہے۔ اس طرح ایسے لوگوں میں قرآن سے سائنسی نکات اخذ کرنے کا رُجحان ہے۔ ایسا کرنے میں وہ اکثر یومِ آخرت پر دیئے گئے قرآنی اشارات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے سچے مذہب اسلام کے مقابلے میں سائنس کی اس قدر حد سے زیادہ وقعت کی کہ اُنہوں نے اسلام کے وہ مسلّم الثبوت حقائق جو بانی اسلام ﷺ کے زمانے سے لے کر آج تک اسلامی دنیا میں برابر تسلیم کئے جاتے رہے تھے اور عقلاً ونقلاً مدلّل ہو چکے' اُن کا انکار کر دیا جس کی وجہ صرف یہ ہوئی کہ جدید فلسفہ سے چمٹے رہنے کی وجہ سے وہ اسلامی مسئلہ کو صحیح طور پر اسلامی لباس میں نہ پہچان سکے اور اسی بناء پر وہ اُنہیں سائنٹیفک اصول کے خلاف معلوم ہوا۔ ورنہ اگر کوئی جامع شخص وہ مسئلہ اُنہیں سائنسی لباس پہنا کر دکھاتا تو بے دھڑک اُس پر ایمان لے آتے۔

اس کے برعکس ایک گروہ اُن مفسرین اور علمائے دین کا ہے جو اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآنِ حکیم محض ہماری دنیاوی اور روحانی زندگیوں کے لئے رُشد و ہدایت کی کتاب ہے کیونکہ اس میں یومِ آخرت کا متعدد بار ذکر آیا ہے اور نماز' زکوٰۃ اور عبادات و ذکرِ الٰہی پر خاص زور دیا گیا ہے۔ وہ سائنس اور قرآن کے باہمی ممکنہ تعلق کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ اس کے تصوّر تک کو بہ نظرِ حقارت دیکھتے ہیں۔ سائنس اور مادیّت کو ایک ہی چیز ثابت کرنے کی کوشش میں وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ سائنس اور مذہب چونکہ دونا قابلِ مصالحت تضادات ہیں' اس لئے وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔ اُن کے نزدیک ''سائنس'' اِلحاد (خدا کے انکار) کا دوسرا نام ہے۔

''ایک وقت یقیناً آئے گا جب یہ بات نامعقول لگے گی کہ فرانسیسی اور جرمن' امریکن اور جاپانی' فرانسیسی اور انگریز کو تصوراتی رکاوٹوں سے تقسیم کیا جائے اور یہ بات بھی (اُس وقت نامعقول ہوگی) کہ برگنڈی اور میکلن برگ کے آرٹو ریس اور ہینوور کے ویسکس اور نارتھمبر لینڈ کے باسی کبھی ایک دوسرے کے دشمن رہے تھے۔''

("The Illusion of National Character" --- Fyfe)

''آج سمندروں کی وسعت یا پہاڑوں کی بلند قامتی نے مختلف انسانی آبادیوں کے افراد کو تنہا نہیں چھوڑا۔ سفر اور آپس کے رابطے فاصلوں کو کم کر رہے ہیں۔ مختلف آبادیوں کے افراد کی آپس میں شادی بیاہ کی وجہ سے یہ آبادیاں اپنے جینز سے قطع تعلق کر رہی ہیں۔'' ("Divine Philosophy and Modern Day Science" --- Dr. A. Rashid Seyal, p. 123)

۱ (ب) <u>یک اصلی جین بمقابلہ کثیر الاصلی جین</u>: (ذات' دولت اور رنگ و نسل معیارِ عزت نہیں)

یَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ'' خَبِيرٌ''o (اَلْحُجُرَات : ۱۳)

''لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قومیں اور خاندان بنا دیا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ دراصل اللہ کے نزدیک تم میں سے پرہیزگار تر معزّز تر ہے' بے شک اللہ خوب جاننے والا' باخبر ہے۔''

وحدتِ نوعِ انسانی اسلام میں ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک تاکیدی حقیقت ہے' جس نے اُن تمام جاہلی نظریات کی جڑ کاٹ دی جو انسان کی مختلف نسلوں کو مختلف مورثوں کی اولاد سمجھتے ہیں۔ نسل پرستی' قوم پرستی' رنگ پرستی جس میں جاہلیتِ قدیم سے لے کر جاہلیّتِ جدید تک ساری قومیں مبتلا رہی ہیں' اُن پر پوری ضرب اِس آیت نے لگا دی ہے' اور ہندوستان کی ذات پات والی پیدائشی تفریق کے حق میں اِس آیت کا سمِّ قاتل ہونا تو ظاہر ہی ہے۔

''فرمایا اے لوگو! تم ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہو' تمہاری نسل کا سلسلہ اُس ایک اصل سے جا کر ملتا ہے۔ تمہارا خالق بھی ایک' تمہارا مادۂ تخلیق بھی یکساں' تمہاری پیدائش کا طریقہ بھی ایک جیسا ہے۔ اتنی بڑی یکسانیتوں کے باوجود تمہارا ایک دوسرے پر برتری کا دعوٰی سراسر کم فہمی اور نادانی ہے۔ اولادِ آدم کا مختلف قوموں اور خاندانوں میں بٹنا اس لئے نہیں کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کو حقیر سمجھے اور اپنے آپ کو اشرف و اعلیٰ خیال کرے بلکہ اس لئے ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو اور باہمی معاملات میں گڑبڑ نہ ہو۔''

''کسی خاندان میں پیدا ہونے' کسی زمین کا باشندہ ہونے اور چہرے کی کوئی خاص رنگت ہونے میں انسان کی اپنی کوشش کا کوئی دخل نہیں' اس لئے قرآن حکیم نے اِسے وجہِ افتخار قرار نہ دیا۔ البتہ ایک چیز ہے جس سے انسان کا مرتبہ دوسرے لوگوں سے برتر اور اعلیٰ ہو جاتا ہے اور اس میں انسان کی ذاتی کوشش کا بھی دخل ہے اور وہ ہے تقویٰ اور خدا خوفی۔ تقویٰ کی بنیاد پر جو معزز و محترم ہوگا' وہ فخر و غرور سے یکسر پاک ہوگا اور ایسے شخص کا وجود نہ صرف اپنے ملک اور قوم کے لئے باعث خیر و برکت ہوگا بلکہ تمام نوعِ انسانی اُس کے فیوض و برکات سے مستفیض ہوتی رہے گی۔ حضور رحمتِ عالم ﷺ نے مختلف مواقع پر بڑے اثر انگیز انداز میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ مثلاً خطبہ حجۃ الوداع میں آپ نے ارشاد فرمایا:

يَاأَيُّهَاالنَّاسُ ! إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ قَدْ أَذْهَبَ عَنْكُمْ عُبِيَةَ الْجَاهِلِيَّةِ وَ تَعَظُّمَهَا بِآبَاءِ هَا أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِد" كُلُّكُمْ بَنُوْا آدَمَ وَ آدَمُ خُلِقَ مِنْ تُرَابٍ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ إِلَّا بِالتَّقْوٰى إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ أَتْقٰكُمْ وَلَيَنْتَهِيَنَّ قَوْم" يَفْخَرُوْنَ بِآبَائِهِمْ أَوْلَيَكُوْنَنَّ أَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الْجُعْلَانِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ

''لوگو! اللہ تعالیٰ نے یقیناً تم سے جاہلیت کی خامیوں اور آباء واجداد پر فخر کرنے کو دُور کر دیا ہے۔ خبردار! بے شک تمہارا پروردگار ایک ہے' تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔ کسی عربی کو کسی غیر عربی پر اور کسی غیر عربی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں' نہ کسی کالے کو سرخ پر اور نہ کسی سرخ کو کالے پر برتری حاصل ہے بجز تقویٰ کے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہوگا۔ لوگ اپنے باپ دادا پر فخر کرنے سے رُک جائیں ورنہ وہ اللہ کے نزدیک گوبر کے کالے کیڑے سے بھی زیادہ حقیر و ذلیل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری شکلوں اور مالوں کی طرف نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہاری نیتوں اور تمہارے عملوں کی طرف دیکھتا ہے۔''

''اگر اِس حدیث کا اُس حدیثِ نبوی سے مقابلہ کیا جائے جس میں آپ نے بنو ہاشم کی فضیلت بیان فرمائی تو اس کے جواب میں علامہ حلیمی نے بیان کیا کہ نبی ﷺ نے بنو ہاشم کی فضیلت سے فخر کا ارادہ نہیں فرمایا بلکہ آپ نے صرف اُن کے مرتبہ اور مقام کو بیان کرنے کا ارادہ فرمایا جیسے کوئی شخص کہے کہ میرا باپ فقیہ ہے اور اِس سے اُس کی غرض صرف اُس کا تعارف کرانا ہو نہ کہ اُس کی فقاہت پر فخر کرنا۔ نیز اِس حدیث سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے آباء و اجداد پر جو انعامات کئے' آپ نے بطور شکر اُن کا اظہار فرمایا ہو۔'' (شعب الایمان للبیہقی' ج ۴' ص ۲۸۹)

ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب Preaching of Islam کے صفحہ ۲۹۱ پر بڑی صاف گوئی سے لکھا ہے:۔

''ہندوستان میں اسلام کی حقیقی قوت کی اصل وجہ ہی تعصبات اور نسلی امتیاز کا نہ ہونا ہے اور اِسی خصوصیت نے اسلام کو اس قابل کیا ہے کہ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہوئی ہے۔''

باسورتھ سمتھ نے اپنی کتاب Muhammad & Muhammadanism کے صفحہ ۲۵۰ پر لکھا ہے:

''پیدائش یا رنگ یا نسل یا دولت کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ وہ انسان کو اعلیٰ عہدے تک پہنچنے میں رکاوٹ ہوں۔ آنحضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ایک جنگ میں اپنی فوج کی قیادت کی تھی۔۔۔ سرقانی غلاموں کے خاندان نے مصر پر عثمانی ترکوں کی فتح سے پہلے ایک سو سال حکومت کی تھی اور کہا جاتا ہے کہ کوہ قاف کے عیسائی اس بات پر خوش تھے کہ اُنہیں مصر کو بطورِ غلام لے جایا جا رہا ہے کیونکہ اُن میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ وہ شاید کسی دن سلطان بن جائے۔''

چارلس ڈارون نے Descent of Man میں لکھا ہے:۔

''اگرچہ انسانوں کی موجودہ نسلیں کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔۔۔۔ تاہم اگر اُن کے ڈھانچے کو بہ حیثیتِ مجموعی لیا جائے تو وہ کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ بھی ہیں۔ جب ماہرینِ فطرت دو یا تین گھریلو نسلوں یا بہت ہی فطری طور پر ملتی جلتی شکلوں کی عادات، ذوق اور مزاج کی لاتعداد چھوٹی چھوٹی تفصیلات کا مشاہدہ کرتے ہیں تو وہ اِس حقیقت کو بطورِ دلیل استعمال کرتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔'' (ص ص ۲۷۶۔۲۷۷)

(۲) **انسانِ اوّل کا مذہب**: دین کی تاریخ لکھنے والے اُس کے آغاز، اُس کی نشوونما اور اُس کے عروج کی داستان قلمبند کرنے والے صدیوں تک بال کی کھال اتارنے والی فضول منطقی بحثوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہے کہ دین کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اُن کی طویل تحقیق کا نتیجہ یہ تھا کہ انسان ابتدا میں مشرک تھا اور عقیدۂ توحید تک اُس کی رسائی آہستہ آہستہ سینکڑوں صدیاں ٹھوکریں کھانے کے بعد ہوئی۔ قرآنِ حکیم بتاتا ہے کہ یوں نہیں بلکہ انسانِ اوّل (آدم علیہ السلام) موحد تھا۔ شرک سے اُس کا کوئی سروکار نہ تھا اور عرصہ دراز تک اُس کی اولاد عقیدۂ توحید پر ثابت قدم رہی۔ قرآن نے اس کا جواب جو صدیوں پہلے دیا تھا اور جسے تسلیم کرنے کے لئے یورپ کے محقق کل تک تیار نہ تھے، آج مجبوراً تسلیم کر رہے ہیں۔ چنانچہ آثارِ قدیمہ کے ماہرینِ انسانیات اور اجتماعیات کے علماء سر چارلس مارسٹن، پروفیسر لنگڈن اور پروفیسر شمڈٹ کا یہی فیصلہ ہے کہ انسان کا دینِ اوّلیں توحید تھا (تفسیر ماجدی اردو، نوٹ ۲۷۷، صفحہ ۸۳)۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے:

(۱) كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ إِلَّا الَّذِيْنَ أُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (البقرة : ۲۱۳)

"لوگ ایک ہی اُمت تھے' پھر اللہ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء بھیجے اور اُن کے ساتھ کتاب حق اُتاری کہ وہ لوگوں کے درمیان اِس باب میں فیصلہ کرے جس میں وہ اختلاف رکھتے تھے' اور کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا مگر اُنہی نے جنہیں وہ ملی تھی اُنہی کی ضد کے باعث بعد اس کے کہ اُنہیں کھلی ہوئی نشانیاں پہنچ چکی تھیں۔ پھر اللہ نے اپنے فضل سے ایمان والوں کو وہ امرِ حق بتا دیا جس کے بارے میں وہ اختلاف کر رہے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے' راہِ راست بتا دیتا ہے۔"

أُمَّةً وَّاحِدَةً میں جس وحدت کا ذکر ہے' وہ دینی اور اعتقادی وحدت ہے۔ أُمَّةً وَّاحِدَةً اور فَبَعَثَ اللّٰهُ کے درمیان ایک چھوٹا سا جملہ اِخْتَلَفُوْا محذوف ہے جس پر فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ کے الفاظ صراحۃً دلالت کر رہے ہیں۔ اب آیت کا مطلب بالکل صاف ہو گیا کہ پہلے مدتِ دراز تک ایک ہی اُمت بنے رہے' بعد میں جب نسلِ انسانی بڑھی تو لوگ اپنے مزاجوں اور طبیعتوں کے اختلاف کی وجہ سے آپس میں جھگڑنے لگے اور اولادِ آدم مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں بٹ گئی۔ بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لانے کے لئے اور اختلاف کی آگ کو بجھانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام مبعوث فرمائے اور اُنہیں آسمانی کتابیں عطا فرمائیں۔ انبیائے کرام نے اُنہیں جھگڑا بازی اور فرقہ بندی سے نکالنے کی کوششیں کیں تاکہ منتشر انسانوں کی یہ ٹکڑیاں پھر سے ایک قوم بن جائیں۔

<u>ابتدا میں نوعِ انسان کے دینِ حق پر ہونے کے دلائل</u> : (۱) اس آیت میں یہ فرمایا گیا کہ پہلے تمام لوگ ایک دین پر تھے' پھر اُن میں اختلاف ہوا تو اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا۔ اگر وہ تمام لوگ کفر پر تھے تو رسولوں کو پہلے بھیجنا چاہئے تھا۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے یومِ میثاق میں تمام ارواح سے پوچھا تھا: أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى (الاعراف : ۱۷۲) "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے کہا ہاں کیوں نہیں!" معلوم ہوا کہ اُس دن سب لوگوں کا دین ایک ہی دین تھا اور وہ دینِ حق تھا۔ (۳) امام بخاری حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ "ہر بچہ فطرت (اسلام) پر پیدا ہوتا ہے' پھر اُس کے والدین اُسے یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔" یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اگر کسی بچے کو اُس کی اصلی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کسی باطل دین پر نہ ہوگا۔

(۲) وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (یونس : ۱۹)
''اور انسان تو ایک ہی طریقہ پر تھے' پھر انہوں نے اختلاف کیا۔''

قرآنِ حکیم اِن کھلے الفاظ میں دین میں ''ارتقاء'' کی صاف تردید کر رہا ہے کہ ابتداءً دینِ اصلی اور دینِ قدیم صرف دینِ توحید ہی تھا۔ اس کے بعد ارتقاء کے نہیں' زوال وانحطاط اور نفسانیت (Vested Interests) کے اثر سے شرک اور بُت پرستی کی مختلف صورتیں پیدا ہونے لگیں۔ اب ''ارتقائے عقیدۂ توحید'' کا وہ نظریہ جو اُنیسویں صدی کے آخر میں بطور فیشن چلا تھا' علمی دنیا میں اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ اب جدید ترین ماہرینِ علم الاصنام و ماہرینِ اثریات پروفیسر شمڈٹ' پروفیسر لینگڈن' سر چارلس مارسٹن وغیرہ سب تسلیم کر رہے ہیں۔

(۳) وَمَاتَفَرَّقُوْا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (اَلشُّوْرٰی : ۱۴)
''اور تفرّقے تو لوگوں نے اُس وقت کے بعد سے پیدا کئے جب اُن کے پاس (صحیح) علم پہنچ چکا تھا (اور تفرّقہ بھی) آپس کی ضدّا ضدّی سے۔''

دَورِ جدید کے ماہرِ آثارِ قدیمہ سر چارلس مارسٹن لکھتے ہیں:۔
''اِن کالموں میں علمِ نوعِ انسان کی شہادت یہ ثابت کرنے کے لئے پیش کی جائے گی کہ ابتدائی نسلوں کا مذہب دراصل توحید یا اس سے بہت ہی ملتا جلتا مذہب تھا۔''

کِش (Kish) کے مقام پر کُھدائی کے نتیجے میں ڈاکٹر لینگڈن لکھتے ہیں:۔
''میری رائے میں انسان کے قدیم ترین مذہب کی تاریخ میں توحید سے حد درجہ کی کثرت پرستی اور بدرُوحوں پر اعتقاد کی طرف تیزی سے تنزّلی ہوئی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انسان کے زوال اور گراوٹ کی تاریخ بھی یہی ہے۔'' ("Semitic Mythology" p. 61)

''میں شاید اِس نتیجے پر یقین نہ کر سکوں کہ سامی اور غیر سامی (قدیم بابل کی ابتدائی تہذیب) دونوں مذاہب میں کثرت پرستی اور نیک و بدرُوحوں پر اعتقاد سے پہلے عقیدۂ توحید موجود تھا۔ اِس نتیجے کے ثبوت اور دلائل (مثبت اور منفی دونوں) موجود ہیں اور جدید نظریات احتیاط اور مخالفانہ تنقید کے احساس سے ترتیب دئے گئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ علم الیقین کا نتیجہ ہے' کسی پیش بینی کی دیدہ دلیری نہیں۔'' (ایضاً' تعارف' صفحہ ۱۸)

”قدیم ترین لائبریریوں کا علمی ذخیرہ اور بابل کے قدیم آثار میں پائی گئی تختیوں پر کندہ تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ توحید ہی دینِ اصلی تھا۔ اور اِس عظیم حقیقت کی تصدیق دوسرے ذرائع بالخصوص علمِ بشریات سے بھی ہوتی ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ حیاتِ اُخروی کا عالمگیر عقیدہ بھی اس کا ثبوت ہے۔“ (ایضاً ص ۲۶۵)

”علم المِلل (ملّت کی جمع مِلل) کی تحقیقات اور ثقافتی تاریخ یہ بتاتے ہیں کہ بنی نوعِ انسان کا پہلا مذہب توحید تھا اور یہ کہ قدیم ترین جنگلی قبائل کا تہذیبی اخلاق (اگرچہ مادی طور پر بہت کم تر تھا) انتہائی بلند تھا۔“ ("Islamic Culture" of October, 1940, p. 446)

(۳) بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے اللہ کے تمام پیغمبر توحیدِ الٰہی لے کر آئے: قرآن فرماتا ہے

(i) اِنَّا أَوْحَيْنَا اِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا اِلٰى نُوحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْ بَعْدِهٖ (النساء : ۱۶۳)
”یقیناً ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے جیسی کہ ہم نے نوح اور اُن کے بعد کے نبیوں کی طرف وحی بھیجی تھی۔“

”وحی کی یہ مشابہت اِس بات میں ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے ہے نہ کہ اُس کی نوعیت میں۔“ (ماجدی)

(ii) شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (اَلشُّورٰى : ۱۳)
”اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا جس کا اُس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جسے ہم نے آپ کے پاس وحی کیا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا کہ اِس دین کو قائم رکھنا اور اِس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔“

فرمایا کہ یہی وہ دین ہے جس کا حکم اُس نے رسولِ اوّل حضرت نوح علیہ السلام کو دیا تھا اور جس پر اے خاتم الانبیاء! آپ کو بذریعہ وحی آگاہی بخشی ہے اور یہی وہ دین ہے جس کے بارے میں حضرات ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو تاکید کی تھی۔ سپہرِ رسالت کے یہی وہ رخشندہ و تابندہ مہر و ماہ ہیں جنہیں اولوالعزم رسول کے لقبِ جلیل سے نوازا گیا ہے۔ فرمایا کہ مختلف زمانوں میں تشریف لانے والے یہ جلیل القدر رسول ایک ہی دین اور ایک ہی نظامِ حیات کے نہ صرف داعی اور مبلّغ تھے بلکہ اس کے مؤسّس اور اسے پروان چڑھانے

والے بھی تھے۔ انبیائے کرام نے ایک دوسرے کی تکذیب نہیں کی اور اپنے اپنے دَور میں علیحدہ اَدیان قبول کرنے کے لئے نہیں کہا بلکہ ایک اور صرف ایک دینِ توحید کے لئے کوشاں رہے۔

دین اور شریعت کا لغوی اور اصطلاحی معنیٰ : یہ بات واضح ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا دین واحد رہا ہے لیکن اُن کی شریعتیں مختلف رہی ہیں' جیسا کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۴۸ میں آیا: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک (خاص) شریعت اور راہ رکھ دی ہے) اس لئے دین اور شریعت میں فرق بیان کرنا ضروری ہے۔ دین کا لغوی معنیٰ اطاعت کا اور شریعت کا لغوی معنیٰ راستہ کا ہے۔ دین اُن اصول اور عقائد کو کہتے ہیں جو تمام انبیاء علیہم السلام میں مشترک رہے ہیں مثلاً اللہ کے وجود' اُس کی توحید وصفات پر ایمان لانا' تمام انبیاء ورُسُل' آسمانی کتابوں' فرشتوں' تقدیر اور قیامت اور حشر ونشر پر ایمان لانا' اللہ کے شکر اور اُس کی عبادت کا فرض ہونا' شرک' کفر' قتل' زِنا اور جھوٹ کا حرام ہونا یہ تمام امورِ دین ہیں۔

شریعت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہر نبی نے اپنے زمانہ کی خصوصیات کے لحاظ سے عبادت کے جو طریقے مقرر کئے' چند چیزوں کو فرض کیا' چند چیزوں کو حرام کیا' چند چیزوں کو مستحب کیا اور چند چیزوں کو مکروہ قرار دیا' مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں مالِ غنیمت حلال نہ تھا' ہماری شریعت میں حلال ہے' اُن کی شریعت میں مسجد کے سوا نماز جائز نہ تھی' ہماری شریعت میں تمام روئے زمین پر نماز جائز ہے' اُن کی شریعت میں تیمم کی سہولت نہ تھی' ہماری شریعت میں عذر کے وقت تیمم کرنا جائز ہے۔ یہ سب امورِ شریعت ہیں۔

(۴) خود پسندی' خودستائشی' مذہبی تنگ نظری وہ واحد رکاوٹیں ہیں جو صحیح رہنمائی کا راستہ تسلیم کرنے میں حائل ہوتی ہیں : قرآنی فرمودات ملاحظہ ہوں:۔

(i) إِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ آيٰتِ اللهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ إِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ" مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ (ألمؤمن : ۵۶)

"جو لوگ اللہ کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے رہتے ہیں بغیر اس کے کہ کوئی سند اُن کے پاس موجود ہو' اُن کے دلوں میں بری بڑائی ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ اُس تک پہنچنے والے نہیں۔"

یعنی اللہ کی آیتوں میں وہ اس لئے جھگڑتے ہیں کہ اُنہیں بڑا بننے کی ہوس ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر اُنہوں نے آپ کو نبی مان لیا تو اُنہیں آپ کے احکام کی اطاعت کرنا ہوگی' آپ کو مقتدا اور پیشوا ماننا ہوگا اور پھر آپ کے سامنے اُن کی چوہدراہٹ کا چراغ نہیں جلے گا اور کل تک جن لوگوں کے سامنے وہ بڑا بنتے چلے آئے تھے'

اب اُن کے سامنے اُنہیں نبی ﷺ کی اطاعت کرنا ہوگی تو وہ اس لئے آپ کو نبی نہیں مانتے تھے کہ اگر آپ کو نبی مان لیا تو اُنہیں بڑائی نصیب نہیں ہوگی۔ فرمایا کہ جس بڑائی کی اِن میں ہوس ہے وہ کبھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گی کیونکہ بالآخر مکّہ مکرّمہ آپ کے ہاتھوں فتح ہوگا اور آج جو لوگ چوہدری اور وڈیرے بنے ہوئے ہیں کل وہ سب آپ کے ماتحت ہوں گے اور اُن سب کی گردنیں آپ کی تلوار کے نیچے ہوں گی۔

(ii) كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَاتَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ۔۔۔ وَمَا تَفَرَّقُوْآ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَاجَآءَ هُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (اَلشُّورٰی : ۱۳، ۱۴)

''جس دین کی طرف آپ مشرکین کو دعوت دے رہے ہیں وہ اُن پر بہت شاق اور بھاری ہے۔۔۔ اور اُنہوں نے اُسی وقت تفرقہ ڈالا تھا جب اُن کے پاس علم آ چکا تھا اور وہ تفرقہ بھی باہمی سرکشی کی وجہ سے تھا۔''

(۵) آباء پرستی کوئی معقول بات نہیں : انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی اعلیٰ صفات سے نوازا گیا ہے تاکہ وہ حق و باطل، صحیح اور غلط میں تمیز کرے اور جو چیز اُس کے حق میں بہتر ہو اُسے اختیار کرے۔ تو پھر یہ کوئی معقول بات نہیں کہ آدمی بلاوجہ اور اندھا دُھند اُس مذہب یا عقیدے سے اِس وجہ سے چمٹا رہے کہ یہ اُس کے آباء و اجداد کا مذہب تھا جبکہ اُس کے آباء و اجداد کے پاس اُس عقیدے کے صحیح ہونے کی نہ تو کوئی معقول وجہ ہے اور نہ ہی کوئی آسمانی وحی اُس کے حق میں ہے۔ قرآن حکیم اِس قسم کے ذہنی رُجحان کو اس طرح مسترد کرتا ہے :۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَ نَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ٥ (البقرۃ : ۱۷۰)

''اور جب اُنہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اتارا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اُس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے۔ اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ ذرا عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں!'' (یہی مضمون سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۰۴ میں بھی آیا ہے)

تقلید کی تعریف : فقہ کے فروعی مسائل میں تقلید جائز ہے۔ قرآن و سنت کے معاملے میں کسی شخص کے قول کو بلا دلیل قبول کرنا تقلید کہلاتا ہے کیونکہ عام آدمی میں قرآن و سنت سے مسائل نکالنے کی اہلیت نہیں ہوتی، اس لئے ضروری ہے کہ وہ ہر پیش آمدہ مسئلہ میں علماء سے رجوع کرے اور علماء اللہ اور رسول کا جو حکم اُسے بتائیں، اُس پر وہ عمل کرے۔ اسی طرح تمام علماء بھی تمام احکامِ شرعیہ کو براہِ راست کتاب، سنت، آثارِ صحابہ، اجماع اور قیاس سے نہیں نکال سکتے اور وہ اس معاملے میں کسی فقیہ اور مجتہد سے استنباط کردہ مسائل پر اعتماد کرتے ہیں جس کی فقہ اور اُس

کے اجتہاد پر اُنہیں وثوق ہوتا ہے۔ سورۃ النّحل کی آیت ۴۳ میں ہے کہ اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لیا کرو۔

(٦) بدکار یومُ الحساب میں ایک دوسرے کو اُن کی بدعملیوں کی وجہ سے کوسیں گے

(i) كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا حَتّٰى إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا جَمِيعًا قَالَتْ أُخْرٰهُمْ لِأُولٰهُمْ رَبَّنَا هٰؤُلَاءِ أَضَلُّونَا فَآتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ٥ وَقَالَتْ أُولٰهُمْ لِأُخْرٰهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ٥ (الاعراف : ۳۸، ۳۹)

''جس وقت بھی کوئی (نئی) جماعت (دوزخ میں) داخل ہوگی تو اُس کی ہمرنگ دوسری جماعت اُس پر لعنت کرے گی، یہاں تک کہ جب سب ہی اس میں جمع ہو جائیں گے تو (اُس وقت) اُن کے پچھلے اپنے اگلوں کی نسبت کہیں گے کہ اے ہمارے پالنہار! اِنہی نے تو ہم کو گمراہ کیا تھا تو اُنہیں دوزخ کا عذاب زیادہ دے۔ (اللہ) کہے گا زیادہ تو سب ہی کا عذاب ہے لیکن تمہیں علم نہیں۔ اور اُن کے اگلے اپنے پچھلوں سے کہیں گے پھر تمہیں ہم پر کوئی ترجیح نہیں، سو تم اُن حرکتوں کے عوض عذاب کا مزہ چکھو جو تم کرتے رہے ہو۔''

ہمرنگ دوسری جماعت سے مراد اپنی جیسی جماعت ہے یعنی مشرکین مشرکین پر لعنت کریں گے، یہود یہود پر لعنت کریں گے اور نصاریٰ نصاریٰ پر۔

ضِعف کے عام اور مشہور معنیٰ تو دوگنا کے ہیں لیکن ایک معنیٰ مطلق زیادتی اور شدت کے بھی ہیں، کوئی متعین درجہ مقدار مراد نہیں ہوتی اور یہی مفہوم یہاں بھی ہے۔ اور اگر معنیٰ دوگنا کے لئے جائیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ دوزخ کا عذاب ہر ساعت بڑھتا ہی جائے گا اس لئے ہر دوزخی کو ہر ساعت کا عذاب پہلے سے دوگنا محسوس ہوگا۔

''زیادہ تو سب ہی کا عذاب ہے لیکن تمہیں علم نہیں''، یعنی عذاب کی زیادتی تمہاری ہی طرح دوسرے بھی محسوس کر رہے ہیں لیکن تمہیں علم نہیں۔ اس لاعلمی اور بے خبری میں بھی ایک حکمت ہے اگر دوسروں کی زیادتِ عذاب کا علم اِنہیں ہو جاتا تو کچھ تو اُن کی تسلی ہو جاتی، اس لئے اُنہیں اُن کے حال کی خبر ہی سرے سے نہ دی گئی۔

''پھر تمہیں ہم پر کوئی ترجیح نہیں'' یعنی تخفیفِ عذاب کے بارے میں تم ہم سے کچھ بھی بہتر نہیں۔ تخفیف سے جس طرح ہم محروم ہیں، تم بھی محروم ہو۔ اور جب ہم اور تم دونوں جرموں میں برابر ہیں تو سزا میں بھی برابر ہونے چاہئیں۔ تم اپنا عذاب برداشت کئے جاؤ، ہم اپنا عذاب برداشت کئے جائیں گے۔

<u>آیات سے ماخوذ مفید نکات</u> : (۱) دوزخ میں تمام کفار یکدم نہیں جائیں گے بلکہ نمبروار آگے پیچھے داخل ہوں گے۔ سردارانِ کفر پہلے پہنچیں گے' اُن کے ماتحت بعد میں پہنچیں گے۔ سورۃ الزُّمَر کی آیت ۷۱ میں بھی یہی مضمون لفظِ زُمَــــر کے تحت آیا ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ گنہگار مسلمانوں کو اگر عارضی طور پر دوزخ میں بھیجے گا تو اُس کی پردہ دری بھی نہ ہوگی اور ایک دوسرے پر لعن طعن کی پھٹکار بھی نہ ہوگی بلکہ ربِّ جلیل اُن کی پردہ پوشی فرمائے گا جیسا کہ لَعَنَتْ اُخْتَھَا کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ (۳) دنیا میں ہر تکلیف پہلے زیادہ معلوم ہوتی ہے بعد میں کم۔ مگر دوزخ میں کفار کے لئے یہ نہ ہوگا۔ وہاں ہر آن تکلیف یا تکلیف کا احساس زیادہ ہوتا جائے گا جیسا کہ لِکُلٍّ ضِعْفٌ'' کے الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے۔ (۴) اللہ تعالیٰ کفار کے ناسمجھ بچوں اور پاگلوں کو عذاب نہ دے گا جو نا سمجھی اور دائمی دیوانگی میں فوت ہوئے ہوں کیونکہ دوزخ صرف کسبی ہے۔ یہ نکتہ بِمَا کُنْتُمْ تَکْسِبُوْنَ سے حاصل ہوا' کیونکہ اُنہوں نے کفر و گناہ کا کسب نہیں کیا۔ بلا جرم سزا دینا ایک قسم کا ظلم ہے اور ربِّ جلیل ظلم سے پاک ہے۔

(ii) وَ أَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَ لُوْنَ٥ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ تَأْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ٥ قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ٥ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ٥ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَا اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ٥ فَأَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ٥ (اَلصّٰفّٰت : ۲۷-۳۲)

''اور (دوزخی) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال و جواب کریں گے۔ پیروکار کہیں گے کہ تم ہمارے پاس بڑے کرّ وفر سے آیا کرتے تھے۔ (سرغنہ) کہیں گے کہ نہیں بلکہ تم خود ہی ایمان نہیں لائے۔ اور ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں بلکہ تم خود ہی سرکشی کیا کرتے تھے۔ سو ہم (سب پر) ہمارے رب کی یہ بات محقق ہو چکی تھی کہ ہم (سب) کو مزا چکھنا ہے۔ سو ہم نے تمہیں بھی گمراہ کیا اور ہم خود ہی گمراہ تھے۔''

ماتحت لوگ اپنے سرداروں سے کہیں گے کہ تم بڑی شان و شوکت اور کرّ وفر سے ہمارے پاس آتے تھے اور ہمیں اسلام سے ہٹا کر کبھی سوشلزم کی دعوت دیتے تھے اور کبھی یورپ کی ننگی اور عریاں تہذیب کو اپنانے کا مشورہ دیتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ تم آنکھیں بند کر کے ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ' ہم دونوں جہانوں میں تمہارے ذمہ دار ہیں۔ آج تمہاری وہ شوخیاں کیا ہوئیں؟ اُس دن گمراہ لیڈر اور رئیس کوئی بھی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے بلکہ الٹا الزام اپنے پیروکاروں پر لگائیں گے اور اُنہیں کہیں گے کہ تم خود کافر تھے' تم نے اسلام قبول ہی نہیں کیا تھا۔ ہم نے تمہیں بالکل مجبور نہیں کیا تھا کہ تم دعوتِ حق کو قبول نہ کرو۔ مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن ہر کوئی اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوگا' کسی دوسرے پر اپنی گمراہی کا الزام لگانے سے کام نہیں بنے گا۔ اس لئے قوم کے سردار اور اُن کے پیروکار اِس حقیقت کو خوب ذہن نشین کر لیں تا کہ روزِ محشر اُنہیں کفِ افسوس نہ ملنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں نظریات افراط و تفریط پر مبنی' انتہا پسندی کے نظریات ہیں اور حقیقت و تحقیق سے لاعلمی کا نتیجہ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں قرآن مجید دونوں جہانوں میں فوز و فلاح کے حصول اور خوش آئند' متوازن اور سیر حاصل زندگی گزارنے کے لئے رُشد و ہدایت فراہم کرتا ہے' وہاں وہ قدرتی مظاہر اور تاریخ کے حقائق پر غور کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے جو سائنسی علوم کا ایک حصّہ ہیں۔ چونکہ وہ حقائق منجانب اللہ ہیں جو کائنات کا خالق اور تمام علوم کا منبع ہے' اس لئے وہ حق اور حقیقت ہیں اور اُن پر ایمان لانا فرض ہے۔

معزّز قارئین! انسائیکلو پیڈیا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے' ایسے دُور اَز کار دَعاوی کا واضح' غیر مبہم اور ناقابلِ فراموش ردّ ہے۔ اسلام نے ہر قدم پر لوگوں کو سائنسی علوم کی ترویج و ترقی کا شوق دلایا۔ یہ شوق ولگن اسلامی تہذیب کے عظیم دَور میں سائنسی علوم و فنون کی حیران کُن ترقی میں خاصا ممد و معاون ثابت ہوا جس سے نشاۃ ثانیہ (یورپ میں احیائے علوم کے دَور) سے قبل مغرب بھی مستفید ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کا یہ سلسلہ قرآنی صداقت کو ظاہر و باہر کرنے اور دشمنانِ اسلام کے مضحکہ خیز' غیر معقول اور اسلام کے خلاف خانہ ساز مفروضات کی بیخ کنی کی ایک کوشش ہے تاکہ فرزندانِ اسلام جن کی اکثریت کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے سچے مذہب کی تعلیمات سے دُور رکھا گیا ہے' اُن کے دامِ فریب سے بچ کر اپنا قبلہ درست کرلیں اور اس طرح ایک بار پھر وہ ''خیرَ اُمّۃٍ'' کے صحیح معنی میں مصداق بن کر اُن روحانی بلندیوں کو پا لیں جو ہمارے آباء و اجداد کا چھوڑا ہوا ورثہ ہیں اور جسے ہر دردمند دل شدت سے محسوس کرتا ہے۔ ایک سائنسدان کا یہ معروف بیان مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کافی ہے کہ: قرآنِ حکیم ایک صداقت (سچائی) ہے اور سائنس ہمیشہ صداقت کے تعاقب میں رہتی ہے۔''

چونکہ قرآنِ حکیم بذاتِ خود ایک اَبدی صداقت ہے' لہٰذا کسی سائنسی صداقت و حقیقت کو پانے کی ہر کوشش اُسے قرآن کے قریب لانے اور اُس کے صحیح ہونے کا موجب بنے گی۔ سائنسی جستجو اور تحقیق کا ہر دَور اور ہر عرصہِ عمل قرآنِ حکیم کی مختلف تاویلات و تفسیرات کا مظہر رہا ہے۔

قرآن مجید انسانی زندگی میں پیش آنے والی ہر ہنگامی صورت کا ناقابلِ چیلنج حل فراہم کرتا ہے جس کے پیچھے ایک غیر مرئی (نظر نہ آنے والا) ہاتھ ہوتا ہے اور جب تک شعلہِ جوّالہ (سورج) نیلگوں آسمان پر اپنی ضیا پاشیوں سے اکنافِ عالم کو روشن کرتا رہے گا اور منبعِ نور (چاند) اپنے نور سے کائنات کو منوّر کرتا رہے گا' قرآن مجید کی حیران کن دریافتیں اور معجزانہ معلومات فانی انسان کو ورطہِ حیرت میں ڈالے رہیں گی۔ ایک مستشرق کا بیان ہے:

''قرآن کو سائنسی علوم کا منبع سمجھنے میں ہمیں حیران نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں ہر مسئلہ کو خواہ وہ آسمان یا زمین سے متعلق ہو' یا انسانی زندگی اور تجارت سے' خاطر خواہ زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ یہ چیز یک موضوعی لٹریچر کا سبب

اگر یہ اعتراض ہو کہ اس سے پہلے تو اُنہوں نے پیروکاروں کے الزام کے جواب میں کہا تھا کہ تم خود ہی ایمان لانے والے نہ تھے' ہمارا تم پر کوئی زور نہ تھا اور اب یہ کہا کہ ہم نے تمہیں گمراہ کیا تھا۔ اِن دونوں باتوں میں تضاد ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہم نے زبردستی اور جبراً تمہیں مشرک نہیں بنایا تھا اور اِس آیت میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ہم نے تمہیں صرف گمراہی کی دعوت دی تھی اور ہم ہی تمہاری گمراہی کا سبب تھے اور اس میں اُنہوں نے زبردستی کرنے اور جبر کرنے کا اعتراف نہیں کیا۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب لکھا ہے کہ اگر ہر گمراہ کی ذمہ داری مغوی پر ڈال دینے کا قاعدہ صحیح تسلیم کرلیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی شخص قابلِ سزا رہ ہی نہ جائے گا کہ اُس مغوی (گمراہ) کا بھی تو کوئی اور مغوی ہوگا اور اُس کا کوئی اور۔ اِس سے صاف تسلسل لازم آتا ہے اور ذمہ داری ایک سے دوسرے پر برابر ہٹتی ہی چلی جائے گی۔

(۷) <u>قرآن مجید انسان کو ایک پاکیزہ ثقافت' زندگی گزارنے کا باوقار طریقہ اور دونوں جہانوں میں کامیابی کی ضمانت عطا کرتا ہے</u> : آیاتِ قرآنی ملاحظہ ہوں :۔

(i) وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ٥ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ٥ (الانعام : ۱۲۶ ' ۱۲۷)

''اور آپ کے پروردگار کا یہی سیدھا راستہ ہے' ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے آیتوں کو خوب کھول کر بیان کردیا ہے۔ اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور وہی اُن کا دوست ہے بہ سبب اِس کے کہ جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں۔''

مُسْتَقِيمًا تاکید کے لئے ہے ورنہ صِرَاطِ رَبّ تو ظاہر ہے کہ مستقیم ہی ہوگی۔ یہ تاکید ایسی ہے جیسے حق کے ساتھ مُصَدِّق (سورہ فاطر آیت ۳۱)۔ اس راستے سے مراد اسلام' قرآن اور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری ہے۔ آیتیں مفصل تو سب کے لئے ہیں لیکن اُن سے نفع وہی لوگ حاصل کریں گے جن کے دلوں میں ہدایت و نصیحت کی طلب ہے۔ وَلِـــی کے معنیٰ قریب کے ہیں اور اسی سے مفسرین نے استدلال کیا ہے کہ آیت سے نیک بندوں کا انتہائی شرف ظاہر ہورہا ہے۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ اللہ سے بندوں کی قربت کا ترجمان ہے تو وَلِيُّهُمْ بندوں سے اللہ کی قربت کا مظہر ہے۔ دَارُ السَّلَام یعنی دَارُ السَّلَامَةِ وہ مکان جو ہر قسم کی آفات سے محفوظ ہو اور وہ جنت ہے۔

<u>جنت کو دَارُ السَّلَام فرمانے کی وجوہات</u> :(۱) سَلام اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے (سورۃ الحشر:۲۳) تو دَارُ السَّلَام کا معنیٰ ہوا اللہ کا گھر۔ یہ اضافت عزت افزائی کے لئے ہے جیسے بَیْتُ اللہ اور نَاقَۃُ اللہ (۲) جنت کو

دارُالسَّــــلام اس لئے کہا کہ اُس میں ہر قسم کے عیوب' تکالیف اور مشقتوں سے سلامتی ہے۔(۳)جنتیوں کو جنت میں داخلے کے وقت سلام کیا جائے گا' اللہ کی طرف سے (سورہ یٰس :۵۸)' فرشتوں کی طرف سے (سورہ الزُّمَر:۷۳)' اہلِ اعراف کی طرف سے (سورۃ الاعراف:۴۶) اور جنتی بھی ایک دوسرے کو سلام کریں گے (سورہ یونُس:۱۰)

آیت سے ماخوذ چند مفید نکات :(۱) خدارسی کا صرف ایک ہی راستہ ہے یعنی قرآن مجید اور صاحبِ قرآن کی غلامی۔ اس کے سوا اللہ تک پہنچنے کا کوئی اور راستہ ہے ہی نہیں' جیسا کہ وَھٰذَا صِرَاطُ رَبِّکَ سے معلوم ہوا۔(۲) شریعت خدارسی کا سیدھا اور آسان راستہ ہے جو ہر قسم کے الٹ پیچ سے خالی ہے جیسا کہ لفظ مُسْتَقِیْمًا بتا رہا ہے۔ (۳) یہاں صِرَاطُ اللہ یا صِرَاطُ ربّ العالمین یا صِرَاطُ رَبِّکُم نہیں فرمایا بلکہ رَبِّکَ (اے محبوب! آپ کے رب کا راستہ) فرما کر یہ بتا دیا کہ جو رب تعالیٰ کو ربِّ محمد ہونے کی شان سے مانے' وہی اُس راستے کو پاسکے گا' آپ کا دامن چھوڑ کر کبھی یہ راستہ نہیں مل سکتا۔(۴) قرآن اور اسلام مؤمنین کے لئے سیدھا راستہ ہیں نہ کہ حضور ﷺ کے لئے کیونکہ مؤمنین تو راستہ میں ہیں اور حضور ﷺ راستہ پر ہیں۔ مؤمنین مسافرین ہیں جبکہ حضور ﷺ منزلِ مقصود ہیں۔ رب فرماتا ہے: اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم نیز فرماتا ہے: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْم (سورہ ھُود:۵۶) (بے شک میرا رب سیدھے راستہ پر ہے) معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ بھی سیدھے راستے پر ہے اور حضور ﷺ بھی سیدے راستے پر ہیں یعنی جہاں حضور ملتے ہیں وہاں ہی اللہ تبارک وتعالیٰ ملتا ہے یا یوں کہئے کہ مؤمنین سیدھی راہ پر ہیں سفر کرنے کے لئے اور حضورِ انور سیدھے راستے پر ہیں رہبری کرنے کے لئے۔ مؤمنین راہگیر ہیں تو حضورِ انور ﷺ رہبر ہیں۔ اُس راستے کی منزل مقصود ربِّ جلیل ہے۔(۵) جنتی لوگ محض مہمان نہ ہوں گے بلکہ اپنی اپنی جنت کے مالک ہوں گے۔ یہ نکتہ لَھُمْ کے لِ سے حاصل ہوا جو ملکیت کا لام ہے۔(۶) جنتیوں کی یہ ملکیت آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ فائدہ لَھُمْ دارُالسَّــــلام جملہ اسمیہ سے حاصل ہوا جو دوام (ہمیشگی) پر دلالت کرتا ہے۔ (۷) جنت میں ہر قسم کی سلامتی ہوگی۔ مرض' موت' عداوتیں وغیرہ کوئی تکلیف دہ چیز وہاں نہ ہوگی۔(۸) جنت حاصل کرنے کا ذریعہ نیک اعمال ہیں۔ یہ فائدہ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ سے حاصل ہوا کہ یہاں ب سببیہ ہے (مگر یہ قانون جنتِ کسبی کے لئے ہے نہ کہ جنتِ عطائی اور وہبی کے لئے' جیسے مسلمانوں کے چھوٹے بچے اور دیوانے جنت میں جائیں گے مگر رب تعالیٰ کے محض کرم سے)۔

(ii) ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا کَذٰلِکَ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥ (یونس : ۱۰۳)
"پھر ہم اپنے پیغمبروں اور اہلِ ایمان کو بچالیتے ہیں یہ ہمارے ذمّے ہے کہ ہم مؤمنین کو نجات دیا کرتے ہیں۔"

قرآن مجید نے بار بار مختلف پیرایوں میں واضح کیا ہے کہ جب عذابِ الٰہی آتا ہے صرف کافروں اور

منکروں پر آتا ہے اور مؤمنین اس سے بچالئے جاتے ہیں اور یہیں سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ تکوینی حادثے جن میں مؤمن و کافر سب بلا امتیاز و تفریق یکساں طور پر مبتلا ہو جاتے ہیں مثلاً قحط' سیلاب' وبا' یہ ہرگز عذابِ الٰہی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں نمونہ عذابِ الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ (تفسیر ماجدی اردو)

نوٹ : لفظ مؤمنین میں یاوَالَّذِيْنَ آمَنُوْا یا یَاۤاَیُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا میں انبیائے کرام شامل نہیں ہوتے کیونکہ وہ صرف مؤمن ہی نہیں بلکہ مؤمن گر ہوتے ہیں۔ یہ فائدہ رُسُلَنَا علیحدہ بیان کرنے سے ملا۔ اس کی ایک اور مثال سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۵ ہے جس میں رسول اور مؤمنین کے ایمان لانے کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا۔

(iii) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ (اَلنَّحل : ۹۷)
"جو کوئی بھی نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے اور ہم اُنہیں اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔"

مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى (مرد ہو یا عورت) نے اِس حقیقت کو روشن کر دیا کہ اجرِ اعمال کے لحاظ سے اسلام کی نظر میں عورت مرد سے کم نہیں بلکہ اُس کے مساوی ہے۔ مشرک قوموں نے عورت کو حق تعالیٰ کی نظر میں جو ایک پست و حقیر مخلوق ٹھہرایا ہے' اُس کی پوری تردید ہوگئی۔ وَهُوَ مُؤْمِنٌ "(بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان ہو) سے معلوم ہوا کہ عملِ صالح کی پہلی اور بنیادی شرط ایمان ہے اور اس کے بغیر کوئی عملِ صالح فی الحقیقت صالح ہو ہی نہیں سکتا' صرف صورۃً صالح کہا جا سکتا ہے۔ علماء نے یہیں سے یہ دلیل حاصل کی ہے کہ عمل اور چیز ہے اور ایمان اور چیز۔ حَيٰوةً طَيِّبَةً (پاکیزہ زندگی) میں جس بشارت کا ذکر ہے' اُس کا یہ مطلب نہیں کہ صالح مؤمن کو کبھی فقر یا مرض لاحق نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اطاعت کی برکت سے اُس کے دل میں ایسا نور پیدا ہوگا جس سے وہ ہر حال میں صابر و شاکر اور تسلیم و رضا کا پیکر ہوگا اور دلی سکون و جمعیت ہی اصل رضا ہے۔ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (اور ہم اُنہیں اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے) کا تعلق آخرت سے ہے۔ گویا ایمان اور عملِ صالح (یعنی مؤمنانہ زندگی) کا ایک معاوضہ تو جس کا نام حیاتِ طیبہ ہے' نقد اسی دنیا میں مل جائے گا اور پھر دوسرا اس سے کہیں بڑا معاوضہ آخرت میں نصیب میں آئے گا۔

حیاتِ طیبہ کا مفہوم : دنیا میں سکون و اطمینانِ قلبی کا حاصل ہونا' توفیقِ عبادات' ذکر و عبادات میں لذت و فرحت' فسق و فجور سے نفرت' پاکیزہ دولتوں کی کثرت' حرام غذا اور حرام کاموں سے بچنے کی ہمت'

غربت میں بھی شکر وصبر اور قناعتِ قلبی (دل بھرا پُرا رہنا)' ہر وقت اطاعت وعبادت میں منہمک رہنا' دُنیوی اور دینی کامیابیاں' بندے کی تمام تدابیر رب تعالیٰ کے ذمّہِ کرم پر ہونا' نیک نامی' اچھی شہرت' مقبول عبادت' نفس وشیطان اور جان لیوا دشمنوں سے بچے رہنا' سب حیاتِ طیّبہ کی دولت میں شامل ہیں۔

صحابہ کرام' تابعین اور مجتہدین کے مختلف اقوال کے مطابق یہ دنیا کی حیاتِ طیّبہ ہے اور قبر میں حیاتِ طیّبہ کی مثالیں یہ ہیں: دیدارِ رسول اللہ ﷺ کی جلوہ ریزیاں' امتحانِ قبر کی کامیابی' جنّت کی روح افزا اور دلنواز ہوائیں' رب تعالیٰ کی رضائیں' دُلہن کی طرح آرام کرنے کی ادائیں' ختمِ قرآن مجید اور ایصالِ ثواب کی محفلیں' اپنے پرایوں میں ذکرِ جمیل کی مجلسیں' قصیدہ خوانیاں' فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ کی دیدہ سامانیاں اور روزِ محشر میں تو خود حیاتِ طیّبہ نثار ہو جائے گی' جب (از روئے حدیث هُمْ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُّوْرٍ) انہیں تاجِ نور پہنا کر تختِ محشر پر بٹھایا جائے گا' جب لَا خَوْفٌ" عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کا مژدہ سنایا جائے گا' جب سَلَامٌ" عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ (تم پر سلامتی ہو' مزے میں رہو) کا نغمہ سنایا جائے گا' جب جامِ کوثر پلایا جائے گا' جب جنت کا مقام دکھایا جائے گا' جب ابدی حیات کا تمغہ عطا فرمایا جائے گا' جب ایک ایک نیکی کا ثواب دس گنا اور خشوع و خضوع کے درجہ بدرجہ سات سو گنا دیا جائے گا' جب آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیاری' دلنواز مسکراہٹ اور شفاعت کا زیور پہنایا جائے گا' جب خوشنودیِ ربِّ کریم کا لباسِ ابدی زیبِ تن کرایا جائے گا' تب حیاتِ طیّبہ کا پورا نظارہ اور وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کی سچی تفسیر آشکار ہوگی۔

(iv) وَعَدَاللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ (اَلتَّوْبَة : ۷۲)

''اللہ نے ایمان والوں اور ایمان والیوں سے باغات کا وعدہ کر رکھا ہے کہ اُن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی' وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے' اور (وعدہ کر رکھا ہے) ہمیشگی کے باغات میں پاکیزہ مکانوں کا اور اللہ کی رضامندی سب (نعمتوں) سے بڑھ کر ہے' بڑی کامیابی تو یہی ہے۔''

''اللہ کی رضامندی سب (نعمتوں) سے بڑھ کر ہے'' جو تعمیلِ احکام سے ہر مومن کو مل سکتی ہے۔ صوفیائے عارفین نے کہا کہ جنت میں دیدارِ الٰہی اگرچہ ایک عظیم الشان نعمت ہے لیکن یہ لذت تو صرف عاشقوں اور دیدار کرنے والوں کے نقطۂ خیال سے ہے اور ایک عاشق کے لئے دیدارِ محبوب سے بڑھ کر لذیذ نعمت اور کیا ہو سکتی ہے لیکن محبوب کی رضا تو اِس سے بھی بڑھ کر لطیف ولذیذ ہے اور محبوبِ حقیقی کی رضا صرف تعمیلِ احکام اور ادائے فرائض میں ہے۔ خود جنت میں جانے اور ہر قسم کی نعمت پانے کا سبب بھی تو یہی رضائے الٰہی ہے اور عاشقوں کا منتہائے مقصود بھی یہی رضا ہے۔

آیت سے ماخوذ چند مفید نکات :(۱) جنت کے درجات وطبقات مختلف ہیں کہ اُن میں جانے والے مختلف ہیں یعنی جس درجے کا مؤمن' اُسی درجے کی اُس کے لئے جنت ہوگی۔ یہ نکتہ مُؤمِنِیْن مُؤمِنات اور جنّٰت کی جمع فرمانے سے حاصل ہؤا۔(۲) اہلِ جنت کو کچھ باغ تو سیر وتفریح کے لئے دیئے جائیں گے اور کچھ باغ رہائش کے لئے جن میں اُن کے بنگلے اور کوٹھیاں ہوں گی جیسا کہ مَسٰکِنَ طَیِّبَۃً سے معلوم ہؤا' اور یہ کہ جنّٰت کا ذکر دو دفعہ ہؤا۔ (۳) خوش نصیب جنتیوں کے لئے جنتِ عدن ہے اور بعض جنتیوں کے لئے جنت کے عام طبقات (۴) نہ جنت کو فنا ہے' نہ جنت کی نعمتوں' حور وغلمان کو اور نہ جنتیوں کو فنا ہے۔ (۵) اعلیٰ درجہ کی نعمت اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ جس سے ربِّ جلیل راضی ہوگیا' وہ دین ودنیا میں کامیاب ہوگیا۔(۶) ممکن ہے کہ جنت کی تمام نعمتیں ہمارے اعمال کا بدلہ ہوں مگر اللہ تعالیٰ کی رضا کسی عمل کا بدلہ نہیں۔ یہ محض رحم وکرم ہے۔ یہ نکتہ اِس نعمت کو الگ عنوان سے بیان فرمانے سے حاصل ہؤا۔

رب تعالیٰ کی پسندیدہ جماعت جسے دوسروں کو بنانے کے لئے بنایا گیا : (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجین' جلد پنجم' صفحہ ۳۱۴) جسے سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ میں یوں آشکار کیا گیا ہے:۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

"تم لوگ بہترین جماعت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے' تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو' اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو اُن کے لئے بہتر ہوتا۔"

آیت کے اِس حصّہ میں اُمّتِ اسلامی کی اعتقادی' اَخلاقی اور عملی زندگی کے کامل ومکمّل ہونے کی پوری تصویر آگئی۔ مطلب یہ ہؤا کہ اے مسلمانو! تم اپنی ذمّہ داری پوری طرح محسوس کرو' تم توحید کے امانتدار ہو' زمین پر اللہ کے نائب وخلیفہ ہو' اُس کے دین کے سپاہی ہو' الٰہی قانون کے نفاذ و تحفّظ کے لئے' دنیا کے نظامِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے بھیجے گئے ہو' تمہاری زندگی کا مشن ہی یہ ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کو چلاؤ' نظامِ حق کے ایک ایک کل پُرزہ کو درست رکھو اور نظامِ باطل کا زور چلنے ہی نہ دو۔ اگر اس ذمّہ دار فعّال (ایگزیکٹو) جماعت کو جدال وقتال کی آزادی نہ ملتی تو یہ ظلم ہوتا۔ بلا اجازت جہاد' بلا اجازت اِجرائے حدود وتعزیرات اِس قوم پر ذمہ داریاں ڈال دینے کے معنیٰ یہ ہوتے کہ ہاتھ پیر باندھ کر دریا میں تیرنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ کیا تماشہ ہے کہ انگریز ہندوستان میں ستی کی رسم کو جرم قرار دے دیں تو وہ مُلک کے محسن۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کے دستور کو روک دیں تو اُن کا شکریہ واجب' لیکن اللہ کے سپاہی اور مالک الملک کے پیارے اگر یہ حق حاصل کرنا چاہیں کہ قانونِ الٰہی سے بغاوت کرنے والوں اور امنِ عالم کو غارت کرکے رکھ دینے والوں کے خلاف فولادی طاقت سے نمٹیں تو

''روشن خیالی'' کے جبینِ تحمل پر شکن آجائے اور ''تہذیب'' کا پروپیگنڈسٹ اُسے رواداری کے خلاف قرار دینے لگے۔ تَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ میں مُنْکَر کے تحت میں آج کے شراب خانے اور تھیٹر' سینما اور کنسرٹ ہال' ناچ گھر اور میوزک کالج سب آجاتے ہیں۔ آیت سے ظاہر ہے کہ اِس اُمّت کی خیریت وافضلیت اُسی وقت تک ہے جب تک وہ اِن صفات کی حامل ہو یعنی ایمان باللہ میں مضبوط ہو' اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (ایجابی وسلبی دونوں قسم کی اخلاقی خوبیوں) پر قائم ہو۔'' (تفسیر ماجدی اردو' ص ۱۴۹)

آیت سے حاصل کردہ چند مفید نکات: (۱) حضور ﷺ کی اُمّت کی موجودگی عالَم کی بقا کا سبب ہے۔ اگر یہ نہ رہے تو دنیا ختم کردی جائے جیسا کہ لِلنَّاسِ کے لفظ سے معلوم ہوا۔ (۲) ہر مسلمان کو مُبلّغ ہونا چاہئے کہ جسے جو مسئلہ معلوم ہو' دوسرے کو بتا کر خَیْرَ اُمَّةٍ کا لقب حاصل کرے اور عمل سے بھی تبلیغ کرے۔ (۳) نبیِ اکرم ﷺ کا انکار دراصل رب تعالیٰ کا بھی انکار ہے اور ساری ایمانیات کا بھی۔ دیکھئے اہلِ کتاب رب تعالیٰ کی ذات وصفات' قیامت وغیرہ کے اقراری تھے مگر ربِّ جلیل نے فرمایا لَوْ اٰمَنَ اَھْلُ الْکِتٰبِ (اگر کتابی ایمان لے آتے) (۴) اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والے مبلّغ کو دنیا میں بھی عزت' دولت' شہرت اور عافیت وغیرہ ملتے ہیں اور آخرت میں بھی مغفرت' رحمت اور جنت وغیرہ ملے گی جیسا کہ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ کے الفاظ سے معلوم ہوا۔

فضائلِ اُمّتِ رسول اللہ ﷺ: (۱) جیسے حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار ہیں' ایسے ہی آپ کی اُمّت ساری اُمّتوں کی سردار ہے' آپ کے صحابہ تمام انبیاء علیہم السلام کے صحابہ سے افضل' آپ کے اہلِ بیت و اولاد تمام انبیاء کے اہلِ بیت واولاد سے افضل ہیں حتّٰی کہ آپ کا وطن یعنی مکّہ معظمہ اور مدینہ منوّرہ دیگر انبیاء کے وطنوں سے افضل۔ (۲) یہ اُمّت آخرالامم ہے۔ گزشتہ اُمّتوں کے عیوب قرآن کریم میں بیان ہوئے جس سے وہ ساری دنیا میں بدنام ہوگئیں مگر اس اُمّت کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ کوئی آسمانی کتاب جس میں ان کے عیوب بیان ہوں' اِس طرح اس اُمّت کی پردہ پوشی کی گئی۔ (۳) پہلی کتب میں اِس اُمت کے اوصاف کا ذکر تو تھا لیکن اُن کے عیوب کا تذکرہ نہ تھا جس کے باعث وہ لوگ اِس امت میں ہونے کی تمنا کرتے تھے۔ (۴) رب تعالیٰ نے دیگر انبیائے کرام کو اُن کے ناموں سے پکارا مگر ہمارے نبی کو اُن کے القاب سے پکارا۔ اسی طرح اُن کی اُمّتوں کو نسبی ناموں سے پکارا گیا یَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (سورۃ البقرۃ: ۴۰' ۴۷' ۱۲۲)' یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا (سورۃ الجُمُعۃ: ۶) وغیرہ مگر اِس اُمّت کو یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے دلکش وپیارے خطاب سے نوازا گیا۔ (۵) گزشتہ تمام اُمّتیں اپنے نبیوں کے بعد گمراہ ہوجاتی تھیں مگر اِس اُمّت میں تا قیامت ایک فرقہ حق پر رہے گا اور شمعِ حق کو فروزاں رکھے گا۔ (۶) اِس اُمّت میں ہمیشہ اولیاء اللہ وعلمائے ربانی ہوتے رہیں گے۔ جس درخت کی جڑ ہری ہو' اُس میں پھل پھول آتے ہی رہتے ہیں۔ (۷) یہی اُمّت کل قیامت کے دن بارگاہِ الٰہی میں گزشتہ

نبیوں کے حق میں گواہی دے گی کہ اُنہوں نے اپنی قوموں کو تبلیغ کی تھی۔(۸) اِس اُمت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح دینِ حق کی خدمت کرتے رہے اور کرتے رہیں گے۔ چنانچہ مفسّرین' محدّثین' فقہاء' متکلمین اِسی اُمّت میں ہوئے کسی اور میں نہ ہوئے۔(۹) حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ میری اُمّت کو کبھی گمراہی پر جمع نہ ہونے دے گا اور اس اُمّت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت رہے گی (ترمذی) (۱۰) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا کہ جنتیوں کی کُل ایک سو بیس صفیں ہوں گی جن میں سے اَسّی صفیں میری اُمّت کی اور باقی چالیس صفیں باقی اُمتوں کی ہوں گی۔(ترمذی) (۱۱) حضرت ابواُمامہ سے روایت ہے کہ رسالتمآب ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمّت کے ستر ہزار شخص بغیر حساب وعذاب' جنت میں داخل ہوں گے جن میں سے ہر ایک کے ساتھ ستر ستر ہزار اُس کے طفیلی ہوں گے (ترمذی) (۱۲) امام بغوی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جنت ہم سے پہلے دیگر انبیائے کرام پر ممنوع ہے اور ہماری امت سے پہلے دیگر امتوں پر ممنوع ہے۔(تفسیر نعیمی' جلد ۴' صفحات ۷۷' ۷۸)

ڈارونزم (نظریہ ارتقاء ۱۸۵۹ء)

ڈارون کا نظریہ ارتقاء ایک ایسے بددیانت فلسفے کے لئے سہارے کی بنیاد ہے جس نے لاتعداد انسانوں کے ذہنوں پر حکمرانی کی ہے۔ یہ ''مادہ پرستی'' کا وہ فلسفہ ہے جو ہمارے کیوں اور کیسے وجود میں آنے کے جوابات کے بارے میں غیر حقیقی نظریات کا حامل ہے۔ اِس فلسفے کی رُو سے مادّہ ازل سے موجود ہے اور سوائے مادّے کے اور کچھ بھی نہیں ہے اور مادّہ ہر شے کا جوہر ہے خواہ وہ نامیاتی ہو یا غیر نامیاتی۔ یہ فلسفہ ایک ایسے خالقِ بزرگ و برتر کے وجود کا انکار کرتا ہے جسے اَللہ کہتے ہیں۔ یہ فلسفہ چونکہ شروع ہی سے تخلیقِ کائنات کا منکر ہے اس لئے یہ اِس بات پر زور دیتا ہے کہ دُنیا کی ہر شے خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان' کسی تخلیق کار کے بغیر وجود میں آ گئی ہے' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ ایک حُسنِ اتفاق تھا جس کے نتیجے میں ایک ترتیب و نظام کی ضرورت خود بخود پوری ہو گئی تھی۔ ہر شے کو مادّے کی سطح تک لانے سے یہ تصوّر انسان کو ایک ایسی مخلوق میں ڈھال دیتا ہے جو ہر قسم کی اخلاقی اَقدار سے منہ موڑتے ہوئے صرف مادّے کی طرف توجّہ دے۔ مادّہ پرستی کے نقصانات صرف افراد تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ ایک ایسے بے رُوح اور بے حس معاشرے کو جنم دیتی ہے جن کی نظروں میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز نہیں اور مادہ ہی سب کچھ ہے۔ اس قسم کے معاشرے کے افراد چونکہ کبھی بھی مثالیت پسندانہ تصوّرات مثلاً حُبِّ وطن' اپنی قوم کے افراد سے محبت' عدل وانصاف' وفاداری' دیانتداری' جذبہ ایثار و قربانی' عزت و توقیر یا اعلیٰ اَخلاق نہیں رکھتے اس لئے جس سماجی نظام کی تشکیل یہ افراد کرتے ہیں' اُس کے مقدر میں بہت جلد بکھر جانا ہوتا ہے۔ اِن وجوہ کے باعث مادّہ پرستی کسی قوم کے سیاسی وسماجی نظام کی بنیادی اقدار کے لئے شدید خطرات کا باعث بنتی ہے۔''

(''نظریہ ارتقاء۔۔ایک فریب'' (اردو) ہارون یحییٰ' ص ص ۹' ۱۰)

’’ڈارون نے حیاتیات کی رسمی تعلیم کبھی بھی حاصل نہیں کی تھی۔ اُسے نیچر یا فطرت اور جاندار چیزوں کے موضوع میں صرف شوقیہ حد تک دلچسپی تھی۔ وہ مختلف جانداروں کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوا' بالخصوص ایک جزیرے میں نظر آنے والی چڑیوں نے اُسے بہت متاثر کیا۔ اُس کے خیال میں اُن کی چونچوں کا مختلف ہونا اُن کے وطن یا جائے پیدائش کے مختلف ہونے کی وجہ سے تھا جس کے مطابق یہ مختلف شکلوں میں ڈھل گئی تھیں۔ اِس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے اُس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ زندگی کا آغاز اور جانداروں کی ابتدا اِسی تصور ’’ماحول وجگہ سے مطابقت پذیری‘‘ میں پوشیدہ ہے۔ ڈارون کے خیال میں مختلف جانداروں کا ایک ہی مشترکہ مورثِ اعلیٰ یا جدّ امجد تھا اور یہ بعد میں قدرتی حالات کے نتیجے میں ایک دوسرے سے مختلف ہو گئے تھے۔‘‘

’’ڈارون نے اِس سارے عمل کو ’’ارتقاء بذریعہ فطری انتخاب‘‘ کا نام دیا اور اُس نے یہ سمجھا کہ اُس نے ’’جانداروں کی ابتداء‘‘ کا راز معلوم کر لیا ہے اور یہ کہ ایک جاندار کی ابتدائے آفرینش کسی دوسرے جاندار سے ہوئی۔ اُس نے اِن خیالات کا اظہار ۱۸۵۹ء میں اپنی کتاب ("The Origin of Species by means of Natural Selection") ’’جانداروں کی ابتداء بذریعہ فطری انتخاب‘‘ میں کیا تھا۔‘‘ (ایضاً ص ۲۱'۲۲)

’’__فطری انتخاب__: فطری انتخاب کا موقف یہ ہے کہ وہ جاندار چیزیں جو اپنی جائے پیدائش کے قدرتی مزاج سے زیادہ موافقت رکھتی ہوں' وہ اولاد کے ذریعے زندہ رہ جائیں گی جبکہ وہ جو ناموافق ہوں گی' مٹ جائیں گی۔ مثلاً ہرنوں کے ایک ریوڑ میں سے جو جنگلی جانوروں کے خطرے میں گھرے ہوئے ہوں' قدرتی طور پر وہی بچ جائیں گے جو تیز دوڑ سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے لیکن قطع نظر اِس بات کے کہ یہ عمل کب تک جاری رہتا ہے' یہ ان ہرنوں کو دوسرے جانداروں میں تبدیل نہیں کر دے گا۔ ایسی اُلٹ تبدیلی ممکن نہیں ہو گی' ہرن بہر حال ہرن ہی رہیں گے۔‘‘ (ایضاً ص ۳۲)

__ڈارون کے نظریے کی بے اثری__: ڈارون یہ بات بخوبی جانتا تھا کہ اُس کا یہ نظریہ بے شمار مسائل سے دوچار ہو گا۔ اُس نے اِس کا اعتراف اپنی کتاب کے جس باب میں کیا' اُس کا عنوان ہے ’’نظریے کی مشکلات‘‘ ایک امریکی طبعیات دان لپسن نے ڈارون کی ’’مشکلات‘‘ پر یوں تبصرہ کیا:۔

’’جانداروں کی ابتداء کے بارے میں پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ ڈارون تو خود اس بارے میں بہت کم یقین رکھتا تھا۔ جس طرح اُسے اکثر پیش کیا جاتا ہے ایسا نہیں ہے۔ مثلاً ’’نظریے کی مشکلات‘‘ والے باب میں تو خود اس کے اپنے بارے میں شکوک موجود ہیں۔ میں بطور ایک طبعیات دان کے خاص

طور پر فریب میں آ گیا تھا جب میں نے اُس کے اِس تبصرے کو دیکھا کہ آنکھ کس طرح اوپر اٹھی ہو گی۔''
("Evolution Trends in Plants" Vol. 2, p. 6 --- H. S. Lipson) 1988.

یونیورسٹی کالج، ویلز کے شعبہ فلکیات اور اطلاقی ریاضی کے پروفیسر چندرا وِکرماسنگھ تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''بے جان مادے سے زندگی کے خود بخود وجود میں آ جانے کا امکان کسی تعداد کے بعد ۴۰۰۰۰ صفر لگا دیئے میں سے ایک ہے اور یہ اتنا بڑا ہے جس سے ڈارون اور اس کے مکمل نظریہ ارتقاء کو دفن کیا جا سکتا ہے۔ عہدِ قدیم میں اِس سیارے پر یا کسی دوسرے سیارے پر کوئی ایسا شوربہ یا یخنی نہیں تھی جس سے ایسا ہو جاتا اور اگر زندگی کا آغاز بے ترتیب نہ تھا تو پھر یہ یقیناً با مقصد ذہانت کی پیداوار تھی۔''
("Evolution from Space" , p. 148 --- Chandra Wickramasinghe) 1984.

سر فریڈ ہائل اِن نامعتبر اعداد و شمار پر یوں تبصرہ کرتا ہے:۔

''بے شک اِس قسم کا نظریہ (کہ زندگی ایک ذہانت کے ذریعے تشکیل دی گئی) اِس قدر واضح ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ اسے وسیع پیمانے پر اظہر من الشمس کے طور پر تسلیم کیوں نہ کر لیا گیا۔ اس کی وجوہ سائنسی کی نسبت زیادہ نفسیاتی ہیں۔'' (ایضاً ص ۱۳۰ بحوالہ ''نظریہ ارتقاء۔۔ایک فریب'' از ہارون یحییٰ ص ۱۱۷)

''مسٹر ہائل نے ''نفسیاتی'' کی اصطلاح کیوں استعمال کی' اس کا سبب یہ ہے کہ ارتقاء پسندوں نے از خود اپنے آپ پر یہ پابندی عائد کر رکھی ہے کہ اُنہوں نے یہ بات تسلیم نہیں کرنی کہ زندگی تخلیق کی جا سکتی تھی۔ اِن لوگوں نے یہ تہیہ کر رکھا ہے کہ اللہ کی موجودگی کو ضرور مسترد کرنا ہے اور یہی اُن کا اصل ہدف ہے۔ صرف اس وجہ سے وہ ان غیر معقول منظر ناموں کا دفاع کئے جا رہے ہیں جنہیں وہ ناممکن مان چکے ہیں۔'' (''نظریہ ارتقاء۔۔ایک فریب'')

سر آرتھر کیتھ جو نامیاتی ارتقاء کے زبردست حامی ہیں' نے بھی ارتقاء کے نظریے کو عملی طور پر یا استخراجی طور پر قبول نہ کیا بلکہ اس کے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ یہ محض استدلالِ عقلی ہے (اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔) ("Revolt against Reason" --- Hugh Ross, p. 83)

''جو صداقت نظریہ ارتقاء کو بے اثر کرتی ہے وہ انسانی زندگی کا انتہائی پیچیدہ ہونا ہے۔ ڈی این اے کا سالمہ

جو ہمارے جسم کے اندر ہر ۱۰۰ ٹریلین خلیوں کے مرکزوں میں پایا جاتا ہے' انسانی جسم کی مکمل تعمیری منصوبہ بندی رکھتا ہے۔ کسی انسان کی تمام خصلتوں کے بارے میں معلومات' اُس کی جسمانی شکل وصورت سے لے کر اُس کے جسم کے اعضاء کی اندرونی ساخت تک کے بارے میں ایک خاص رمزی نظام Coding) (System ڈی این اے میں درج کر دیتا ہے۔ ڈی این اے میں درج معلومات چار خاص بنیادوں کی ترتیب کے اندر Code (رمز) کی شکل میں موجود ہوتی ہیں جو اُس سالمے کو بناتی ہیں۔ ان بنیادوں کو اے ٹی جی سی کا نام دیا گیا ہے جو اُن کے ناموں کے پہلے حرف کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ لوگوں میں پایا جانے والا ساختیاتی فرق ان حروف کی ترتیب کے فرق پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ ایک قسم کا ڈیٹا بنک ہوتا ہے جس کی تشکیل چار حروف سے ہوتی ہے۔ ڈی این اے میں اِن حروف کی ترتیب کسی انسان کے جسم کی ساخت کا پتہ لگاتی ہے اور اس میں وہ کسی حد تک تفصیلات کی گہرائی تک پہنچ جاتی ہے۔ انسانی جسم کے خدّ وخال مثلاً قدّ' آنکھیں' بال اور جلد کی رنگت کے علاوہ ایک واحد خلیے کے ڈی این اے ۲۰۶ ہڈیوں' ۶۰۰ عضلات کی بناوٹ' ۱۰،۰۰۰ اسامعاتی عضلات کا نیٹ ورک' ۲ ملین بصری نسوں' ۱۰۰ بلین عصبی خلیوں' ۱۳۰ بلین میٹر لمبی رگوں اور ۱۰۰ ٹریلین خلیات ایک جسم کے اندر رکھتی ہے۔ اگر ہمیں اِن معلومات کو تحریر میں لانا ہو جو ڈی این اے میں کوڈ (رمز) کی شکل میں درج ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں ایک بہت بڑی لائبریری تیار کرنا ہوگی جس میں انسائیکلوپیڈیا کی ۹۰۰ جلدیں ہوں گی اور ہر جلد کے ۵۰۰ صفحات ہوں گے۔ یہ غیر معمولی حقائق نظریہ ارتقاء کو بالکل بے اثر بنا دیتے ہیں۔''

("The Miracle of Creation in Plants" --- Harun Hahya, p. 193)

فتح اللہ خان (انجنیئر) اپنی کتاب میں لکھتے ہیں :۔

''ڈارون کا نظریہ محض ایک نظریہ ہے جو اپنی موت آپ مر جائے گا۔ یہ اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہے۔ سائنس کی دنیا میں بھی اِسے مسترد کر دیا گیا ہے اور اِسے چیلنج کیا گیا ہے اور اب سائنس دان اس پر مزید یقین رکھنے کو تیار نہیں ہیں۔''

''جانور صرف جبلی طور پر زندہ رہتے ہیں اور اُن میں انسانوں کی طرح رُوح اور حسِ اخلاق نہیں ہوتا۔ اُن کی زندگی کا واحد مقصد اپنا دفاع کرنا' اپنے آپ کو پالنا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانا اور اُس میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ جبلّت کی یہ قوّت بنیادی طور پر حسِ اخلاق سے مختلف ہے۔ جانوروں کی جبلاّتی طاقت کو ارتقائی عمل کے ذریعے حسِ اخلاق میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دنیا میں کوئی بھی جانور ایسا نہیں جس میں حسِ

بنی اور جو قرآن کے مختلف اجزاء کی تفسیر بن گئے۔اس طرح گرما گرم علمی بحثیں قرآن کی رہینِ منت ہیں اور مسلم دُنیا میں سائنسی علوم کی تمام شاخوں کی معجزانہ ترقی و ترویج کی تمام تر وجہ یہی تحریک تھی۔'' ("New Researches into the Composition & Exegesis of the Qur'an" .. Dr. Hartwig Hirshfield, p. 9)

''محمد ﷺ خود اگرچہ ایک اُمّی انسان تھے تاہم وہ ایک ایسی کتاب لانے کے ذمہ دار ہیں جسے عالمِ انسانیت کا چھٹا حصّہ اب تک تمام علوم' دانش و فراست اور دینیات کا مجموعہ سمجھتا ہے۔'' ("History of the Arabs" ... Philip K. Hitti, p. 124)

یہ سچ ہے کہ یہ الٰہیاتی معجزانہ کتاب ایمان والوں کو سائنسی حقائق اور اس وسیع وعریض' لامحدود کائنات میں پھیلے ہوئے مظاہرِ قدرت پر غور و فکر کرنے کی 750 دفعہ دعوت دیتی ہے۔کیا یہ عجیب اور فکر انگیز معاملہ نہیں ہے کہ آئن سٹائن' کارل مارکس اور ماکس پلینک جیسے سائنسدانوں کی تحریروں میں قرآنی تفسیر کی جھلک نظر آتی ہے جبکہ مسلمان ایک طول طویل گہری نیند سو چکا ہے اور قرآن مجید کو مخمل کے غلافوں میں بند کر کے اپنے گھر کی کسی اونچی اور مقدّس جگہوں پر رکھنے کو کافی سمجھ لیا ہے' یہ نہ جانتے ہوئے کہ دائمی خوشی دینے والی اس غیر فانی ضامن کتاب کے بھیجے جانے کے پیچھے کیا مقصد کار فرما ہے۔

قرآن مجید کی کسی بھی آیت کی تشریح کرنے سے پہلے چند اہم نکات ذہن نشین ہونا ضروری ہیں: اوّل تو یہ کہ قرآن مجید بنیادی طور پر نہ تو سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اُسے سائنسی حقائق کو ثابت کرنے کے لئے نازل کیا گیا۔ کچھ لوگ سائنسی حقائق کو قرآن مجید سے ثابت کرنے کے عادی ہوتے ہیں کیونکہ اُن کے نزدیک قرآن مجید کا یہ اعلان (۱) مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ (الانعام: ۳۸) ''ہم نے اپنی کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی۔'' (۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتَابٍ مُّبِيْنٍ (الانعام: ۵۹) ''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں مَوجود ہیں۔'' ناقص اور غیر مؤثر رہ جائے گا اگر اس سے سائنسی حقائق ثابت نہ ہوئے۔ مانا کہ اُن سائنسی حقائق کو قرآن سے تطبیق دینے میں اُن کی کوشش مخلصانہ اور کامل یکسوئی کی حامل ہوتی ہے اور اُس میں تکلف وتصنّع اور نمود و نمائش کا عنصر نام کو نہیں ہوتا۔ لیکن وہ یہاں اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ قرآن مجید کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے۔ اگر کسی مقام پر قرآن کسی سائنسی حقیقت کو بیان کرتا ہے تو اُسے ہمارا جزوِ ایمان بن جانا چاہئے۔ لیکن اگر قرآن کا سیاق وسباق اُس کی اجازت نہیں دیتا تو اُس سے کسی سائنسی اصول کا اخذ کرنا بالکل غلط ہوگا اور یہ ایسے ہی بے وقوفی کی بات ہوگی جیسے حفظانِ صحت کے اصولوں کو علم ہیئت کی کتاب میں تلاش کیا جائے۔

قرآن مجید کے نزول کا مقصد اس کے اپنے الفاظ میں سورۃ المائدۃ میں واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا گیا:

اخلاق یا دانائی ہو یا اُس نے بولنے کی ذہنی طاقت حاصل کر لی ہو۔ جبلّت اور حسِ اخلاق موروثی طور پر دو مختلف خصوصیات ہیں۔ جبلّت جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کی صفت ہے' جبکہ جبلّت اور حسِ اخلاق (ضمیر) دونوں انسان میں پائے جاتے ہیں۔ یوں انسان انتہائی اعلیٰ اور ذہین مخلوق ہے۔ جانوروں (مثلاً بندروں) اور انسانوں کے ڈی این اے مختلف رمزی اشارات کے حامل ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ خالقِ حقیقی نے ہی کیا ہے۔۔۔۔ خالق خالصتاً ایک مذہبی عقیدہ ہے اور اُن مذہبی بنیادوں کی تردید کرنا مشکل ہوتا ہے جو تخلیقی دلائل کی تائید میں ہوں۔ کسی نے کبھی نہ تو یہ دیکھا ہے اور نہ ہی ثابت کیا ہے کہ بندر انسانوں میں تبدیل ہوئے ہوں۔ یہ بات بنیادی صداقت کی حامل ہے کہ سب سے پہلا انسان مکمل جسم' دماغ اور روح کا حامل انسان تھا اور وہ کسی بھی فطری عمل کے ذریعے بندر یا کسی اور شکل سے ترقی کر کے موجودہ شکل میں نہیں پہنچا۔''
("God, Universe and Man .. The Holy Qur'an and the Hereafter" --- p. 91) 1982 Kot Lakhpat, Lahore (Pakistan)

یہ محض اتفاق یا حادثات کا معاملہ نہیں ہے جیسا کہ نظریہ ارتقاء کے حامیوں کا نظریہ ہے۔ بلکہ یہ خالقِ کائنات کا پہلے سے طے شدہ پروگرام تھا جس کے پس پردہ با مقصد اغراض تھیں۔ لہٰذا اُس نے انسان کو تخلیق کیا' بندر کو نہیں اور اس طرح اُس نے حضرتِ انسان کو فہم و ذکا اور دوسری پیدائشی صفات سے مزیّن کر کے تمام مخلوقات سے برتر بنایا۔

''<u>بندر سے انسان کا ارتقاء۔۔ایک مکروہ نظریہ</u>: خالقِ کائنات کے لئے یہ کوئی تفریح اور کھیل کود کی بات نہیں ہے کہ وہ پہلے بندر جیسے کم تر جانور کو پیدا کرے اور پھر اُسے لاکھوں کروڑوں سالوں میں ارتقائی عمل سے گزارتے ہوئے انسان یا اس سے اعلیٰ تر مخلوق پیدا کرے۔ خالقِ کائنات کو ہر کام کے بہ آسانی کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ تو کیا ضرورت تھی کہ وہ پہلے بندر بنائے اور پھر اُسے ارتقائی عمل سے گزارتے ہوئے اُس کا دماغ تبدیل کرے اور اُس بندر کو انسان میں بدلے۔۔۔۔ لہٰذا کائنات کے بنیادی نظاموں میں تخلیقِ انسان بہت اہمیت کی حامل ہے۔ انسان کسی بھی طور نہ تو کوئی ضمنی مخلوق ہے اور نہ ہی وہ حادثاتی یا ارتقائی عمل کے نتیجے میں وجود میں آیا ہے۔۔۔۔ لہٰذا بندر سے انسان بنائے جانے کا نظریہ ایک قابلِ نفرت اور مکروہ نظریہ ہے' اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بہت سے مذہبی عقائد اور آسمانی وحی کے بھی خلاف ہے۔ یہ نظریہ خود انسان کے لئے بھی باعثِ نفرت ہے بلکہ اُس کے لئے ایک طمانچہ ہے کہ کس قصور کی پاداش میں اُسے بندر سے انسان بنایا گیا۔ (ایضاً ص ص ۸۹' ۹۰)

<u>انسان کا بندر میں تبدیل ہو جانا محض اُن کی باغیانہ فطرت کی وجہ سے تھا</u>: یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ گزشتہ قوموں میں سے ایک قوم کو بندروں میں تبدیل کر دیا گیا تھا کیونکہ اُنہوں نے

خداوندِ قدّوس کے احکامات کے خلاف زبردست بغاوت کی تھی اور اپنے ہمعصر پیغمبر کے خلاف توہین آمیز رویّہ اپنایا تھا۔ اور ایک حدیث کے مطابق "وہ قومیں جو اللہ کے غیظ وغضب کا شکار ہوئیں، تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہیں اور تین دن کے مختصر سے عرصہ میں صفحۂ ہستی سے مٹا دی گئیں۔" اُس قوم کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا جو انسان سے بندروں میں تبدیل کر دئے گئے تھے اور ظاہر ہے کہ اتنے کم عرصے میں نسل کا پروان چڑھنا ناممکن ہے (تفسیرِ عزیزی بحوالہ تفسیر نعیمی، جلد اوّل، صفحہ ۵۱۴)۔ قرآن مجید اُن کے بارے میں اِس حوالے کے ساتھ بات کرتا ہے کہ وہ سنیچر کے دن سے متعلق نافرمانی کرتے تھے :۔

(i) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ (البقرۃ : ۶۵، ۶۶)

"اور تم اُن لوگوں کو خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے سَبت (سنیچر) کے بارے میں تجاوز کیا تھا، تو ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ پھر ہم نے اُسے اُس زمانہ کے اور اس کے بعد کے لوگوں کے لئے موجبِ عبرت بنا دیا اور خوفِ خدا رکھنے والوں کے لئے موجبِ نصیحت بنا دیا۔"

علامہ آلوسی صاحب "روح المعانی" نے یہاں اہلِ عرفان کے لئے یہ نکتہ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادتوں کو خاص خاص ہیئتوں کے ساتھ خاص اوقات میں متعیّن کیا ہے تاکہ طبعی ظلمتیں دُور ہوں۔ تو جو شخص اِن ہیئتوں کا لحاظ نہیں کرتا، اس کا نورِ استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحابِ سَبت کی طرح مسخ کر دیا جاتا ہے یعنی جس جانور کے اوصاف اُس میں راسخ ہیں، اُنہی کی طبیعت اُس میں پیدا کر دی جاتی ہے اگر چہ اِس اُمت میں مسخِ صورت نہیں۔ لٰہذا انسان کو چاہئے کہ شریعت کی پاسداری کے ذریعے اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے۔ اِس زمانہ میں بعض اہلِ کشف ایسے بھی ہیں جو انسان کو اُسی حیوان کی شکل میں دیکھتے ہیں جس کی صفتِ حیوانی اُس پر غالب ہوتی ہے۔ مثلاً جس میں ظلم وشقاوت غالب ہوتی ہے، اُسے آتا ہوا دیکھ کر پکار اُٹھتے ہیں کہ بھیڑیا آ رہا ہے یا جس پر حرامخوری کی گندگی غالب ہوتی ہے، اُسے دیکھ کر بول اُٹھتے ہیں کہ خنزیر چلا آ رہا ہے۔ (ماجدی اردو)

(ii) فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خَاسِئِيْنَ ○ (الاعراف : ۱۶۶)

"پھر جب وہ اُس چیز کی حد سے نکل گئے جس سے وہ روکے گئے تھے، تو ہم نے اُنہیں کہہ دیا کہ ذلیل بندر بن جاؤ۔"

سَبت ہفتے کا ساتواں دن ہے جو یہودی دین کے مطابق مکمل طور پر مذہبی عبادات کی انجام دہی کے

لئے وقف تھا اور اُس دن ہر قسم کی دنیاوی سرگرمیاں معطل تھیں جیسا کہ کھیتوں میں کام کرنا' تجارت کرنا' کھانا پکانا' شکار کرنا وغیرہ اور جو کوئی بھی اس مقدس دن کو کام کر کے پلید کرتا' اُس کی سزا موت تھی۔

(The Jewish Encyclopedia, Vol. X, p. 587)

آیات سے حاصل کردہ نکات : (۱) گناہِ صغیرہ ہمیشہ کرنے سے کبیرہ بن جاتا ہے۔ ہفتہ کے دن شکار کرنا اہلِ ایلہ کے لئے گناہِ صغیرہ تھا مگر ہمیشہ کرنے سے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ (۲) کسی گناہ پر عذاب کا نہ آنا اُس کے جائز ہونے کی دلیل نہیں۔ ستر سال تک یہ یہودی شکار کرتے رہے مگر عذاب نہ آیا اور جب آیا تو تباہ کر گیا۔ (۳) دوسروں کی مصیبت سے نصیحت حاصل کرنی چاہئے جیسا کہ قرآن نے بتایا کہ ہم نے اِس قصہ کو عبرت بنا دیا (عبرت دل کا فعل ہے اور مَوعِظۃ زبان کا۔ چونکہ عام لوگوں میں وعظ کہنے کی طاقت نہیں ہوتی' البتہ وہ وعظ سن کر ڈر جاتے ہیں' اس لئے اُن کے لئے عبرت فرمایا گیا اور پرہیزگاروں کے لئے مَوعِظۃ یعنی قیامت تک علماء و واعظین اس کا وعظ کیا کریں گے اور سامعین سن کر ڈرا کریں گے اور استغفار کیا کریں گے)۔ (۴) بدکاروں سے دُور رہنا چاہئے ورنہ اُن کے ساتھ نیکوکاروں پر بھی عذاب آجائے گا کیونکہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں اور جواریوں کے پاس کھڑے ہونے والے تماشائی بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ (۵) تبلیغ صرف علماء پر ہی فرض نہیں بلکہ جسے جو بھی مسئلہ معلوم ہو' ناواقف کو ضرور بتادے ورنہ گنہگار ہو گا۔ دیکھئے شکار سے منع کرنے والے سب علماء نہ تھے مگر اُن پر تبلیغ فرض تھی اور اِسی تبلیغ ہی کی برکت سے وہ عذاب سے محفوظ رہے۔ (۶) دوسرے کے گناہ سے راضی ہونا گناہ' کفر سے راضی ہونا کفر اور اس کی تردید نہ کرنا جرم ہے۔ اگر کسی کو گناہ کرتا دیکھے تو اگر طاقت ہو تو ہاتھ سے روکے ورنہ زبان سے منع کرے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے ہی بُرا سمجھ کر وہاں سے علیحدہ ہو جائے۔ (۷) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت تمام امتوں سے افضل کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے صحابہ کا شکار سے امتحان لیا کہ ایک مرتبہ بحالتِ اِحرام شکاری جانور اُن کے خیموں میں آئے (تَنَالُهُ أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ سورۃ المائدۃ:۹۴) مگر کسی نے اُنہیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ آج بھی آپ کی اُمت پر بحالتِ اِحرام شکار حرام ہے بلکہ حرم شریف کا شکار ہمیشہ حرام۔ بفضلہٖ تعالیٰ اُمت اب تک اس پر مضبوطی سے کاربند ہے حتیٰ کہ حرم کے کبوتر حاجیوں کے سروں اور بازوؤں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں مگر کیا مجال کوئی اُنہیں چھیڑدے یا تنگ کرے۔ (۸) انسان رب تعالیٰ کی ڈھیل سے دھوکہ نہ کھائے کیونکہ بعض اوقات گناہوں پر انسان کو نعمتیں ملتی ہیں جو رب تعالیٰ کے سخت عذاب کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ (۹) یہودیوں کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اے یہودیو! جب سَبت کی خلاف ورزی کرنے اور اُس دن مچھلی کا شکار کرنے سے عذاب آگیا تو کیا اِتنے جلیل القدر رسول اور اِمام الانبیاء کی مخالفت کرنے سے عذاب نہ آئے گا!!

نوٹ ضروری : اس واقعہ سے ہندوؤں کو اعتراض کا موقع مل گیا کہ چونکہ انسان کا بندر وغیرہ

بن جانا ممکن ہے۔ یہ ہی آواگون (یونی چکر) ہے تو پھر اہلِ اسلام اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟

اِس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صورتیں بدل گئی تھیں نہ کہ روح (نفسِ ناطقہ)۔ لہٰذا یہ مسخ ہوا نہ کہ نسخ۔ مسخ ممکن ہے اور نسخ ناممکن۔ روح اور نفس کا بدلنا ناممکن ہے مگر جسم کی شکل ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ بچپن' بڑھاپے' بیماری' تندرستی' رنج وخوشی میں جسم کا رنگ ورُوپ' لاغری وفربہی وغیرہ بدلتی رہتی ہے مگر اصلی اجزاء برابر باقی رہتے ہیں۔ دن رات شکل کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے' جسمِ انسانی قبر میں مٹی بن جاتا ہے۔ ہوا' پانی اور پانی ہوا' یونہی آگ ہوا اور ہوا آگ بن جاتے ہیں۔ ان سب میں تبدیلیِ جسم ہے' تبدیلیِ رُوح نہیں۔ آواگون (جو کفریہ عقیدہ ہے) یہ ہے کہ اصلی اجزاء ظاہری شکل اور نفس ورُوح وغیرہ سب ہی بدل جائیں کہ انسان حقیقتاً کتّا اور گدھا بن جائے یہ محال ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ مسخ تین قسم کا ہوتا ہے: (۱) مسخِ حقیقی: جس میں حقیقت ہی بدل جائے۔ (۲) مسخِ صُوری: جس سے ظاہری شکل بدلے۔ (۳) مسخِ معنوی: جس سے جسم کے اصلی اجزاء اور نفس کی صفات بدل جائیں۔ مسخِ حقیقی ناممکن ہے اور اسی کا نام آواگون ہے جو یہاں نہ ہوا۔ (تفسیرِ نعیمی' جلد اوّل' ص ص ۵۱۶' ۵۱۷) لاہور ۱۳۶۳ھ

"<u>انسان اور بندر میں مشابہت ایک داستانِ خیالی ہے</u>: دعوٰی کیا جاتا ہے کہ چمپینزی اور انسان کے جینز میں ۹۸ فیصد تک مماثلت ہے اور اِسے اِس دعوٰی کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ بندروں کا انسانوں کے ساتھ کوئی رشتہ ہے اور یوں اِس نظریے کو نظریہ ارتقاء کی صداقت کے طور پر لیا جاتا ہے۔ دراصل یہ بودی قسم کا ثبوت ہے جسے ارتقائی نظریہ کے حامی لوگوں کی کم علمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔"

("The Miracle of Creation in DNA" --- Harun Yahya, p. 56)

"<u>اٹھانوے فیصد مشابہت ایک گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے</u>: نظریہ ارتقاء پر یقین رکھنے والوں کا یہ خیال کہ چمپینزی اور انسان کے ڈی این اے میں ۹۸ فیصد مماثلت ہے' گمراہ کن ہے۔۔۔۔ اب تک صرف انسانوں کے جینز کی نقشہ کشی کی گئی ہے اور اس قسم کی کوئی تحقیق چیمپینزی پر نہیں کی گئی۔ درحقیقت یہ محض پروپیگنڈہ ہے جسے سالوں پہلے اختراع کیا گیا تھا۔"

"تاہم جینز کوئی ایک لاکھ ہیں اور اِن جینز میں ایک لاکھ لحمیات انسانوں میں موجود ہیں۔ اس لئے اِس دعوٰی کی کوئی سائنسی بنیاد نہیں کہ انسانوں اور بندروں کے اٹھانوے فیصد جینز باہم متماثل ہیں محض اس لئے کہ دس ہزار لحمیات میں سے صرف چالیس باہم مشابہ ہیں۔"

"علاوہ ازیں ڈی این اے کے ان چالیس لحمیات کا جو موازنہ کیا گیا ہے' وہ بذاتِ خود ایک متنازعہ

مسئلہ ہے۔ یہ موازنہ دو ماہرینِ حیاتیات Sibley اور Ahlquist نے ۱۹۸۷ء میں اپنے رسالے Journal of Molecular Evolution کی جلد ۲۶ کے صفحات ۹۹ تا ۱۲۱ میں کیا۔ تاہم Sarich نامی ایک اور سائنسدان نے ان دونوں سائنسدانوں کے جمع کردہ اعداد و شمار کا مشاہدہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اِن دونوں سائنس دانوں کا استعمال کردہ طریقہ متنازعہ ہے اور یہ کہ ان اعداد و شمار میں مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔'' ("Cladistics"

--- Sarich, Vol. 5, pp. 3-32 w.ref.t. Harun Yahya's "The Miracle of Creation in DNA" pp. 56-57)

ڈاکٹر کرسچین شوابے بائیوکیمسٹری کے محقق اور خاص طور پر مالیکیول کے ارتقاء کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ اُنہوں نے سالوں ارتقائی نظریے کی تحقیق میں گزارے۔ اُنہوں نے خاص طور پر انسولین اور ریلکسن ٹائپ پروٹین پر تحقیق کی اور زندہ چیزوں میں ارتقائی تعلق قائم کرنے کی کوشش کی اور اُنہیں کئی مرتبہ یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اپنی تحقیق میں کوئی ارتقائی شہادت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔

''مماثلتیں کوئی ارتقاء کی علامت نہیں بلکہ تخلیق کی علامت ہیں: انسانی جسم میں دوسرے جانوروں سے ملتی جلتی مالیکیولر مشابہتیں پائی جاتی ہیں کیونکہ وہ سب جانور اِنہی جیسے مالیکیولز کے بنے ہوئے ہیں، وہ سب ایک ہی پانی استعمال کرتے ہیں، ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں اور وہی خوراک استعمال کرتے ہیں جو ایک جیسے مالیکیولز پر مشتمل ہوتی ہے۔ تو یقیناً اُن کے تحول (Metabolisms) (زندہ نامیوں کے اندر ہونے والے تمام کیمیائی عمل جس سے توانائی پیدا ہوتی ہے) اور جنیاتی نظاموں میں باہم مشابہت ہوگی۔ تاہم یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اُن کا مورث ایک ہی ہے۔ یہ ایک جیسا مواد ارتقائی عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ مشترک نمونہ ہے یعنی اُنہیں ایک ہی منصوبے کے تحت تخلیق کیا گیا ہے۔''

''اِس نکتے کی وضاحت اس مثال سے بھی کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں ہر طرح کی تعمیر ایک ہی قسم کے میٹیریل (اینٹوں، سریا، سیمنٹ وغیرہ) سے کی جاتی ہے تو اِس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب عمارتیں ارتقائی عمل سے بنی ہیں۔ حالانکہ ایک ہی جیسے میٹیریل کو استعمال کر کے وہ سب علیحدہ علیحدہ تعمیر ہوئی ہیں۔ یہی بات انسانوں پر بھی لاگو ہو سکتی ہے۔'' ("The Miracle of Creation in DNA" --- Harun Yahya, pp. 60.61)

''جیسا کہ ارتقائی نظریے کا دعویٰ ہے، زندگی کسی بھی طرح لاشعوری حادثات یا اتفاقات کا نتیجہ نہیں بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی تخلیق کا نتیجہ ہے جو لامتناہی علم اور عقل کا سرچشمہ ہے۔ قرآن حکیم فرماتا ہے:

(i) بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ○ (البقرة: ۱۱۷)

''وہ آسمانوں اور زمین کا مُوجِد ہے، اور وہ جب کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو بس اِتنا ہی اُس سے کہتا ہے کہ ہوجا، بس وہ ہو جاتا ہے۔''

اِبْدَاع کے معنی نیست سے ہست کرنا اور عدمِ محض سے وجود میں لانا' بغیر کیسی مثال یا نمونہ کے اور بغیر کسی سابق مادّہ کے۔ بَدِیْع وہ ہے جو نہ کسی آلے کا محتاج ہو اور نہ کسی مال مسالے کا' نہ مقام و مکان کا پابند اور نہ زمان و وقت سے مقیّد۔ محتاج نہ کسی نمونے کا' نہ استاد کا۔ وہ صنّاع ہے' کاریگر نہیں۔ بغیر کسی کی اعانت و شرکت کے وجود میں لانے والا ہے۔ بَدِیْع کا لفظ اُن مشرک قوموں کے ردّ میں ہے جو خدا کو محض صانع کی حیثیت دیتے ہیں اور رُوح یا مادّہ یا دونوں کو کسی نہ کسی درجہ میں اُس کا شریک رکھتے ہیں۔ گویا اُن کے نزدیک مادّہ قدیم اور غیر حادث ہونے کے لحاظ سے پہلے سے موجود تھا یا اس کے ساتھ ساتھ رُوح بھی قدیم و غیر حادث ہے۔ اب خدا نے اتنا کیا کہ ایک اعلیٰ درجے کے کیمسٹ کی طرح اُن میں باہمی ترکیب و ترتیب سے نئی صورتیں پیدا کر دیں۔ اِبْدَاع کا لفظ اِن سارے مشرکانہ تخیلات کی تردید کے لئے کافی ہے۔ یَقُوْلُ (کہتا ہے) کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح یہ دو حرفی لفظ کُــــــن بولتا ہے۔ لفظ و حروف تو خود ہی حادث ہیں اور نہ حق تعالیٰ کا تلفظ زبان' ہونٹ یا اعصاب کا محتاج ہے۔ بندوں کی سمجھ کے مطابق آخر اس کے سوا قریب سے قریب تر پیرایہ بیان اور اسلوبِ تعبیر اور کیا اختیار کیا جائے۔ مقصود صرف اِس قدر ہے کہ اُدھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہُوا اور اِدھر معًا اور بلا توسط و توقف اُس کا عملاً ظہور ہو گیا۔ لَہٗ میں ضمیر اُس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج میں نہیں ہُوا لیکن علمِ الٰہی میں تو بہر حال موجود ہے اور امرِ الٰہی کے اعتبار سے مامور و موجود میں کوئی فرق ہی زمانی حیثیت سے نہیں۔ ہر مامور کے معنیٰ موجود ہونے کے اور ہر موجود کے معنیٰ مامور ہونے کے ہیں۔ (تفسیر ماجدی اردو' صفحہ ۴۶)

(ii) قُلِ اللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ وَّھُوَ الْوَاحِدُ الْقَھَّارُ ٥ (اَلرَّعْد : ۱۶)

''فرما دیجئے کہ اللہ ہر چیز کا پیدا فرمانے والا ہے اور وہ واحد ہے' غالب ہے۔''

یہاں مختصرًا تین صفات بیان کر کے بہت سی پھیلی ہوئی گمراہیوں اور کثیر التعداد مذاہبِ شرک کی جڑ کاٹ دی: پہلی صفت یہ کہ اللہ ہی چھوٹی بڑی ہر چیز کا جو ہر و عرض' خوشگوار و ناخوشگوار سب کا خالق ہے۔ دوسری صفت یہ کہ وہ عددًا بھی ایک ہی ہے' اپنی ذات کے لحاظ سے بھی اور اپنی صفاتِ کمالیہ کے لحاظ سے بھی' یہ نہیں کہ اُس کی ''شخصیت'' تو ایک ہو لیکن اُس کے ''بروز'' اور اُس کے ''اقنوم'' کئی کئی ہوں۔ تیسری صفت یہ ہے کہ وہ اپنی ساری مخلوقات پر غالب و حاکم ہے اور خود اُس کے اوپر کوئی ہستی یا کوئی قانون حاکم و متصرف نہیں۔

''اگر انسان بندر سے بنا ہے تو بندر ابھی تک موجود کیوں ہیں؟ تعجب کی بات ہے کہ ارتقاء کے بارے میں یہ عام دلیل جہالت کے کئی گوشوں کی عکاس ہے۔ پہلی غلطی تو یہ کہ ارتقاء کا نظریہ اس بات کی تعلیم نہیں دیتا کہ انسان بندر سے بنا ہے بلکہ اس نظریے کا نقطۂ آغاز ہی یہ ہے کہ ان کا مورث ایک ہے۔''

''دوسری بڑی غلطی یہ کہ یہ اعتراض بالکل ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ بچے بالغوں سے بنے ہیں تو پھر

بالغ ابھی تک موجود کیوں ہیں؟ نئی نسلیں اپنے کسی پیشرو سے وجود میں آتی ہیں۔"

("Divine Philosophy and Modern Day Science" --Dr. A. Rashid Seyal, p. 263)

"فوسل ریکارڈ ارتقاء کو مسترد کرتا ہے: جیسا کہ بیان ہوا ہر جاندار شے اپنے کسی پیشرو سے وجود میں آئی ہے۔ نظریہ ارتقاء کے مطابق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماضی میں موجود کوئی جاندار شے کسی اور شے میں تبدیل ہوگئی اور اس طرح تمام جاندار وجود میں آئے۔ اِس نظریہ کی رُو سے یہ اُلٹ تبدیلی بتدریج آگے بڑھتی ہے اور یہ عمل کروڑوں سالوں سے جاری ہے۔"

"اگر یہ بات اس طرح سے تھی تو بہت سے جاندار وسطی زمانے میں تسلسل برقرار رکھنے کے لئے موجود رہے ہوں گے اور قلبِ ماہیت (اُلٹ تبدیلی) کے طویل عرصے کے اندر زندہ ہوں گے۔ مثلاً نصف مچھلی/ نصف کوئی رینگنے والا جانور (جیسے سانپ، چھپکلی یا مگرمچھ وغیرہ) ضرور ماضی میں زندہ رہا ہوگا جس میں رینگنے والے جانوروں کی خصوصیات پائی جاتی ہوں گی، یا ایسے رینگنے والے پرندے موجود ہوں گے جن میں رینگنے والے جانوروں کے اوصاف کے علاوہ پہلے سے موجود رینگنے والے جانور کے اوصاف موجود ہوں گے۔ ارتقاء پسند اِس خیالی مخلوق کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کے بارے میں اُنہیں یقین تھا کہ وہ ماضی میں زندہ تھے اور یہ اُن کی "عبوری اَشکال" تھیں۔"

"اگر یہ جانور فی الواقع موجود تھے تو دنیا میں اُن کی تعداد اور اقسام کروڑوں میں نہیں بلکہ اربوں میں ہوں گی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس عجیب وغریب مخلوق کی باقیات کو فوسل ریکارڈ میں موجود ہونا چاہئے تھا۔ ضروری تھا کہ اِن عبوری شکلوں کی تعداد موجودہ جانوروں کی قسموں سے بھی زیادہ ہوتی اور اُن کی باقیات دنیا بھر میں پائی جانے چاہئے تھیں۔" ("The Miracle in the Spider"... Harun Yahya, pp. 135-136)

"اگرچہ ارتقاء پسندوں نے اُنیسویں صدی کے وسط سے دنیا بھر میں گم شدہ کڑیاں کھود کر فوسلز کی تلاش اور اُنہیں نکال لینے کی کوشش شروع کر رکھی ہے لیکن اُن کی کوششوں کے باوجود آج تک کوئی عبوری شکلیں پردۂ اِخفاء سے نکل کر سامنے نہیں آئیں۔ کھدائی کے ذریعے نکالے گئے تمام فوسلز سے پتہ چلا ہے کہ ارتقاء پسندوں کے عقائد کے برعکس زندگی زمین اچانک اپنی مکمل شکل میں نمودار ہوئی۔ ایک مشہور برطانوی ماہرِ رکازیات (ماضی میں پائی جانے والی زندگی کا مطالعہ جو باقی بچ جانے والے رکازوں کی مدد سے کیا جاتا ہے) ارتقاء پسند ہونے کے باوجود اِس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ:

"فوسل ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ زندگی کی عبوری انواع کبھی موجود تھی ہی نہیں۔ ارتقاء سرے سے

ناپید رہا ہے اور زندگی اپنی تمام انواع میں علیحدہ علیحدہ اور کامل ترین صورتوں میں تخلیق ہوئی تھی۔''
("The Nature of the Fossil Record" --- Derek A. Ager, Vol. 87, p. 133, quoted in "The Miracle in the Spider" at p. 137).

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ فوسل ریکارڈ کے مطابق تمام زندہ اقسام اپنی مکمل شکل میں اچانک ظاہر ہوئیں اور اُن کے درمیان کوئی اور شکل نہ تھی اور یہ حقیقت ڈارون کے مفروضات کے بالکل برعکس ہے۔ یہ اِس بات کی بھی زبردست شہادت ہے کہ زندہ چیزوں کی تخلیق کی گئی۔ زندہ نسل کا اچانک اور مکمل شکل میں پیدا ہونا بغیر اس کے کہ درمیان میں کوئی ارتقائی مورث تھے' کی واحد وضاحت یہی ہوسکتی ہے کہ اِس کی تخلیق ہوئی اور اِس حقیقت کو ایک جانے پہچانے ماہرِ ارتقاء وحیاتیات ڈاکٹر ڈوگلاس فیوٹیما نے بھی یہ کہتے ہوئے تسلیم کیا ہے:۔

''تخلیق اور ارتقاء اور اُن کے درمیان کی زندہ چیزوں کے بارے میں ابتدا کی ممکنہ وضاحتیں تھکا دینے والی ہیں۔ نامیات یا تو زمین پر مکمل طور پر ظاہر ہوئیں یا ظاہر نہیں ہوئیں۔ اگر تو وہ ظاہر نہیں ہوئیں تو وہ بعد میں اپنے سے پہلے سے موجود انواع سے کسی تبدیلی کے عمل کے ذریعے موجود ہوئی ہوں گی اور اگر وہ مکمل شکل میں ظاہر ہوئیں تو اُنہیں کسی مقتدر ذہانت نے تخلیق کیا ہوگا۔'' ("Science on Trial")
-- Douglas Futuyma, p. 197, quoted in "The Miracle in the Spider by H. Yahya, at p. 137.

''فوسل ریکارڈ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جاندار چیزیں ارتقائی عمل کے ذریعے قدیم شکلوں سے جدید کی طرف حرکت نہیں کرتیں بلکہ یہ تو اچانک نمودار ہوئیں اور ایک جامع شکل میں ظاہر ہوئیں۔ مختصر یہ کہ جاندار بہ ذریعہ ارتقائی عمل وجود میں نہیں آئے بلکہ اُنہیں تخلیق کیا گیا ہے۔'' ("The Miracle in the Spider")

''<u>حرکیات (THERMODYNAMICS) کا دوسرا قانون نظریہ ارتقاء کو باطل قرار دیتا ہے</u>: یہ قانون جسے طبعیات کے ایک بنیادی قانون کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے' اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ عام حالات کے زیرِ اثر وہ تمام نظام جن کو اُن کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے' بے ترتیب ہو جانے کا میلان رکھتے ہیں۔ جس قدر وقت گزرتا ہے اُسی نسبت سے وہ تنزلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہر جاندار اور بے جان شے پرانی اور خستہ وخراب ہو کر زوال پذیر ہو جاتی ہے اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ قطعی انجام جس سے تمام چیزیں کسی نہ کسی طرح دوچار ہوتی ہیں اور اِس قانون کے مطابق اِس ناگزیر عمل سے فرار کا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''مثال کے طور پر اگر آپ ایک موٹر کار کو صحرا میں لے جائیں اور اُسے وہیں چھوڑ دیں تو برسوں بعد وہاں واپس لوٹنے پر آپ یہ توقع کبھی نہیں کر سکتے کہ وہ بہتر حالت میں ملے گی۔ بلکہ آپ دیکھیں گے کہ اُس کے

پہیوں میں سے ہوا نکل گئی ہے اور وہ چپٹے ہو گئے ہیں' اُس کی کھڑکیاں ٹوٹ گئی ہیں' اُس کے ڈھانچے کو زنگ لگ گیا ہے اور اُس کا انجن گل سڑ گیا ہے۔ یہی ناگزیر عمل جانداروں میں بھی ہوتا ہے بلکہ زیادہ تیزی کے ساتھ کارفرما ہوتا ہے۔"

"اِس مشہور قانونِ طبعیات کو "قانونِ ناکارگی" بھی کہتے ہیں۔ جس قدر کسی نظام کی بے ترتیبی زیادہ ہوگی' اُس کی ناکارگی اُسی قدر بڑھی ہوئی ہوگی۔ "قانونِ ناکارگی" کا دعوٰی ہے کہ پوری کائنات اٹل طور پر ایک زیادہ بے ترتیب' عدم منصوبہ بندی کی حامل اور غیر منظم حالت کی جانب بڑھتی ہے۔ اِس "قانونِ ناکارگی" کا معتبر اور صحیح ہونا تجرباتی اور نظری طور پر مسلّم ہے۔ ہمارے عہد کا عظیم ترین سائنسدان اسے "تمام سائنس کا اوّلین قانون" قرار دیتا ہے اور سر آرتھر ایڈنگٹن نے بھی اسے "پوری کائنات کا عظیم مابعد الطبعیاتی قانون" کہا ہے۔"

"حرکیاتی قانون کا دعوٰی ہے کہ قدرتی حالات ہمیشہ بے ترتیبی کی طرف لے جاتے ہیں۔ دوسری جانب نظریہ ارتقاء ایک ایسا غیر سائنسی نظریہ ہے جو مکمل طور پر اس قانون کے خلاف جاتا ہے۔ قانونِ ناکارگی کہتا ہے کہ ارتقاء اِس سیارے پر زندگی کے لئے میسّر مجموعی توانائی کو ضائع کر دیتا ہے۔ ارتقاء سے متعلق ہمارا نکتہ نظر اس کے بالکل برعکس ہے اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ارتقاء کسی طرح زمین پر مجموعی طور پر زیادہ افادیت اور ترتیب و نظم پیدا کرتا ہے۔ یہ بات صاف اور واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ ارتقاء کلی طور پر ایک آمرانہ عقیدہ ہے۔"

"واضح سائنسی صداقتیں ظاہر کرتی ہیں کہ جاندار چیزیں ترتیب و نظم کے اندر' منصوبہ بند ہیں اور پیچیدہ ساخت والی جاندار اشیاء عام حالات میں اتفاقاً کبھی معرضِ وجود میں نہ آ سکتی تھیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کو واضح کرتی ہے کہ جاندار چیزوں کی ابتدا صرف مافوق الفطرت طاقت کی مداخلت کے ذریعے وضاحت کی جا سکتی ہے۔ وہ مافوق الفطرت طاقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے جس نے عدم سے پوری کائنات کو وجود بخشا۔ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ جہاں تک حرکیات کا تعلق ہے' ارتقاء اب بھی ناممکن ہے اور زندگی کی موجودگی کی کوئی اور توجیہ یا وضاحت سوائے تخلیق کے دوسری کوئی نہیں ہے۔" (نظریہ ارتقاء۔ ایک فریب ص ۱۵۲)

"نظریہ ارتقاء یہ واضح نہیں کر سکتا کہ زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی : زندگی کی ابتدا ایک سربستہ راز ہے۔ تخلیقیت کے حامی بعض اوقات تمام ارتقاء کو اِس اشارے کے ساتھ بے ضابطہ قرار دیتے ہیں کہ موجودہ سائنس اِس قابل نہیں ہے کہ زمین پر زندگی کی ابتدا کو واضح کر سکے۔"

("Divine Philosophy and Modern Day Science" --Dr. A. Rashid Seyal, p. 263)

"ریاضیاتی طور پر بھی اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ پروٹین جیسی پیچیدہ چیز یا انسان کا خلیہ کسی بھی طور

اتفاقاً وجود میں آجائے۔" (ایضاً)

جدید ڈارونی نظریہ اور متغیرات: ڈارون کے حامیوں نے ارتقائی نظریہ کی راہ میں حائل دشواریوں کا حل تلاش کرنے کے لئے ۱۹۳۰ء کے اواخر میں جدید من گھڑت نظریہ پیش کیا جو "نیوڈارونزم" کے نام سے مشہور ہے۔ اِس نظریے کے مطابق زمین پر لاکھوں زندہ اجسام کے بے شمار پیچیدہ اعضاء (جیسے کان' آنکھیں' پھیپھڑے وغیرہ) ایک عمل کی تبدیلی کے نتیجے میں یا یوں کہئے کہ جینیاتی بے ترتیبی سے تشکیل پا گئے۔ لیکن ایک واضح سائنسی حقیقت اِس نظریے کو کُلّی طور پر مسترد کرتی ہے۔ تبدیلیوں سے زندہ چیزیں پیدا نہیں ہوا کرتیں بلکہ اِس کے برعکس اُنہیں نقصان پہنچتا ہے۔"

"اس کی وجہ بہت سادہ اور آسان ہے۔ ڈی این اے کی ساخت بہت پیچیدہ ہے اور اتفاقیہ اثرات اس کے لئے مضر ہوتے ہیں۔ ایک امریکی ماہر جینیات B. G. Ranganathan اس کی وضاحت یوں کرتا ہے:

"تبدیلیاں چھوٹی' بے ترتیب اور مضر ہوتی ہیں۔ وہ بہت کم واقع ہوتی ہیں اور اِمکانی طور پر وہ بے اثر ہوتی ہیں۔ تبدیلی کی یہ چار خصوصیات ارتقائی نشوونما کی طرف اشارہ نہیں کرتیں۔ ایک گھڑی میں بے ترتیب تبدیلی گھڑی کو بہتر نہیں بنا سکتی اور زیادہ اِمکان یہ ہے کہ یا تو یہ اُسے بگاڑ دے گی یا وہ اُسے بے اثر ہوگی۔ ایک زلزلے سے شہر کی حالت بہتر نہیں ہوتی بلکہ زلزلہ تو تباہی لاتا ہے۔" ("Origins" quoted in Harun Yahya's "The Miracle of Creation in Plants" pp. 194-195)

ڈارون کے نظریے میں تمام تر زور اللہ کی ذات کی نفی پر اور ارتقاء کے واضح اعلان پر ہے۔ وہ ارتقاء جس کا عمل ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں بلکہ ایک اتفاقی تغیّر کے طور پر جاری رہا۔ اس نظریے کی مخالفین اسے مسترد کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ تغیّر اور تبدیلی کوئی تعمیری عمل نہیں ہے بلکہ یہ تو تمام حالات میں تباہ کن ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ جب فانی انسان کو اُس کے اصل مقام سے گرا کر جانوروں کے برابر کر دیا جائے گا تو اُس سے انسانیت کے شایانِ شاں کسی باوقار عمل کی توقّع نہیں کی جا سکے گی۔ وہ بندروں جیسے کام کرے گا اور اُس کا انداز بندروں اور وحشی جانوروں جیسا ہوگا اور بیوی' بیٹی اور بہن کے درمیان تمیز نہ کرتے ہوئے اُنہی کی طرح وہ جنسی تعلقات قائم کرے گا۔ اِس طرح بے حیائی' اخلاقی گراوٹ' بدکاری' زناکاری اور کمینگی ارتقائی نظریے کی نمایاں قباحتیں ہیں۔ اِس نظریے کے حامیوں نے اِس کے آغاز ہی سے اسے مضبوط بنیاد فراہم کرنے اور اس کے حق میں زوردار دلائل دینے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن وہ اپنے مقصد میں بُری طرح ناکام رہے ہیں۔ اِس نظریے کی تردید میں مختلف عیسائی سائنسدانوں نے دفاتر کے دفاتر یہ دلائل دیتے ہوئے قلم بند کئے ہیں کہ یہ نظریہ عقل اور سائنس کے کسی بھی معیار پر پورا نہیں اُترتا۔

قَدْ جَآءَ کُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ o یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ o (المائدۃ:۵،۱۵،۱۶)

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشنی اور واضح کتاب آ چکی ہے۔ اُس کے ذریعے سے اللہ اُن لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اُس کی رضا کی پیروی کرتے رہتے ہیں اور اُنہیں اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے اور اُنہیں سیدھی راہ دکھائے رہتا ہے۔''

چنانچہ اللہ کی اس آخری کتاب کا مقصدِ اصلی انسان کو اس بات پر راغب کرنا ہے کہ وہ اعمالِ صالحہ اور حیات بالآخرۃ کی تیاری کے ذریعے اپنے خالق کی رضا کا متلاشی رہے۔ کسی سائنسی یا تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کا قرآنی مقصد اسی مرکزی مدعا کے گرد گھومتا ہے کہ انسان کا ایمان اللہ کی لامحدود اور بلاشرکتِ غیرے قدرتِ مطلقہ پر مضبوط و راسخ ہو جائے اور اُس کے اعمال و افعال کا مقصد اُس کی رضا جوئی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اگر کوئی مخصوص تاریخی واقعہ یا کوئی سائنسی حقیقت قرآن سے نہیں ملتی تو یہ تعجب کی بات نہیں ہونی چاہئے کیونکہ قرآن تاریخ یا سائنس یا انجینیرنگ کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی اس کا موضوع مادّی ترقی ہے کیونکہ مادّی ترقی کو تو انسان اپنی دماغی صلاحیتوں اور دانش و فراست سے حاصل کر سکتا ہے اور اسی لئے مادّی ترقی کو انسانی جدّ وجُہد اور تحقیق پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ قرآن مجید سے کسی سائنسی حقیقت کو اخذ کرنا غلط ہے۔ کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید کچھ سائنسی حقائق بیان کرتا ہے لیکن اس بیان میں یہ اُس کا مرکزی مقصد نہیں ہوتا بلکہ چلتے چلتے سرسری طور پر اُنہیں بیان کر جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مبہم اور واضح سائنسی حقیقت قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے تو اُسے بیان کرنا اور واضح کرنا غلط نہیں ہوگا۔ اس سلسلے میں امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس بات پر زور دیتے ہیں:۔

''ہوسکتا ہے کچھ ناواقف لوگ الٰہی کتاب (قرآن) کی وضاحت میں علمِ ہیئت کے میرے غیر معمولی استعمال پر اعتراض کریں۔ اس کے جواب میں میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو اپنے علم، طاقت و قدرت اور دانش و فراست سے بھر دیا ہے جو آسمانوں اور زمین کی حالتوں سے اخذ کی گئی ہیں۔ اگر ان مضامین کی تحقیق و تفتیش کی اجازت نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانوں کو اس عمومیت کے ساتھ اِن نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی ترغیب نہ دیتا۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن، ج ۱، ص ص ۵۵۱، ۵۵۲)

دوم یہ کہ جہاں قرآن مجید کسی مسئلہ پر خاموش ہے اور اس کے متن یا سیاق و سباق میں کوئی ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ہے تو متن کی تاویل کرنا یا کسی سائنسی مفروضے کے جواز اور معقولیت کو ثابت کرنے کے لئے کسی فارمولے کا اخذ کرنا بالکل غلط اور خانہ ساز ہوگا۔ مندرجہ ذیل مثال سے اس حقیقت کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے:۔

ڈاروِنزم کے برعکس قرآن مجید انسان کو باوقار مقام عطا کرتا ہے : جیسا کہ مندرجہ ذیل قرآنی آیات سے ثابت ہو رہا ہے :۔

(i) وَاِذْقَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ o فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ o فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ o اِلَّآ اِبْلِيْسَ (اَلْحِجر : ۲۸۔۳۱)

"اور (یاد کرو وہ وقت) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں سڑے ہوئے گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ سو جب اُسے پورا بنا چکوں اور اُس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ چنانچہ سوائے ابلیس کے سب کے سب فرشتوں نے سجدہ کیا۔"

اللہ تعالیٰ کا روحِ انسانی کی اضافت اپنی جانب کرنا اُس کے اظہارِ قدر و منزلت کے لئے ہے (تفسیر کبیر) اور اسی نفخِ رُوح کا شاید نتیجہ ہے کہ روحِ انسانی میں خلافتِ الٰہی کی استعداد پیدا ہوگئی ہے۔

(ii) وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا o (بنی اسرائیل : ۷۰)

"اور ہم نے بنی آدم کو یقیناً عزت بخشی ہے اور ہم نے اُنہیں خشکی اور دریاؤں (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے اُنہیں نفیس چیزیں عطا کیں اور اُنہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔"

بعض ادیانِ باطل خصوصاً یہودیت و نصرانیت کی طرح اسلام کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں کہ انسان ایک ذلیل ترین مخلوق ہے جسے پیدا کر کے اُس کا خالق (معاذ اللہ) خود پچھتایا (ملاحظہ ہو توریت بحوالہ ماجدی ص ۵۹۲)۔ اسلام کی نظر میں انسان بجائے خود ایک معزّز و مکرّم ہستی ہے اور بیشتر مخلوقات سے افضل ہے۔ یہ تو نصِ قرآنی سے ثابت ہو گیا لیکن تفسیر خازن نے کَثِیر کو کُل کے معنیٰ میں لے کر انسان کو حق تعالیٰ کی افضل ترین مخلوق ہونے پر بھی استدلال کیا ہے۔ امام رازی نے فرمایا کہ کَثِیر فرما کر فرشتوں کو علیحدہ کیا گیا کیونکہ عام انسان میں تو کفار اور فُساق بھی شامل ہیں' لہٰذا عام انسان فرشتوں سے افضل نہیں۔ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی جانوروں اور کشتیوں دونوں پر سوار کرایا اور جاندار اور بے جان دونوں طرح کی سواریاں اُسے عطا کیں۔ الفاظِ قرآنی ہر قسم کی سواری' ہر قسم کے مشینری آلۂ نقل و حرکت موٹر' لاری' ریل' موٹر لاری' موٹر لانچ' ہوائی جہاز اور دخانی جہاز سب کو شامل ہیں۔

آیتِ مذکورہ سے ماخوذ چند مفید نکات : (1) اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کو کائنات کی تمام

مخلوقات پر افضل کرنے کے لئے بارہ نعمتوں سے نوازا: (۱) اپنے محبوب خاتم الانبیاء ﷺ کو بنی آدم میں مبعوث فرمایا۔ (۲) ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا (سورہ صٓ: ۷۵) (۳) دنیا و آخرت (معاش و معاد) کے حاصل کرنے کی تدبیر تعلیم فرمائی۔ (۴) چہرہ اور اُس کا حُسن عطا فرمایا۔ (۵) خوبصورت قد کی لمبائی عطا کی۔ (۶) مَردوں کو داڑھی اور عورتوں کو زلفیں عطا کیں۔ (۷) ہاتھ سے کھانے کی قوت ملی۔ (۸) کھانے کی لذّتیں ملیں۔ (۹) سلطنت اور حکومت کرنے کا طریقہ سکھایا۔ (۱۰) عقل کی دولت ملی۔ (۱۱) بات چیت کے ذریعے اپنا مُدّعا بیان کرنے کے آداب سکھائے گئے۔ (۱۲) نبوّت اور کلامِ الٰہی کے ذریعے ہر طرح کا علم و ہدایت ملی۔ یہ فائدہ اِس آیت میں چار باتیں فرمانے سے حاصل ہوا: یعنی کَرَّمْنَا۔ حَمَلْنَا۔ رَزَقْنَا اور فَضَّلْنَا (2) زمین یا نہر، دریا، رہٹ، کنویں اور ٹیوب ویل کی نالی سے منہ لگا کر پانی پینا مکروہِ تحریمی ہے اور اسی طرح زمین سے منہ لگا کر کھانا بھی گناہ ہے کیونکہ یہ حیوانوں اور جانوروں کا طریق ہے۔ اسی طرح کھڑے ہو کر کھانا پینا یا جانوروں کی طرح کھڑے ہو کر پیشاب کرنا بھی بلا مجبوری حرامِ شرعی ہے۔ یہ مسئلہ فَضَّلْنَاهُمْ --- الخ سے حاصل ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جانوروں پر فضیلت دی ہے لہٰذا اس کی خلاف ورزی حرام ہے۔ (3) مرد کو داڑھی اور عورت کو بال کٹانے یا منڈوانے حرام ہیں۔ یہ مسئلہ بھی فَضَّلْنَا اور کَرَّمْنَا کے الفاظ سے حاصل ہوا۔ کیونکہ خوبصورتی سے بھی انسان کو فضیلت دی گئی (سُورۃُ التِّین: ۴) اور داڑھی بطریقہ سنّتِ رسول اور عورت کی زلفیں اور لمبے بال خوبصورتی و زینت ہیں۔ (4) بہ حیثیتِ انسانیت تمام بنی آدم تمام مخلوق سے افضل ہیں لیکن بہ حیثیتِ اعمال بہت سے انسان جانوروں سے بھی بدتر ہیں جیسے کفّار، فُسّاق اور بدعقیدہ لوگ۔ بہ حیثیت مدارج اور قُربِ الٰہی انبیاء علیہم السلام تمام مخلوق سے افضل و مکرّم و مقرّب ہیں۔ اولیاء اخص الخاص چار فرشتوں کے سوا باقی تمام فرشتوں سے افضل ہیں۔ عام نیک مسلمان عام فرشتوں سے افضل۔ یہ مسئلہ کَرَّمْنَا فرمانے اور دیگر آیات و احادیث سے حاصل ہوا (تفسیر نعیمی، جلد ۱۴)

<u>انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجوہ</u>: (۱) اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں سے صرف انسان کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا (سورۃ البقرۃ: ۳۰) (۲) اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا (سورہ صٓ: ۷۵) جبکہ باقی تمام مخلوقات کو لفظ کُن سے پیدا فرمایا۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے پہلے فرد کو فرشتوں سے زیادہ علم عطا فرمایا۔ (۴) اللہ تعالیٰ نے آدم کی تعظیم و تکریم کے لئے فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرایا۔ (۵) اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو مارے تو چہرے سے اجتناب کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔ (صحیح مسلم: کتاب البرّ والصّلۃ) (۶) اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوق میں اچھی صورت پر پیدا کیا (سورۃ التین: ۴) (۷) ہر مخلوق کھاتے وقت اپنا سر جھکا کر کھاتی ہے اور اپنے

منہ کو کھانے تک لے جاتی ہے جبکہ انسان سر اٹھا کر کھاتا ہے اور کھانے کو اٹھا کر اپنے منہ تک لے جاتا ہے۔(۸) انسان کو اللہ تعالیٰ نے بلند قامت بنایا ہے۔ وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے جبکہ باقی مخلوق جھک کر چلتی ہے یا زمین پر رینگتی ہوئی چلتی ہے جبکہ انسان سر اٹھا کر چلتا ہے۔(۹) تمام مخلوق تین قسم کی قوتوں میں تقسیم ہے : (i) قوتِ نشوونما۔ (ii) قوتِ حواس اور قوتِ شہوانیہ۔(iii) قوتِ عقلیہ حکمیہ۔ نباتات یعنی پودوں اور درختوں میں صرف قوتِ نشوونما ہے۔ حیوانوں میں صرف قوتِ حواس اور قوتِ شہوانیہ ہے۔فرشتوں میں صرف قوتِ عقلیہ حکمیہ ہے۔ جبکہ انسانوں میں یہ تینوں قوتیں جمع کر دی گئی ہیں اور اِس وجہ سے اُس کے ماتھے اشرف المخلوقات ہونے کا سہرا سجا دیا گیا۔ (۱۰) جانوروں کو اگر کوئی درد یا تکلیف ہو تو وہ کسی کو بتا نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس رنگِ رنگیلی کائنات کے دولہا حضرتِ انسان کو اِدراک اور اظہار کی قوتیں عطا کی ہیں کہ وہ اپنا اور دوسروں کا حال محسوس بھی کر سکتا ہے اور بتا بھی سکتا ہے۔ (۱۱) انسان کو اللہ تعالیٰ نے لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ وہ علوم ومعارف پر کتابیں لکھ سکتا ہے اور لکھی ہوئی چیزوں کو پڑھ بھی سکتا ہے۔سورۃ العَلَق میں فرمایا: عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (اُس نے انسان کو وہ کچھ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا)۔(۱۲) اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کائنات کو عناصرِ اربعہ(مٹی‘ ہوا‘ پانی اور آگ) سے بنایا اور یہ چاروں عناصر انسان کی خدمت کے لئے مسخر کر دیئے۔ مٹی کو انسان کے لئے فرش بنایا(سورۃ البقرۃ:۲۲)۔ ہوا کو اس لئے بنایا کہ انسان اس سے سانس لے سکے‘ انسان کی بوئی ہوئی اناج کی فصلوں میں دانوں کو بھوسے سے الگ کر سکے‘ سمندری سفر میں اُس کی بادبانی کشتیوں کو چلانے میں اپنا کردار ادا کر سکے‘ اور ہوائیں اِس خاکدانِ گیتی سے بدبوؤں کو اڑا کر لے جائیں۔ پانی اس لئے بنایا کہ وہ انسان کے پینے کے کام آئے اور وہ اپنی کھیتی باڑی اور زراعت میں اس سے کام لے سکے۔ پانی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندروں کو مسخر کیا جن سے انسان خوراک کے لئے تازہ ترین مچھلی حاصل کرتا ہے اور اُن سے قیمتی موتی اور سونے جیسی نایاب دھات حاصل کرتا ہے(سورۃ النّحل:۱۴)۔ انسان کشتیوں اور جہازوں کے ذریعے سمندری سفر کرتا ہے(سورہ یونس:۲۲) اور اب سمندر سے تیل بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ آگ ہمارے کھانوں کے پکانے کے کام آتی ہے اور اسی نوع سے ایندھن بنتا ہے جس کی کئی قسمیں ہیں یعنی تیل اور گیس وغیرہ جن سے موٹریں‘ ٹرینیں اور ہوائی جہاز چلائے جاتے ہیں اور اسی نوع سے سورج اور چاند ہیں جن سے ہم روشنی‘ حرارت اور دیگر توانائیاں حاصل کرتے ہیں اور اِن عناصرِ اربعہ کے مرکبات ہیں مثلاً معدنیات‘ سونا‘ چاندی‘ لوہا‘ تانبا اور پیتل وغیرہ۔ غرض پوری کائنات کو خالقِ لم یزل نے انسان کے فوائد اور منافع کے لئے مسخر کر دیا ہے۔*(۱۳) تمام موجودات میں سب سے اشرف‘ سب سے اعلیٰ اور سب سے اکبر اللہ تعالیٰ ہے‘ پھر وہ سب سے اشرف اور اعلیٰ ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب ہو اور اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب انسان ہے کیونکہ اس کے دل

* کچھ لوگوں نے یہاں اعتراض کیا کہ جب ہر چیز ہمارے لئے بنی تو شریعت نے بعض چیزیں حرام کیوں کیں۔ چاہئے تھا کہ ہم ہر چیز کو استعمال کر سکتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے بنی نہ کہ اُس کے کھانے کے لئے۔ ہر چیز کا فائدہ الگ الگ ہے۔ کسی کو کھایا جاتا ہے‘ کسی کو پیا جاتا ہے‘ کسی کو پہنا جاتا ہے اور کسی کو سونگھا جاتا ہے۔ گھر میں بیوی‘ ماں‘ بہن‘ بیٹی یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہیں لیکن ان کا فائدہ یکساں نہیں ہے۔ پانی اور آگ واقعی انسان کے فائدے کے لئے ہیں مگر پانی پیا جاتا ہے جبکہ آگ کھائی پی نہیں جاتی اور جس طرح ہر چیز کا طریقہ استعمال سکھانے والے کی رہنمائی کے بغیر حاصل نہیں ہوتا‘ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے بغیر کسی چیز کا استعمال فائدہ مند نہ ہوگا۔ انبیائے کرام نے فرمایا کہ بکری‘ گائے کو استعمال کر کے نفع لو اور خنزیر سے بچو۔

میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، دماغ میں اُس پر ایمان اور زبان پر اُس کا ذکر ہے اور اُس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول ہیں۔ لہٰذا ضروری ہوا کہ اِس عالَم میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ قریب انسان ہے اور اُسے یہ قربِ اللہ تعالیٰ کے انعام اور احسان سے حاصل ہوا اور اسی لئے فرمایا گیا کہ بے شک ہم نے انسان کو فضیلت دی۔ (۱۴) انسان کی فضیلت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اُس نے انسان کو جانوروں اور کشتیوں دونوں پر سوار کرایا اور جاندار اور بے جان دونوں طرح کی سواریاں اُسے عطا کیں تاکہ وہ تجارتی اور جنگی ہر طرح کے سفر کر سکے۔ (۱۵) انسان کی فضیلت کی وجہ میں فرمایا کہ ہم نے انسان کو طیّب اور نفیس چیزوں سے رزق دیا کیونکہ انسان کی خوراک اور غذا یا تو زمینی پیداوار سے حاصل ہوتی ہے یا حیوانوں کے گوشت سے اور یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کر دی ہیں۔ (۱۶) آخر میں فرمایا کہ ہم نے اپنی مخلوق میں سے ان کو بہت سی چیزوں پر فضیلت دی ہے جس کا معنیٰ یہ ہے کہ بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر انسان کو فضیلت نہیں دی اور وہ فرشتے ہیں کہ وہ انسان سے افضل ہیں۔

اِس مسئلہ میں دو قول ہیں: حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ انسان فرشتوں کے علاوہ تمام مخلوق سے افضل ہے اور دوسرا قول یہ ہے کہ تمام مخلوق سے انسان افضل ہے اور عرب اکثر اور کثیر کو جمع کی جگہ استعمال کرتے ہیں جیسا کہ سورۃ الشُّعَراء کی آیات ۲۲۱، ۲۲۲ میں ہے:-

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ० تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيْمٍ ०

"کیا میں تمہیں بتادوں کہ شیاطین کس پر اترتے ہیں۔ وہ ہر جھوٹے، گنہگار پر اترتے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ یہاں اکثر اور کُل کا اطلاق جمع پر کیا گیا ہے یعنی تمام شیاطین جھوٹے ہیں۔ اسی طرح زیرِ نظر آیت (بنی اسرائیل: ۷۰) میں بھی کثیر کا اطلاق تمام مخلوق پر ہے یعنی انسان کو تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے اور اس کی تائید اِس حدیث سے ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن اللہ عزّ وجلّ کے نزدیک اُن فرشتوں سے زیادہ مکرّم ہے جو اُس کے نزدیک ہیں (سنن ابن ماجہ: ۳۹۴۷؛ شعب الایمان: ۱۵۲) حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ابنِ آدم سے زیادہ عزت والی کوئی چیز نہیں۔ پوچھا گیا کیا فرشتے بھی نہیں؟ فرمایا: وہ تو سورج اور چاند کی طرح مجبور ہیں۔ (شعب الایمان: ۱۵۴؛ مجمع الزوائد ج ۱ ص ۸۲؛ تخریج الکشاف: ۶۲۳)

(iii) قَالَ يَا إِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ (ص: ۷۵)

"اللہ نے فرمایا اے ابلیس! تجھے کس چیز نے اس کے رُوبرو سجدہ کرنے سے روکا جسے میں نے اپنے دستِ خاص سے بنایا ہے۔"

یعنی اُن کی پیدائش میں ماں باپ کو وسیلہ نہیں بنایا اور نہ کسی ایک کے نطفہ کو اُن کی تخلیق میں دخل ہے امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب کوئی سلطانِ اعظم کسی عمل کو اپنے دستِ خاص کی جانب منسوب کرتا ہے تو اس سے اُس کی مراد عنایتِ خاص ہوتی ہے اور اس میں اُس کی عظمت اور کرامت کا اظہار ہوتا ہے۔ بِیَدَیَّ۔ یَد کے صیغہ تثنیہ کی توجیہ میں بعض صوفیاء نے کہا کہ اس سے مراد صفاتِ جمال وجلال ہیں اور یہ اُمّ الصّفات ہیں۔ اِن صفاتِ جمال وجلال کی ایک تعبیر قوائے ملکوتی وقوائے حیوانی سے بھی کی جاسکتی ہے۔

(iv) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ (اَلتِّین : ۴)
"یقیناً ہم نے انسان کو (بہ لحاظ عقل وشکل) بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔"

آیت نے ضمناً اِس مسیحی عقیدے کی تردید بھی کردی کہ انسان خِلقۃً ایک گنہگار مخلوق ہے کیونکہ حُسن وجمال کا ہیئت ونقشہ، بہترین ساخت وترکیب اور صفاتِ حق کی مظہریت سب اِس میں آگئے (تفسیر ماجدی اردو) اور صُوری اور معنوی حُسن وکمال میں کوئی بھی چیز انسان کی ہمسری کا دعوٰی نہیں کرسکتی۔ وہ باطن وظاہر میں، صورت کے جمال میں، بناوٹ کی ندرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی تمام مخلوقات سے زیادہ حسین وجمیل ہے۔ فلاسفہ نے اِسی وجہ سے انسان کو "عالمِ اصغر" کہا ہے۔ ("ضیاء القرآن"۔ جسٹس کرم شاہ الازہری، ج ۵، ص ۶۰۷)

"قاضی ابوبکر ابن العربی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی مخلوق انسان سے زیادہ حسین نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں علم، قدرت، ارادہ کرنے، باتیں کرنے، سننے، دیکھنے، تدبیر کرنے اور حکمت کی صلاحیت رکھی اور یہ تمام صفات رب تعالیٰ کی ہیں۔ گویا انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا: اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ (اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا) علماء نے بیان کیا کہ یہاں صورت بمعنی صفت ہے کیونکہ اللہ صورت کے معروف معنٰی سے پاک ہے اور کوئی بھی اُس کے مثل نہیں ہے۔ انسان عالمِ صغیر ہے اور عالمِ کبیر کی ہر نشانی اِس عالمِ صغیر میں موجود ہے۔" ("تبیان القرآن"۔ علامہ غلام رسول سعیدی، ج ۱۲، ص ۸۷۲)

یہاں شیکسپیئر کے ڈرامے HAMLET کا حوالہ دینا بے محل نہ ہوگا جس میں اُس نے انسان کے بلند وبالا مقام کو خراجِ تحسین اس طرح پیش کیا ہے :-

"انسان کس قدر حیرت انگیز صناعی ہے۔ عقل میں اشرف واعلیٰ، صلاحیتوں میں لامحدود، شکل وصورت اور تحرّک میں کتنا غیر مبہم، واضح اور قابلِ تحسین! عمل میں کتنا فرشتہ صفت! فہم وادراک کا حامل جیسے دیوتا! دنیا کا حُسن وجمال اور عالمِ حیوانیت کا نمونہ کمال!"

("HAMLET" --- Shakespeare, Act II, Scene II)

Charles Gai Eaton نے Encyclopaedia of Spirituality میں تحریر کیا ہے :

''اسلام نے انسان کو زمین پر اللہ کا نائب اور اُس کی صفات کا مظہر بنایا ہے گویا کہ اُفقی سطح پر وہ عمودی سطح کا مظہر ہے۔ صحیح معنوں میں ذہانت جیسی نعمت سے نوازے جانے کے طور پر تمام مخلوقات میں صرف انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جو اُس حقیقت سے آشنا ہے جس کا وہ خود مظہر ہے اور اِسی علم کی روشنی میں وہ اپنے خاکی اور فانی وجود سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ قوّتِ گویائی سے نوازے جانے کے طور پر صرف وہی اللہ سے ہم کلام ہونے کا مجاز ہے۔ اگرچہ وحی اور الہام کے ذریعے اللہ اپنی مخلوق (انبیاء و رُسُل) سے کلام کرتا ہے اور اگرچہ عبادت' دعا اور آگاہی کے ذریعے جو اِبلاغ کا ایک خاموش وسیلہ ہے' انسان اللہ سے کلام کرتا ہے اور اپنے آس پاس کی بے زبان مخلوق کی جانب سے بھی وہ اللہ سے کلام کرتا ہے۔ وہ حقیقت میں تو نہیں لیکن صلاحیتی طور پر فرشتوں سے بلند تر ہے کیونکہ اُس کی فطرت کُلّیت (Totality) کی عکاس ہے اور کُلّیت سے کم کسی چیز سے بھی وہ مطمئن نہیں ہوتی (مراد اپنے خالقِ حقیقی سے رابطہ اور تعلق ہے)۔ یہ وہ نظامِ فکر ہے جس سے اعلیٰ ترین سے لے کر ادنیٰ ترین تک کوئی بھی عنصر خارج نہیں ہے اور یہ وہ آئینہ ہے جس میں اللہ کے اسمائے حُسنیٰ اور صفاتِ حُسنیٰ کی عکاسی ہوتی ہے جس کے حضور وہ (یعنی انسان) ہمیشہ اپنے آپ کو (اعمال و اقوال میں) سیدھا رکھتا ہے۔'' (جلد اوّل' صفحہ ۳۵۸' مطبوعہ لاہور ۲۰۰۰ء)

اِن تمام شواہد و حقائق کے بعد اب نتیجہ نکالنا قاری پر منحصر ہے کہ انسان کو باوقار مقام کس نے عطا کیا ہے' ڈارون نے یا قرآنِ حکیم نے؟

<u>انسانی تخلیق کے کیمیائی اور حیاتیاتی دونوں طریق ہائے عمل خدائی دانش و حکمت کی بلند ترین چوٹی کو چھوتے ہیں</u>:۔ جیسا کہ ذیل کی قرآنی آیات اِس حقیقت کی شاہد ہیں :۔

(i) اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَاللّٰہِ کَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۝ (آلِ عمران:۵۹)
''بے شک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) جیسی ہے۔ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا پھر اُس (خاکی پُتلے) سے کہا کہ ہو جا چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔''

یہ آیتِ مبارکہ عیسائیوں کے عقیدۂ تثلیث (Trinity : تین خدا ماننا) کے ردّ میں نازل ہوئی۔ فرمایا کہ ربّ جلیل نے اُنہیں بغیر نطفے اور بغیر ماں باپ کے پیدا فرمایا۔ اگر بغیر باپ پیدا ہونا خدا ہونے کی دلیل ہے تو کیا

عیسائی آدم علیہ السلام کو بھی خدا مانیں گے۔ جب اُنہیں خدا نہیں مانتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کیوں مانتے ہیں؟ کیونکہ آدم علیہ السلام کے معاملے میں ماں اور باپ دونوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا جبکہ عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں دو میں سے ایک سبب یعنی ماں تو موجود ہے۔

حضرت عیسیٰ اور حضرت آدم علیہما السلام کے درمیان وجوہِ مماثلت : یہ مماثلت کئی وجوہ سے ہے:
(۱) دونوں بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ (۲) دونوں کلمہ کُــن سے پیدا ہوئے۔ (۳) دونوں اللہ کے نبی ہیں۔ (۴) دونوں اللہ کے بندے ہیں۔ (۵) دونوں کی مخالفت کی گئی۔ آدم علیہ السلام کی ابلیس نے اور عیسیٰ علیہ السلام کی یہود نے مخالفت کی۔ (۶) اِس مخالفت کی وجہ سے آدم علیہ السلام آسمانوں سے زمین کی طرف اور عیسیٰ علیہ السلام زمین سے آسمانوں کی طرف گئے۔ (۷) آدم علیہ السلام کامیاب ہو کر جنت میں جائیں گے اور عیسیٰ علیہ السلام کامیاب ہو کر زمین پر آئیں گے۔ (۸) اللہ تعالیٰ نے دونوں معزّز ہستیوں کے علم کا اظہار فرمایا: وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (البقرۃ:۳۱) اور وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (آلِ عمران:۴۸) (۹) دونوں میں اپنی پسندیدہ روح پھونکی۔ آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (الحجر:۲۹' ص:۷۲) اور عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: وَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء:۹۱؛ التحریم:۱۲) (۱۰) دونوں اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں' دونوں ہی کھاتے پیتے تھے اور دونوں کے لئے موت مقدّر رہی۔

انسان کو مٹی سے پیدا کرنے کی حکمتیں: (۱) آدم کی فطرت میں تواضع اور انکساری کا پیدا کرنا مقصود تھا کیونکہ عناصرِ اربعہ میں سے مٹی کا کام نیچے جانا ہوتا ہے۔ (۲) مٹی دوسری چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ اس سے انسان کی اصل فطرت میں سترِ عیوب (لوگوں کے عیوب پر پردہ رکھنے) کی صفت کا پیدا کرنا تھا۔ (۳) حضرت آدم کو زمین پر خلیفہ بنانا تھا اس لئے اُنہیں مٹی سے بنایا گیا تا کہ اُن کی مٹی کے ساتھ قوی مناسبت ہو۔ (۴) اس مٹی سے شہوت' حرص اور غضب کی آگ کو بجھانا تھا۔ (۵) انسان کو مٹی سے پیدا کرنے میں رب تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے۔ کیونکہ عناصرِ اربعہ میں سب سے روشن آگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو آگ سے پیدا فرمایا اور اُنہیں گمراہی کے اندھیروں میں مبتلا کر دیا۔ سب سے لطیف ہوا ہے اور ایک قول کے مطابق فرشتوں کو ہوا سے پیدا کیا اور اُنہیں انتہائی شدّت اور قوّت عطا فرمائی۔ پانی جو بہت رقیق ہے' اس سے آسمانوں کو پیدا کیا اور اُنہیں فضا میں معلّق کر دیا۔ مٹی جو چاروں عناصر میں سب سے کثیف' تاریک اور نچلے درجے میں تھی اس سے انسان کو پیدا فرمایا اور اُسے اپنی معرفت' ہدایت' نورانیت اور محبت عطا فرمائی اور اُسے سب مخلوقات پر فائق اور سربلند کر دیا۔

حضرت آدم کے خاکی پُتلے سے كُنْ فَيَكُوْنُ کے خطاب کی وضاحت: آیت مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

پہلے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اور اُس کے بعد اللہ عزّ وجلّ نے "کُن" فرمایا حالانکہ تخلیق "کُن" سے ہی ہوتی ہے؟ اس سوال کے کئی جوابات ہیں: (۱) مٹی سے پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی مٹی سے تخلیق کا ارادہ فرمایا۔ پھر "کُن" فرمایا تو وہ ہو گئے۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے مٹی سے ایک پُتلا بنایا۔ پھر "کُن" فرما کر اُس میں جان ڈال دی۔ (۳) اللہ تعالیٰ نے پہلے فرمایا کہ آدم کو مٹی سے بنایا۔ پھر اس کی وضاحت کی کہ اللہ نے کٹی سے کیسے بنایا تو فرمایا کہ ہم نے اس سے کُن فرمایا تو وہ ہو گئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ثُمَّ تاخیرِ واقع کے لئے نہیں بلکہ تاخیرِ بیان کے لئے ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ "کُن" فرمانے سے پہلے حضرت آدم وجود میں آئے ہی نہ تھے پھر اللہ تعالیٰ نے کیسے فرمایا کہ ہو جا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علمِ ازلی میں جو حضرت آدم کا وجودِ علمی تھا' اللہ تعالیٰ نے اُس کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ علمِ تفصیلی اور وجودِ خارجی میں آجاؤ۔ (''تبیان القرآن'' ---علامہ غلام رسول سعیدیؒ ج ۲' ص ص ۱۸۵-۱۸۷)

(ii) وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ (المؤمنون : ۱۲)
''اور بالیقین ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا فرمایا۔'' (تشریح کے لئے دیکھیے صفحات ۱۹۲'۱۹۷)

(iii) اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ (الٓمّٓ السجدة : ۷)
''وہی ہے جس نے جو بھی چیز بنائی' خوب ہی بنائی اور اُس نے انسان کی پیدائش گارے سے شروع کی۔''

یعنی جس کو جس مصلحت کے لئے پیدا کیا' ٹھیک اُسی کے مناسبِ حال اُس کی ساخت و فطرت رکھی۔ جانوروں کے پیر اور اُن کی گردنیں لمبی رکھیں تا کہ اُن پر رزق کا حصول دشوار نہ ہو۔ انسان کے تمام اعضاء اس طرح بنائے جن میں اُس کی مصلحت تھی۔ جو جاندار بہ ظاہر بدصورت ہیں وہ بھی اس لحاظ سے حسین ہیں کہ وہ اللہ کی تخلیق ہیں۔ بعض چیزیں بظاہر مضر ہوتی ہیں لیکن اُن میں بھی اللہ تعالیٰ نے منفعت رکھی ہے۔ ان میں سے بعض چیزوں کی مصلحت اور اُن کی افادیت کا علم پہلے نہ تھا' اب اُن کا علم ہو گیا ہے۔ مثلاً انسان کی پنڈلیوں میں کچھ زائد اور فالتو شریانیں ہیں اور جب انسان کے دل کی شریانیں کلسٹرول اور چربی سے بلاک (بند) ہو جاتی ہیں اور اُن سے خون کا دوران نہیں ہو سکتا تو پنڈلی کی زائد شریانوں کو نکال کر سرجری کے ذریعے ناکارہ شریانوں کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ سو اِن شریانوں کی افادیت کا اب علم ہو گیا ہے۔ اسی طرح کائنات کے اور سربستہ راز ہیں جو بتدریج کھل رہے ہیں اور تا قیامت اُن کا علم ہوتا رہے گا۔ سو اللہ نے ہر چیز اور ہر مخلوق میں حُسن رکھا ہے۔ کسی چیز کا حُسن آنکھوں سے نظر آتا ہے اور کسی کا حُسن عقل اِدراک کرتی ہے۔ غرض کہ اُس کی پیدا کردہ کوئی بھی چیز حُسن اور خوبی سے خالی نہیں' خواہ وہ حُسن ہمیں نظر آئے یا نہ آئے۔

<u>انسان کو مٹی سے بنانا:</u> ''انسان کی تخلیق مٹی سے کی'' کے دو معنی ہیں۔ایک یہ کہ انسان سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور اُنہیں مٹی سے بنایا۔دوسرا یہ کہ اِس سے مراد عام انسان ہے جو بظاہر نطفہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے مٹی سے پیدا ہونے کے دو محمل ہیں: ایک یہ کہ جیسا کہ عطا خراسانی سے روایت ہے کہ فرشتہ انسان کے مدفن سے مٹی اُٹھا کر لاتا ہے اور اُسے انسان کے نطفہ پر چھڑک دیتا ہے اور اس سے اُس کا خمیر تیار کیا جاتا ہے (معالم التنزیل' ج ۳' ص ۲۶۵ ؛ اَلدُّرُّ المنثور' ج ۵' ص ۵۱۳) اس کا دوسرا محمل یہ ہے کہ <u>نطفہ خون سے اور خون غذا سے بنتا ہے اور غذا زمین اور مٹی کی پیداوار سے حاصل ہوتی ہے تو اس طرح نطفہ کا مآل بھی مٹی ہے اور یوں ہر انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔</u>'' (تبیان القرآن' ج ۹' ص ص ۳۱۳' ۳۱۴)

(iv) إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي خَالِقٌ بَشَرًا مِّن طِينٍ ۞ فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ۞ (ص: ۷۱' ۷۲)

''اور (یاد کرو وہ وقت) جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں گیلی مٹی سے بشر پیدا کرنے والا ہوں سو جب اُسے پورا بنا چکوں اور اُس میں اپنی طرف سے روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔''

بَشَر کا معنیٰ ہے ظاہری جلد اور کھال۔انسان کو بشر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اُس کی جلد صاف اور ظاہر ہوتی ہے جبکہ حیوانات کی جلد بالوں سے یا اون سے یا پشم سے ڈھکی ہوتی ہے۔

سَوَّیْتُہ' کا معنیٰ ہے میں اُسے درست بنالوں اور یہاں اس سے مراد ہے کہ میں اُس کا پُتلا بنالوں اور اسے انسانی صورت میں ڈھال لوں۔

<u>روح کا معنیٰ' رُوح پھونکنے کا محمل اور ہماری شریعت میں سجدہ تعظیمی کا عدمِ جواز:</u> قرآن و حدیث میں رُوح کا لفظ کئی بار آیا ہے اور اس کے کئی معانی ہیں۔اس کا غالب اطلاق اُس چیز پر ہے جس کے ساتھ جسم قائم ہے اور جس کے سبب سے جسم میں حیات ہے۔اس کے علاوہ اس کا اطلاق قرآن' وحی' رحمت اور جبریل علیہ السلام پر بھی کیا گیا ہے۔(اَلنِّھایَہ: علامہ محمد بن الاثیر الجزری المتوفّٰی ۶۰۶ ھ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۹' ص ۳۱۴)

آیتِ مذکورہ میں رُوح پھونکنے کا ذکر اطلاقِ مجازی ہے۔اللہ کا رُوحِ انسانی کی اضافت اپنی طرف کرنا اُس کے اظہارِ قدر و منزلت کے لئے ہے جیسے بیت اللہ اور ناقۃ اللہ' یہ بتانے کے لئے کہ یہ بہت عظیم مخلوق ہے (تفسیر کبیر)

مِنْ رُّوْحِیْ میں اضافت یا تو تملیکی ہے یعنی ہماری مملوک ومخلوقِ خاص' یا اضافتِ تشریفی ہے یعنی وہ روح جو ہماری نسبت سے مکرّم ومشرّف ہے' یا تخصیصی ہے یعنی وہ جان یا زندگی جس میں ہمارے سوا کوئی تعلق نہیں۔(ماجدی اردو' ص ۹۱۵)

خلقِ آدم کا مادّہ کہیں طِیْن آیا ہے جیسے یہاں ہے' کہیں تُراب (الحج: ۵) اور کہیں صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْن (اَلْحِجْر:۲۸) کہیں فرمایا خَلَقْنَاالْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ (المؤمنون:۱۲) تو کہیں فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ کہ انسان کی خِلقت ہی جلد بازی کے خمیر سے ہوئی ہے (الانبیاء :۳۷) کہیں فرمایا لَقَدْ خَلَقْنَاالْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ کہ ہم نے انسان کو بڑی مشقت کے لئے پیدا کیا ہے (اَلْبَلَد : ۴) کیونکہ پیدائشِ انسان میں یہ تمام باتیں موجود تھیں' اس لئے مختلف آیتوں میں مختلف باتوں کا ذکر ہوا' لہٰذا اُن میں کچھ تضاد کی بات نہیں۔(تفسیر کبیر)

سجدہ کا اِطلاق حدِّ رکوع تک جھکنے پر بھی ہوتا ہے اور زمین پر چہرہ رکھنے پر بھی سجدہ کا اِطلاق ہوتا ہے۔ چونکہ آیتِ مذکورہ میں فرمایا کہ تم سب سجدے میں گر جانا' جس سے معلوم ہوا کہ یہاں سجدہ سے مراد حدِّ رکوع تک جھکنا نہیں بلکہ زمین پر چہرہ رکھنا مراد ہے۔

یہ سجدہ تعظیم تھا' سجدہ عبودیت نہیں تھا۔ سجدہ تعظیم سابقہ شریعتوں میں جائز تھا جیسے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور اُن کے والدین نے یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا تھا* اور سجدہ عبودیت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے جائز نہیں اور ہماری شریعت میں مخلوق کے سامنے سجدہ تعظیم کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

(۷) خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۝ (اَلرَّحْمٰن : ۱۴)

''اُس نے انسان کو (ایسی مٹّی سے) پیدا کیا جو ٹھیکرے کی طرح بجتی تھی۔'' (تشریح بر صفحات ۱۹۱'۱۹۲)

*ماں باپ کا بیٹے کو سجدہ کرنا بہت عجیب ہے۔ نیز یعقوب علیہ السلام باپ ہونے کے ناطے سے اپنے بیٹے یوسف علیہ السلام سے افضل تھے اور افضل کا مفضول کو سجدہ کرنا عجیب تر بات ہے۔ اِس اعتراض کے کئی جوابات مفسرین نے دئے ہیں لیکن بہترین جواب تفسیر صاوی نے دیا ہے کہ: (۱) سجدہ بحکمِ الٰہی اُس خواب کی تعبیر میں تھا جس کا ذکر اِسی سورہ یوسف کی آیت ۴ میں ہوا۔ (۲) یوسف علیہ السلام بمنزلہ کعبہ تھے اور سجدہ اللہ کو تھا۔ (۳) ہر چند کہ یعقوب علیہ السلام' یوسف علیہ السلام سے افضل تھے لیکن اُنہوں نے اس لئے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا تا کہ اُن کے بھائیوں کو حضرت یوسف کے سامنے سجدہ کرنے میں عار محسوس نہ ہو جیسے کسی ادارے کا سربراہ کسی شخص کی تعظیم کرے تو ادارے کے باقی اراکین بھی اُس کی تعظیم بجالانے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ (۵) اگرچہ قیاس اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ حضرت یعقوب حضرت یوسف کو سجدہ نہ کرتے لیکن بعض احکام تعبدی ہوتے ہیں' اُن میں عقل کا دخل نہیں ہوتا جیسے تیمم وضو کا قائم مقام ہے جبکہ وضو سے منہ صاف ہوتا ہے اور تیمم میں خاک آلود ہاتھ منہ پر ملے جاتے ہیں۔ (۶) یہ دکھانا مقصود تھا کہ نبی میں نفسانیت اور خود پسندی (Egoism) بالکل نہیں ہوتی۔ اللہ نے باپ کو حکم دیا کہ بیٹے کو سجدہ کرے اور باپ بلا چون وچرا تعمیلِ حکم کرتا ہے اور اُس کے دل میں بیٹے کے خلاف کوئی میل نہیں آتا۔ سو ایسے عظیم بندے کی بندگی پر سلام ہو! سلام ہو حضرت یعقوب پر (تبیان)

ایک وقت وہ بھی تھا جب ماہرینِ ارضیات کا خیال تھا کہ زمین ساکن ہے اور دوسرے سیارے اُس کے گرد گھومتے ہیں۔ کچھ علماء نے اس مفروضے کی صداقت کو سورۃ النّمل کی اس آیت (۶۱) سے ثابت کرنے کی کوشش کی:
أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا (یہ بُت بہتر ہیں یا وہ ذات جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا؟)۔

اوپر کی آیت میں قرآنی لفظ قَرَارًا (متعین قرارگاہ) سے ان حامیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمین ساکن ہے حالانکہ یہاں مقصدِ قرآن یہ بتانا ہے کہ یہ خالق کی انسان پر عظیم نعمت ہے کہ اُس نے زمین کو انسان کے اُس پر بلاخوف وخطر مکمل طور پر پُرسکون رہنے کے لئے بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس الٰہی نعمت کا زمین کے ساکن ہونے یا متحرک ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور حضرتِ انسان نے بہرحال اس سے فائدہ اُٹھانا ہے۔ اس لئے اس آیتِ قرآنی سے زمین کی ساکن حالت کا اخذ کرنا اس میں نئے معانی کا غیرضروری تعارف کرانا ہے۔

اچھا خاصا وقت گزرنے کے بعد جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے برعکس زمین کے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو کچھ علماء اس موقف کی تائید میں سورۃ النّمل کی آیت ۸۸ کا سہارا لئے آگے بڑھے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ

''اور تو پہاڑوں کو دیکھ رہا ہے اور اُن کے لئے خیال کر رہا ہے کہ وہ جنبش نہ کریں گے درآنحالیکہ وہ بادلوں کی طرح اُڑے پھریں گے۔''

اس مؤخرالذکر نظریہ کے حامیوں نے هِيَ تَمُرُّ کے مؤنث کے صیغوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یہ کہا کہ مؤنث کے یہ صیغے زمین کے لئے استعمال ہوئے ہیں جبکہ آیت میں زمین کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دراصل یہ الفاظ پہاڑوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں (کیونکہ لفظ جبال بمعنی پہاڑ جمع مکسر ہے اور عربی زبان میں جمع مکسر بھی بطور مؤنث استعمال ہوتی ہے)۔ اس سارے معاملہ کو سمجھتے ہوئے زمین کی گردش کے نظریہ کے حامیوں نے پہاڑوں کی جنبش کو زمانہ حال میں لیا (کہ وہ پہاڑ جنبش کر رہے ہیں) حالانکہ اس جنبش کا تعلق روزِ قیامت یعنی مستقبل سے ہے جیسا کہ آیت کا سیاق وسباق بڑے واضح طور پر بتا رہا ہے۔ اس طرح اُنہوں نے یہ یقین کرلیا کہ یہ آیت (۸۸) گردشِ زمین کو ثابت کرتی ہے کیونکہ پہاڑوں کی حرکت کا مطلب دراصل زمین کی حرکت ہے۔*

یہ چیز ہمیں مسئلہ کی تیسری جہت کی طرف لے جاتی ہے اور وہ یہ کہ ہمیں قرآن کی صداقت کو ہم عصر نظریات یا

* قرآن مجید گردشِ زمین کے متعلق خاموش ہے اور پورے قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کیونکہ یہ اس کا موضوع نہیں ہے۔ ہم گردشِ زمین کو قرآن سے ثابت یا رد نہیں کرسکتے۔ لہٰذا سائنسی دلیل کی روشنی میں جو بھی نظریہ اپنایا جائے' قرآن اس میں مداخلت نہیں کرتا اور اس کا ایمان اور مذہب کو کوئی خطرہ نہیں۔ ("An Approach to the Qur'anic Sciences"... Justice Mufti Mohammad Taqi Usmani)

(vi) اِنَّا خَلَقۡنٰهُمۡ مِّنۡ طِيۡنٍ لَّازِبٍ o (الصّٰفّٰت : ۱۱)
"بے شک ہم نے اُنہیں لیسدار مٹی سے پیدا کیا۔"

یہ چپکتی ہوئی مٹی ایسی معمولی اور کمزور ہے کہ نہ قوّت میں کوئی امتیاز رکھتی ہے اور نہ صلاحیّت میں۔ یہ چپکتی ہوئی لیسدار مٹی طِیۡن کی اگلی شکل ہے اور اس مرحلے میں مٹی کی موٹائی میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب پانی کا بہاؤ مٹی سے رک جاتا ہے تو یہ لیسدار چپکتی مٹی بن جاتی ہے۔ یہ تھوڑی سی سخت ہو جاتی ہے اور چپکنے لگ جاتی ہے۔

(vii) وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا o (نوح : ۱۷)
"اور اللہ نے تمہیں زمین ہی سے ایک خاص طور پر پیدا کیا۔"

<u>انسان کو زمین سے پیدا کرنے کی توجیہات</u> : سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو نطفہ سے پیدا فرمایا ہے جیسا کہ سورۃُ النَّحل کی آیت ۴ اور سورۃ الدّھر کی آیت ۲ میں بھی ارشاد ہوا۔ لیکن زیرِ نظر آیت میں فرمایا کہ ہم نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔ دونوں بیانات میں مطابقت کی صورت یہ ہے کہ ہمارے جدِّ امجد آدم علیہ السلام ہماری اصل ہیں اور اُنہیں اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا تو چونکہ اصل انسان کو رب تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا تو اِس وجہ سے فرمایا کہ ہم نے تمہیں اِس زمین سے پیدا کیا ہے۔ سورۃ المؤمنون میں ہماری خِلقت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے (دیکھئے صفحات ۱۹۶، ۱۹۷)

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان کی پیدائش نطفہ اور حَیض کے خون سے ہوتی ہے اور نطفہ اور حَیض کا خون دونوں غذا سے بنتے ہیں اور غذا گوشت اور سبزیوں سے حاصل ہوتی ہے اور گوشت بھی حیوانوں کے سبزہ کھانے سے بنتا ہے۔ سبزیاں پانی اور مٹی کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہیں تو خلاصہ یہ ہے کہ نطفہ اور حَیض کا خون زمین کی مٹی سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا صحیح ہے کہ ہر انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے۔

اِس کا تیسرا جواب یہ ہے کہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر پیدا ہونے والے بچے کی ناف میں وہ مٹی ہوتی ہے جس سے وہ پیدا کیا جاتا ہے اور جب وہ اَرذَل عمر کی طرف لوٹایا جاتا ہے تو وہ اُس مٹی کی طرف لوٹایا جاتا ہے جس سے وہ پیدا کیا جاتا ہے حتّٰی کہ اُس مٹی میں اُسے دفن کیا جاتا ہے۔ (تبیان القرآن---علامہ غلام رسول سعیدی، ج ۱۲، ص ص ۲۵۷، ۲۵۸)

<u>ایک اور حیاتیاتی عجوبہ تولید</u> : حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے حضرت حوّا سلام اللہ علیہا کی

پیدائش ایک اور الٰہی سائنسی معجزہ ہے۔ عبارت یوں نہیں کہ اُس نے آدم اور حوّا دونوں کو مٹی سے پیدا کیا۔ یہ جینیاتی معجزاتی نکتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں اور طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ ذیل کی آیت

اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَاللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ۝ (آلِ عمران:۵۹)
''بے شک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال اللہ کے نزدیک آدم (علیہ السلام) جیسی ہے۔ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا فرمایا' پھر اُس (خاکی پُتلے) سے کہا کہ ہو جا چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔''

تولیدی اور جینیاتی عجوبے پر زور دیتی ہے۔ اسکے برعکس کائنات کے محور یعنی انسان کے آباء کو جھوٹی تصویروں اور خود ساختہ ڈھانچوں میں تلاش کرنا عقلاً ایک مضحکہ خیز دھوکہ ہے۔ لہٰذا انسان کی تشکیل مٹی سے ترکیب شدہ مادّی مواد سے ہوئی ہے جس میں وہ رُوح بھی ہے جسے خالق نے اُس میں پھونکا۔ اور جب روح اور جسم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں تو نتیجہ موت ہوتا ہے۔ اُس قادرِ مُطلق کا یہ اور صرف یہی تخلیقی راز ہے۔

تو یہ بات ہمیں ہمہ وقت ذہن نشین ہونی چاہئے کہ نظریہ ارتقاء دیدہ و دانستہ ایک فریب ہے جو سرکش عقائد کی بنیاد فراہم کرتا ہے اور انسانی معاشرے پر تباہی لاتا ہے۔ اسے غیر مستحکم اور غیر پائیدار ثابت کیا جا چکا ہے کیونکہ یہ علومِ طبعیات' ریاضی اور حیاتیات کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔

اِرتقاء کے ماہرین کے مفروضہ کہ کائنات حادثاتی ہے' کو ہارون یحییٰ نے بڑی مہارت سے اپنی کتاب بہ عنوان "Miracles in Our Bodies" میں ردّ کیا ہے جو واقعی روح افزا ہے جس کے کچھ اقتباسات اِسی انسائیکلوپیڈیا کے اَبواب ''اللہ کی فنکارانہ صناعی'' اور ''ارتقاء بہ مقابل تخلیق'' میں زیبِ قرطاس کر دیئے گئے ہیں۔

کیا خالق کا مقصدِ وحید تخلیقِ انسان ہی تھا اور اس کے سوا کچھ نہ تھا؟ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ سورہ بنی اسرائیل کی آیت ۷۰' سورۃ المؤمنون کی آیت ۱۴ اور سورۃ التّین کی آیت ۴ میں انسان کو تمام مخلوقات میں انتہائی ارفع و اعلیٰ مقام عطا کیا گیا ہے۔ لیکن درج ذیل آیت بات کو کچھ اور انداز میں بیان کرتی ہے:۔

ءَ اَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنٰہَا ۝ (اَلنّٰزِعٰت : ۲۷)
''بھلا تمہارا (دوبارہ) پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا؟ اُسی نے اُسے بنایا۔''

اگر سابقہ آیات کو سورۃ النّٰزعٰت کی مذکورہ آیت ۲۷ سے ملا کر پڑھا جائے تو قدرتی طور پر سوال پیدا

ہوتا ہے کہ آیا انسان ہی مقصدِ وحید تھا یا انسان کی تخلیق سے بڑھ کر کائنات کی تخلیق اصل مقصد تھا؟

پہلی صورت میں یعنی اگر انسانی تخلیق ہی خالق کا واحد مقصد تھا تو پھر تمام الٰہی قوانین انسان کے مفادات کی خدمت پر مامور ہوتے۔ دوسری صورت میں یعنی اگر کائنات کی تخلیق انسانی تخلیق سے زیادہ اہم تھی (جس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت اس کائنات میں ثانوی ہے) تو انسان کو کارخانے (کائنات) میں کام کرتا ہوا ایک مزدور ماننا پڑے گا اور اِس صورت میں بھی قوانین انسانی مفاد کے حق میں ہونے چاہئیں۔ معلوم ہوا کہ ہر دو صورتوں میں الٰہی قوانین اور انسانی مفاد میں کوئی تعلق ضرور ہے۔ اس تعلق کو بجا طور پر ''علّتی تعلق'' کہا جا سکتا ہے۔ انسان کے مفاد کا تعین قانون دینے والا ہی کرتا ہے۔ ایک مثال کے ذریعے اس کی وضاحت کی جا سکتی ہے:۔

ایک مل اور کارخانے کے قائم کرنے کا واحد اور بڑا مقصد اشیائے ضروریہ کا پیدا کرنا ہوتا ہے اور اُس میں کام کرنے والے مزدوروں سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ معیاری چیزیں وقت پر بنائیں گے۔ مل یا کارخانہ مزدوروں کے لئے نہیں بلکہ اشیائے ضروریہ کی پیداوار کے لئے بنایا جاتا ہے۔ لیکن معیاری اشیاء کے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مزدوروں کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھا جائے۔ اگر مزدور کی کارکردگی اچھی اور تسلی بخش ہو تو مل مالک اور کارخانہ دار اُسے بونس بھی دیتا ہے اور ترقی بھی دیتا ہے' کیونکہ مزدور اپنی صوابدید' آزادیٔ عمل' اہلیت اور صلاحیت کو صحیح طور پر بروئے کار لایا ہے' ورنہ بجائے ترقی کے اس کی تنزلی ہو جائے گی اور بجائے انعام کے اُسے سزا ملے گی کیونکہ اُس نے آزادیٔ عمل سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور اپنی صلاحیتوں کا غلط استعمال کیا ہے۔ اِن دونوں ٹھوس حقائق کی طرف سورۃ التین کی آیات ۵'۶ میں یوں اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر حضرتِ انسان اپنے قویٰ کا صحیح استعمال نہیں کرتا تو انجام کیا ہوتا ہے اور یہ کہ وہ اگر قانونِ الٰہی پر کاربند رہے تو وہ اپنا بہترین قوام قائم رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:۔

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝
''پھر ہم اُسے پستوں سے بھی پست کر دیتے ہیں۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور اُنہوں نے نیک عمل بھی کئے تو اُن کے لئے اجرِ غیر منقطع ہے۔''

تو مندرجہ بالا سوال کا جواب تلاش کرنا مشکل نہیں ہے۔ انسان کو ذہنی صلاحیتوں اور آزادیٔ عمل سے نوازا گیا ہے۔ قرآن نے ہمیں بتایا کہ دنیاوی زندگی جو کُل سلسلۂ حیات و کائنات کا ایک بہت ہی مختصر سا حصّہ ہے' اُس کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ انسانی اعمال کی جانچ کر کے نیکوں کو حشر میں انعامات سے سرفراز کیا جائے

انسان کی آزادیِ عمل کے بارے میں چند قرآنی فرمودات یہ ہیں :۔

(i) لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلاً (هُود : ۷)

''تا کہ وہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے بہترین کون ہے۔''

(ii) فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (الكهف : ۲۹)

''سو جس کا جی چاہے' ایمان لائے اور جس کا جی چاہے' کافر رہے۔''

(iii) اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ (اَلزُّمَر : ۷)

''اگر تم کفر کرو گے تو اللہ تمہارا حاجتمند نہیں ہے اور نہ وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند کرتا ہے اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔''

یہاں اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کفر اور گناہ کو پسند نہیں کرتا تو اُس نے اُنہیں پیدا ہی کیوں کیا؟ اُن کے پیدا کرنے کا معنیٰ یہ ہوا کہ اُس نے انہیں پسند کیا ہے۔ اِس کا جواب علاّمہ پانی پتی نے یہ دیا ہے کہ ارادہ (مشیت) اور چیز ہے اور رضائے الٰہی اور چیز ہے۔ دنیا میں کسی اچھی بُری چیز اور خیر وشر کا وجود مشیتِ الٰہی کے بغیر ہو نہیں سکتا لیکن خیر اور نیکی پر وہ راضی ہوتا ہے اور شر اور بُرائی پر وہ راضی نہیں ہوتا۔ چور چوری کرتا ہے' ڈاکو ڈاکہ ڈالتا ہے' قاتل قتل کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں سے یہ کام سرزد ہوتے ہیں۔ اگر اُس کی مشیت اور ارادہ نہ ہو تو کوئی بھی فعل صادر نہیں ہو سکتا لیکن ان میں سے کوئی فعل اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث نہیں بلکہ یہ امور اُس کے قہر وغضب کو دعوت دیتے ہیں۔ جب کوئی انسان کفر اور گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے کیونکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے وجود میں آتی ہے' جیسا کہ سورہ اَلصّٰفّٰت کی آیت ۹۶ میں فرمایا: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور تم جو عمل کرتے ہو اُس کو بھی) لیکن وہ کفر اور گناہ سے راضی نہیں ہوتا بلکہ وہ راضی صرف ایمان اور اطاعت سے ہوتا ہے (تفسیر مظہری)۔

(iv) اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○ (اَلدَّهر : ۳)

''یقیناً ہم نے ہی اُسے راستہ بتایا' پھر یا تو وہ شکر گزار ہوا اور یا کافر ہو گیا۔''

یہیں سے معلوم ہوا کہ اسباب وحالات اور قوتیں اللہ نے پیدا فرمائیں (اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ) اور اختیار و صرفِ ہمت انسان کی رائے پر چھوڑ دیا (اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا)

دراصل آسمانوں اور زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ بھی ہے' اُسے صرف اور صرف انسان کی فلاح اور فائدے کے لئے پیدا کیا گیا تاکہ وہ مل مالک (اللہ تبارک وتعالیٰ) کی مرضی اور منشا کے مطابق کام کرے' پیداوار معیاری دے (یعنی نیک اور اچھے کام کرے) اور یوں اُسے انعام ملے' اُس کی ترقی (درجات) ہو اور انجام کار وہ بلند درجہ حاصل کرے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ کائنات انسان کے لئے ہے' انسان کائنات کے لئے نہیں۔ یہ بات بالکل کارخانے کے کارکنوں کی فلاح و بہبود کی تکمیل کے لئے ہے کہ اُنہوں نے اچھی چیزیں پیدا کیں اور معیار بہتر بنایا (یعنی اعمالِ صالحہ کئے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو پسند آئے)۔

سورۃ النّازعٰت کی آیت ۲۷ جس کا حوالہ صفحہ ۲۵۲ پر دیا گیا' زمین پر انسان کی نیابتِ الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ آیت میں انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری اور خالق کے حضور جوابدہی کو فراموش کرتے ہوئے مغرور ہو گیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی وسیع دھرتی پر وہ ایک معمولی اور چھوٹے سے دھبے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ افضلیت اور فوقیت جو اُسے عطا کی گئی' قابلِ قدر عطیہ خداوندی ہے اور اس عطیہ کو قائم رکھنے اور محفوظ کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کا شکرگزار بندہ بن کر رہے اور اُس کی مرضی کے مطابق کام کرے۔ اگر وہ اپنے مقصدِ حیات کو پورا کرتا ہے (بہ الفاظِ دیگر وہ اچھی اور معیاری پیداوار دیتا ہے) تو اُسے انعام ملے گا۔ سورۃ النّازعٰت کی بعد کی آیات ۲۸ تا ۳۳ کو قدرتی آیات کہنا موزوں ہے کہ اُن میں آسمانوں اور زمین کے حُسن و تجمل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور یہ کہ اُنہیں کیسے حیاتِ انسانی کی خدمت کے لئے تخلیق کیا گیا ہے:۔

رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَاo وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحٰهَاo وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَاo أَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَ هَا وَمَرْعٰهَاo وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَاo مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْo (اَلنّٰزِعٰت:۲۸۔۳۳)

"(آسمان کی) چھت کو اُس نے بلند کیا اور اُسے درست بنایا اور اُس کی رات کو ڈھانپا اور اُس کے دن کو ظاہر کیا۔ اور اُس کے بعد زمین کو بچھایا اور اُس سے اُس کا پانی اور اُس کا چارا نکالا اور پہاڑوں کو قائم کر دیا۔ (یہ سب) تمہیں اور تمہارے مویشیوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہے۔"

اس آیت سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ پہلے آسمان کو بنایا اور اُس کے بعد زمین کو پھیلا دیا جبکہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۹ اور سورہ فُصّلت کی آیت ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمین کو بنایا اور آسمان کو اس کے بعد بنایا۔ اس تعارض کے جواب یہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ نے پہلے زمین کا مادّہ پیدا کیا' پھر آسمانوں کو پیدا فرمایا اور آسمانوں کو پیدا کرنے کے بعد پھر زمین کو پھیلایا اور اُسے موجودہ شکل دی۔ سورۃ البقرۃ میں نفسِ زمین کو پیدا کرنے کا ذکر ہے اور اَلنّازعات میں زمین کو پھیلانے اور اُسے موجودہ شکل دینے کا ذکر ہے۔ (۲) آیت سے مراد زمین کو صرف پھیلانا نہیں ہے بلکہ زمین کو قابلِ کاشت بنانا ہے کیونکہ اس کے بعد والی آیت میں فرمایا کہ زمین سے

اُس کا پانی اور اُس کا چارا نکالا کیونکہ زمین میں کھیتی باڑی اور روئیدگی کی صلاحیت اُس وقت پیدا ہوتی ہے اور زمین میں دریا اور چشمے بھی اُسی وقت وجود میں آتے ہیں جب آسمان سے بارش برسے۔ اس لئے پہلے آسمانوں کو پیدا کرنے کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد زمین کو قابلِ کاشت بنانے کا ذکر کیا۔ (۳) بَعْدَ ذٰلِكَ کا معنیٰ یہاں حقیقی نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ یعنی آسمانوں کے بنانے کے ساتھ زمین کو پھیلا دیا جیسے سورۃ القلم کی آیت ۱۳ میں فرمایا: عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ یعنی دشمنِ رسول (ولید بن مغیرہ) اِن عیوب کے ساتھ ساتھ بے نسب بھی ہے۔

نوٹ :(۱) دَحٰی کے معنیٰ کسی چیز کو اس کے اصل مقر سے ہٹا دینے کے ہیں (مفردات راغب اصفہانی)۔ اس سے گویا اشارہ اِس طبیعیاتی حقیقت کی طرف ہوگیا کہ کرۂ ارض کسی اور بڑے اجرامِ سماوی کا ٹکڑا ہے جو اس سے کٹ کر ایک مستقل وجود میں آ گیا ہے۔ (تفسیر ماجدی اردو' ص ۱۱۷۴) (۲) مَرْعٰی (چراگاہ) کے لفظ میں یہ بات بھی بتا دی کہ اے حضرتِ انسان! زمین سے جو پیداوار حاصل ہوتی ہے وہ صرف تیرے لئے ہی نہیں بلکہ تیرے خدمت گزار چوپایوں کی خدمت و سہولت کے لئے بھی ہے اور اس میں سب برابر کے شریک ہیں' لہٰذا تجھے اپنے خالق و مالک کا ہر وقت شکر گزار اور اطاعت گزار بندہ بن کر رہنا چاہئے۔ (۴) اَنْعام جمع ہے نَعَمْ کی۔ صحاح میں مذکور ہے کہ اِس لفظ کا اطلاق زیادہ تر اونٹ' گائے' بکریوں اور دُنبوں پر کیا جاتا ہے (مختار الصحاح ص ۳۸۵ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ۵۶۰)

<u>زمین کے فوائد و منافع</u>: فرمایا کہ ہم نے زمین سے انسانوں اور اُن کے جانوروں کی خوراک نکالی' سبزہ اور غلّہ پیدا کیا' انواع و اَقسام کے پھل پیدا کئے' جڑی بوٹیاں پیدا کیں جو انسانی بیماریوں میں بطور علاج کام آتی ہیں' روئی پیدا کی جس سے لباس بنایا جاتا ہے' درخت پیدا کئے جن سے فرنیچر اور دوسری اشیائے ضروریہ بنائی جاتی ہیں' زمین میں معدنیات رکھیں جن میں لوہا ہے جس سے مشینیں اور اسلحہ بنایا جاتا ہے' تانبا اور پیتل ہے جن سے برتن بنائے جاتے ہیں' سونا اور چاندی ہے جن سے زیورات بنائے جاتے ہیں' تیل اور قدرتی گیس ہے جن سے ایندھن حاصل کیا جاتا ہے۔ دریا پیدا کئے جن سے کاشت کاری کے لئے پانی حاصل کیا جاتا ہے اور بجلی بنائی جاتی ہے اور انہی دریاؤں میں مچھلی جیسی ذائقے دار آبی مخلوق پیدا کی جس میں کولیسٹرول (Cholesterol) جیسا الکلی مادّہ اور چکناہٹ بھی نہیں اور جس کا تر و تازہ گوشت کھا کر تم غذائیت (Nutrition) کا سامان کرتے ہو۔

(۶) آثارِ قدیمہ (ARCHAEOLOGY) اور قرآنِ حکیم

پاکستان میں ہڑپہ (پنجاب)، موہنجوداڑو (سندھ) اور ٹیکسلا (سرحد) کے کھنڈرات زبانِ حال سے اپنی تاریخ بتا رہے ہیں کہ کسی زمانے میں یہاں بھی کوئی انسانی آبادی تھی۔ عین ممکن ہے کہ اُس زمانے کے اِن پُرشکوہ علاقوں کے مکینوں نے اپنے ہم عصر نبیوں اور رسولوں کی مخالفت کی ہو جس کے نتیجے میں اُن پر وہ تباہی آئی جو اقوامِ عاد و ثمود، قومِ لُوط اور قومِ شعیب پر (جو حجاز اور یمن وغیرہ کے علاقوں میں آباد تھیں) اتارے گئے عذاب سے کم نہ تھی۔ مقتدر و قادر اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں اور معاشروں پر ہر زمانے میں مہربان و شفیق رہا ہے کہ وہ بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے مختلف زمانوں میں اپنے پیغامبر بھیجتا رہا ہے (سورہ بنی اسرائیل: ۱۵؛ سورۃ الشعراء: ۲۰۸، ۲۰۹؛ سورہ فاطر: ۲۴)۔ وہ معصیت پیشہ لوگوں کو خاصی مہلت دیتا ہے لیکن اِس مہلت کا اُنہیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا اگر وہ اللہ کو بھولتے ہوئے دنیوی جاذبیتوں میں گم ہو کر رہ جائیں۔ اُن کی مسلسل بغاوت اور انکار کے باوجود ربِّ جلیل نے تنبیہ کرنے والوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا اور کافی تنبیہ کے بغیر اُنہیں سزا نہیں دی۔ چنانچہ قرآنِ حکیم فرماتا ہے:

(i) وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل: ۱۵)
''اور جب تک کسی رَسول کو ہم بھیج نہیں دیتے تو ہم کبھی سزا نہیں دیتے۔''

یہاں یہ عام قاعدہ بیان ہوا کہ تبلیغِ دین، رسول یا اُس کے کسی نائب کے ذریعہ سے ہو جانا ضروری ہے۔ محققین نے اس آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ (۱) جن قوموں تک رسول کی اصلاً خبر نہیں پہنچی اُنہیں کفر اور گناہوں پر سزا نہیں دی جائے گی۔ سورۃ القَصص کی آیت ۵۹، سورۃ الزُّمر کی آیت ۷۱، اور سورۃ المُلْك کی آیات ۸، ۹ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ عذاب صرف اُنہی لوگوں پر ہوگا جن کے پاس رسول آئے اور اُنہوں نے اُن کی مخالفت کی۔ (۲) اصحابِ فَترت پر بھی عذاب نہیں ہوگا (یعنی جس زمانہ کے لوگوں کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جیسے اہلِ مکہ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے کوئی رسول نہیں آیا تھا۔ زمانۂ فترت کا حوالہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۹ میں ہے)۔ (۳) احکام صرف شرع سے ثابت ہوتے ہیں۔ (۴) صرف ربِ تعالیٰ کی نافرمانی پر عذاب نہیں آیا کرتا بلکہ انبیائے کرام کی گستاخیوں پر عذابِ الٰہی آتا ہے۔ بیت اللہ شریف میں رکھے گئے بتوں کی پانچ سو سال تک پرستش ہوتی رہی، عذاب سے وہ مشرکین محفوظ رہے لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مخالفت اور آپ کی گستاخیوں پر دھر لئے گئے۔ سورۃ النَّحل میں ارشاد ہوا:

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ (النَّحل: ۱۱۳)
''اور اُن (کفارِ مکہ) کے پاس ایک رسول بھی اُنہی میں سے آیا تھا، سو اُنہوں نے جھٹلایا پس اُنہیں عذاب نے آ پکڑا اِس حال میں کہ وہ (اپنے حق میں) ظالم تھے۔''

کفارِ مکہ کے دل خراش اور دلدوز رویے نے آنجناب ﷺ اور آپ کے صحابہ کو ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا جس کے نتیجہ میں مکہ میں شدید قحط پڑا' جانور مرنے لگے اور آدمی جان سے گزرنے لگے جس حقیقت کا ذکر اِس سے قبل آیت ۱۱۲ میں فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (اللہ نے اُنہیں ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا) کے الفاظ میں ہوا۔

(ii) وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ٥ ذِكْرٰى وَمَا كُنَّا ظَالِمِيْنَ (الشعراء: ۲۰۸' ۲۰۹)
''اور ہم نے جتنی بھی بستیاں ہلاک کیں' سب میں ڈرانے والے آچکے' نصیحت کے لئے اور ہم کچھ ظلم کرنے والے تو تھے نہیں۔''

جن لوگوں نے پیغامِ حق کو قبول نہ کیا اور اپنے ہم عصر نبیوں کے خلاف بغاوت کی راہ اختیار کی' اُنہیں بیخ وبُن سے اکھاڑ دیا گیا اور وہ ہولناک انجام سے دوچار ہوئے۔ اللہ کی یہ آخری کتاب ۔۔ قرآن مجید ۔۔ فانی انسان کو بار بار یہ تلقین کرتی ہے کہ وہ اللہ کی اِس دھرتی پر رہتے ہوئے اُس تباہی و بربادی سے عبرت حاصل کریں جو اِن خود پسند' مغرور اور عادی باغیوں پر آکے رہی اور اِس طرح اُن خطرناک چور گڑھوں سے بچ کر رہیں جو اُن قسمت کے مارے معاشروں کا مقدر رہنے۔ قرآن مجید کا اندازِ بیان کس قدر اعصاب شکن ہے جب وہ تنبیہ کرتا ہے کہ اُن کی تباہی پر کوئی آنکھ بھی تو نمناک نہ ہوئی اور کسی نے بھی تو ہمدردی کا اظہار نہ کیا :

(i) فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ ٥ (اَلدُّخان : ۲۹)
''تو نہ تو اُن پر آسمان اور زمین روئے اور نہ اُنہیں مہلت ہی ملی۔''

پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لی جائے کہ کائنات کی کوئی سی بھی شے ہو' بڑی سے بڑی یا چھوٹی سے چھوٹی' احساس و شعور کسی نہ کسی درجہ میں ضرور رکھتی ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھئے کہ آسمان اور زمین میں بھی ان کے مرتبہ کے لائق شعور موجود ہے۔ اسی سے وہ مؤمن کے مرتبہ کا ادراک کر کے اُس کی وفات پر غمگین ہوتے ہیں۔ حکیم کائنات و دانائے فطرت محمد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مَامِنْ عَبْدٍ اِلَّا وَلَهٗ فِي السَّمَآءِ بَابَان بَاب ''يَخْرُجُ مِنْهُ رِزْقُهٗ' وَبَاب'' يَدْخُلُ مِنْهُ عَمَلُهٗ' وَكَلَامُهٗ' فَاِذَا مَاتَ فَقَدَاهُ وَبَكِيَا عَلَيْهِ (جامع ترمذی) [مؤمن جب مر جاتا ہے تو آسمان کا وہ دروازہ جس سے اُس کا نیک عمل اوپر جاتا تھا اور وہ دروازہ جس سے اُس کے رزق کا نزول ہوتا تھا' اُس پر روتے ہیں] اور حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' سے مروی ہے کہ مومن کی وفات پر زمین میں اُس کے نماز پڑھنے کی جگہ اور آسمان میں اُس کے عمل کے اوپر جانے کی جگہ یہ دونوں اُس پر روتی ہیں۔

(ii) فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْ بَاقِيَةٍ ۝ (اَلْحَآقَّة : ٨)
"تو کیا تمہیں اُن میں سے کوئی بھی بچا ہوُا نظر آتا ہے؟"

غرض اِن قصوں میں کفارِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی میں گزشتہ نافرمان قوموں کی پیروی کرنے سے باز رکھنا مطلوب ہے۔

تاریخی جغرافیہ اور جزیرہ نمائے عرب میں حاصل کئے گئے کتبوں پر تحقیقی کام اُنیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوُا اور محققین میں الائس موصل (شمالی عرب میں) اور ایڈورڈ گلیسر (یمن میں) نمایاں ہیں لیکن جنگ عظیم دوم سے پہلے آثاریاتی جائزوں اور کھدائیوں کی محدود تعداد ہی عمل میں لائی جاسکی۔ ٹھوس اور پائدار آثاریاتی کام ۱۹۵۰ء سے یمن اور خلیج ہائے عرب کی ریاستوں میں شروع ہے۔ سعودی عرب میں قریۃُ الفَی کے مقام پر کھدائی کا کام ۱۹۷۲ء میں شروع ہوُا اور علاقائی جائزے ۱۹۷۶ء میں شروع ہوئے (جس کا اعلان "اَطلال" نامی جریدے کے پہلے شمارے میں ہوُا) لیکن آثارِ قدیمہ کا یہ کام مذکورہ پہلی دو جگہوں سے کمتر درجے میں ہے۔

اُس روشنی کی جو آثارِ قدیمہ قرآن مجید کے حقائق پر ڈال سکتا ہے' دو قسمیں ہیں: (۱) انتہائی قدیم زمانہ قبل از اسلام کے طبیعی کھنڈرات جن کے تعلق کو ابتدائی بائبل اور عربی رسولوں اور اُن کی اُمتوں سے جوڑا جاسکتا ہے۔ (۲) وہ طبیعی کھنڈرات جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ حیات پر معلومات مہیا کرتے ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو فلسطین میں موجود آثاریاتی کھنڈرات کو بنی اسرائیل اور اُن لوگوں سے تعلق دیا جاسکتا ہے جن کا ذکر بائبل میں ہوُا اور گزشتہ ایک صدی سے زائد کے عرصہ سے اس موضوع پر خاصی دلچسپی لی جارہی ہے۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قومِ لوط پر جو عذابِ الٰہی آیا' اُس کی باقیات کے آثار بحرِ مُردار کے علاقے کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔ بحرِ مردار کا یہ علاقہ راندۂ درگاہِ الٰہی ہے۔ (انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' صفحات ۱۴۸'۱۴۹) یو ایس اے ۲۰۰۲ء

سورۃ الاعراف کی آیات ۸۰ تا ۸۴ کے علاوہ درج ذیل قرآنی آیات بھی اُس عذابِ الٰہی کے بیان میں ہیں جو علاقۂ سدوم کے باسیوں پر اُن کی ہم جنسی کے جرم کی پاداش میں آیا۔ وہ حضرت لوط علیہ السلام کی اُمت تھے:

(i) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۝ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۝ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۝ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ۝ (اَلْحِجر: ۷۳ تا ۷۶)
"پس سورج نکلتے نکلتے اُنہیں ایک سخت آواز نے پکڑ لیا' چنانچہ ہم نے اُس بستی کا اوپر کا تختہ نیچے کردیا اور اُن لوگوں پر کھنگر کے پتھر برسادئے۔ بے شک اِس واقعہ میں اہلِ بصیرت کے لئے نشانیاں ہیں اور وہ بستی تو ایک آباد راستے پر ملتی ہے۔"

یعنی جس طرح یہ اپنے ہم جنس مَردوں کو پلٹ کر اُن سے لذت کشید کرتے تھے' اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُسی طرح اُن پر اُن کی بستیوں کو الٹ دیا۔ پھر اُن کی ذلت کے لئے اُن پر کنکر اور پتھر برسائے گئے۔ سدوم وعمورہ کے برباد شدہ شہر عرب وشام کے درمیان خوب چلتے ہوئے راستے پر بحرِ لُوط (بحرِ مُردار) کے کنارے واقع تھے جس پر حجاز وشام کے درمیان قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور جس سے قرآن مجید کے اوّل مخاطبین یعنی اہلِ عرب خوب واقف تھے۔ *

اس سے ماقبل آیت ۶۶ میں لفظ مُصبِحِین آیا اور یہاں آیت ۷۳ میں لفظ مُشرِقِین آیا ہے جس سے بتانا یہ مقصود ہے کہ جو کام فجر کے وقت شروع ہوا تھا' وہ وقتِ اِشراق تک اپنی تکمیل کو پہنچ گیا۔

(ii) وَلَقَدْ أَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِي أُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ أَفَلَمْ يَكُونُوا يَرَوْنَهَا بَلْ كَانُوا لَا يَرْجُونَ نُشُورًا○ (اَلْفُرقان : ۴۰)

"اور (یہ لوگ) اُس بستی پر سے گزرے ہیں جس پر پتھر بُری طرح برسائے گئے تھے' تو کیا یہ لوگ اُسے دیکھتے نہیں رہتے؟ بات یہ ہے کہ یہ لوگ مر کر جی اُٹھنے کا یقین ہی نہیں رکھتے۔"

(iii) ثُمَّ دَمَّرْنَا الْآخَرِينَ○ وَإِنَّكُمْ لَتَمُرُّونَ عَلَيْهِمْ مُصْبِحِينَ○ وَبِاللَّيْلِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (الصّٰفّٰت: ۱۳۶ تا ۱۳۸)

"پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر مارا اور تم تو اُن پر صبح وشام گزرا کرتے ہو تو کیا پھر بھی عقل سے کام نہ لو گے!"

اِسی طرح قصرِ سلیمان (علیہ السلام) کے نشانات بھی ابھی تک نہیں مل سکے ہیں۔

اصحاب مدین جن کی طرف پیغمبر شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا اور جن کی بابت قرآن حکیم یوں فرماتا ہے:۔

وَإِلَى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ○ وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا وَاذْكُرُوا إِذْ كُنْتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ وَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ○ (الاعراف : ۸۵' ۸۶)

"اور مدین کی طرف ہم نے اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔ اُنہوں نے کہا اے میری قوم والو! اللہ ہی کی پرستش کرو' اُس کے سوا تمہارا کوئی معبودِ برحق نہیں۔ اب تو تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے کھلا نشان بھی آ چکا' سو تم ناپ اور تول پوری کیا کرو اور لوگوں کا نقصان اُن کی چیزوں میں مت کیا

* ہر جنسی کے فعل کو "لواطت" کہنے میں پیغمبر لوط علیہ السلام کی بے ادبی کا پہلو نکلتا ہے کیونکہ لواطت نسبت ہے لوط (علیہ السلام) کی طرف۔ اس لئے پیغمبر کے اعلیٰ وارفع مقام کا خیال رکھتے ہوئے اس مذموم فعل کو لونڈے بازی یا فعلِ اغلام کہنا ہی صحیح ہے۔

دریافتوں کی مدد سے ثابت نہیں کرنا۔ نظریات تو راتوں رات بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو شروع میں بڑی ہردلعزیزی حاصل ہوئی لیکن بعدہ' اسے مسترد کردیا گیا اور اس کی جگہ زوردار دھماکہ کے نظریہ (Big Bang Theory) نے لے لی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی علم اور تحقیق انسانی جدّ وجُہد کا نتیجہ ہیں اور انسان کا پُر خطا ہونا ایک عالمگیر صداقت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آج کے سائنسی حقائق آنے والے کل میں محض مفروضے بن کر رہ جائیں لیکن ایسی صورت قرآن مجید کے ساتھ نہیں۔ اللہ کا کلام ہونے کے حوالے سے قرآن ابدی صداقت ہے اور قرآن کے بیان کردہ حقائق حتمی، قطعی، آخری، آفاقی، دائمی اور ناقابلِ تغیر ہیں۔ لہٰذا قرآن کو ہمیشہ بدلنے والے نظریات کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہیئے بلکہ اُن نظریات کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔ اگر وہ مکمل طور پر قرآن کے موافق ہیں تو اُنہیں سچا تسلیم کرلینا چاہیئے۔

قرآنِ حکیم مابعد الطبعیاتی (Metaphysical) حقائق پر بھی بات کرتا ہے اور بنی نوعِ انسان سے اُن پر ایمان لانے کی توقع کرتا ہے۔ لیکن انسان فطری طور پر اُن حقائق پر یقین کرتا ہے جو اُس کے روزمرّہ مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اس معمّہ کا حل قرآن مجید نے اس طرح پیش کیا کہ اُس نے اُن مادّی حقائق کو بے نقاب کیا جو بعد کے زمانوں میں سائنسی طور پر سچے ثابت ہونے تھے اور ایسا اس لئے کیا گیا تاکہ سائنسی ترقی کے دَور میں یہ جتلا دیا جائے کہ اگر قرآن کسی انسان کی کاوش کا نتیجہ ہے تو ایک غیر سائنسی انسان نے اُس غیر سائنسی دَور (ساتویں صدی عیسوی) میں اُن حقائق کو کیسے بے نقاب کردیا جو آج کی سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہیں!!

''یہاں اس بات کا ذکر کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات قرآنِ حکیم سے سائنسی مسائل اخذ کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں اور ایسی کوششوں کے پسِ پردہ یہ نظریہ تھا کہ غیر مسلم سائنسدانوں کو بتایا جائے کہ ہمارے قرآن نے صدیوں پہلے اُن سائنسی حقائق کو بے نقاب کردیا تھا جن کے بے نقاب کرنے کا بہت بعد کے زمانوں میں دعویٰ کیا گیا۔ دراصل یہ کوشش اگر قرآن کے ''اصولِ تفسیر'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کی گئی ہے تو یہ قرآن کے ساتھ غیر دانشمندانہ دوستی کے مترادف ہے۔ لہٰذا اگر تو وہ سائنسی حقائق اس آخری الٰہی کتاب میں حتمی طور پر بیان ہوئے ہیں تو اُنہیں بلا خوف وخطر قرآن کی طرف منسوب ہونا چاہیئے' لیکن اُن باتوں کو قرآن کی طرف منسوب کرنا جن کا بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآن میں ذکر تک نہیں ہے' آج کی دنیا میں ایسے ہی غلط اور پوچ ہوگا جیسا گزشتہ زمانوں میں۔'' (''علوم القرآن''۔ محمد تقی عثمانی' ص ۳۹۵)

چہارم یہ کہ قرآنِ حکیم کی حیران کن خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بہت سی آیات کی کثیرالجہتی تاویلات اور تفسیریں ہیں یعنی اس کی تاویلات گلاب کے پھول کی طرح ہیں جو پتیوں سے ڈھانپا ہوتا ہے۔ جونہی ایک پتی کو اٹھالیا جائے تو معنی کی ایک اور نئی پتی سامنے آجاتی ہے۔ اسی لئے ایک ہی آیت اپنے اندر مختلف معانی اور تفسیر رکھتی ہے اور کسی آیت کو کسی خاص معنی اور تفسیر میں محدود کردینا کہ دوسرے معانی اور تفسیر کو نظرانداز کردیا جائے' صحیح نہ ہوگا۔ اُس وقت یہ بھی

کرو، ملک میں اُس کی درستی کے بعد فساد برپا نہ کرو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان والے ہو۔ اور راہ پر اس طرح مت بیٹھا کرو کہ راہ گیروں کو ڈراؤ اور اللہ کی راہ سے اُنہیں روکو جو ایمان لا چکے ہیں اور اس (راہ) میں کجی تلاش کرو۔ اور وہ وقت یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، پھر اللہ نے تمہیں بڑھا دیا اور دیکھ رکھو اہلِ فساد کا کیسا انجام ہوا۔"

قَدْ جَآءَتْكُمْ بَيِّنَةٌ" (تمہارے پاس نشانی پہنچ چکی ہے) میں اپنی نبوّت کا اظہار ہے۔ بَيِّنَةٌ'' سے مراد آپ کا معجزہ ہے یعنی رب کی طرف سے تمہیں میرا معجزہ پہنچ گیا جو میری نبوت کی دلیل ہے۔ قرآنِ حکیم میں آپ کے معجزے کا ذکر نہیں۔ خود ہمارے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کے ہزار ہا معجزات کا ذکر نہیں۔ قرآنِ حکیم میں شق القمر اور معراج جیسے چند معجزات کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ اس نشانی سے مراد خود آپ کی اپنی ذاتِ والا صفات ہو کیونکہ نبی رب تعالیٰ کی کھلی دلیل ہوتے ہیں۔ ربّ ذوالجلال والاکرام نے ہمارے نبی علیہ السلام کو سورۃ النساء کی آیت ۱۷۴ میں بُرھان فرمایا۔

<u>آیاتِ مذکورہ سے ماخوذ چند مفید نکات</u> : (۱) سارے اعمال پر ایمان مقدّم ہے۔ انسان پہلے ایمان لائے پھر نیک اعمال کرے۔ یہ نکتہ اعْبُدُوا اللهَ کو أَوْفُوا الْكَيْلَ پر مقدّم کرنے سے حاصل ہوا۔ (۲) رب کی عبادت سے درستیٔ معاملات میں مدد ملتی ہے۔ درست طریقے سے عبادت کرنے والا ما شاء اللہ معاملات میں بھی درست رہتا ہے۔ یہ نکتہ بھی عبادت کو مقدّم فرمانے سے حاصل ہوا۔ (۳) نجات کے لئے صرف رب تعالیٰ کی ذات وصفات کو مان لینا کافی نہیں بلکہ نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے جیسا کہ لفظ بَيِّنَةٌ" سے واضح ہے کہ شعیب علیہ السلام نے رب کی وحدانیت کے ساتھ قوم کو اپنی نبوت کی بھی تبلیغ فرمائی کیونکہ بَيِّنَةٌ'' سے مراد آپ کا معجزہ ہے اور معجزہ سے نبی کی نبوّت ثابت ہوتی ہے۔ (۴) پاسنگ والی ترازو رکھنا، خریدتے وقت زیادہ تول لینا اور فروخت کرتے وقت ڈنڈی مارنا یہ سب حرام ہے۔ (۵) دھوکہ دے کر خریدار کو بُری چیز دینا، فریب و چالاکی سے اُس کے کھرے سکے کھوٹوں سے بدلنا حرام ہے۔ یہ نکتہ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ سے حاصل ہوا۔ (۶) راہزنی، ڈکیتی، چوری وغیرہ سخت جرم ہیں جن کی سزا دنیا و آخرت میں بہت سخت ہے۔ یہ نکتہ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْأَرْضِ سے حاصل ہوا۔ (۷) معاملات کی درستی، صدقات و خیرات پر ثواب صرف مؤمن کو ملے گا۔ کافر خواہ کتنا ہی دیانتدار اور امانتدار ہو، ثواب یا نجات کا مستحق نہیں۔ یہ نکتہ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ کے الفاظ سے ملا۔ البتہ کفار کی بعض نیکیوں کی وجہ سے اُن کے عذاب میں تخفیف کی امید ہے جیسے حاتم طائی، نوشیرواں وغیرہ۔ (۸) کفار ایمان سے روکنے کی تدبیریں ہمیشہ سے کرتے رہے ہیں مگر اللہ کا نور کسی گرد وغبار سے دھندلا نہیں سکا۔ مدین والے لوگوں کو ایمان سے روکنے کے لئے مدین کے راستوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ (۹) سیدھا راستہ محض عقل سے کبھی نہیں مل سکتا بلکہ یہ تو نبی ہی سے ملتا ہے۔ یہ نکتہ وَ تَبْغُوْنَهَا

عِوَجًا سے حاصل ہوا۔ (۱۰) افراد کی کثرت قوم کی قوت کا ذریعہ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے جیسا کہ لفظ فَكَثَّرَكُمْ بتا رہا ہے۔ (۱۱) اللہ کی نعمتیں قولاً، عقیدۃً، عملاً یاد کرنا اور یاد رکھنا اور اُن کا تذکرہ کرنا بالکل جائز بلکہ حکمِ الٰہی ہے۔ یہ نکتہ وَاذْكُرُوْا سے حاصل ہوا۔ (۱۲) انسان پر دو وقت آتے ہیں: چڑھاؤ کا اور گراؤ کا۔ چڑھاؤ کے وقت اپنے گرے وقت کو یاد کرے۔ اس سے رب تعالیٰ سے محبت پیدا ہوگی، اُس کی اطاعت کا جذبہ پیدا ہوگا اور دل کو بے حد خوشی ہوگی۔ مگر گرے وقت میں چڑھتے وقت کو ہرگز یاد نہ کرے کہ اُس سے صدمہ اور ناشکری ہونے کا اندیشہ ہے بلکہ اُس وقت اپنے سے نیچے کو دیکھے تاکہ شکر کرے۔ (۱۳) عذابِ الٰہی والی قوموں کی اجڑی ہوئی بستیاں دیکھنا بلکہ وہاں سفر کر کے جانا جائز بلکہ حکمِ الٰہی ہے جیسا کہ لفظ وَانْظُرُوْا بتا رہا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا: سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (زمین میں چل پھر کر دیکھو کہ فسادیوں کا انجام کیسا ہوا)

سورہ ھُود کی آیات ۸۴ تا ۹۵ اور سورۃ الشعراء کی آیات ۱۷۶ تا ۱۸۹ بھی قومِ شعیب کی بربادی سے متعلق ہیں۔ قرآنِ عزیز نے مدین قبیلہ کی آبادی کے متعلق ہمیں دو باتوں سے متعارف کرایا ہے۔ ایک یہ کہ وہ ''امامِ مبین'' پر آباد تھا:

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝ (اَلْحِجْر : ۷۹)

''اور لوط کی قوم اور مدین دونوں بڑی شاہراہ پر آباد تھے۔''

''عرب کے جغرافیہ میں جو شاہراہ حجاز کے تاجر قافلوں کو شام، فلسطین، یمن بلکہ مصر تک لے جاتی اور بحرِ قُلزم کے مشرقی کنارے سے ہو کر گزرتی تھی، قرآن اُسی کو اِمَام مُبِین (کھلی اور صاف شاہراہ) کہتا ہے کیونکہ صَیف (گرمی) اور شِتَاء (سردی) دونوں زمانوں میں قریشی قافلوں کے لئے یہ متعارف اور بڑی تجارتی سڑک تھی جس کا سلسلہ بری مسافت کے ساتھ بحری کے بھی ڈانڈے ملا دیتا تھا۔''

''دوسرے یہ کہ وہ ''اصحابِ اَیکہ'' (جھنڈ والے) تھے۔ عربی میں اَیکہ اُن سرسبز و شاداب جھاڑیوں کو کہتے ہیں جو ہرے بھرے درختوں کی کثرت کی وجہ سے جنگلوں اور بنوں میں اُگی رہتی ہیں اور جھاندے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔'' زمین کی طبعی اور جغرافی حیثیت سے مدین کا قبیلہ ''اصحابِ اَیکہ'' کہلایا۔

''اِن دونوں باتوں کے جان لینے کے بعد مدین کی آبادی کا پتہ آسانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ مدین کا قبیلہ بحرِ قُلزم کے مشرقی کنارہ اور عرب کے شمال مغرب میں ایسی جگہ آباد تھا جو شام کے متصل حجاز کا آخری حصّہ کہا جا سکتا ہے اور حجاز والوں کو شام، فلسطین بلکہ مصر تک جانے میں اس کے کھنڈر راہ میں پڑتے تھے

اور جو تبوک کے بالمقابل واقع تھا۔'' (معجم البلدان ۔۔یاقوت حموی' ج ۵' ص ۴۱۸ بحوالہ قصص القرآن از حفظ الرحمٰن سیوہاروی' ج اوّل' ص ۳۴۴)

''وہ مقام جہاں قومِ ثمود پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر گھر بناتی تھی (سورۃ الاعراف: ۷۴ ؛ سورۃ الشعراء: ۱۴۹ ؛ سورۃ الفجر: ۹) عرب کے شمال مغرب میں واقع ہے اور حِجر یا میدانِ صالح کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہاں پہلی صدی عیسوی میں نبطی حکمرانوں' جرنیلوں اور مرکزی حکومت کی دوسری با اختیار شخصیتوں نے کئی پہاڑوں کو کاٹ کر اپنے گھر بنائے تھے۔ وہاں آثاریاتی مطالعہ جات کا کام اوّل دَور میں اور آثاریاتی کھدائیاں ۱۹۸۸ء میں شروع ہوئیں (جن کی ابتدائی رپورٹیں ۱۹۸۸ء کے جریدے ''اَطلال'' میں موجود ہیں)۔ میدانِ صالح اور اَلعُلاء کے مقامات سے دوسری صدی عیسوی میں ملنے والے کتبوں سے یہاں رومی فوجی حکومت کے وجود کا ایک معمولی سا ثبوت ملتا ہے اگرچہ یہ علاقہ رُومی حکومت کی حدود سے باہر تھا۔''

''دوسری قوموں میں جو اپنے ہم عصر رسولوں کی مخالفت کی وجہ سے تباہ و برباد ہوئیں' ایک قومِ عاد ہے جو ہر بلند جگہ پر یادگاری تعمیرات اور مورچے بناتے تھے (سورۃ الشعراء: ۱۲۸' ۱۲۹) اور قرآنِ کریم کی رُو سے جن کی بدقسمتی کی داستان اُن کے کھنڈرات سے واضح ہے (سورۃ العنکبوت: ۳۸ ؛ سورۃ الاحقاف: ۲۵)۔ وہ کھنڈرات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے جنہیں اَصحابُ الرَّس (سورۃ الفرقان: ۳۸) کی طرف منسوب کیا جا سکے۔''

''جنوب مغربی عرب میں سَبائی حکومت کے دارالخلافہ مارب اور اس کے آب رسانی کے ڈیم Dam (سورہ سبا: ۱۵' ۱۶) پر خاصا تحقیقی کام ہوا ہے۔ محققین میں جرمن فضلاء' بی ڈُو اَور ڈبلیو ڈوم کے نام بالخصوص نمایاں ہیں۔ جنوب مغربی عرب میں مارب کا ڈیم دیگر تمام متعدد پشتوں کی نسبت زیادہ بڑا اور تکنیکی مہارت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ دوسرے پشتوں کی طرح اِس کا کام زیادہ عرصے تک پانی کو ذخیرہ کرنا نہیں تھا بلکہ شِشماہی سیلابوں کی رفتار کو کم کرنا اور سطحِ آب کو بلند کرنا تھا تاکہ پانی کے رُخ کو دو آب روکوں کے ذریعے موڑتے ہوئے ایک وسیع رقبے کو مربوط نہری نظام کے ذریعے کاشت کے لئے پانی فراہم ہو سکے۔ شمالی صحرا میں تقریباً گیارہ کلومیٹر کے رقبہ میں ۹۶۰۰' ہیکٹر (= ۱۹۲۰۰ ایکڑ تقریباً) اور جنوبی صحرا میں اِکیس کلومیٹر کا رقبہ اِس ڈیم سے سیراب ہوتا تھا۔ پشتے کو کثیر الوقوع دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی تھی اور ڈیم کی ٹوٹ پھوٹ کے خطرے کے پیشِ نظر کئی بار کی مرمتیں پہلی صدی عیسوی میں حاصل شدہ کتبوں پر اندراج سے اور آخری مرتبہ ۵۵۳ عیسوی میں ملی ہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' صفحات ۱۵۰' ۱۵۱)

''ستمبر ۱۹۵۱ء کی ایک اخباری رپورٹ کے مطابق وینڈل فلپس نے جو جنوبی عرب میں ایک امریکی آثاریاتی مہم کا لیڈر تھا' لندن کے ایک اجتماع میں کہا تھا کہ زمانۂ قدیم کے انتہائی وسیع آبپاشی کے نظام مارب ڈیم کے کچھ نشانات اب تک دیکھنے میں آتے ہیں۔ فلپس کا یہ بھی بیان ہے کہ مملکتِ شیبا کی دولت اور حُسن و جمال کی مختلف داستانیں غالباً صحیح ہیں اور مملکتِ شیبا کی خوشحالی اس کے آبپاشی کے نظام کے مرہونِ منت تھی۔ جنوبی عرب جسے ڈیم کی موجودگی کے وقت جنت نظیر کہا جاتا تھا' اپنی موجودہ تنزّلی کی حالت میں ڈیم کی تباہی کے بعد ہوا۔'' (تفسیر ماجدی انگریزی' جلد دوم' صفحہ ۴۲۲A۔ نوٹ: ۱۹۶)

''قرآنِ حکیم میں اصحابِ کہف کے غار (سورۃ الکہف: ۹ تا ۲۶) کے وقوع کے متعلق کئی آراء ہیں۔ ان میں سے ایک ممکنہ جگہ اُردن میں عمان کے بالکل جنوب کی سمت الرّقیم کا مقام ہے۔'' (انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' صفحہ ۱۵۱)

''صدیوں پر محیط بار بار کے تعمیراتی اور توسیعی کاموں کے باعث نہ تو مکّہ مکرّمہ میں اور نہ ہی مدینہ منوّرہ میں اصل آثاریاتی نشان ملے ہیں سوائے کعبہ کے۔'' (ایضاً ص ۱۵۳' ۱۵۴)

''جنوبی عرب میں القلیس نامی مشہور گرجا گھر کے چند ستون باقی ہیں جسے ابرہہ نے چھٹی صدی کے وسط میں مکّہ میں کعبہ کے تقدّس پر غلبہ پانے کے لئے تعمیر کیا تھا۔'' (ایضاً' ص ۱۵۵)

(۷) تیراندازی اور شکاریات (Archery & Hunting)

مسلمان کی زندگی میں تیراندازی کی اہمیت مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ سے واضح ہوتی ہے :۔
''۱۔ اپنے بچوں کو تیرنے اور تیراندازی کی تربیت دو اور اپنی بچیوں کو کاتنا سکھاؤ۔''

تیراندازی مشرک عربوں کا ایک عام مشغلہ اور اُن کی روزمرّہ زندگی کا ایک جزوِ لاینفک تھا اور اُن کے معاشرے کا ہر جوان و پیر ماہر تیرانداز ہوتا تھا۔ لیکن اُن کی جوانمردی اور بہادری جھوٹی عزت' قبائلی عصبیّت اور ایک دوسرے پر بالادستی حاصل کرنے میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ کوئی بھی قبیلہ یا کنبہ دوسرے کی فضیلت اور بالادستی قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ مقولہ کہ ''جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے' وہاں تمہاری آزادی ختم ہو جاتی

ہے'' سے وہ نا آشنا تھے۔ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس' خود پسندی اور خود بینی اُن کے طے شدہ لائحہ عمل تھے اور وہ اخلاقی قدروں اور احترامِ آدمیت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ مشرکینِ عرب کی تاریخی یادداشتوں میں ہمیں کچھ جنگوں کے نام ملتے ہیں جو بیسیوں سالوں تک اُسی قبائلی عصبیت کے تحت لڑی گئیں مثلاً جنگِ بُعاث' بسُوس اور جنگ داحس وغبراء وغیرہ۔ اِن تمام جنگوں میں اُن کے نیزوں کی اَنیاں بڑی تیز دھار تھیں اور اُن کی نوکیں ذاتی یا قبائلی انتقام اور باہمی برتری کی بے چین دیوانگی کے مہلک زہر میں بجھی ہوتی تھیں۔ الحمد للہ کہ اُس نے اُس وحشی' خونخوار' سنگدل اور مغرور معاشرے میں اپنا آخری رسول بھیجا جس نے اپنے مثالی کردار' شریفانہ اور مشفقانہ طریقہ تبلیغ کے ذریعے اُن کی منفی شجاعت کو انسانیت کے مثبت اور تعمیری رُخ کی طرف موڑ دیا اور انہیں اس بات کی تعلیم دی کہ اِس خداداد نعمتِ شجاعت کا رُخ اللہ اور اُس کے رسول کے دشمنوں سے لڑنے کی طرف مڑنا چاہئے۔ یہاں صرف اِسی مقام پر ہم جنگ اور جہاد کے مابین واضح فرق پاتے ہیں۔ جہاد کا مطلب ہر وہ کوشش ہے جو اللہ کی راہ میں کی جائے جبکہ جنگ صرف قوت ومنصب کی شیطانی خواہش کی تسکین اور خالصتاً دنیاوی مقاصد کے لئے ہوتی ہے۔ قرآنِ حکیم واضح طور پر اُن لوگوں کا انعام بیان کرتا ہے جو اللہ کی خاطر لڑتے ہیں۔ مثلاً فرمایا:۔

(۱) وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًاO دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاO (النساء: ۹۵' ۹۶)

''اور اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں پر اجرِ عظیم کے لحاظ سے برتری دے رکھی ہے یعنی اللہ کی طرف سے (بہت سے) درجے اور بخشش اور رحمت' اور اللہ ہے ہی بڑا بخشنے والا' مہربان۔''

(۲) وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَO (الْعَنْكَبُوت: ۶۹)

''اور جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں' ہم اُنہیں اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے اور بے شک اللہ تعالیٰ حسنِ عمل کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

جَاهَدُوْا فِيْنَا کے معنی' قدرت' صنعت' حکمتِ الٰہی کے دلائل پر غور وفکر کے بھی کئے گئے ہیں۔

سُورۃُ الانفال میں قرآن حکیم مسلمانوں کو یوں حکم دیتا ہے:

وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ آخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال: ۶۰)

''اور اُن (دشمنوں سے مقابلہ) کے لئے جس قدر بھی تم سے ہو سکے قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان تیار رکھو جس کے ذریعہ سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں پر اپنا رعب رکھتے ہو اور اُن کے علاوہ دوسروں پر بھی کہ تم اُنہیں نہیں جانتے' اللہ اُنہیں جانتا ہے۔''

قُــوّة کا لفظ عام ہے: عددی قوّت، سامانِ جنگ کی قوّت، آلاتِ حرب کی قوّت سب کچھ اس میں آ گیا یہاں تک کہ بڑھے ہوئے ناخن بھی۔ صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے آیت کے تحت میں بندوق کا ذکر تصریح کے ساتھ کیا ہے اور اگر وہ آج حیات ہوتے تو مشین گن، طیّارہ، ٹینک، ایٹم بم اور راڈار وغیرہ سب کے نام لکھ جاتے۔ سوار فوج کی اہمیّت رِبَــاطِ الْــخَیْــل کے حکم سے ظاہر ہے۔ آیت کے آخر میں اشارۃً بتا دیا کہ اُن کافروں کے علاوہ جن سے تمہارا سابقہ رہا کرتا ہے، کچھ اور بھی قومیں ہیں جو ابھی تمہارے علم میں نہیں مگر اللہ کے علم میں تو ہے کہ کبھی اُن سے بھی تمہاری مڈبھیڑ ہو گی۔ اس میں ایران کے مجوسی اور روم کی مسیحی قومیں تو آ ہی گئیں جن سے آگے چل کر حضرات صحابہ کو معرکہ آرائی کرنا پڑی۔ باقی قیامت تک کی ساری مخالف قومیں آ سکتی ہیں۔

مندرجہ ذیل حدیثِ مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ کا ایک ہی جملہ کو بار بار دُہرانا ایک مسلمان کی زندگی میں تیراندازی کی اہمیّت کو اجاگر کرتا ہے:

عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ وَهُوَ عَلَي الْمِنْبَرِ يَقُوْلُ: وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّااسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ أَلَاإِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ أَلَاإِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ أَلَاإِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمْيُ (صحیح مسلم ؛ مشکوٰۃ المصابیح باب إعدادُ آلَةِ الْجِهَاد)

"عقبہ بن عامر بیان کرتے ہیں کہ مَیں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا: وَأَعِدُّوْا لَهُمْ مَّااسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ۔ خبردار! قوّت سے مراد تیراندازی ہے، خبردار! قوّت سے مراد تیراندازی ہے، خبردار! قوّت سے مراد تیراندازی ہے۔"

لغوی لحاظ سے عربی لفظ اَلــرَّمْــیُ کا لفظی ترجمہ پھینکنے کا ہے۔ جنگِ بدر کے بالکل آغاز میں کفار کی طرف نبی اکرم ﷺ کا مٹھی بھر کنکریاں پھینکنے کا حوالہ دیتے ہوئے رب تعالیٰ فرماتا ہے:

مَا رَمَيْتَ إِذْرَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ۱۷)

"(محبوب!) جب آپ نے (کنکریاں) پھینکی تھیں، وہ آپ نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ وہ تو اللہ نے پھینکی تھیں۔"

خصوصی اصطلاح میں اَلــرَّمْــیُ کا معنی تیر پھینکنا ہے۔ موجودہ جنگی اصطلاح میں اس پھینکنے میں بم گرانا، راکٹ داغنا، گولیاں چلانا، میزائل چھوڑنا اور اُن سب جدید تکنیکی ہتھیاروں کا استعمال شامل ہے جن سے دشمن کی تباہی ہو سکتی ہے۔

اسلام میں تیراندازی نہ صرف پسندیدہ ہے بلکہ صحت کے لئے ایک موافق و مؤثر ذریعہ ہے کیونکہ یہ

اعصاب اور نگاہ کو تقویت دیتا ہے۔ تیراندازی کو اگر اسلام کی خدمت اور اللہ کے دشمنوں سے لڑنے کے لئے سیکھا جائے تو یہ اللہ کی رضا کا موجب بھی ہے اور اُس کی عنایات و انعامات کا سبب بھی۔ ایک مسلمان کی زندگی میں تیر اندازی کی اہمیت ذیل کے فرامینِ نبوی سے ظاہر ہوتی ہے:۔

(۱) مَنْ عَلِمَ الرَّمْیَ ثُمَّ تَرَکَہ، فَلَیْسَ مِنَّا۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح)

(۲) مَنْ عَلِمَ الرَّمْیَ ثُمَّ تَرَکَہ، فَقَدْ عَصٰی (صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح:۳۸۶۳)

(۳) سَتُفْتَحُ عَلَیْکُمُ الرُّوْمُ وَیَکْفِیْکُمُ اللّٰہُ فَلَا یَعْجِزُ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّلْھُوَ بِاَسْھُمِہ (ایضاً)

(۴) اِنَّ اللّٰہَ یُدْخِلُ بِالسَّھْمِ الْوَاحِدِ ثَلَاثَۃَ نَفَرٍ فِی الْجَنَّۃِ : صَانِعَہ، یَحْتَسِبُ فِیْ صَنْعَتِہِ الْخَیْرَ وَالرَّامِیَ بِہ وَمُنَبِّلَہ، فَارْمُوْا وَ ارْکَبُوْا وَ اَنْ تَرْمُوْا اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَنْ تَرْکَبُوْا کُلُّ شَیْءٍ یَلْھُوْا بِہِ الرَّجُلُ بَاطِلٌ" اِلَّا رَمْیَۃَ بِقَوْسِہ وَ تَادِیْبَہ، فَرَسَہ، وَ مُلَاعَبَتَہ، اِمْرَأَتَہ، فَاِنَّھُنَّ مِنَ الْحَقِّ (ترمذی و ابن ماجہ)

(۵) مَنْ تَرَکَ الرَّمْیَ بَعْدَمَا عَلِمَہ، رَغْبَۃً عَنْہُ فَاِنَّھَا نِعْمَۃٌ "تَرَکَھَا اَوْقَالَ کَفَرَھَا (مشکوٰۃ المصابیح، باب: اِعدادُ آلۃِ الجھاد)

(۶) مَنْ بَلَغَ بِسَھْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَلَہ، دَرَجَۃٌ" فِی الْجَنَّۃِ وَ مَنْ رَمٰی بِسَھْمٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَھُوَلَہ، عَدْلُ مُحَرَّرٍ (ایضاً)

(۷) کُلُّ لَھْوِالْمُسْلِمِ حَرَامٌ" اِلَّا ثَلَاثَۃٌ" : مُلَاعَبَتَہ، اَھْلَہ، وَتَادِیْبَہ، فَرَسَہ، وَ مُنَاضَلَتَہ، بِقَوْسِہ (دُرُّالمُختار ج۶، ص ۳۹۵)

ترجمہ: (۱) جو شخص فنِ تیراندازی سیکھتا ہے پھر اُسے چھوڑ دیتا ہے تو اُس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲) جس کسی نے فنِ تیراندازی سیکھا پھر اُسے چھوڑ دیا تو اُس نے گناہ کا ارتکاب کیا۔

(۳) ملکِ روم عنقریب تمہارے لئے فتح ہوگا اور اللہ تبارک وتعالیٰ (دشمن کے مقابلے میں) تمہارے لئے کافی ہوگا (لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ) تم تیراندازی کی مشق سے غافل ہو جاؤ۔

(۴) بے شک اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین قسم کے لوگوں کو جنت میں داخل کرے گا : ایک وہ جو تیر بناتا ہے اگر اُس کی نیت اللہ سے اجر پانے کی ہو، دوسرا وہ جو تیر پھینکتا ہے اور تیسرا وہ جو تیر کو دوسرے آدمی کو اُسے پھینکنے کے لئے دیتا ہے۔ تو اے لوگو! تیراندازی اور گھوڑسواری سیکھو لیکن تمہارا تیراندازی سیکھنا مجھے گھوڑسواری سے زیادہ محبوب ہے۔ آدمی جو بھی تفریح کا سامان کرتا ہے، سب بے کار ہے سوائے تیراندازی، گھوڑے کو سدھانے اور اپنی بیوی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے کہ یہ تینوں جائز اور حق ہیں۔

(۵) ''جو کوئی تیراندازی کے فن کو سیکھنے کے بعد اُسے بغیر کسی عذر کے چھوڑ دیتا ہے' وہ دراصل نعمتِ الٰہی کو چھوڑتا ہے یا یہ کہ آپ نے یہ فرمایا کہ وہ نعمتِ الٰہی کی بے قدری کرتا ہے۔''

(۶) ''جو کوئی اللہ کے راستے میں ایک تیر چلاتا ہے' اُس کا جنت میں ایک مقام ہے' اور جو کوئی اللہ کے راستے میں تیر چلاتا ہے چاہے وہ تیر نشانے پر لگے یا نہ لگے' اُس کا یہ عمل ایک غلام کو آزاد کرنے کے برابر ہے۔''

(۷) ''مسلمان کا ہر بیکار عمل حرام ہے سوائے تین اعمال کے: اپنی بیوی سے کھیل کود کرنا' اپنے گھوڑے کو سدھانا اور تیراندازی۔''

درجِ بالا احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا آسان ہے کہ تیراندازی کی مشق یا اِس جیسی نشانہ بازی کی کوئی بھی مشق اسلام میں پسندیدہ ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کو نبیِ اکرم ﷺ کے حکم کی پیروی میں اِسے سیکھنا چاہئے اور اس کی مشق کو جاری رکھنا چاہئے۔ لیکن ایک چیز کا خیال ضرور رہے کہ تیراندازی/نشانہ بازی کی مشق با مقصد ہونی چاہئے تاکہ دشمنانِ اسلام کے خلاف جہاد میں فائدہ ہو۔ غلیل میں سنگریزے رکھ کر نشانہ بازی جیسے عمل کی ممانعت آئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل احادیث ظاہر کرتی ہیں:۔

(۱) عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مُغَفَّلٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّہ' رَآی رَجُلاً یَخْذِفُ فَقَالَ: لَا تَخْذِفْ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَھٰی عَنِ الْخَذْفِ وَ قَالَ: إِنَّہ' لَایُصَادُ بِہ صَیْدٌ" وَلَا یُنْکَأُ بِہ عَدُوٌّ" وَ لٰکِنَّھَا قَدْ تُکْسِرُ السِّنَّ وَ تَفْقَأُ الْعَیْنَ (بخاری و مسلم' مشکوٰۃ المصابیح: ج ۳' ص ۱۲۷ اُردو باب: مالایُضمَنُ مِنَ الجنایات)

(۲) عَنْ حَکِیْمِ بْنِ عِبَادٍ قَالَ: أَوَّلُ مُنْکَرٍ ظَھَرَ بِالْمَدِیْنَۃِ حِیْنَ فَاضَتِ الدُّنْیَا وَ انْتَھٰی سَمَنُ النَّاسِ طَیَرَانُ الْحَمَامِ وَالرَّمْیُ فِی الْجَلَاھِقِ فَاسْتَعْمَلَ عَلَیْھَا عُثْمَانُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ رَجُلاً مِّنْ بَنِیْ لَیْثٍ یَقُصُّھَا وَیُکَسِّرُ الْجَلَاھِقَ (کنز العمال: کتاب اللّھو وَاللّعب رقم: ۴۰۶۷۵)

ترجمہ: (۱) ''حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی کو غلیل میں پتھریاں مارتے ہوئے دیکھا تو آپ نے اُسے روکا اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے اِس عمل سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ ایسے ذرائع سے نہ تو شکار پکڑا جا سکتا ہے نہ ہی دشمنِ دین کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے ہاں البتہ اِس کا یہ نقصان ہو سکتا ہے کہ اس سے تم کسی کا دانت توڑ دو یا کسی کی آنکھ پھوڑ ڈالو۔''

(۲) حکیم بن عباد فرماتے ہیں کہ جب دولت کی ریل پیل ہوگئی اور فربہی لوگوں پر غالب آگئی تو سب سے پہلی بُرائی جو مدینہ منوّرہ میں ظاہر ہوئی' وہ کبوتر اُڑانا اور غلیل کا مشغلہ تھا۔ اپنے زمانۂ خلافت

میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے قبیلہ بنی لیث کے ایک آدمی کو کبوتروں کے پر کاٹنے اور غلیلوں کے توڑنے پر مقرر فرمایا تھا۔''

برّی و بحری شکاریات سے متعلق ہمیں کچھ حوالہ جات (صَیْد) صرف سورۃُ المائدۃ میں ملتے ہیں۔

جیسا کہ آنے والے صفحات میں حیاتیات (Biology) کے ذیل میں حیوانیات (Zoology) کے عنوان کے تحت بیان ہوگا کہ حیوانوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کا مقصد بنی نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانا ہے (سورۃ الانعام :۱۴۲)۔ لہٰذا اِس کلیدی اشارے کے تحت جانوروں کو ذبح کرنا اور اُن کا گوشت کھانا یا اُن کی کھال وغیرہ کو استعمال کرنا جائز ہے بشرطیکہ یہ جانور اور اُن سے حاصل شدہ چیزیں پاک اور حلال ہوں۔ دراصل اللہ کی نظر میں ان کا شمار طیّبات میں ہے (سورۃ البقرۃ:۱۶۸ ؛سورۃ المؤمنون:۵۱)

''فقہائے اسلام نے شکاریات کے مضمون کو ہمیشہ علیحدہ عنوان کے تحت لیا ہے اِس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہ اِس ضمن میں حلال وحرام' فرض اور مستحب کیا ہے کیونکہ بہت سے جانور اور پرندے ایسے ہیں جن کا گوشت صحت بخش' جانفزا ہوتا ہے لیکن اُنہیں نہ تو سدھایا جاتا ہے اور نہ ہی وہ انسان کے کنٹرول میں ہیں۔''

''ایسے شکار کے کھانے کو حلال بنانے کے لئے اسلام یہ نہیں کہتا کہ ایسی مخلوقات کے گلے پر چھری پھیری جائے یا اُن کے گلے کے خلائی (اندرونی) حصے کو کسی نوک دار آلے سے چیرا جائے جیسا کہ سدھائے ہوئے اور پالتو جانوروں کو ذبح کرتے وقت کیا جاتا ہے۔ شکار کے حالات کے مطابق اِن اعمال کو کسی حد تک اور وہ بھی کمتر درجے میں کر لینا کافی ہے۔ لوگوں نے شکار کرتے ہوئے ہمیشہ اپنی جبلّتوں کی پیروی کی ہے اور اسلام قدرتی اور جبلّاتی باتوں کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ چند شرائط کا اضافہ کرتا ہے تاکہ شکار کو اپنے عمومی نظریاتی نظام کے مطابق بنا دے جیسا کہ وہ مسلمانوں کے تمام دوسرے معاملات کو اُس نظریاتی نظام کے تحت لاتا ہے۔ ان میں سے کچھ شرائط تو شکاری سے متعلق ہیں' کچھ شکار سے اور کچھ شکار کے آلے سے متعلق ہیں۔''

''اِن شرائط کا اطلاق قدرتی طور پر صرف برّی شکار پر ہوتا ہے۔ جہاں تک دریائی شکار کا تعلق ہے' اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی پابندی کے اس سب کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ (المائدۃ: ۹۶)

''تمہارے لئے دریائی شکار اور اُس کا کھانا جائز کیا گیا ہے' تمہارے اور مسافروں کے فائدہ کے لئے۔''

بَحر سے مراد صرف سمندر ہی نہیں بلکہ ہر قسم کے دریا، ندی، جھیل، تالاب وغیرہ غرض پانی کا ہر ذخیرہ اس کے تحت آ جاتا ہے۔ فقہاء نے دریائی جانور کی یہ تعریف کی ہے کہ یہ وہ جانور ہے جو پیدا ہی پانی میں ہوا اور رہتا بھی پانی میں ہو، اس لئے مرغابی، بط وغیرہ اس تعریف کی رُو سے دریائی جانور کے حکم سے خارج ہو گئے (ماجدی)۔ خشکی کا شکار وہ ہے جو خشکی میں پیدا ہوا ہو اور خشکی ہی میں رہتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے خشکی کے جانوروں کو قتل کرنے کی ممانعت کے عمومی حکم سے پانچ خبیث جانوروں کو مستثنیٰ فرما دیا ہے: کاٹنے والا کتا، بھیڑیا، چیل، کوا، سانپ (اور بچھو سانپ ہی میں شامل ہے)۔ کیونکہ یہ جانور ابتداءً حملہ کرتے ہیں اور ایذا پہنچاتے ہیں اور کوے سے مراد وہ ہے جو مردار کھاتا ہے۔ صرف خشکی کے جانور کو شکار کرنا مُحرِم پر حرام ہے خواہ اُس نے حج کا اِحرام باندھا ہو یا عمرے کا جبکہ دریائی اور سمندری جانور کا شکار مُحرِم کے لئے جائز ہے۔ (تبیان القرآن، جلد ۳، صفحہ ۳۱۶، ۳۱۸)

<u>شکار کی تعریف</u>: شکار وہ جانور ہے جس کا کوئی مالک نہ ہو، وہ پالتو جانور نہ ہو، انسانوں سے غیر مانوس ہو اور اُنہیں دیکھ کر بھاگنے والا، متنفر اور وحشی ہو۔ (ایضاً)

(الف) <u>شکاری سے متعلّق شرائط</u>: (۱) اسلامی تعلیمات کے مطابق شکاری محض مشغلے کے طور پر شکار نہ کرے اور جانور کی زندگی اُس کا گوشت کھانے یا اُس سے کوئی دیگر فائدہ اٹھانے کی نیت کے بغیر یونہی تلف نہ کرے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(i) ''اگر کسی شخص نے ایک چڑیا کو مشغلہ کے طور پر مارا تو وہ چڑیا روزِ قیامت چیخ کر پکارے گی: اے میرے رب! فلاں شخص نے مجھے بے مقصد مارا تھا اور مجھے کسی مفید مقصد کے لئے نہیں مارا تھا۔''
(نسائی، صحیح ابنِ حبّان)

(ii) ''جو کوئی ایک چڑیا یا اُس سے کسی بڑی چیز کو بغیر کسی جائز وجہ کے مارے، اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اُس سے جواب طلبی کرے گا۔ سامعین نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! جائز وجہ سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: یہ کہ اُس کا گوشت کھانے کے لئے اُسے مارے نہ کہ اُس کا سر علیحدہ کر کے اُسے پھینک دے۔'' (نسائی، الحاکم)

(۲) شکاری کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ شکار کے وقت حالتِ اِحرام میں نہ ہو خواہ وہ اِحرام حج کا ہو یا عمرے کا، کیونکہ وہ اُس وقت مکمل سکون اور متانت میں ہوتا ہے جس کا حلقۂ اثر اُس کے آس پاس کے جانوروں اور پرندوں تک بھی پہنچتا ہے۔ اگرچہ کوئی جانور بالکل اُس کے سامنے آ جاتا ہے اور وہ اُسے پکڑ سکتا ہے اور نیزے سے مار سکتا ہے، ایسا کرنے کی اُسے اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف اُسے آزمانے کے لئے اور اُسے ایمان کی پختگی اور صبر کی تربیت دینے کے لئے ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

ضروری ہے کہ معنی اور تاویل اصولِ تفسیر کے خلاف نہ ہوں جس کی نمایاں مثال ذیل میں دی گئی ہے:۔

قرآنی اصطلاح ''نفسِ واحدہ'' کی حیاتیاتی (Biological) تفسیر: قرآن مجید نے کچھ مقامات پر تخلیقِ انسانی کو یوں بیان کیا ہے:۔

(۱) اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ (اَلنِّساء : ۱)

''وہ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان (نفسِ واحدہ) سے پیدا کیا۔'' (۱ : ۴)

(۲) ھُوَالَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ جَعَلَ مِنْھَا زَوْجَھَا لِیَسْکُنَ اِلَیْھَا (الاعراف:۱۸۹)

''وہ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان (نفسِ واحدہ) سے پیدا کیا اور اس سے اُس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اُس (جوڑے) سے تسکین حاصل کرے۔'' (۱۸۹ : ۷)

ابنِ کثیر جیسے قدیم مفسّرین نے ''نفسِ واحدہ'' سے مراد ایک جان/ایک رُوح یعنی آدم علیہ السلام اور اُن کی بیوی ''حوّا'' لی ہے جو بالکل صحیح اور اُس زمانہ کے واقعاتی ماحولیات کی مطابقت سے درست تھا کیونکہ اُس زمانہ میں لوگوں کو اُن حیاتیاتی حقائق کا علم نہ تھا جو آج کے سائنسی روشنی کے اِس دَور میں بے نقاب ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ نفسِ واحدہ کی اور کوئی تاویل نہیں کر سکتے تھے۔

کثیرالجہتی تاویلات کی سکیم کے تحت نَفسِ واحِدہ کی سائنسی تاویل ''واحد خلیہ'' ہے۔ نَفسِ واحِدہ کی اِس حیاتیاتی تاویل کو ہمارے مذہبی علماء نے بڑے شدّ ومد سے ردّ کر دیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ''خلیہ واحد'' یعنی امیبا (Amoeba) یا یک خلوی (Unicellular) جاندار نَفسِ واحِدہ پر ہرگز صادق نہیں آسکتا اور مفسرین کے قول کے مطابق یہ یہاں صرف حضرت آدم علیہ السلام پر صادق آسکتا ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر عبدالکریم اس اصطلاح کی قدیم تاویل سے متفق نہیں ہیں اور اُنہوں نے نَفسِ واحِدہ کی نئی حیاتیاتی (Biological) تاویل پیش کی ہے جس کی اُنہوں نے یہ دلیل دی ہے کہ تمام انسانی خصائل ''جینز Genes'' کی بدولت ہیں مثلاً ایک مرد عورت کی طرف مائل ہوتا ہے جس کا حوالہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۹ میں اوپر گزر چکا ہے' تو یہ مخصوص جینز کی وجہ سے ہے جو اُس کے خلیوں میں موجود ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر نفسِ واحدہ کا متبادل ترجمہ ''واحدۃ الخلیہ'' تسلیم کر لیا جائے تو انسانی کلوننگ کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ (''قرآن کے جدید سائنسی انکشافات''۔ پروفیسر ڈاکٹر فضل کریم' ص۱۶۰)

پنجم یہ کہ قرآن مجید بڑے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ حیران کن سائنسی علوم کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں سے توقع کرتا ہے کہ وہ اپنی جستجو' تحقیق اور فکری صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے کائنات میں پوشیدہ رازہائے سربستہ کو بے نقاب کریں۔ قرآن مجید نے ترکیبِ کائنات (Cosmology)' علم الافلاک' جغرافیہ' حیاتیات' مطالعہ جنین (Embryology) اور طبعیات وغیرہ سے متعلق کچھ پیچیدہ سوالات کے جوابات نہیں دیئے

(۱) یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ" (المائدۃ : ۹۵)
''اے اہلِ ایمان! شکار کو مت مارو جبکہ تم حالتِ اِحرام میں ہو۔''

اور یا تم خود حالتِ اِحرام سے باہر ہو لیکن وہ شکار حدودِ حرم کے اندر ہو۔ یہ عام ممانعت خشکی اور تری کے اُن جانوروں کے حق میں نہیں جن کے قتل کا جواز اوپر بیان ہوا یعنی کاٹنے والا کتا' بھیڑیا' سانپ وغیرہ۔

شکاری جانور لاوارث اور بے یارومددگار رہوتا ہے۔ اُس نے کعبہ معظمہ کی پناہ لی کہ اُس کے حدودِ حرم میں آ گیا تو وہ (بروئے آیت ۹۷ سورہ آلِ عمران) امان پا گیا کہ اُس کا شکار کرنا حرام قرار دیا۔

(۲) وَحُرِّمَ عَلَیْکُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا (المائدۃ : ۹۶)
''اور جب تک تم حالتِ اِحرام میں ہو' خشکی کا شکار تم پر حرام کیا گیا۔''

نوٹ : (۱) مُحرِم بحالتِ اِحرام مکھی' مچھر' جوں' کھٹمل بھی نہیں مار سکتا کیونکہ یہ چیزیں موذی نہیں۔ موذی جانور وہ ہے جو اپنے نفع کے بغیر انسان کا نقصان کر دے۔ لہٰذا سانپ' بچھو' چوہا' چیل وغیرہ موذی ہیں کہ یہ بلاوجہ انسان کو نقصان پہنچاتے اور اُسے تکلیف دیتے ہیں مگر جوں' کھٹمل وغیرہ اپنا پیٹ بھرنے کے لئے انسان کو کاٹتے اور اُس کا خون چوستے ہیں۔ (۲) اِحرام کھل جانے کے بعد شکار کرنا تو جائز ہوگا مگر حالتِ اِحرام کا شکار کیا ہوا جانور حرام ہی رہے گا۔ (تفسیر نعیمی' ج ۷' ص ۸۰)

(ب) شکار سے متعلق شرائط : (۱) شکار ایسا جانور ہو جس کا ذبح کرنا انسان کے بس میں نہ ہو یعنی اُس جانور پر انسان کا کنٹرول نہ ہو۔ (۲) اگر کوئی شخص جانور پر تیر چلاتا ہے یا اُس کا شکاری کتا شکار کو اُس کے پاس لاتا ہے تو جب تک شکار میں زندگی کے آثار ہیں تو اُسے ذبح کر دیا جائے۔ ذبح کرنا بہتر ہے لیکن اگر شکار ذبح کئے بغیر مر جاتا ہے اور اس پر بسم اللہ اکبر پہلے ہی سے پڑھی ہوئی ہے تو وہ حلال ہے اور اُس کا گوشت کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ نبی مکرّم ﷺ نے فرمایا :
''جب تم اپنا شکاری کتا شکار پر چھوڑو تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو۔ اگر شکاری کتا شکار کو دبوچ لیتا ہے اور شکار میں زندگی کے آثار ہوتے ہوئے تم اُس کے پاس پہنچ جاتے ہو تو اُسے ذبح کر دو۔''

(ج) شکار کے آلے سے متعلق شرائط: شکار کے آلات دو قسم کے ہوتے ہیں:۔

(۱) تلواریں، تیر اور نیزے جن کا ذکر سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۴ میں رماحُکُم کے لفظ میں ہوا:
(۲) شکاری جانور جنہیں شکار کے لئے سدھایا جاتا ہے جیسے درندوں میں کتا، چیتا اور پرندوں میں باز اور عقاب (شاہین)۔ اللہ تعالیٰ سورۃ المائدۃ کی آیت ۴ میں فرماتا ہے:۔

قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللهُ

"فرما دیجئے کہ تم پر (کل) پاکیزہ جانور حلال ہیں اور تمہارے سدھائے ہوئے شکاری جانوروں کا شکار جو شکار پر چھوڑے جاتے ہیں، تم انہیں اُس طریقے پر سکھاتے ہو جو تمہیں اللہ نے سکھایا۔"

طیّب وہ پاک اور لذیذ غذا ہے جسے طبع سلیم پسند اور قبول کرے۔ آیت میں دو شرطیں بیان ہوئیں: پہلی یہ کہ وہ جانور سکھائے ہوئے سدھائے ہوئے ہوں یعنی اگر وہ سدھائے ہوئے نہ ہوں تو اُن کا کیا ہوا شکار حلال نہ ہوگا۔ سدھائے ہوئے جانور کا فعل خود شکاری کا فعل سمجھا جائے گا۔ دوسری شرط یہ کہ تمہارے چھوڑے ہوئے وہ جانور جھپٹیں، یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ کر لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔ اَلْجَوارِح جمع ہے جارحۃ کی۔ اُس کا یہ نام اس لئے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے (راغب اصفہانی)۔ مُکَلِّب کے ایک معنیٰ تو ہیں کُتّے کو تعلیم دینے والا اور دوسرے معنیٰ ہیں شکار پر جھپٹنے والا اور دونوں معانی صحیح ہیں۔ مُکَلِّبین کے لفظ سے یہ دھوکا نہ ہو کہ یہ تعلیم و تربیت صرف کُتّوں کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ بلا اختلاف شکاری پرندے بھی اِسی حکم میں داخل ہیں، کیونکہ ہر شکاری جانور کَلْب ہے۔ فقہاء نے تعلیم (ٹریننگ) کا معیار کُتّے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سکھایا ہوا کُتا شکار کو پکڑ کر خود نہ کھا جائے اور باز کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سدھائے ہوئے باز کو جب آواز دی جائے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ تو اگر کُتا اُس شکار کو خود کھانے لگے یا باز شکاری کے بلانے سے واپس نہ آئے تو یہی سمجھا جائے گا کہ جانور نے شکار مالک کے لئے نہیں، اپنے لئے پکڑا ہے اور اسی وجہ سے وہ حرام ہوگا (تفسیر ماجدی اردو، ص ۲۳۷)۔

<u>آیت سے ماخوذ چند باریک نکات</u> :(۱) علم اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ دیکھئے معلّم کُتّے کا مارا ہوا شکار حلال ہے، غیر معلّم کُتّے کا مارا ہوا شکار حرام ہے تو یقیناً عالم آدمی غیر عالم سے افضل ہے۔ (۲) کامل کی صحبت ناقص کو کامل کر دیتی ہے۔ آوارہ کُتا انسانِ معلّم کی صحبت میں رہ کر اور اُس سے فیض لے کر کلبِ معلّم یعنی شکاری کُتا بن جاتا ہے کہ اُس کا مارا ہوا شکار حلال ہو جاتا ہے۔ غیر صحبت یافتہ غیر تعلیم یافتہ آوارہ کتے کو سارا قرآن پڑھ کر شکار پر چھوڑ دیجئے، اُس کا مارا ہوا شکار حرام ہوگا۔ معلوم ہوا کہ صحبت و فیضان ایک نعمتِ بے بدل ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے صحبت یافتہ ہُدہُد نے پورے ملکِ یمن، وہاں کی ملکہ بلقیس اور اُس کی رعایا کو ایمان بخش دیا۔ جب سلیمان علیہ السلام کے صحبت یافتہ ہُدہُد کا یہ فیض ہے تو جنابِ ختمی مرتبت حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحبت یافتگان صحابہ کرام کے فیض کا کیا کہنا!!! (علیہم السلام اَلْفَ اَلْفَ مَرَّۃ) (۳) شکار کے لئے کُتّے پالنے

اور اسے سدھانے میں کوئی حرج نہیں جیسا کہ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ سے معلوم ہوا۔(۴) غیر مسلم کا سکھایا ہوا کتا معلّم نہیں، مسلمان خود سکھائے۔ یہ نکتہ بھی تُعَلِّمُوْنَهُنَّ سے معلوم ہوا جس میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔(۵) شکاری کتے کی خرید و فروخت جائز ہے کیونکہ جب اُس کتے سے شکار کھیلنا جائز قرار دیا تو لازمی طور پر یہ کارآمد مال مانا گیا۔(۶) شکاری جانور کا شکار کو زخمی کرنا ضروری ہے۔ اگر بغیر زخم کئے یوں ہی دبوچ کر مار دیا تو شکار حلال نہ ہوگا۔ یہ نکتہ جوارح کے لفظ سے معلوم ہوا جس کے معنیٰ پہلے بیان ہو چکے۔(تفسیر نعیمی، جلد ۶، صفحہ ۲۰۳)

<u>ہتھیار سے شکار کھیلنا</u>: اگر شکار کسی ہتھیار کے ذریعے کرنا ہو تو اُس کے لئے دو شرطیں ہیں: اوّل یہ کہ وہ ہتھیار شکار کے جسم میں زخم کرتا ہوا اُسے چیر دے۔ اس کے بغیر اگر شکار کی موت واقع ہوگئی تو شکار حلال نہ ہوگا۔ حاتم طائی کے بیٹے جناب عدی رضی اللہ عنہ نے رسالتمآب ﷺ سے یہی سوال کیا تھا تو آپ نے جواب میں فرمایا: "اگر تم ہتھیار شکار پر چلاؤ اور وہ شکار کو زخمی کر کے اُسے مار دے تو اُسے کھاؤ ورنہ نہیں" (بخاری، مسلم)

یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ جو چیز شکار کو حلال کرتی ہے وہ جانور کا زخمی ہونا ہے اگرچہ وہ ہتھیار جس سے وہ زخمی ہوا، کُند ہی کیوں نہ ہو۔ اِسی طرح رائفل، پستول یا اسی قسم کے آلے سے مارا ہوا شکار بھی حلال ہوگا کیونکہ تیر، نیزے یا تلوار کی نسبت رائفل یا پستول کی گولی شکار کے جسم کو زیادہ گہرا زخمی کرے گی۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کے مطابق بندوقہ سے مارا ہوا شکار اُس جانور کی طرح ہے جسے گھونسے سے مارا گیا ہو۔ یہ بات خیال میں رہے کہ بندوقہ سے یہاں مراد مٹی کا غلولہ ہے نہ کہ موجودہ بندوق یا پستول کی گولی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے شکاری جانور کو پتھروں سے مارنے سے منع فرمایا ہے جس (ممانعت) کا ذکر صفحہ ۲۶۸ میں بیان شدہ حدیث نمبر ایک میں ہو چکا ہے۔

ہتھیار کے ذریعے شکار کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ ہتھیار پھینکنے یا اس سے ضرب لگانے کے وقت <u>اللہ کا نام ضرور پڑھ لیا جائے جس کا حکم سورۃ المائدۃ کی آیت ۴ میں وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ (اور اُس پر اللہ کا</u>

<u>نوٹ ضروری</u>: حدیث پاک میں آیا کہ جس گھر میں جاندار کی تصویر یا کتا یا جنبی انسان ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے تو جو چیز رحمت کے فرشتوں کی آڑ بنے وہ جائز کیونکر ہو سکتی ہے لہٰذا اعتراض وارد ہوا کہ کتا پالنا حرام ہے۔ جواب اِس اعتراض کا یہ ہے کہ حدیث مذکورہ بالکل صحیح ہے لیکن مخصوص البعض ہے اور حدیث میں جاندار کی ایسی تصویر مراد ہے جو بلا ضرورت ہو، شوقیہ اور خود نمائی کی نیت سے ہو۔ آخر روپیہ پیسہ اور کرنسی نوٹوں پر بھی تو تصویر ہوتی ہے اور وہ ضرورتاً رکھی جاتی ہے۔ اسی طرح وہ کتا جو بلا ضرورت اور شوقیہ رکھا یا پالا جائے، ممنوع ہے۔ شکار یا گھربار یا جانوروں یا کھیتی کی حفاظت کے لئے اگر رکھا جائے تو جائز ہے اور اس سے رحمت کے فرشتے نہیں رکتے۔ یونہی بلا وجہ جنبی رہنا حرام ہے۔ اگر رات میں جنبی ہوا، وضو کر کے سو رہا اور نمازِ فجر سے پہلے غسل کر لیا تو اس جنبی سے رحمت کے فرشتے نہیں رکیں گے۔ یہ تفصیل دوسری حدیث پاک میں موجود ہے۔

نام لے لیا کرو) کے الفاظ میں ہوا اور جس کی ہدایت جنابِ عدی بن حاتم کو رسالتمآب ﷺ نے کی تھی۔ یہ وہ عدی ہیں جن کی شکاریات کے بارے میں روایت کردہ احادیث ہی اِس موضوع کا ماخذ ہیں (مذکورہ ہدایات کا اِطلاق بندوق سے شکار کرنے پر بھی ہوتا ہے)[''اَلْحَلال والْحَرام فی الاسلام''۔ یوسف القرضاوی (انگریزی ترجمہ) صفحات ۵۵ تا ۶۷]

شکاری کُتوں وغیرہ کے ذریعے شکار کرنا : اگر شکار کُتے یا باز وغیرہ کے ذریعے کرنا ہو تو اِن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے: (۱) شکاری جانور مسلمان کا ہو اور سدھایا ہوا ہو۔ (۲) اُس نے شکار کو زخم لگا کر مارا ہو۔ (۳) شکاری جانور بسم اللہ اَللہُ اَکبَر کہہ کر چھوڑا گیا ہو۔ (۴) اگر شکاری کے پاس شکار زندہ پہنچا ہو تو اُسے بسم اللہ اَللہُ اَکبَر کہہ کر ذبح کر دیا جائے۔ اگر اِن شرطوں میں سے کوئی بھی شرط نہ پائی گئی تو حلال نہ ہوگا۔ (ضیاء القرآن ۔۔۔ جسٹس کرم شاہ الازہری' ج ۱' ص ۴۴۲)

سدھائے جانے کا مطلب یہ ہے کہ شکاری جانور اپنے مالک کے کنٹرول میں ہو تا کہ مالک جب بھی اُسے بلائے تو بھاگتا ہوا آئے' جب وہ اُسے شکار کی طرف بھیجے تو شکار کرے اور جب وہ اُسے روکے تو رُک جائے۔

'' فقہاء کہتے ہیں کہ وہ شکار جس میں سے شکاری جانور نے کچھ کھا لیا ہو' حلال نہیں ہے۔ اِس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ سدھائے ہوئے جانور کو خوب تربیت یافتہ اور ہمیشہ اپنے مالک کے کنٹرول میں ہونا چاہئے اور دوسری وجہ انسانی وقار و حُرمت کو برقرار رکھنا ہے کہ انسان کسی جانور کے کھائے ہوئے کو نہیں کھایا کرتا۔ اِس کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جو خوب تربیت یافتہ کُتا اپنے مالک کے لئے شکار پکڑتا ہے' اُس کی مثال اُس بے جان ہتھیار کی سی ہے جو مالک کے ہاتھ میں ہوتا ہے' جیسے تیر۔

شکاری کُتے کو شکار کے لئے بھیجنے پر اللہ کا نام لینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے تیر چلاتے ہوئے یا نیزہ پھینکتے ہوئے یا تلوار سے ضرب لگاتے ہوئے اللہ کا نام لینا۔

اِس شرط کی واجب التعمیل قدرتی خصوصیت اِس حقیقت سے بھی ثابت ہے کہ اگر شکاری کُتے کے علاوہ کوئی اور کُتا شکار پر موجود ہو تو اُس کا کھانا حلال نہ ہوگا۔ جنابِ عدی رضی اللہ عنہ نے آنجناب ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ اگر میں اپنے کُتے کو شکار کے لئے بھیجتا ہوں لیکن شکار پر کسی اور کُتے کو پاتا ہوں اور مجھے معلوم نہیں کہ آیا میرے کُتے نے شکار کو پکڑا یا اُس کُتے نے؟ (تو اِس صورت میں کیا حکم ہے؟) اِس کے جواب میں آپ نے فرمایا:

''اُسے مت کھاؤ کیونکہ شکار کو بھیجتے ہوئے اللہ کا نام تم نے اپنے کتے پر لیا' دوسرے کتے پر تو نہیں لیا تھا۔''

تاہم اگر کوئی شکاری تیر یا بندوق چلاتے ہوئے یا شکاری جانور کو شکار کے لئے بھیجنے کے وقت اللہ کا نام لینا بھول جاتا ہے (اگر اُس نے دانستہ طور پر اللہ کا نام نہیں لیا تو شکار کا کھانا بالاتفاق حرام ہوگا) تو کھاتے وقت وہ اللہ کا نام لے لے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بروئے حدیث' نبی علیہ السلام کی اُمّت سے غیر دانستہ خطا اور بھول چوک کو معاف کر رکھا ہے۔ جانور کو ذبح کرتے وقت بھی اگر وہ اللہ کا نام لینا بھول جاتا ہے تو اُس کا بھی یہی حکم ہے۔ (الحلال والحرام فی الاسلام (انگریزی ترجمہ)۔۔۔ یوسف القرضاوی' ص ص ۶۷'۶۸)

<u>جب شکار مُردہ حالت میں پایا جائے</u> : ہوسکتا ہے کہ اگرچہ شکار پر شکاری جانور یا شکاری پرندے کا حملہ ہوا ہو لیکن شکار بچ کر نکل گیا ہو اور شکاری نے اُسے بعد میں کسی دن مُردہ پایا ہو۔ ایسی صورت میں اُس کا کھانا مندرجہ ذیل شرائط کے تحت جائز ہے:۔

(۱) وہ پانی میں نہ پایا گیا ہو۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے:

''اگر تم تیر چلاؤ اور وہ تیر کسی (حلال) جانور کو مار دیتا ہے' تم اُسے کھا سکتے ہو۔ لیکن اگر وہ پانی میں پایا جائے اور تمہیں معلوم نہیں کہ اُس کی موت ڈوبنے سے ہوئی یا تمہارے تیر سے' تو اُسے مت کھاؤ۔'' (بخاری' مسلم)

(۲) تمہارے تیر سے لگے ہوئے زخم کے علاوہ اُس کے جسم پر کوئی اور زخم نہ ہو۔ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے نبی ﷺ سے پوچھا تھا کہ اگر میں تیر چلاؤں اور شکار کو دوسرے دن اِس حالت میں پاؤں کہ میرا چلایا ہوا تیر اُس کے جسم میں پیوست ہے تو کیا حکم ہے؟ اس پر آپ نے فرمایا:

''اگر تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ہی تیر سے اُس کی موت واقع ہوئی اور وحشی جانوروں سے لگایا ہوا کوئی زخم اُس کے جسم پر نہیں پاتے' تو تم اُسے کھا سکتے ہو۔'' (ترمذی)

(۳) اگر شکار گلا سڑا نہیں ہے کیونکہ ایسے گوشت کا کھانا مضرِ صحت ہوتا ہے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث کے مطابق حضور ﷺ نے ابوثعلبہ الخشینی کو بتایا تھا:

''تم نے تیر چلایا لیکن شکار تین دن کے بعد تمہیں ملتا ہے تو جو حصّہ خراب نہیں ہوا' اُس میں سے تم کھا سکتے ہو۔'' (یوسف القرضاوی ص ص ۶۸'۶۹)

طیور بانی (پرندوں کو پالنے اور پرورش کرنے کا مشغلہ)

اِس کے جواز کے لئے دیکھئے سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۰ (بحوالہ جنابِ ابراہیم علیہ السلام)

شکاری کُتوں اور نگراں کُتوں کے رکھنے کا جواز : کُتّے جو شکار کے لئے یا مویشیوں' فصلوں کی حفاظت اور اس جیسے مقاصد کے لئے رکھے جاتے ہیں' درجِ ذیل حکم سے مستثنیٰ ہیں جس میں بہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسالتمآب ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

مَنِ اتَّخَذَ کَلْبًا اِلَّا کَلْبَ مَاشِیَۃٍ أَوْصَیْدٍ أَوْ زَرْعٍ اِنْتَقَصَ مِنْ أَجْرِہِ کُلَّ یَوْمٍ قِیْرَاط''
(بخاری' مسلم' مشکوٰۃ)

''جو کوئی شکار یا فصلوں اور مویشیوں کی حفاظت کے علاوہ (شوقیہ) کُتّے رکھتا ہے تو وہ ہر روز اپنے ثواب میں سے قیراط جیسی مقدار کم کرتا ہے۔'' (قیراط = دینار کا دو تہائی حصّہ)

تاہم گھروں میں کُتّے رکھنے کی ممانعت کا یہ مطلب نہیں کہ کُتوں سے ظلماً پیش آیا جائے یا یہ کہ اُنہیں ختم کر دیا جائے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۳۸ ''اور جو بھی جانور زمین پر چلنے والا ہے اور جو بھی پرندا اپنے دونوں پروں سے اُڑنے والا ہے' وہ سب تمہارے ہی طرح کے گروہ ہیں'' کا حوالہ دیتے ہوئے ختمی مرتبت رسول ﷺ نے فرمایا: ''اگر کُتّے ملّتوں میں سے ایک ملّت نہ ہوتے تو میں اُن کے قتل کا حکم دے دیتا۔''

نوٹ: یہ بات حضور ﷺ نے جبریل علیہ السلام کے یہ کہنے پر فرمائی کہ میں اُس گھر میں داخل نہیں ہوتا جس میں کُتّے ہوں۔

حیوانوں اور پرندوں کی انسانوں سے مماثلت کی وجوہ : سورۃ الانعام کی محولہ بالا آیت ۳۸ میں بتایا گیا کہ ہر حیوان اور ہر پرندہ تمہاری مثل مخلوق ہے۔ یہ تمثیل اور تشبیہ کس چیز میں ہے؟ اس کی مفسرین نے حسبِ ذیل وجوہ بیان کی ہیں: (ا) حیوانوں اور پرندوں کو بھی اللہ کی معرفت حاصل ہے۔ وہ اُس کی وحدانیت کا ذکر کرتے ہیں اور اُس کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں۔ حوالہ کے لئے دیکھئے سورہ بنی اسرائیل: آیت ۴۴ ؛ سورہ النور کی آیت ۴۱) حضرت سلیمان علیہ السلام سے ہدہد کے جس مکالمہ کا ذکر سورۃ النمل میں ہوا' اُس سے بھی اس حقیقت

کی تائید ہوتی ہے۔ اسی طرح چیونٹی کے جس کلام کا ذکر اُسی سورۃ النّمل میں کیا گیا' وہ بھی حیوانوں کے ادراک اور معرفت پر دلیل ہے۔ (۲) جس طرح حیوانوں اور پرندوں میں توالد و تناسل ہے اور وہ ایک دوسرے سے اُنس رکھتے ہیں' اسی طرح انسانوں میں بھی یہ امور ہیں۔ (۳) اللہ عزّ وجل نے جس طرح انسانوں کو ایک خاص تدبیر سے پیدا کیا اور وہ اُن کے رزق کا کفیل ہے' اسی طرح حیوانوں اور پرندوں کا معاملہ ہے۔ (۴) جس طرح قیامت کے دن انسانوں سے ایک دوسرے کا قصاص لیا جائے گا' اسی طرح حیوانوں اور پرندوں سے بھی یہ معاملہ ہوگا۔ (۵) ہر انسان میں کسی نہ کسی حیوان یا پرندے کی خصلت اور خصوصیت ہوتی ہے: بعض انسان شیر کی طرح دلیر اور بہادر ہوتے ہیں' بعض بھیڑیے کی طرح حملہ کرتے ہیں' بعض انسان کتوں کی سی آواز نکالتے ہیں' بعض انسان مور کی طرح مزیّن ہوتے ہیں' بعض انسان خنزیر کی طرح پاک چیز کو چھوڑ کر ناپاک کی طرف لپکتے ہیں' اور اُسی کی طرح بے غیرت ہوتے ہیں' بعض انسان بلّی کی طرح خوشامدی' بعض بکری بھیڑ کی طرح معصوم' بعض کوّے کی طرح حریص اور بعض لومڑی کی طرح چالاک ہوتے ہیں۔ (۶) جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی موت و حیات' اُن کا عمل' اُن کا رزق اور اُن کا اُخروی انجام مقدر کر دیا ہے' اسی طرح حیوانوں اور پرندوں کے بھی یہ امور مقرر کر دئے ہیں۔ (۷) جس طرح انسان اپنی روزی میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے اور اُسے کسی مکان کی حاجت ہوتی ہے جس میں وہ سردی' گرمی اور بارش سے پناہ حاصل کر سکے' اس طرح حیوانوں اور پرندوں کو بھی اِن امور کی حاجت ہوتی ہے۔'' (تبیانِ القرآن' ج ۳' ص ص ۴۵۲' ۴۵۳)

<u>بلاضرورت کُتّے رکھنا</u>: گھر میں بلاضرورت پالتو کُتّے رکھنے کی حضور علیہ السلام نے جو ممانعت فرمائی اُس کی حکمت یہ ہے کہ وہ گھریلو برتنوں کو اپنے چاٹنے سے پلید اور حفظانِ صحت کے منافی کر دیتے ہیں۔ اس ضمن آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر کوئی کُتّا کسی برتن کو چاٹ جاتا ہے تو اُسے سات بار صاف کرو جن میں سے ایک مرتبہ ریت یا خشک مٹّی کے ساتھ صاف کرو۔''

کچھ علماء نے کہا کہ گھروں میں کُتّوں کے رکھنے کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ وہ مہمانوں پر بھونکتے ہیں' اُن ضرورتمندوں کو خوفزدہ کرتے ہیں جو خیرات لینے آتے ہیں اور راہ گزروں کا پیچھا کرتے ہیں اور اُنہیں کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:۔

''جبریل میرے پاس آئے اور کہا کہ میں کل آپ کے پاس آیا تھا لیکن جس چیز نے مجھے اندر آنے سے روکا' وہ یہ کہ دروازے پر کے پردے پر کچھ تصاویر تھیں اور گھر کے اندر ایک کتا تھا۔ تو (اے نبی مکرّم!) آپ تصویر کا سر کاٹنے کا حکم دیجئے کہ وہ درخت کے تنے کا سا ہو جائے اور یہ کہ پردے کو کاٹ کر اس کے دو

تکیے ٹیک لگانے کے لئے بنادئے جائیں اور یہ کہ کُتّے کو باہر نکال دیا جائے۔'' (ابوداؤد' نسائی' ترمذی' صحیح ابن حبّان بحوالہ ''الحلال و الحرام فی الاسلام''۔۔یوسف القرضاوی ص ص ۱۲۰ تا ۱۲۲)

''کُتّے رکھنے سے متعلق سائنسی تحقیق پرمبنی معلومات: مسلم ممالک میں مغربی تہذیب کے دلدادہ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تمام مخلوقات کیلئے اُنس ومحبت ہونی چاہئے اور اُنہیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ اسلام اِس ''انسان دوست'' جانور کے خلاف کیوں تنبیہ کرتا ہے۔اُن کے اپنے مفاد کے لئے ہم یہاں ایک جرمن سائنسدان Dr. Gerard Finstimer کے مضمون میں سے ایک طویل اقتباس کا حوالہ دے رہے ہیں جس میں اُنہوں نے کُتّے پالنے یا اُن سے تعلق رکھنے کے نتیجہ میں انسانی صحت کو جو خطرات لاحق ہوتے ہیں' اُن پر روشنی ڈالی ہے:۔

''جدید دَور میں متعدّد لوگوں کی جانب سے کُتّوں کو پالنے میں حد درجہ دلچسپی لینے نے ہمیں عوام کی توجہ کو اُن خطرات کی طرف مبذول کرنے پر مجبور کیا ہے جو اس کے نتیجہ میں سامنے آئے ہیں بالخصوص جبکہ پالتو کُتّوں کو چھاتی سے لگایا جاتا ہے' اُنہیں چوما جاتا ہے اور اُنہیں بڑے بوڑھوں کے ہاتھ چٹوائے جاتے ہیں اور جو چیز سب سے بُری ہے' وہ یہ کہ کُتّے انسانی خورونوش میں استعمال ہونے والی پلیٹوں اور برتنوں کو چاٹتے ہیں۔''

''حفظانِ صحت کے منفی ہونے اور ناشائستگی کے علاوہ یہ بُرا طریقہ اور ذوقِ سلیم کے نزدیک قابلِ نفرت ہے۔تاہم ہمیں اِن معاملات سے کچھ سروکار نہیں اور ہم یہ معاملہ اخلاقیات کے معلّمین اور ذوقِ سلیم کے لوگوں پر چھوڑتے ہیں کہ یہ مضمون کچھ سائنسی مشاہدات کو پیش کرنے کے مقصد سے لکھا گیا ہے۔''

''طبّی نقطہ نگاہ سے جو یہاں ہمارا اصل مقصد ہے' کُتّے رکھنے اور اُن سے کھیلنے میں انسانی صحت اور زندگی کو جو خدشات وخطرات درپیش ہیں' ہمیں اُنہیں نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔بہت سے لوگوں نے اِس غفلت کی بھاری قیمت ادا کی ہے کیونکہ کُتّوں میں موجود کیچوا شدید مرض کا باعث بنتا ہے جس کا نتیجہ موت ہے۔یہ کیڑا انسانوں' مویشیوں اور خنزیروں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن مکمل ترقی یافتہ شکل میں یہ صرف کُتّوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ کیڑے دوسرے کیڑوں سے اس لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں کہ یہ چھوٹے اور ناقابلِ دید ہوتے ہیں اور اب تک اُنہیں دریافت نہیں کیا جاسکا تھا۔''

''حیاتیاتی لحاظ سے اِس کیڑے کے ترقیاتی عمل میں کچھ نمایاں خصائص ہیں۔اِن کی وجہ سے بننے والے پھوڑوں اور زخموں میں ایک کیڑا بہت سے سَروں کو پیدا کرتا ہے جو پھیل کر بہت سے دوسرے مختلف قسموں کے

پھوڑوں اور ڈنبلوں کو بناتے ہیں۔ یہ سَر صرف کُتوں کے گلوں کی غدودوں کے اندر مکمل ترقی یافتہ کیڑوں کی شکل میں نشوونما پاتے ہیں۔ انسانوں اور دوسرے جانوروں میں نظر آنے والے یہ پھوڑے اور ڈنبل اس کیچوے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جانوروں میں ایک ڈنبل کا سائز سیب جتنا ہوسکتا ہے جبکہ جراثیم زدہ متاثرہ جانور کا جگرا اپنے اصل سائز سے پانچ سے دس گنا تک بڑھ سکتا ہے۔ انسانوں میں اِس ڈنبل کا سائز بند مٹھی جتنا یا ایک شیر خوار بچے کے سر جتنا ہوسکتا ہے۔ جراثیم زدہ متاثرہ شخص میں یہ پھوڑا پھیپھڑوں، اعصاب، تلی، گردوں اور دماغ میں سوزش اور جلن کی مختلف قسموں کا سبب بن سکتا ہے۔ یہ پھوڑا اتنی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے کہ ماہرین کو اب تک اِسے پہچاننے میں دشواری رہی ہے۔''

''بہر حال جہاں کہیں بھی یہ سوزش اور جلن پائی جائے، یہ مریض کی صحت اور زندگی کے لئے سخت خطرے کا باعث بنتی ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ پریشان کن ہے، وہ یہ کہ اِس کی تاریخِ حیات، ابتدا اور نشوونما کا علم رکھنے کے باوجود ہم اس کا علاج تجویز کرنے کے قابل نہیں ہوئے، سوائے اس کے کہ کچھ حالات میں یہ طفیلی کیڑے مر جاتے ہیں شاید اس وجہ سے کہ انسانی جسم میں دافع سمیّت (زہر کا اثر زائل کرنے والی) پروٹین پیدا ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے وہ کیس جن میں یہ طفیلی کیڑے نقصان کئے بغیر مر جاتے ہیں بہت ہی کم ہیں۔ علاوہ ازیں کیمیاوی علاج کسی قسم کا فائدہ دکھانے میں ناکام رہا ہے اور اس کا عمومی علاج عملِ جراحی کے ذریعے جسم کے ڈنبل شدہ حصّوں کا نکال دینا ہے۔ اِن تمام وجوہ کے پیشِ نظر ہمیں اِس مہلک مرض کے خلاف تمام وسائل بروئے کار لانے چاہئیں اور انسان کو اس کے خطرات سے محفوظ رکھنا چاہئے۔''

''انسان کُتوں سے دُور رہتے ہوئے اپنی زندگی اور صحت کی حفاظت کرسکتا ہے۔ اُسے کُتوں سے بغلگیر نہیں ہونا چاہئے، اُن کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہئے اور بچوں کے قریب نہ آنے دینا چاہئے۔ بچوں کو بھی یہ تعلیم ہو کہ وہ کُتوں کے ساتھ نہ تو کھیلیں اور نہ ہی اُنہیں تھپتھپائیں۔ الغرض اِس بات میں بڑی احتیاط ہونی چاہئے کہ کُتے اُس چیز کے بالکل قریب نہ آنے پائیں جو انسانوں کے کھانے پینے میں استعمال ہوتی ہے۔''

''ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ ہمارے پیغمبر ﷺ نے کُتوں سے میل ملاپ رکھنے سے منع فرمایا ہے اور یہ کہ آپ نے اُن کے برتن چاٹنے کے خلاف اور اُنہیں ضرورت کے بغیر رکھنے کے خلاف تنبیہ کی ہے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جدید سائنسی انکشافات ایک اُمّی عرب یعنی محمد ﷺ کی تعلیمات کے مطابق نہ ہوں؟ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم اِس فرمانِ الٰہی کو دُہرانے کے سوا کچھ بھی تو نہیں کہہ سکتے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ (اَلنَّجم: ۳، ۴)

''وہ اپنی نفسانی خواہش سے بات نہیں کرتے۔ اُن کا کلام تو تمام تر وحی ہی ہے جو اُن پر بھیجی جاتی ہے۔''

(۸) فنِّ تعمیرات (ARCHITECTURE)

"یہ بات خوب ذہن نشین رہے کہ قرآنِ حکیم میں کوئی ایسا بیان نہیں جس کی تاویل مصنوعات کے بیان یا فنِّ تعمیرات کے بیان سے کی جائے۔ قرآنِ حکیم کا نزول جس ماحول میں ہوا' وہ فن کے نام تک سے واقف نہیں تھا چہ جائیکہ اُسے داد دی جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ قرآنِ حکیم سے مسلمان معاشروں اور ثقافتوں کی جمالیاتی اور معاشرتی ضروریات سے متعلق اور وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات لئے جاتے رہیں گے تاہم یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ وحیِ الٰہی کا تعلق فنون سے نہیں تھا اور نہ ہی فنون نے پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) میں جزیرۂ عرب کے لوگوں کے طرزِ زندگی میں کوئی بڑا کردار ادا کیا۔ مکّہ اور مدینہ میں تخیلاتی اور انتہائی پختگی اور کاریگری سے بنائی گئی چیزوں کا بہت حد تک فقدان تھا اور فنِّ تعمیر صرف کعبہ کو دیکھنے کی حد تک محدود تھا۔ فن اور فنِّ تعمیر کے تصوّر کا انحصار حضرت سلیمان علیہ السلام کے روایتی قصوں اور قدیم عرب بادشاہتوں کی یادگاروں پر تھا۔" (انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' صفحات ۱۶۲' ۱۶۸)

(i) قرآنِ حکیم حضرت سلیمان علیہ السلام کی انوکھی اور غیر معمولی تعمیرات کی حقیقت کو بیان کرتا ہے جیسا کہ سورۃ النّمل کی آیت ۴۴ میں بیان ہوا کہ آپ نے ایک محل (صَرح) تعمیر کرنے کا حکم دیا تا کہ ایک دُنیوی حکمران (ملکہ) پر اللہ کے پیغمبر کی افضلیت اور فوقیت ثابت کر دی جائے۔ لفظ صَرح سورۃ القصص کی آیت ۳۸ اور سورۃ المؤمن کی آیت ۳۶ میں بھی آیا ہے۔ بالترتیب آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) فَأَوْقِدْ لِي يَاهَامَانُ عَلَى الطِّينِ فَاجْعَل لِّي صَرْحًا لَّعَلِّي أَطَّلِعُ إِلَى إِلَٰهِ مُوسَىٰ

"اے ہامان! (فرعون کا وزیر) میرے لئے مٹی کو آگ میں پکا پھر میرے واسطے ایک بلند عمارت بنا تا کہ میں موسٰی کے خدا کو دیکھوں۔"

(۲) وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاهَامَانُ ابْنِ لِي صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ٥

"اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت بنوا کہ میں (اس سے) آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔" [صَرح" کا معنیٰ ہے بلند عمارت اور خالص چیز]

<u>فرعون نے اللہ کو دیکھنے کے لئے بلند عمارت بنائی تھی یا نہیں؟</u> امام رازی (م ۶۰۶ ھ) نے لکھا کہ فرعون نے لوگوں کو اِس وہم میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ قلعہ بنائے گا لیکن اُس نے بنایا نہیں تھا۔ کیونکہ ہر صاحبِ عقل جانتا ہے کہ وہ بلند سے بلند پہاڑ پر چڑھے پھر بھی اُسے آسمان اتنی ہی دُور بلند نظر آتا ہے جتنا زمین سے

اگر قرآن مجید اِن رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر دیتا تو فکری اور ذہنی صلاحیتوں کے استعمال کی بار بار کی قرآنی تکرار اور قرآن کے ترغیبی جملے اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ (سورۃ النساء: ۸۲) ''وہ قرآن میں غور و فکر کیوں نہیں کرتے؟'' اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (سورۃ الانعام: ۳۲) ''تو کیا تم عقل سے کام ہی نہیں لیتے؟'' اور اَفَلَا تَتَفَکَّرُوْنَ (سورۃ الانعام: ۵۰) ''تو کیا تم غور نہیں کرتے؟'' اپنی افادیت و اہمیت کھو دیتے جس کا نتیجہ مسلم اُمّہ کی فکری صلاحیتوں کی لاعلاج بے حسی میں ہوتا۔ فرض کیجئے کہ ریاضی کا استاد اگر اپنے طالب علموں کے ریاضی کے سوالات خود حل کر دے اور اُنہیں اُن کے حل کرنے پر نہ چھوڑے تو اُن میں خود اعتمادی کیسے پیدا ہوگی اور وہ اپنے ذہنی حاصل قسمت (Intelligent Quotient : I. Q.) کو کیسے استعمال کر سکیں گے؟ چنانچہ انسان کی فکری قوّتوں اور تجسّس کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور اُنہیں جمود و تعطّل اور بنجر پن سے بچانے کے لئے حکیمِ مطلق اللہ نے اُن مسائل کا اشارہ دینے کے بعد اُن کی تعبیر و تحقیق کو خود اُمّت پر چھوڑ دیا۔ مثلاً لوگوں نے ایک دفعہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کے اسباب کی بابت پوچھا (جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۹ میں بہ الفاظ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ہوا)۔ علم الافلاک کی تفصیلات میں جانے کی بجائے قرآن مجید نے اپنے آپ کو قمری مہینوں کی اہمیت تک محدود رکھا جو چاند کے گھٹنے' بڑھنے کا نتیجہ ہوتے ہیں اور یہ کہ قمری مہینے انسان کی مذہبی رسوم کی ادائی اور کاروباری لین دین وغیرہ میں کارآمد اور مفید ہوتے ہیں۔ چاند کے ظاہر ہونے' اُس کے گھٹنے بڑھنے اور بالآخر اس کے گم ہونے کے اسباب کو ارادی طور پر نظر انداز کر دیا گیا جس نے انسانی تجسس کو مہمیز لگائی اور وہ سائنس کی جتنی انتہا تک جا سکتی تھی' پہنچ گئی۔

قرآنِ حکیم بعض اوقات سائنسی معلومات بالواسطہ فراہم کرتا ہے اور اسی بالواسطہ فراہمی میں کچھ سائنسی راز مخفی ہوتے ہیں جن کی طرف قرآنِ حکیم ہماری توجہ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ اور اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ کے الفاظ میں مبذول کراتا ہے۔ بعض اوقات وہ معلومات کو تقابل اور علامات کے ذریعے بے نقاب کرتا ہے۔ ایمان کی تابندگی اور اس کی تپش کو بڑھانے کی غرض سے مؤلّف کے لئے کچھ اُن سائنسی حقائق کو اپنے قارئینِ کرام کے سامنے رکھنے میں اعزاز کی بات ہے جو حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں لیکن قرآن مجید نے اُنہیں صدیوں پہلے بے نقاب کر دیا تھا:۔

(۱) علم زراعت سے متعلق قرآنی بیانات صرف ناگزیر فصلوں اور پھلوں تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اُن کا دائرہ پھیل کر اُس پیداوار تک پہنچ جاتا ہے جو انسانی ذائقے کو طراوت اور لذت بخشتی ہیں۔ لہٰذا قرآنی تعلیمات نے مسلم دُنیا میں ہر قسم کی نباتات اور پھلوں کو اُگانے کے جذبے کو ہوا دی اور سہارا دیا۔

حسین و جمیل جناتِ عدن کا نقشہ جن کے نیچے ہمیشہ بہنے والی نہریں جاری ہیں' بھی مسلم کاشتکاروں کے لئے علمِ زراعت میں تحقیق کا ذریعہ ثابت ہوا۔ سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت میں خوشحال' مالدار طبقہ کے لئے ایک ناصحانہ' معلمانہ سبق چھپا ہوا ہے کہ اُنہیں صرف اپنی ذات کی ضروریات و آسائش میں مگن رہ کر خودغرض اور ماسوا سے

بلندی پر نظر آتا ہے۔ لہٰذا ایسی حرکت تو کوئی دیوانہ اور فاتر العقل ہی کر سکتا ہے اور سُدّی بہت ضعیف راوی ہے اور اُس کی یہ روایت صحیح نہیں کہ جب وہ بلند قلعہ بنا لیا گیا تو اُس نے آسمان کی طرف تیر پھینکے اور وہ تیر خون میں ڈوبے ہوئے واپس کر دیے گئے تو فرعون نے کہا کہ میں نے موسیٰ کے معبود کو قتل کر دیا ہے۔
(تفسیر کبیر، ج ۸، ص ص ۶۰۰۔۵۹۹ ملخصاً بیروت ۱۴۱۵ھ)

(ii) فنِ تعمیر سے متعلق قرآنِ حکیم کی ایک اور اصطلاح کا تعلق زیادہ تر روزمرّہ کے استعمال کے الفاظ سے ہے۔ مثلاً رہائش گاہوں کے معنیٰ میں درج ذیل الفاظ استعمال ہوتے ہیں:۔

(۱) ''قَــرْيَة'' (سورۃ النساء:۷۵ ؛ سورۃ الاعراف:۴، ۹۴ ؛ سورہ یوسف:۸۲ ؛ سورہ بنی اسرائیل:۱۶ ؛ سورۃ الانبیاء:۱۱، ۹۵ ؛ سورۃ الفرقان:۵۱) جس کی جمع قُریٰ ہے (سورۃ الاعراف:۹۶ تا ۹۸، ۱۰۱ ؛ سورۃ الکھف: ۵۹ ؛ سورۃ الاحقاف:۲۷) جو عام طور پر شہر یا تھوڑی آبادی والی جگہوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اُمُّ الــقُــریٰ بمعنیٰ شہروں کی ماں اور اصل، سورۃ الانعام:۹۲ میں شہرِ مکّہ کے لئے استعمال ہوا ہے کیونکہ یہ مرکزِ اسلام ہے اور روایتاً یہ پیغمبر ابراہیم و آدم علیہما السلام اور جنابہ حوا رضی اللہ عنہا کے ساتھ منسلک ہے۔

(۲) ''مَــدِيــنَة'' کے بڑے وسیع مفاہیم ہیں اور یہ لفظ موقع کی مناسبت سے استعمال ہوتا ہے جیسے سورۃ النمل:۴۸ ؛ سورۃ القصص:۱۵، ۱۸، ۲۰ ؛ سورہ یٰسٓ:۲۰ اور سورۃ المنافقون:۸۔

(۳) ''مَسَــاكِــن'' (سورۃ العنکبوت:۳۸) بمعنیٰ تباہ شدہ آبادیاں ؛ (سورۃ النمل:۱۸) بمعنیٰ روزمرّہ کے رہنے کی جگہیں ؛ مَسَــاكِــن طَيِّبَةً (سورۃ التوبۃ : ۷۲) باغاتِ عدن میں وہ پُرسکون رہائش گاہیں ہیں جو اللہ تبارک و تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار بندوں / بندیوں کو عطا کئے جائیں گے۔

(۴) ''بَلَد'' بَلَدُ الأمِين (سورۃ التین:۳) کا لفظ بمعنیٰ ''محفوظ شہر'' مقدّس اور محفوظ شہرِ مکّہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔

(۵) ''بَيْــت'' کا لفظ ''گھر'' کے معنیٰ میں عام ہے جسے تخلیہ کی جگہ سمجھا جاتا ہے اور سورۃ النساء: ۱۰۰ میں استعمال ہوا ہے۔ تخلیہ اور آرام کی یہ صفت اسلامی روایت رہی ہے اور عمارتوں کی تعمیر میں آج تک اِس ضرورت کو مدِّنظر رکھا جاتا رہا ہے۔ اِس کی جمع بُیُوت ہے جو سورہ آلِ عمران:۴۹ ؛ سورۃ النور:۲۷، ۲۹، ۳۶ ؛ سورۃ النمل:۵۲ ؛ سورۃ الاحزاب:۳۳، ۳۴، ۵۳ اور سورۃ الزخرف:۳۳، ۳۴ میں استعمال ہوا ہے۔

دراصل یہ لفظ نبیِ معظم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کی رہائش گاہوں کے لئے سورۃ الاحزاب: ۳۳، ۳۴، ۵۳
میں استعمال ہوا جن کے لئے تخلیہ ایک ضرورت کی چیز کی تھی اور یہ گمان بھی غالب ہے کہ یہ لفظ فوطیفار کی بیوی زُلیخا
کی رہائش کے لئے استعمال ہوا ہو۔ جب اِس لفظ کو ناپسندیدگی اور نفرت سے استعمال کیا جائے جیسے سورہ بنی
اسرائیل کی آیت ۹۳ میں بَیت " مِّنۡ زُخۡرُفٍ کے الفاظ میں ہے، تو اس سے مراد بے جا خودنمائی اور دولت کی
تعلّی (بڑ) ہوتی ہے۔ (لسان العرب۔۔ابنِ منظور افریقی) مطبوعہ قاہرہ ۱۴۰۲ء

(۶) "دیار" (سورۃ البقرۃ: ۲۴۶؛ سورہ آلِ عمران: ۱۹۵؛ سورۃ الاسراء: ۵؛ سورۃ الحشر: ۲) جو دار کی
جمع ہے، اس میں اور لفظ بَیت میں بہ لحاظ معنیٰ کوئی فرق نہیں، سوائے اِس کے کہ دَار بطور مؤنث اور بَیت بہ طور مذکّر
استعمال ہوتا ہے۔ بعض اوقات لفظ دَار وسیع تر مفہوم کو ادا کرتا ہے جیسے اَلدَّارُ الۡاٰخِرۃ (سورۃ القصص: ۸۳
؛ سورۃ العنکبوت: ۶۴) بمعنیٰ آخرت کا گھر جس میں وسعت کا معنیٰ ہے۔

(۷) ایک عام لفظ قَصر (بمعنیٰ محل، جمع قُصُور اور جو سورۃ الاعراف: ۷۴ وسورۃ
الفرقان: ۱۰ میں استعمال ہوا ہے) پورے قرآنِ پاک میں چار مرتبہ استعمال ہوا ہے: دو مرتبہ بطور
استعارہ جن میں سے ایک مرتبہ ماضی قدیم کے نابود اور مٹے ہوئے محلات کے لئے اور ایک مرتبہ جہنّم
کے اُن بلند و بالا شعلوں کے لئے جو کسی محل کی طرح بلند ہیں، سورہ اَلمُرسَلات کی آیت ۳۲ میں
استعمال ہوا ہے۔

سورۃُ النّساء کی آیت ۷۸ میں لفظ بُرُوج "محل" کے معنیٰ میں آیا ہے، اگرچہ کچھ مقامات پر یہ
علمِ نجوم کی مشہور اصطلاح مِنطقۃ البروج (Zodiacal Signs) کے معنیٰ میں آیا ہے جیسے سورۃُ الحِجر کی آیت ۱۶،
سورۃ الفُرقان کی آیت ۶۱، اور سورۃ البروج کی اوّل آیت میں۔

(۸) بہت کم اور شاذ استعمال ہونے والے لفظ مَثۡوٰی (سورہ یوسف: ۲۱، ۲۳؛ سورہ محمّد: ۱۹) اور مَصَانِع
(سورۃ الشعراء: ۱۲۹) بالترتیب رہائشی جگہوں اور عمارتوں کے لئے استعمال ہوئے ہیں۔

(۹) سورۃُ الرَّعد کی آیت ۲ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ (اُس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے بلند کیا) اور
سورہ لقمٰن کی آیت ۱۰ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ (اُس نے آسمانوں کو بغیر ستون کے پیدا فرمایا) میں آسمانوں
کو بطور استعارہ ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ ستونوں کے بغیر خدائی تخلیق کا معجزاتی نمونہ ہیں۔

(iii) فنِ تعمیر سے متعلق قرآنی اصطلاحات کی ایک اور قسم اُن الفاظ کی ہے جو رسولِ اکرم ﷺ کے زمانۂ حیات یا آپ کے بعد کے زمانہ میں ایک خاص معانی میں استعمال ہونے لگے، قطع نظر اس کے کہ اُن الفاظ کے اصل معانی کیا تھے۔ اِن الفاظ میں دو اہم لفظ مَسْجِد اور مِحْراب ہیں۔

مَسْجِد (بمعنیٰ سجدہ گاہ) جس کا مادّہ س، ج، د ہے، قرآنِ حکیم میں ۲۸ مرتبہ آیا ہے۔ دس مرتبہ سے زیادہ اِس لفظ کی اَلْحَرَام کے لفظ کے ساتھ ترمیم کی گئی ہے جیسے سورۃُ البقرۃ: ۱۴۴، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۹۱، ۱۹۶؛ سورۃُ المائدۃ: ۲؛ سورۃُ التوبۃ: ۷، ۱۹، ۲۸؛ سورۃُ الاسراء: ۱؛ سورۃُ الفتح: ۲۵، ۲۷ میں اور اس سے مراد مکّہ مکرّمہ کی وہ مقدس عبادت گاہ ہے جو حضرت ابراہیم اور اُن کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہما السلام نے تعمیر کی تھی اور جو سورۃُ البقرۃ کی آیت ۱۴۴ کے نزول پر 'قِبلہ' میں تبدیل کر دی گئی جس کا معنیٰ ''طرف اور جہتِ نماز'' ہے۔ سورۃُ المائدۃ کی آیت ۲ میں اِسے بیت الحرام بھی کہا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۹ میں اِس کی صحیح دیکھ بھال کی اہمیت پر ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔

سورۃُ الاسراء کی اوّل آیت میں مَسْجِد کا لفظ مکّہ کی مقدس عبادت گاہ کے لئے استعمال ہوا، جبکہ اِسی سورت کی آیت ۷ میں یہ لفظ یروشلم میں واقع یہودیوں کی عبادت گاہ کے لئے آیا ہے۔ مَسْجِد کا لفظ پھر اُسی سورۃُ الاسراء کی اوّل آیت میں بطور مَسْجِدِ الْاَقْصٰی استعمال ہوا ہے بمعنیٰ بعید ترین مسجد۔

قرآنِ حکیم کے باقی تمام مقامات میں یہ لفظ اُس جگہ کے لئے استعمال ہوا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہو جیسے سورۃُ الاعراف کی آیت ۲۹ میں۔ سورۃُ التوبۃ کی آیت ۲۸ میں کفار کی مساجد میں آنے پر بندش لگا دی گئی ہے۔ سورۃ الجنّ کی آیت ۱۸ اِنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰہِ (بے شک مسجدیں اللہ کے لئے ہیں) مساجد میں اکثر نقش کی ہوئی دیکھی گئی ہے۔

سورۃُ التوبۃ میں مساجد کی نگہداشت اور عبادت کی خاطر ان میں کثیر الوقوع آمد کو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا معیار بتایا گیا ہے۔ ایک اور آیت جس کا مساجد میں نقش کیا جانا عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے، یہ ہے:-

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ آمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَآتَی الزَّکٰوۃَ وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ (التوبۃ: ۱۸)

''اللہ کی مسجدوں کا آباد کرنا تو بس اُن لوگوں کا کام ہے جو اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوں، نماز کی پابندی کرتے ہوں، زکوٰۃ دیتے رہتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے ہوں۔''

''اِس آیت میں تعمیرِ مساجد کا جواز پانچ چیزوں میں منحصر کیا گیا ہے: ایمان باللہ' ایمان بالآخرت' نماز قائم کرنا' زکوٰۃ ادا کرنا اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرنا۔''

''مساجد بنانے کے لئے اللہ پر ایمان رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ مسجد وہ جگہ ہے جہاں اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی عبادت کی جاتی ہے' سو جو شخص اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ رکھتا ہو' اُس کے لئے اللہ کی عبادت کی جگہ بنانا ممنوع ہوگا۔ قیامت پر ایمان رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ جس شخص کا قیامت پر ایمان نہیں ہوگا اُس کے لئے اللہ کی عبادت کا کوئی محرّک اور باعث نہیں ہوگا۔''

''مساجد بنانے کے لئے نماز قائم کرنا اس لئے ضروری ہے کہ مسجد بنانے کی غرض ہی نماز کی ادائیگی ہے۔ تو بے نمازی کے لئے مسجد کا بنانا ممنوع ہوگا۔ زکوٰۃ ادا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ مسجد میں داخل ہونے کے لئے بدن کی طہارت ضروری ہے اور نماز کے لئے وضو اور پاک وصاف لباس ضروری ہے جس کے لئے مال خرچ کرنا ہوگا۔ اس کے لئے فراخدلی سے مال وہی خرچ کرے گا جو زکوٰۃ ادا کرتا ہو۔ نیز زکوٰۃ فقراء و مساکین اور مسافروں کو ادا کی جاتی ہے اور مسجد کے نمازیوں میں فقراء' مساکین' مسافر اور دیگر مستحقینِ زکوٰۃ ہوتے ہیں اور مسجد میں آنے والوں کو اِنہیں زکوٰۃ ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔''

''مسجد بنانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مسجد بنانے والا اللہ عزّ وجلّ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو کیونکہ بعض اوقات غیر مسلم مسجد بنانے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ ایسے میں مسجد بنانے کی جرأت وہی کرے گا جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتا ہو۔ نیز اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مسجد بنانے والا نام ونمود اور اپنی تعریف وشہرت کے لئے مسجد نہ بنائے بلکہ صرف اللہ عزّ وجلّ کی رضا اور خوشنودی کے لئے مسجد بنائے۔'' (تبیان القرآن' ج ۵' ص ۹۵)

<u>مسجد بنانے کے انحصار میں ایمان بالرسول ذکر نہ کرنے کی توجیہات</u> : آیت مذکورہ میں مسجد بنانے کے لئے ایمان باللہ اور دیگر امور کا تو ذکر آیا ہے لیکن ایمان بالرسول کا ذکر نہیں فرمایا۔ اس کے جواب یہ ہیں: (۱) ایمان باللہ ایمان بالرسول کے لئے لازم ہے کیونکہ اللہ پر ایمان لانے کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کے تمام فرامین پر ایمان لایا جائے اور رسول پر ایمان لانا اُس کے فرامین و احکام میں سے ہے۔ تو جس نے سیّدنا محمد ﷺ کو اللہ کا رسول نہیں مانا' اُس نے اللہ عزّ وجلّ کو نہیں مانا۔ (۲) آیت میں نماز کا ذکر ہے اور نماز سے مراد وہ نماز ہے جس کی رسولِ معظم ﷺ نے تعلیم دی کہ آپ نے فرمایا کہ اِس طرح نماز پڑھو جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو (صحیح بخاری) (۳) آیت میں نماز کا ذکر ہے اور نماز سے پہلے اذان اور اقامت ہوتی ہے اور

اذان اور اقامت میں ہے مُحَمَّد " رَّسُوْلُ اللّٰہ (۴) خود نماز کے تشہد میں ہے: اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور نماز کے دوران میں ہے: اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ (۵) رسول اللہ ﷺ کا ذکر صراحتاً اس لئے نہیں فرمایا تاکہ مشرکین کے اس قول کا ردّ ہو کہ (سیدنا) محمد (ﷺ) دینِ اسلام کی دعوت اپنی ریاست اور حکومت کی طلب کی خاطر دیتے ہیں۔'' (تبیان القرآن۔ علامہ غلام رسول سعیدی، ج ۵، ص ۹۵)

اُصحابِ کہف کے واقعہ کے بیان میں قرآنِ حکیم نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اُس غار میں سونے والوں کی یاد میں وہاں ایک مسجد تعمیر کی گئی (سورۃُ الکھف: ۲۱)۔

سورۃُ الحج کی آیت ۴۰ اُن مقدس عبادت گاہوں کی فہرست پر مشتمل ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اُن کی حفاظت کے لئے مداخلت نہ کرتا تو وہ نابود ہو گئے ہوتے۔ اُس فہرست میں صَوَامِع (نصاریٰ کی خانقاہیں)، بِیَع (عبادت خانے)، صَلَوٰت (یہود کے عبادت خانے) اور مَساجد ہیں۔ پہلے دو لفظ یعنی صَوَامِع اور بِیَع'' قرآن مجید میں کسی اور جگہ استعمال نہیں ہوئے۔ تیسرے لفظ یعنی صَلَوٰت (جس کا واحد صَلٰوۃ ہے) کا اطلاق عام طور پر مسلمانوں کی نماز پر ہوتا ہے۔ قرآنِ پاک میں لفظ مَسجِد مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے لئے آیا ہے جیسا کہ اس کے مادّے س، ج، د سے معلوم ہو رہا ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۸ میں لفظ مَشعَرُالحرام مُزدلفہ (عرب) میں واقع ایک جگہ کے لئے آیا ہے جہاں نبیِ مکرّم ﷺ نے طویل نماز ادا فرمائی تھی۔

لفظ مِحراب جو سورہ آلِ عمران کی آیات ۳۷، ۳۹، سورہ مریم کی آیت ۱۱ اور سورہ صٓ کی آیت ۲۱ میں آیا، اُس تزئینی کام کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے جو قبروں کے کتبوں، غالیچوں اور تختہ آلات پر پائے جاتے ہیں۔ سورہ صٓ کی آیت ۲۱ میں اہلِ مقدمہ محراب پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے پاس اپنے جھگڑے کا تصفیہ کرانے آئے۔ مذکورہ بالا تمام چاروں آیات میں یہ لفظ اُس جگہ کی حرمت و تقدس کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جبکہ مَساجد کی چھتوں اور دیواروں پر آیۃ الکُرسی کندہ کی ہوتی ہے، وہاں محرابیں بھی قرآنی نقاشی سے خالی نہیں ہوتیں اور سورۃ النّور کی یہ آیت وہاں لکھی ہوئی نظر آتی ہے:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ'' اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ'' دُرِّیٌّ'' یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ'' (النور: ۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے' اُس کے نور کی مثال ایسے طاق کی طرح ہے جس میں چراغ ہو' وہ چراغ ایک فانوس میں ہو' وہ فانوس ایک روشن ستارے کی مانند ہو' وہ چراغ برکت والے زیتون کے تیل سے روشن کیا جاتا ہے' وہ (درخت) نہ مشرقی ہے نہ مغربی' عنقریب اُس کا تیل خود ہی بھڑک اُٹھے گا اگرچہ اُسے آگ نہ چھوئے۔''

جب لفظ مِحراب کی جمع یعنی مَحاریب استعمال کیا جائے جیسا کہ سورہ سَبا کی آیت ۱۳ میں ہے' تو عام طور پر اس سے مراد مقاماتِ عبادت لیا جاتا ہے۔ لیکن آیت ۱۳ مذکور کے ضمن میں ایسے معانی کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اِسی آیت میں تَمَاثِیل (مجسمے)' جِفَان (حوض) اور قُدُور (دیگیں) کے تینوں الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے جنّات یہ سارے کام انجام دیتے تھے اور اس سارے عمل میں مذہبی رنگ سے زیادہ اُن کی جاہ وحشمت اور دولت کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

(iv) تعمیراتی منصوبوں اور ڈیزائنوں کی طرف قرآنِ حکیم کے براہِ راست اشارات قرآن کی تعمیراتی اصطلاحات کی ایک اور قسم ہے۔ صاف اور واضح الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ اس قسم کے طرزِ بیان نے اقوامِ عالَم میں عموماً اور مسلمانوں میں خصوصاً تعمیراتی ذوق کے ابھارنے اور اُسے ترقّی دینے میں خاصا اثر کیا ہے' مثلاً:

(۱) وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ○

''اور (وہ وقت) یاد کرو جب اللہ نے تمہیں (قومِ) عاد کے بعد اُن کا جانشین بنایا اور زمین میں تمہیں بسایا' تم نرم زمین میں محلات بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو' پس تم اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔'' (الاعراف : ۷۴)

یعنی قومِ عاد جیسی متمدّن اور ترقی یافتہ قوم کے بعد تہذیب وتمدّن کا مالک تمہیں بنایا۔ یہ مطلب نہیں کہ اُنہی کا ملک تمہیں دیا۔ عاد وثمود دونوں کے مرکز بالکل جداگانہ تھے۔ عاد کا ملک جنوب مشرقی عرب اور ثمود کا شمال مغربی عرب تھا۔ ''اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو'' سے معلوم ہوا کہ دنیوی علوم وفنون میں کمال کا شمار بھی اللہ کی نعمتوں میں ہے اور اُنہیں مطلقاً حرام یا ناجائز سمجھ لینا بہت زیادتی ہے۔ تہذیب وتمدّن کی پیداکردہ عیش پرستیوں میں پڑ کر خوفِ آخرت سے بے نیاز ہو جانا اور قانونِ شریعت کی حدود کو توڑ کر فسق و فجور میں مبتلا ہو جانا' اللہ کی عظمت اور اپنی بندگی کو فراموش کر دینا' یہ سب فَساد فی الارض میں داخل ہے۔

آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ قومِ ثمود انجینئروں اور ماہرینِ تعمیرات کی قوم تھی اور یہ کہ اُن کی تہذیب مشینوں کے علم اور فنِ تعمیر میں خاصے ترقی یافتہ تھے۔

(۲) وَأَوْحَيْنَا إِلَى مُوسَى وَ أَخِيهِ أَنْ تَبَوَّآ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوتًا وَ اجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ قِبْلَةً وَّ أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ○ (یونس : ۸۷)

''اور ہم نے موسیٰ اور اُن کے بھائی (ہارون) کی طرف وحی بھیجی کہ تم دونوں اپنی قوم کے لئے مصر میں گھر بناؤ اور تم لوگ اپنے گھروں ہی کو نماز گاہ قرار دے لو اور نماز کی پابندی رکھو اور آپ ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔''

اِس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ بنی اسرائیل نماز پڑھنے میں فرعون اور اُس کی قوم سے ڈرتے تھے تو اُنہیں حکم ہوا کہ تم اپنے گھروں کو قبلہ یعنی مسجد بنا لو اور اُن میں نماز پڑھو۔ خوشخبری سنانے میں یا تو خطاب نبی اکرم ﷺ سے ہے کہ مؤمنین کو عظیم ثواب کی خوشخبری سنا دیجئے یا یہ کہ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ بنی اسرائیل کو یہ بشارت دیجئے کہ عنقریب اللہ اُنہیں فرعون اور اُس کے سرداروں پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ (جامع البیان: جز ۱۱، ص ۲۰۲ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

(۳) وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ○ وَآتَيْنَاهُمْ آيٰتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ○ وَ كَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ○ (الحجر : ۸۰ تا ۸۲)

''اور بالیقین حجر والوں نے (بھی ہمارے) بھیجے ہوؤں کو جھٹلایا اور ہم نے اُنہیں اپنی طرف سے نشانیاں دیں، پر وہ اُن سے رُوگردانی ہی کرتے رہے اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے کہ (اُن میں) چین سے رہیں۔''

اَلْحِجْر شمالی عرب اور شام کے درمیان کا علاقہ کہلاتا ہے جو حضرت صالح علیہ السلام کی اُمت قومِ ثمود کا مسکن تھا۔ شام سے مدینہ کو آتے ہوئے سب سے پہلے ارضِ لوط پڑے گی، پھر سرزمینِ شعیب (مدین) ملے گی اور آخر میں علاقۂ حجر یا قومِ ثمود کا مسکن۔ یہ تینوں عبرت انگیز خطے باہم متصل ہیں اور شاید اسی مناسبت سے یہاں تینوں کا ذکر ایک ساتھ ہے۔ اَلْمُرْسَلِیْن صیغہ جمع سے متعلق امام فخر الدین رازی نے لکھا کہ ممکن ہے کہ یہ قوم ہندی برہمنوں کی طرح کُل سلسلۂ رسالت ہی کی منکر ہو۔ (تفسیر ماجدی اردو، ص ۵۴۵)

(۴) وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا (اَلنَّحل : ۸۰)
"اور اللہ نے تمہارے لئے تمہارے گھر وجہِ سکون بنائے۔"

(۵) أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ o وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ o (الشعراء:۱۲۸'۱۲۹)
"تو کیا تم ہر اونچی جگہ پر لہو ولعب کی ایک (فضول) یادگار تعمیر کر رہے ہو؟ اور تم اس توقع پر مضبوط مکان بنا رہے ہو کہ تم ہمیشہ رہو گے۔"

یہ آیات حضرت ہود علیہ السلام کی قومِ عاد سے متعلق ہیں جن کا مَسکن یمن میں اَحقاف کا علاقہ تھا جو عمان اور حضرموت کے درمیان ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ وہ لوگ اونچی جگہوں پر عمارتیں بناتے تاکہ اس سے اُن کا مالدار اور خوشحال ہونا ظاہر ہو اور وہ اُن عمارتوں پر فخر کرتے تھے' اس لئے اس کام کو عَبَث فرمایا۔ امام راغب اصفہانی نے "المفردات" میں فرمایا کہ عَبَث کا معنٰی ہے جس کام کی صحیح غرض نہ ہو۔ لفظ تَعْبَثُونَ سے ظاہر ہے کہ اُن کا یہ شوقِ تعمیر کسی ضرورت کی بناء پر نہ تھا' محض جذباتِ فخر ونمائش کی تسکین کے لئے تھا۔

متعدد منزلہ بلڈنگیں' خوبصورت عمارات' پلازے' شاپنگ سنٹر بنانے کی شرعی حیثیت: مذکورہ آیت ۱۲۹ نے بتایا کہ اُن کے ظاہر حال سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مکانوں میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالٰی نے اس کی مذمّت چند وجوہ سے فرمائی: (۱) اُن کا یہ فعل ازراہِ اظہارِ تکبّر تھا اس لئے اِسراف اور فضول خرچی تھا۔ (۲) وہ دنیا کی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر اپنے خالقِ حقیقی اور موت کی یاد سے غافل ہو گئے تھے اور یہ حقیقت بھول گئے تھے کہ یہ دنیا تو سرائے فانی ہے' یہاں سے آگے گزر جانا ہے اور قیام گاہ نہیں ہے۔

اگر اِن وجوہ میں سے کوئی وجہ نہ ہو تو پلازے' شاپنگ سنٹر اور متعدد منزلہ عمارات بنانا بالکل جائز ہے اور روز افزوں کثرتِ آبادی کی وجہ سے وقت کی ضرورت بھی ہے کہ کم جگہ کو زیادہ سے زیادہ افراد کی رہائش کے قابل بنانے کے لئے کثیرالمنزلہ عمارات تعمیر کی جائیں جو بہ کثرت فلیٹس پر مشتمل ہوں۔ تعمیرات میں حُسن وجمال کو شامل کرنا' خوبصورت کوٹھیاں اور خوشنما بنگلے تعمیر کرنا اسلام کے خلاف نہیں ہے اور نبی اکرم ﷺ نے جو ایک مقام پر بلند وبالا مکانات بنانے کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا (بحوالہ سنن ابی داؤد: ۵۲۳۷)'

اُس کی بھی یہی وجہ تھی کہ اُس دَور میں مدینہ منورہ چھوٹا سا شہر تھا اور اُس دَور کے مسلمانوں کے لئے چھوٹے اور سادہ مکان اُن کی ضروریات کے لئے کافی تھے' اِس لئے بلند و بالا مکانات کو اسراف سمجھتے ہوئے آپ نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اِس حقیقت کو سمجھنے کے لئے درج ذیل حدیثِ مبارکہ بروایت حضرت عبداللہ ابنِ مسعود (رضی اللہ عنہ) ملاحظہ ہو جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص کے دل میں ذرّہ کے برابر بھی تکبر ہو' وہ جنّت میں داخل نہیں ہوگا۔ ایک شخص نے کہا کہ ایک آدمی چاہتا ہے کہ وہ خوش لباس ہو' اُس کے جوتے عمدہ ہوں' تو کیا یہ بھی تکبّر ہوگا؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ اللہ حسین و جمیل ہے' وہ حُسن و جمال سے محبت کرتا ہے۔ تکبّر تو حق کا انکار اور لوگوں کو اپنے سے حقیر جاننا ہے۔
(صحیح مسلم: ۱۴۷؛ سنن ترمذی: ۱۹۹۹؛ سنن ابی داؤد: ۴۰۹۱؛ سنن ابنِ ماجہ: ۵۹)

اِس حدیث سے ظاہر ہو گیا کہ انسان کا اپنی وسعت کے مطابق عمدہ لباس اور اچھے جوتے پہننا اور خوبصورت مکان بنانا اسلام میں پسندیدہ ہے۔ لہٰذا مضبوط' مستحکم' بلند و بالا' عالیشان اور حسین و جمیل عمارات بنانا اسلام کے عین مطابق ہے اور اُس کے خلاف نہیں بشرطیکہ اُس میں ریا کاری' خودنمائی' تکبّر اور دوسروں کو کم نگاہی سے دیکھنے کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اس کی وضاحت اِس حدیث سے بھی ہوتی ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مسجد (نبوی) کچی اینٹوں' اُس کی چھت کھجور کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی اور اُس کے ستون کھجور کے تنے کے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اِس میں توسیع کی اور اضافہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے عہد کی بنیادوں پر اینٹوں اور شاخوں سے مسجد کو وسیع بنایا اور اس کے لکڑیوں کے ستون دوبارہ بنوائے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس میں تبدیلی اور توسیع کی' اُس کی دیواریں نقشین پتھروں اور چونے سے بنائیں' اُس کے ستون بھی نقشین پتھروں سے بنائے اور اُس کی چھت ساگوان کی لکڑی سے بنائی۔ (صحیح بخاری: ۴۴۶؛ سنن ابی داؤد: ۴۵۱؛ مُسند احمد: ۶۱۳۹ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۸' ص ۳۹۱)

اِس حدیث سے اس حقیقت پر وافر روشنی پڑتی ہے کہ ہر دَور کے تقاضوں کے لحاظ سے عمارات کی تعمیر کے طور طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ رسولِ معظم ﷺ اور جنابِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانوں میں مدینہ منورہ کی آبادی کم تھی تو اُس وقت کی ضرورت کے لئے ایک چھوٹی سی کچی مسجد کافی تھی۔ لیکن جنابِ عمر رضی اللہ عنہ

کے زمانہ میں آبادی بڑھ گئی اور دوسرے صوبوں سے بھی نومسلمین نے مدینہ منورہ کا رخ کیا تو حضرت عمر نے مسجدِ نبوی کی توسیع بھی کی اور اُس کی دیواروں اور ستونوں کو پختہ بھی کیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَورِ خلافت میں آبادی مزید بڑھی اور فنِ تعمیر میں جدید تقاضے درآنے لگے تو آپ نے مسجدِ نبوی کی عمارت کو بھی تعمیر کے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا اور اس کے حُسن میں بھی اضافہ کیا وغیرہ۔ یوں جیسے جیسے اسلامی رقبہ وسیع ہوتا گیا اور دنیا میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی گئی اور دوسری قوموں کی آمیزش سے علوم وفنون اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوتی گئی تو جدید تقاضوں کے مطابق فنِ تعمیر میں بھی توسیع اور ترقی ہوتی گئی۔ تیروں' تلواروں اور نیزوں کے ذریعے جنگ کا مقابلہ بندوقوں' توپوں اور ٹینکوں کے ذریعے لڑی جانے والی جنگ سے کر لیجئے اور پھر مؤخر الذکر کا موازنہ موجودہ دَور کی جنگوں سے کر لیجئے جو آبدوزوں' جنگی طیاروں' بموں' راڈار' ایٹمی ہتھیاروں اور میزائلوں کے ذریعے لڑی جارہی ہیں۔ تمدنی زندگی میں اب کچے مکان اور جھونپڑیاں وقت کی ضرورت نہیں رہے اور چراغ اور موم بتی زمانہ ماضی کی یادگار بن کے رہ گئے ہیں اور اُن کی جگہ بجلی کے دلآویز قمقموں نے لے لی ہے۔ لہٰذا دیگر تمدنی اور ثقافتی معاملات میں بھی ہمیں ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونا چاہئے کہ اس سے اسلام کے بنیادی ڈھانچے اور اُس کے اَساسی نظریات پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

(٦) اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَاهٰهُنَآ اٰمِنِیْنَ٥ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ٥ وَّزُرُوْعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ٥ وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ٥ (اَلشُّعراء : ۱۴۶ تا ۱۴۹)

"کیا تم یہاں کی چیزوں میں امن کے ساتھ رہتے رہو گے؟ باغوں اور چشموں میں' کھیتوں میں اور کھجور کے درختوں میں جن کے خوشے نرم ہیں۔ اور تم خوشی سے اِتراتے ہوئے پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے ہو۔" (یہ آیات قومِ صالح علیہ السلام یعنی قومِ ثمود کے بارے میں ہیں)

اِن آیات اور سابقہ مذکورہ آیات کے پیشِ نظر قومِ عاد اور قومِ ثمود کے تقابلی جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ قومِ ہُود پر عقلی اور معنوی لذّات غالب تھیں کیونکہ وہ سربلندی کو' ہمیشہ باقی رہنے کو' انفرادیت کو اور تکبّر کو پسند کرتی تھی اور قومِ ثمود پر حسّی اور ظاہری لذّات غالب تھیں کیونکہ وہ کھانے پینے کی چیزوں اور اچھی رہائش کو پسند کرتی تھی اور یہ اہلِ دنیا کی لذّتوں میں سے ہیں اور آخرت کی لذّتیں اِن تمام لذّتوں سے بالاتر ہیں۔

(٧) وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ٥ (القصص : ۳۸)

"اور فرعون نے کہا کہ اے ہامان! میرے لئے ایک بلند عمارت بنوا کہ میں (اس سے) آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں۔" [صَرْح" بمعنیٰ بلند عمارت اور خالص چیز]

بیگانہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ اُنہیں محروم القسمت اور مفلوک الحال لوگوں کی بھی خبر گیری کرنی چاہئے اور اُنہیں حالات کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑنا چاہئے :۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّأَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ لَهُ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ فَأَصَابَهَآ إِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ٥ (اَلْبَقَرة : ۲۶۶)

''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کا ایک باغ کھجوروں اور انگوروں کا ہو جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں (اور) اُس کے ہاں باغ میں (اور بھی) ہر قسم کے میوے ہوں اور اُسے بڑھاپا آچکا ہو اور اُس کے (چھوٹے چھوٹے) ناتواں بچے ہوں۔ اُس (باغ) پر ایک آتشیں بگولا آئے تو وہ (باغ) جل جائے اِسی طرح اللہ تمہارے لئے نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم فکر سے کام لو۔'' (۲ : ۲۶۶)

(۲) جمالیات کی دنیا میں جھانکیں تو ہر سُو ربِّ ذوالجلال والاکرام کے حُسن و جمال کا مینا بازار لگا ہوا ہے۔ کیا انسان وحیوان اور کیا جمادات ونباتات' کیا شجر وحجر اور کیا وادی و دِمن' کوئی جگہ اور کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جسے اُس ذاتِ کردگار نے اپنی قدرتِ کاملہ کے حُسن کا مظہر نہ بنایا ہو۔ صرف اشرف المخلوقات حضرتِ انسان کو یہ جتلانے کے لئے کہ جس طرح تیرے خالق و مالک نے تیرے آس پاس کی کائنات کو اپنے جلووں سے سجا رکھا ہے' تو بھی اپنے حسنِ عمل اور اخلاق وگفتار کی بلندی سے اِس دھرتی کو سجا کر اپنے خالق و مالک کو اپنے آپ سے راضی کرنے کا سامان کر لے۔

(۳) انسانی جنین (Embryology) کے بارے میں قرآن مجید ماں کی بچہ دانی کی تین تاریک تہوں کا ذکر سورۃ الزُّمَر کی آیت ششم میں کرتا ہے اور یہ حقیقت علمِ بشریات (Anthropology) کی جدید تحقیق کی رُو سے بالکل درست ہے۔ سورۃ الحج کی آیت ۵' سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴' اور سورۃ العلق کی آیت دوئم میں جنین کے بیان کردہ ارتقائی مراحل کی ناقابلِ تردید صحت اور درستی کی علمِ جنین کے کئی ماہرین نے تصدیق وتائید کی ہے۔ یونیورسٹی آف ٹورنٹو (کینیڈا) کے شعبہ تشریح الاعضاء (Anatomy) کے پروفیسر اور چیئرمین اور "The Develop-ing Human" نامی کتاب کے مصنف ڈاکٹر کتھ مور (Dr. Keith Moore) جو ماہرینِ جنینات کی صفِ اوّل میں شمار کئے جاتے ہیں' نے قرآن مجید اور مستند احادیث کے اِن بیانات کی بابت کہا تھا :

"اُنیسویں صدی تک شکم مادر میں بچے کے ارتقائی مراحل کی بابت کچھ معلوم نہ تھا۔ بیسویں صدی کے دوران جنین کے ارتقاء اور افزائش کے ۲۳ مراحل کو بیان کرنے کے لئے اعداد کا استعمال کیا گیا۔ مراحل کی نمبرنگ کے اس نظام کا تتبع کوئی آسان کام نہیں۔ حالیہ سالوں میں قرآنی مطالعہ نے ارتقائی جنین کے مراحل کو بے نقاب کیا ہے جو قابلِ فہم اور آسان ہے۔ قرآن وہ اصطلاحات استعمال کرتا ہے جو اللہ کی جانب سے پیغمبر محمد ﷺ کی طرف جبریل نامی فرشتہ کے ذریعے بھیجی گئیں اور جنہیں قرآن میں محفوظ کر دیا

اینٹیں بنانے اور اینٹوں سے گھر تعمیر کرنے کے ماہر مصر اور میسوپوٹامیا دو ملک تھے۔ مصری اینٹیں عموماً ہماری جدید اینٹوں سے سائز میں دوگنا ہوتی تھیں۔ اٹھارویں خاندان سے بعد کے زمانوں میں اُن میں سے اکثر اینٹوں پر یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ وہ عوامی عمارتوں میں استعمال کی ہیں' کسی بادشاہ کا نام ہوتا تھا۔ مہروں اور سانچوں کی حفاظت تو اب تک ہوتی آئی ہے اور اُن اینٹوں کی بھی جن پر ظالم و جابر بادشاہ رعمسیس دوم کا نام تھا اور جو ہمارے عجائب گھر میں رکھے ہوئے ہیں۔ (Chene and Black's Encylopaedia Biblica)

''مصر نے قدیم خاندانوں کی حکومتوں کے دوران اور مابعد کے زمانوں میں اینٹوں کے متعدد نمونوں سے متعارف کرایا ہے۔'' (انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا' جلد چہارم' ص ۱۱۱)

(۸) يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَايَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ (سبا : ۱۳)
''سلیمان (علیہ السلام) جو کچھ بھی چاہتے تھے' وہ جنات اُن کے لئے بنادیتے تھے' بلند و بالا حسین عمارتیں اور مجسمے۔''

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَحارِیْب سے مراد محلات اور مساجد ہیں۔

<u>محراب کے داخلِ مسجد ہونے کی تحقیق</u> : عام طور پر یہ بحث کی جاتی ہے کہ آیا محراب مسجد میں داخل ہے یا اُس سے خارج ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ مسجد بنانے والا مسجد بناتے وقت جس جگہ کو مسجد میں داخل رکھے گا' وہ مسجد میں داخل ہوگی اور جس جگہ کو وہ مسجد سے خارج رکھے گا وہ مسجد سے خارج ہوگی۔ مسجد جب بنائی جاتی ہے تو اس کے بنانے والوں کا ارادہ یہ نہیں ہوتا کہ محراب کو مسجد سے خارج رکھا جائے بلکہ مسجد کی محراب اسلامی طرزِ تعمیر کا شِعار اور اس کی خصوصیت ہے۔ البتہ امام کو نماز میں پاؤں محراب سے خارج رکھنے چاہئیں۔ محراب اس لئے بنائی جاتی ہے کہ امام مسجد کے وسط میں کھڑا ہو سکے کیونکہ محراب مسجد کا وسط ہوتی ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی (متوفّٰی ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں :۔
''مسلمانوں کی دائمی عادت یہ ہے کہ محراب مسجد میں داخل ہوتی ہے۔ تاہم اگر امام کے پاؤں محراب میں داخل ہوں تو اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ امام کی الگ اور ممتاز جگہ ہے اور یہ اہلِ کتاب کے طریقہ کے مشابہ ہے۔ اس لئے امام کے پیر محراب سے باہر ہونے چاہئیں اور اگر اُس کے پیر محراب میں ہوں تو یہ مکروہ ہے۔'' (ردُّ المختار' ج ۲' ص ۲۵۷)

تصویروں کا شرعی حکم : تَمَاثِیْل مذکور کا معنیٰ ہے صورتیں اور مجسمے ۔ اسلام میں مجسموں کا بنانا اور اُن کا رکھنا جائز نہیں ہے' صرف چھوٹی بچیوں کے لئے گڑیاں کھیلنے کا جواز احادیث مبارکہ میں آیا ہے۔ تصاویر کا بنانا بھی جائز نہیں ہے خواہ وہ تصاویر ہاتھ سے پینٹنگ کے ذریعے بنائی جائیں یا کیمرے کا فوٹو گراف ہو یا وڈیو کیمرے کی تصاویر ہوں۔ آیت مذکورہ ۱۳ میں مجسمے بنانے کا جواز ملتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم سے پہلی شریعتوں میں تصویر جائز تھی۔ (تبیان القرآن' ج ۹' ص ۶۱۲)

''اگر گھر میں قبلہ کی جانب ایسی تصاویر یا مجسمے ہوں جن کے سَر کٹے ہوئے ہوں تو وہاں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں کہ تصویر سَر کے ساتھ ہوتی ہے اور سَر کٹنے سے وہ تصویر نہیں رہتی۔ کیونکہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک کپڑا ہدیۃً پیش کیا گیا جس میں ایک پرندے کی تصویر تھی۔ صبح کو صحابہ کرام نے دیکھا کہ اُس کا سَر مٹا دیا گیا تھا۔ اسی طرح روایت ہے کہ جبریلِ امین نے نبی ﷺ سے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اجازت دے دی۔ حضرت جبریل نے کہا: میں کیسے آسکتا ہوں جبکہ گھر میں ایک ایسا پردہ ہے جس پر گھوڑوں اور مَردوں کی تصویریں ہیں۔ آپ یا تو اِن تصویروں کے سَر کاٹ دیں کہ سَر کاٹنے کے بعد تصویر درخت کی طرح ہو جاتی ہے جو مکروہ نہیں ہے' (مکروہ جاندار کی تصویر ہے) یا اُنہیں بچھانے والے گدّے بنا دیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اُنہوں نے ایک شخص کو تصویر بنانے سے منع کیا۔ اُس نے کہا میرے کمانے کا یہی طریقہ ہے تو میں کیا کروں؟ فرمایا کہ اگر تصویر بنانے کے علاوہ تمہارے لئے کوئی اور چارۂ کار نہیں تو درختوں کی تصویر بنایا کرو۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' نے فرمایا جس شخص نے کسی جاندار کی تصویر بنائی' اُسے قیامت کے دن اُس میں روح پھونکنے کے لئے کہا جائے گا اور وہ اُس میں روح نہیں پھونک سکے گا۔''

''اگر تصویر کا سَر کٹا ہوا نہ ہو تو اُس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ اس میں بتوں کی عبادت کرنے والوں کے ساتھ مشابہت ہے لیکن یہ اُس وقت ہے جب تصویر بڑی ہو اور دیکھنے والوں کو دُور سے نظر آتی ہو۔ اگر تصویر چھوٹی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں کیونکہ تصویروں کی عبادت کرنے والے بہت چھوٹی تصویر کی عبادت نہیں کرتے۔''

حدیث شریف میں ہے کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اُس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے' اس لئے نماز کی جگہوں کو تصویر سے پاک کرنا واجب ہے' ہاں اگر نمازی کے پیچھے تصویر ہو تو اس میں کم درجے کی کراہت ہے کیونکہ ایسی صورت میں تصویر کی تعظیم یا اُس کی عبادت سے مشابہت نہیں ہے۔ اسی طرح اگر تصویر زمین یا تہبند یا پردوں پر ہو تو اُس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ بستر کو روندا جاتا ہے اور اس میں تصویر کی تعظیم نہیں ہے۔ گدّے کا بھی

یہی حکم ہے کہ جبریلِ امین نے کہا تھا کہ آپ اس کا گدّا بنالیں جسے روندا جائے۔ اگر نمازی بستر پر نماز پڑھے اور اُس کی پیشانی کی جگہ یا اُس کے سامنے تصویر ہو تو یہ مکروہ ہے کیونکہ اس میں تصویر کی تعظیم ہے اور اگر اُس کے قدموں کی جگہ تصویر ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ اب تصویر کی تعظیم نہیں ہے۔'' (المبسوط' ج ا' ص ص ۲۱۰' ۲۱۱ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۸' ص ۷۱۰)

''بعض لوگوں مثلاً علمائے ازہر نے کہا کہ فوٹوگراف کی تصاویر بھی چونکہ آئینہ کے عکس کی طرح ہیں' اس لئے وہ حرمت کے حکم میں نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اِن تصاویر میں صرف عکس کو ایک کاغذ پر مقیّد کر دیا جاتا ہے اور چھوٹی بچیوں کے لئے گڑیوں کو حرام نہیں کیا گیا اور وہ مجسمے بھی حرام نہیں ہیں جن کی علمِ طب یا تعلیم میں ضرورت ہوتی ہے اور وہ تصاویر جنہیں تعظیم کے لئے نہ بنایا جائے' حرام نہیں۔ کیونکہ تصاویر کے حرام ہونے کی بنیاد بت سازی اور بت پرستی کا راستہ بند کرنا ہے۔'' (یَسْئَلُوْنَكَ فِی الدِّیْنِ وَالْحَیَاۃ ج ا' ص ۶۳۲ طبع بیروت)

علاّمہ غلام رسول سعیدی فرماتے ہیں کہ آئینہ میں عکس ناپائدار اور عارضی ہوتا ہے جبکہ کیمرے کے ذریعے اُس تصویر کو اپنے اختیار سے قائم اور مستقل کر لیا جاتا ہے لہٰذا کیمرے کے فوٹوگراف کو آئینہ کے عکس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ (تبیان القرآن' ج ۹' ص ۶۱۲)

وہ مزید فرماتے ہیں: ''میرے نزدیک علمائے ازہر کا یہ نظریہ صحیح نہیں ہے کہ کیمرے کی بنائی ہوئی تصاویر اس لئے جائز ہیں کہ وہ ہاتھ سے نہیں بنائی جاتیں اور یہ کہ کیمرے کے ذریعے صرف عکس کو مقیّد کر لیا جاتا ہے۔ دیکھئے پہلے شراب ہاتھ سے بنائی جاتی تھی' اب مشینی عمل کے ذریعے شراب بنائی جاتی ہے تو کیا اِس فرق سے شراب اب جائز ہو جائے گی؟ پہلے ہاتھوں کی تراش خراش سے مجسمے بنائے جاتے تھے' اب مشینوں کے ذریعے پلاسٹک اور دوسری اجناس کے مجسمے ڈھال لئے جاتے ہیں تو کیا اب وہ جائز ہو جائیں گے؟''

''فوٹو کے متعلق اسلام کا منشاء یہ ہے کہ کسی بھی جاندار کی صورت اور شبیہ کو مستقل طور پر محفوظ کر لینا جائز نہیں ہے کیونکہ جانداروں کی تصویریں ہمیشہ شرک اور فتنوں کی موجب بنتی رہی ہیں۔۔۔۔ بت تراشی' مصوّری اور فوٹوگرافی میں جواز اور عدمِ جواز کا فرق کرنا صحیح نہیں ہے۔''

''<u>ویڈیو اور ٹیلیویژن کی تصاویر کی شرعی حیثیت</u>: ہمارے نزدیک ٹی وی کی اسکرین کا آئینہ پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ اوّل اس لئے کہ اگر مثلاً چار شخص آئینے کے سامنے مختلف سمتوں میں کھڑے ہوں' کوئی دائیں

جانب' کوئی بائیں جانب' کوئی بالکل سیدھا کھڑا ہو' کوئی کسی اور زاویہ سے ترچھا کھڑا ہو تو سب کو بیک وقت آئینہ میں مختلف عکوس (عکس کی جمع) نظر آئیں گے۔ اس کے برخلاف اگر ٹی وی کی اسکرین کو بہ یک وقت چار یا چار سے زائد اشخاص مختلف سمتوں سے دیکھ رہے ہوں تو اُنہیں ایک ہی منظر دکھائی دے گا اور یہ وہی منظر ہوگا جو ویڈیو ٹیپ پر ریکارڈ شدہ ہے۔''

''دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر VCR کے مخصوص بٹن کے ذریعے کسی تصویر کو ساکن کر دیا جائے اور ٹھہرا لیا جائے تو اُس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا بہر حال ویڈیو کے مجوزین کے نزدیک بھی ناجائز ہے جبکہ آئینہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا ناجائز یا مکروہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے نزدیک ٹی وی کی اسکرین آئینہ کی طرح نہیں ہے اور اُسے آئینہ پر قیاس کر کے جائز قرار دینا صحیح نہیں ہے۔''

''ویڈیو کی وہ تصاویر جن میں ریز (شعاعوں) کے ذریعے جاندار کی صورتوں کو وجود میں لایا جائے خواہ وہ متحرک ہوں یا غیر متحرک' وہ اُسی طرح حرام ہیں جیسے پتھر' کاغذ یا کپڑے پر نقش شدہ تصاویر ناجائز اور حرام ہیں' جیسے موسیقی صرف اس لئے حرام نہیں کہ وہ طبلہ' سارنگی اور بانسری کے ذریعے بجا کر آواز بنائی جاتی ہے۔ اگر یہ آواز ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے' فلم یا ویڈیو ٹیپ کے ذریعے سنائی دے' وہ بہر حال موسیقی کی آواز ہے جو سنائی دے رہی ہے۔ اِسی طرح جاندار کی صورت خواہ کسی ذریعے سے دکھائی دے' وہ بہر حال صورت گری ہے اور اِسی وجہ سے ناجائز اور حرام ہے۔ میں نے اِس مسئلہ کو اسی طرح سمجھا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر یہ غلط ہے تو میری فکر کی نارسائی ہے۔'' (تبیان القرآن از علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۸' ص ۱۲۷)

<u>حج وعمرہ کے لئے فوٹو کا جواز</u> : فقیہ العصر علامہ نور اللہ بصیر پوری لکھتے ہیں:۔

''حج کے لئے عازمِ حج کے پورے جسم کا فوٹو ضروری نہیں بلکہ چہرے یا قدرے زائد کا فوٹو حکومت نے مصالح انتظامیہ کے لئے ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ عموماً پاسپورٹوں پر ایسے ہی فوٹو چسپاں کئے جاتے ہیں جو نصف سینہ تک کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ انسان نصف سینہ یا سینہ کے نیچے سے کاٹ دیا جائے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا یہ فوٹو ایسے جسم کا فوٹو ہوگا جو شجر و حجر کی طرح بے جان ہے۔ بہر حال اِن ارشادات کی روشنی میں حج وعمرہ وغیرہ کے لئے ایسے فوٹو کی اجازت ہے جو جسم کے ایسے حصہ کا ہو جو صرف اتنا ہی زندہ نہ رہ سکتا ہو' ہاں یہ بھی ضروری ہے کہ بلا ضرورت فوٹو نہ کھچوائے جائیں۔''

(الفتاویٰ النوریہ' ج ۲' ص ۱۷۱' لاہور ۱۴۰۸ھ)

(۹) وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍo وَّآخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْأَصْفَادِo (ص: ۳۷، ۳۸)
''اور سرکش جنّوں کو بھی سلیمان (علیہ السلام) کے تابع کر دیا کوئی معمار اور کوئی غوطہ خور اور دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے رہتے تھے۔''

وہ جنّات سمندر میں غوطہ لگا کر موتی، جواہر اور دوسری ایسی چیزیں نکال کر لاتے تھے جو زیورات میں کام آتی ہیں۔ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے ایسے جنّات بھی مسخر کر دیئے تھے جو اونچی اونچی عمارتیں بناتے تھے اور ایسے جنّات بھی مسخر کئے تھے جو سمندر میں غوطے لگاتے تھے اور دوسری قسم کے ایسے جنّات بھی اُن کے تابع کئے تھے جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے یعنی وہ بہت سرکش تھے جنہیں لوہے کی زنجیروں کے ساتھ جکڑ کے رکھا ہوا تھا تاکہ اُنہیں شر اور فساد سے روکا جا سکے۔''

(۷) فنِ تعمیرات سے متعلق قرآنِ حکیم کی اصطلاحات کی ایک اور قسم کا تعلّق مافوق الطبعیات (Metaphysics) سے ہے جو چشمِ ظاہر سے تو قابلِ دید نہیں ہیں لیکن بہرحال اُن کا وجود ضرور ہے۔ مثلاً مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (الٓمّٓ السَّجدة: ۱۷)
''سو کسی کو علم نہیں آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو جو سامان اُن کے لئے (خزانہِ غیب میں) مخفی ہے۔''

جنّت کا ماحول، ناسوت کے ماحول سے بالکل مختلف ہوگا اس لئے وہاں کی ''مادّیات'' کا بھی یہاں کی مادّیات سے بالکل مختلف ہونا قرینِ قیاس ہے۔ وہاں کی مادّیات بس صرف لفظاً ہی مادّیات ہوں گی۔ دوم یہ کہ نفسیاتی نقطہ سے اگر دیکھا جائے تو انسان کا تصوّر اُس کے روزمرّہ مشاہدے تک محدود ہوتا ہے یعنی اپنی روزمرّہ زندگی میں جن چیزوں کو وہ دیکھتا ہے، اُسی دائرے کے اندر وہ اپنے تصوّر کے گھوڑے دوڑاتا ہے اور اُس دائرے سے باہر اُس کا طائرِ پرواز جا ہی نہیں سکتا۔ جنت اور اُس کی بے مثال نعمتیں جو اہلِ جنت کو ہمیشہ ملتی رہیں گی، اُن کا صحیح تصوّر تو تبھی ہو جب اُن جیسی چیزوں کا مشاہدہ کیا گیا ہو۔ جب مشاہدہ ہی نہیں تو تصوّر کی دوڑ کی صحت چہ معنیٰ دارد؟ چاہے وہ شاعر کا تصوّر ہی کیوں نہ ہو جس کی برق رفتاری کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

(۲) لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ (الزُّمَر: ۲۰)
''لیکن جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے رہے، اُن کے لئے (جنت میں) بالاخانے ہیں، اُن کے اوپر بالاخانے بنے ہوئے ہیں۔''

یہاں لٰکِنْ کا لفظ کسی قولِ سابق کی تردید کے لئے بطور حرفِ استدراک نہیں آیا بلکہ ایک دوسری بات شروع کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس سے قبل آیت ۱۶ میں فرمایا تھا کہ کفار کے لئے دوزخ میں آگ کے سائبان ہیں اور اُن کے اوپر آگ کے اور سائبان ہیں یعنی اُنہیں اُن کے اوپر اور نیچے ہر طرف سے آگ کا عذاب پہنچتا رہے گا اور جنت میں جو بالا خانے اوپر نیچے ہوں گے وہ اہلِ جنت کو زیادہ سے زیادہ نعمتیں اور راحتیں پہنچانے کے لئے ہوں گے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ بالا خانے تو اوپر بنے ہوئے ہوتے ہیں تو جو عمارت اُن کے نیچے بنی ہوگی' اُس پر بالا خانے کا اطلاق کیسے درست ہوگا؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ وہ عمارت نچلی منزل کے اہلِ جنت کے اعتبار سے بالا خانہ ہوگی۔

(۳) اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِىْ مَقَامٍ اَمِيْنٍo فِىْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍo يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَo كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍo يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَo (اَلدُّخان : ۵۱ تا ۵۵)

"بے شک متقین مقامِ امن میں ہوں گے' جنتوں اور چشموں میں' وہ باریک اور دبیز ریشم کا لباس پہنے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ایسا ہی ہوگا اور ہم موٹی آنکھوں والی حوروں کو اُن سے بیاہ دیں گے۔ وہ وہاں سکون سے ہر قسم کے میووں کی طلب کریں گے۔"

(۴) مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِىْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَا اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى وَلَهُمْ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِى النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْo (مُحَمَّد : ۱۵)

"جس جنت کا متقین سے وعدہ کیا جا رہا ہے اُس کی کیفیت یہ ہے کہ اُس میں متغیر نہ ہونے والے پانی کی نہریں ہوں گی' اور ذائقہ نہ بدلنے والی نہریں دودھ کی ہوں گی' اور پینے والوں کے لئے خوش ذائقہ نہریں شراب کی ہوں گی اور شہدِ صاف کی نہریں ہوں گی اور وہاں اُن کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں گے اور اُن کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہوگی۔ تو کیا ایسے لوگ اُن لوگوں جیسے ہو سکتے ہیں جو ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور کھولتا ہوا پانی اُنہیں پینے کو دیا جائے گا' وہ اُن کی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے گا۔"

جنت میں باغاتِ عدن جن کا ذکر متعدد بار مختلف پیرایوں میں ہوا' اُن میں تعمیراتی منصوبہ کارفرما ہے۔

یوں لگتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے اِن تفصیلی بیانات نے (دنیاوی) باغات کے ڈیزائن کرنے میں خاصا اثر ڈالا ہے بالخصوص مغل انڈیا میں آگرہ کے مقام پر تاج محل' اور اسکندریہ (انڈیا) میں مقبرہِ اکبر پر۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ اِن قرآنی آیات کو مسجدوں کی تزیین و آرائش میں استعمال کیا گیا' بالخصوص دوسری صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں دمشق کی عظیم مسجد کے کاشی کاری کے کام میں جسے اُموی مسجد بھی کہا جاتا ہے۔ تزیین و آرائش کے کام میں بعد کے زمانوں میں جو ترقی ہوئی' وہ تعمیراتی اور جمالیاتی نقش گری میں قرآنی نظریہِ جنت کی عکاس ہے اور بعض مقامات پر نظریہ جہنم کی بھی۔

جنت اور جہنم دونوں کے نادر دروازوں سے داخلہ ہوگا (اَلزُّمَر: ۷۲' ۷۳) اور اہلِ جنت کے گوتکیوں کا رنگ سبز ہوگا (سورۃ الرّحمٰن: ۷۶؛ سورۃ الدّھر: ۲۱)۔ بہت سے مقاماتِ جنّت کو دریا اور باغات گھیرے ہوئے ہیں (سورۃ الدُّخان: ۵۱' ۵۲ ؛ سورہ محمد: ۱۵ ؛ سورۃ الدّھر: ۱۲) جنّت میں چشمے بھی ہیں (سورۃ الدّھر: ۱۸)۔ سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ۶۱ میں باغات کو زمین دوز دریاؤں اور خوبصورت مکانوں کے اوپر دکھایا گیا ہے۔ اِن باغات میں قصور اور مَسَاکِن تعمیر کئے گئے ہیں جن کا ذکر بالترتیب سورۃ الفرقان: ۱۰ اور سورۃ الصّف: ۱۲ میں آیا ہے۔

چار مقامات یعنی سورۃ الفرقان کی آیت ۷۵' سورۃ العنکبوت کی آیت ۵۸' سورہ سبا کی آیت ۳۷ اور سورۃ الزُّمَر کی آیت ۲۰ میں اِن رہائش گاہوں کو غُرَف کہا گیا ہے جس کا واحد غُرْفَة ہے۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ سورۃ الفرقان کی آیت ۷۵ میں اس لفظ کو واحد یعنی غُرْفَة لانے میں کیا مقصد ہے' جس سے یوں لگتا ہے کہ جنت میں صرف ایک غُرْفَة ہے۔

''اللہ تبارک وتعالیٰ کے تخت کے لئے قرآن میں لفظ عَرش استعمال ہوا ہے (سورہ ھُود: ۱۱؛ سورۃ الزُّمَر: ۷۵ ؛ سورۃ المؤمن: ۷)۔ یہ لفظ عام طور پر واحد کے طور پر استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد وہ تخت ہے جو انوارِ الٰہی کا مرکزِ تجلّیات ہے۔ لفظ عَرش حضرت سلیمان علیہ السلام اور ملکہ سَبا کے قصّے میں تین مرتبہ استعمال ہوا ہے (سورۃ النّمل: آیات ۲۳' ۴۱' ۴۲)۔ جب یہ بطور جمع (عُروش) استعمال ہو جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۵۹' سورۃ الکھف کی آیت ۴۲' سورۃ الحج کی آیت ۴۵ میں (تینوں مقامات پر خَاوِیَة عَلیٰ عُروشِھا کے الفاظ آئے ہیں) تو اس سے مراد کسی بڑی تعمیراتی ساخت کا کوئی جزو ہوتا ہے۔''

(انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' ج ۱' ص ص ۱۶۳ تا ۱۶۶)

<u>قرآنی حوالہ جات کا اثر تعمیراتی منصوبہ بندی پر</u> : ہندوستان میں مغل شہنشاہوں کے عالیشان

مقبروں میں پائے گئے قرآنی کتبوں کی دولت نے ڈبلیو بیگلے اور زیڈ اے ڈیسائی جیسے فضلاء کو اِن تعمیرات کی تاویل کرنے میں کچھ بے ادبی کی حد تک یہ کہنے کی جرأت دلائی کہ یہ تعمیرات اِس زمین پر اللہ کی بنائی ہوئی جنت ہیں۔ اِن تاویلات نے تمام مؤرخین کو قائل نہیں کیا' تاہم یہ بات ضرور ہے کہ کتبوں کا انتخاب اور اُن پر قرآنی حوالہ جات کوئی حادثاتی یا اتفاقی بات نہیں بلکہ یہ اُن کے سرپرستوں کا قرآنِ حکیم سے تعلق کو ثابت کرتے ہیں اور خارجی دنیا کو ایک مضبوط اور قوی پیغام پہنچانے کی تشکیل کرتے ہیں۔''

''عمومی طور پر اب یہ نتیجہ نکالنا مناسب ہے کہ قرآنی حوالہ جات اسلامی فن بالخصوص فنِ تعمیر کی شناخت کرانے میں اُس کا ایک اہم جزو رہے ہیں۔ یہ حوالہ جات الواحِ قبور (کتبوں) کا حصّہ بن گئے اور اُنہوں نے اپنے طریق کار اور اپنے وہاں کندہ کئے جانے کا سبب مہیا کر دیا۔'' (ایضاً ص ص ۱۷۱'۱۷۲)

چند متعلقہ اصطلاحات اور نام قرآنِ حکیم کی روشنی میں

(۱) بیروک (Baroque): (نہایت مزیّن اور پُرتکلّف) : ترجمہ اور تشریح کے لئے دیکھئے صفحہ ۲۹۰ سورۃ الشّعراء آیت ۱۴۹)

(۲) بیسمنٹ (Basement) [عمارت کی سب سے نچلی منزل کم از کم جزو اتہ زمین]
''لَوْ یَجِدُوْنَ مَلْجَأً أَوْ مَغٰرٰتٍ أَوْ مُدَّخَلاً لَّوَلَّوْا اِلَیْهِ وَهُمْ یَجْمَحُوْنَ ۝ (التّوبۃ : ۵۷)
''وہ (منافقین) اگر کوئی سی بھی جائے پناہ پاتے یا کوئی تہہ خانہ یا کوئی (اور) گھُس بیٹھنے کی جگہ تو وہ اُس میں تیزی سے رسیاں تڑاتے ہوئے گھُس جائیں۔''

مطلب یہ کہ منافقین مسلمانوں سے اس قدر خوفزدہ ہیں کہ جلد سے جلد مسلمانوں کی پہنچ اور اُن کی گرفت سے نکلنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں کوئی قلعہ مل جائے' یا کسی پہاڑ میں غار یا زمین کے نیچے کوئی تہہ خانہ تو وہ تیزی سے دوڑتے ہوئے اُس میں گھُس جائیں۔ آیت سے یہ نکتہ حاصل ہوا کہ مؤمن بندہ مدینہ منوّرہ کی تکلیف پر تمام دنیا کے آرام کو قربان کر دیتا ہے کہ منافقین مدینہ منوّرہ میں رہنے کے مقابل غاروں اور تہہ خانوں میں رہنے کو پسند کرتے ہیں۔

(۳) بالٹی یا ڈول (Bucket) پانی کے لئے مستعمل
''وَجَآءَتْ سَیَّارَةٌ فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَأَدْلٰی دَلْوَهٗ قَالَ یٰبُشْرٰی هٰذَا غُلٰمٌ'' (یوسف:۱۹)

''اور ایک قافلہ آ نکلا' تو اُن لوگوں نے اپنا سقہ بھیجا اور اُس نے اپنا ڈول ڈالا اور بول اُٹھا:
ارے واہ! یہ تو ایک لڑکا نکل آیا۔''

(۴) قلعہ (مستحکم و مضبوط) (Castle .. fortified)

أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ (النساء : ۷۸)
"تم جہاں کہیں بھی ہوگے وہیں تمہیں موت آلے گی خواہ تم مضبوط قلعوں ہی میں ہو۔"

(۵) مُردہ خانہ (Charnel House) : فرعون کی مردہ لاش کے بارے میں پیش گوئی کی گئی:۔

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (یونس : ۹۲)
"سو آج ہم تیرے جسم کو نجات دیں گے تاکہ تو پیچھے آنے والوں کے لئے نشانِ عبرت رہے۔"

قرآنِ حکیم کی سچائی و حقانیت عقلاً' نقلاً' تجربے اور تاریخ ہر لحاظ سے ثابت ہے۔ بائبل کی کتاب خروج میں فرعونِ مصر کا تمام واقعہ درج ہوا ملتا ہے مگر وہاں نہ تو فرعون کی ڈوبتے وقت توبہ کا ذکر ہے اور نہ اُس کی لاش کے بچائے جانے کا تذکرہ ہے اور کسی بھی اسرائیلی کتاب میں یہ نہیں ہے۔ لیکن قربان جایئے نبی علیہ الصلوۃ و السلام کی نبوّت و رسالت پر جنہوں نے بغیر پڑھے لکھے ہوتے ہوئے بھی اِس وحی میں بدنِ فرعون کا تذکرہ فرمایا حالانکہ آپ نے کبھی مصر کا سفر نہیں کیا تھا اور نہ ہی فرعون کی لاش کو دیکھا تھا۔ آج دنیا کے سیاح اِس لاش کو قاہرہ (مصر) کے عجائب خانہ میں دیکھ کر زبانِ انصاف سے قرآن کی حقانیت کی گواہی دے رہے ہیں اور یہود و نصاریٰ کا یہ الزام کس قدر رکیک ہے کہ مسلمانوں کے نبی نے انجیل' تورات و زبور سے خبریں لے کر قرآن بنا دیا اور اُسے اللہ کی طرف منسوب کر دیا (العیاذ باللہ)۔

(۶) (Condominium) وہ عمارت جس میں فلیٹ افراد کی نجی ملکیت ہوں
اصل قرآنی متن اور ترجمہ و تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۲۹۵' ۲۹۶

(۷) (Conservation Area):

(ایسا علاقہ جس میں کسی اہم قدرتی ماحول کو ناپسندیدہ تبدیلیوں کے خلاف خاص طور پر قانونی تحفظ دلایا گیا ہو۔)

نوٹ : اِس سے قبل آیت ۹۱ میں بتایا گیا کہ فرعون کا ایمان ڈوبتے وقت قبول نہ ہوا حالانکہ اُس کے جادوگروں کا ایمان قبول کر لیا گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایمان وہی معتبر ہے جو موت کے آثار ظاہر ہونے سے پہلے لایا جائے۔ فرعون کا ایمان لانا تو موت کے ڈر سے تھا اس لئے قبول نہ ہوا۔ دوسری وجہ یہ کہ قانونِ شریعت میں ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ اور اُس کے رسول دونوں پر لایا جائے۔ جادوگروں نے رب تعالیٰ اور اُس کے انبیائے کرام دونوں کا نام لیا تھا آمَنَّا بِرَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ جس سے نبی کے وسیلے سے ایمان کا ثبوت ہوا' اس لئے قبول ہوا۔ لیکن فرعون صرف اللہ پر ایمان لایا آمَنْتُ أَنَّهُ' لَا إِلٰهَ إِلَّا الَّذِي آمَنَتْ بِهِ بَنُوْا إِسْرَائِيلَ اور اُس کا نبوّت پر ایمان قطعاً ثابت نہ ہوا۔

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اِنَّمَاالْمُشْرِکُوْنَ نَجَس "فَلاَ یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا (التوبۃ:۲۸)

"اے ایمان والو! مشرکین تو نرے ناپاک ہیں' سو اِس سال کے بعد تو وہ مسجدِ حرام کے پاس بھی نہ آنے پائیں"۔

مسجدوں میں کافروں کے داخلے کی شرعی حیثیت: نجاست سے مراد نجاستِ عقائد ہے نہ کہ نجاستِ اجسام۔ مشرکین اہلِ ذمہ کا مسجدِ حرام اور دیگر مساجد میں داخلہ جائز ہے۔ کیونکہ (۱) اگر مشرکین کو مسجد میں مطلقاً داخل ہونے سے منع کرنا مقصود ہوتا تو "اِس سال یعنی ۹ ہجری کے بعد" کی قید لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ (۲) مشرکین کو اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے قریب جانے سے ممانعت کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اور اگر تمہیں تنگدستی کا خوف ہو تو اگر اللہ نے چاہا تو وہ عنقریب اپنے فضل سے تمہیں غنی کردے گا"۔ اور تنگدستی کا خوف اِسی صورت میں ہوسکتا تھا کہ مشرکین کو حج کے لئے آنے سے روک دیا جائے کیونکہ حج کے موقع پر مشرکین کے آنے سے مسلمانوں کو تجارت میں بہت فائدہ ہوتا تھا اور اُن کے نہ آنے سے اس تجارت کے منقطع ہونے کا خدشہ تھا۔

مسجدوں میں کافروں کے داخلے کا جواز مع دلائل: جیسا کہ بیان ہوا کہ کفار و مشرکین کے عقائد نجس گندے ہیں نہ کہ جسم۔ اگر مشرک یا کافر کو سات سمندروں میں غسل دیا جائے تب بھی وہ نجس ہی ہے کیونکہ اُس نجاست شرک کی وجہ سے ہے اور شرک پانی سے نہیں' ایمان سے ہی دُھلتا ہے۔ مشرکین اور کفار مسجدوں میں ا عبادت نہیں کرسکتے' دوسرے کاموں کے لئے مسلمانوں کی اجازت سے آسکتے ہیں۔ اِس مسئلہ پر چند دلائل قائم ہیں

(۱) رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش فرعون کے گھر اور امام الانبیاء ﷺ کی پرورش جنا ابو طالب کے گھر کرائی۔ اگر یہ لوگ نجس العین ہوتے تو اللہ تعالیٰ اپنے نبیوں کی پرورش اِن نجس لوگوں کے ہا نہ کراتا۔ (۲) آیت مذکور میں ارشاد ہوا کہ مشرکین اِس سال کے بعد یعنی اگلے سال سے مسجد حرام کے قریب آئیں۔ معلوم ہوا کہ اُنہیں حج سے روکا جارہا ہے نہ کہ مطلقاً آنے سے۔ ورنہ فرمایا جاتا کہ آج ہی سے نہ آئیں۔ (۳) حضور ﷺ نے یہودی کے ایک بچے کو مسجدِ نبوی میں جھاڑو دینے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ آخر کار وہ مؤمن ہو فوت ہوا لیکن جھاڑو دیتے وقت تو وہ کافر ہی تھا۔ (۴) حضور ﷺ نے ایک بار کفار کی ایک جماعت کو مسجدِ نبوی شریف میں اتارا۔ (۵) حضور ﷺ اور خلفائے راشدین مسجد میں کچہری کرتے تھے اور وہیں مقدمات طے کر تے تھے اور ظاہر ہے کہ مقدمات مسلمانوں کے بھی آتے تھے اور کفار کے بھی۔ اور کفار مقدمہ کے سلسلے میں مسجد میں حا ہوتے تھے۔ (۶) اگر مشرکین نجس العین ہوں تو مسلمانوں کی زندگی ناممکن ہوجائے۔ آج ہمارے ہاں اکثر و بیشتر چیز غیر مسلم ممالک سے آتی ہیں جنہیں ہر ملک کے مسلمان استعمال کرتے ہیں۔ (۷) اگر کفار کا مسجد میں آنا مطلقاً ممنوع بہت مشکل پڑ جائے۔ اکثر مستری' مزدور' انجینئر کافر ہوتے ہیں جن سے مسجدیں تعمیر کرائی جاتی ہیں اور اُن بغیر کام نہیں چلتا۔ (تفسیر نعیمی از حکیم الامت مفتی احمد یار خاں گجراتی' جلد ۱۰' صفحہ ۲۴۷' ۲۴۸)۔

گیا ہے۔ یہ بات مجھ پر واضح اور عیاں ہے کہ یہ بیانات محمد ﷺ کے پاس اللہ کی طرف سے آئے کیونکہ یہ تمام تر علم اُن کی وفات سے کئی صدیوں بعد تک کسی کو معلوم نہیں تھا اور میرے نزدیک یہی ثبوت کافی ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''

ڈینئل باغ انسٹی ٹیوٹ کے شعبہ تشریح الاعضاء (Anatomy) کے ڈائریکٹر پروفیسر اور چیئرمین مارشل جانسن اور فلاڈیلفیا (یو ایس اے) یونیورسٹی کے تھامس جیفرسن نے کہا تھا:۔

''بطور ایک سائنسدان کے مجھے صرف اُن چیزوں سے سروکار ہے جو بالخصوص میرے مشاہدے میں آتی ہیں۔ میں جنین اور ترقیاتی حیاتیات کو سمجھ سکتا ہوں۔ میں اُن الفاظ کو بھی سمجھتا ہوں جو قرآن کے ترجمہ سے مجھ تک پہنچے ہیں۔۔۔۔ مجھے اس نظریہ کی تردید میں کوئی ایسی شہادت نہیں ملی کہ محمد ﷺ نامی یہ فرد کہیں جگہ سے یہ معلومات حاصل کرتا ہے اور میرے پاس اس نظریہ سے متصادم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ یہ شخص جو کچھ بھی کہہ رہا ہے وہ صرف خدائی کلام کو اپنی زبان سے کہہ رہا ہے۔''

(۴) انسانی ہوابازی کی پیش گوئی : قرآن مجید میں پیغمبر سلیمان علیہ السلام کا قصہ ہوابازی کی ایجاد کی اس طرح پیش گوئی کرتا ہے:۔

(i) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (الانبیاء: ۸۱)
''اور ہم نے زوردار ہوا کو سلیمان کے تابع (کردیا تھا) کہ وہ اُن کے حکم سے اُس سرزمین کی طرف چلتی جس میں ہم نے برکت رکھ دی ہے۔'' (۸۱ : ۲۱)

یعنی ملکِ شام کی طرف کہ وہ جب بھی باہر جاتے تو واپس ہوا کے ذریعہ سے آتے تھے۔

(ii) وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ (سبا: ۱۲)
''اور ہم نے سلیمان کے لئے ہوا کو مسخر کردیا کہ اُن کی صبح کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی اور شام کی منزل مہینہ بھر کی ہوتی۔'' (۱۲ : ۳۴)

یوں کہئے کہ بڑے بڑے تیز رفتار ہوائی جہاز آپ کے تابع تھے اگرچہ وہ تیل، مشینری اور انجن وغیرہ کے بغیر براہِ راست قدرتِ الٰہی سے چلتے تھے۔

علاوہ ازیں ہوابازی سے متعلق مخصوص ناموں مثلاً ہوائی اڈہ، رن وے، آکسیجن ماسک۔ کنٹرولنگ ٹاور، ہوائی جہاز کے اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے کا بالواسطہ ذکر قرآن میں ہے جس کے لئے ''ہوابازی'' کا عنوان دیکھ لیا جائے۔

(۸) بڑی شاندار عمارت (Edifice):

وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِأَيْدِيْهِمْ وَأَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ (الحشر:۲)

''اللہ نے اُن (یہود کے قبیلہ بنی نضیر) کے دلوں میں رُعب ڈال دیا تو وہ اپنے (عالیشان) گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے اُجاڑ رہے تھے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔''

(۹) جنگلہ (Fence)

فَأَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ٥ (الکہف:۹۵)

''(ذوالقرنین نے کہا) تم میری مدد محنت سے کرو تو میں تمہارے اور اُن (یاجوج ماجوج) کے درمیان مضبوط آڑ بنا دوں۔''

(۱۰) بنیاد (Foundation)

أَفَمَنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ ''
أَمْ مَّنْ أَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى شَفَا جُرُفٍ هَارٍ (التوبۃ:۱۰۸)

''سو آیا وہ شخص جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقوٰی اور رضا مندی پر رکھی وہ بہتر ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد کسی گھاٹی کے کنارہ پر رکھی جو گرنے ہی کو ہے۔''

آیت سے اخذ کردہ چند مفید نکات: (۱) مسجد حلال پیسہ، خلوص اور نیک نیتی سے بنائی جائے جیسا کہ قرآنی عبارت لَمَسْجِدٌ'' أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى سے ظاہر ہے۔ (۲) مسجد کا سنگِ بنیاد کسی مقبول و محبوب بندے سے رکھایا جائے اور مقبول و محبوب ہی سے اس کا افتتاح کرایا جائے کہ مسجد قُبا کی بنیاد کا پتھر خود امام الانبیاء ﷺ نے رکھا۔ رب نے اُسے لَمَسْجِدٌ'' أُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى (وہ مسجد جس کی بنیاد تقوٰی پر رکھی گئی) کا خطاب عطا فرمایا۔ (۳) منافقین اور کفار کا وقف شرعاً درست نہیں اس لئے اُس مسجد (ضرار) کو بحکمِ الٰہی گرا دیا گیا۔ جب اُس پر مسجد کا اطلاق ہوتا ہی نہیں تو اُس کے گرا دینے میں کوئی گناہ نہیں۔

(۱۱) زنگ سے بچانے کے لئے لوہے پر قلعی یا جست کا پچارا پھیرنا (Galvanize):
(دیکھئے سورۃ الکہف کی آیت ۹۶ میں ذوالقرنین کا قول)

(۱۲) دروازہ (Gate) جو اندر آنے اور باہر جانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔
(دیکھئے سورہ یوسف کی آیت ۶۷ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی اپنے فرزندان کو نصیحت)

(۱۳) ناقابلِ تسخیر (Impregnability)
(دیکھئے سورۃ الکھف کی آیت ۹۷ میں یاجوج ماجوج کی عدمِ استطاعت)

(۱۴) فولادی ساخت (Leaded Structure)
سورۃ الصّف کی آیت چہارم میں ہے کہ ''اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ میں ایسے لڑتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی گئی عمارت ہوں۔''

(۱۵) سطح ہموار کرنا (Levelling of Surface)
(دیکھئے سورۃ الکھف کی آیت ۹۶ میں حضرت ذوالقرنین کا عمل)

(۱۶) افرادی قوت (Man-power)
(دیکھئے سورۃ الکھف کی آیت ۹۵ میں حضرت ذوالقرنین کا قول)

(۱۷) مستری (Mason) (دیکھئے سورہ صٓ کی آیت ۳۷)

(۱۸) فنِ تعمیر (Masonry)
(دیکھئے سورۃ الکھف کی آیت ۷۷ جس میں خضر علیہ السلام نے یتیموں کی ایک دیوار تعمیر کردی)

(۱۹) متفرق ساز و سامان (Paraphernalia)
(دیکھئے سورۃ الکھف کی آیت ۹۶ میں حضرت ذوالقرنین کا عمل)

(۲۰) کسی بلند عمارت کی بالائی منزل کی چھت پر واقع گھر (Penthouse)
(دیکھئے سورہ سبا کی آیت ۳۷ کا آخری حصہ)

(۲۱) ستون (Pillars)
''قومِ اِرم ستون جیسے قد والی جس کا مثل شہروں میں پیدا نہیں کیا گیا۔'' (سورۃ الفجر: ۶، ۷)

(۲۴) چھت (Roof): (دیکھئے سورۃ الزخرف کی آیات ۳۳ تا ۳۵)

(۲۴) عبادت خانہ (Sanctuary)

(i) اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝ (آلِ عمران:۹۶)

"کچھ شک نہیں سب سے پہلا مکان جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا، وہ وہ ہے جو مکّہ میں ہے، برکت والا اور سارے جہان کے لئے رہنما ہے۔"

مراد خانہ کعبہ ہے جس کی اوّلیت اور اَقدمیت کی تشریح احادیثِ نبویہ، صحابہ کرام اور تابعین کے اقوال میں ملتی ہے۔ کعبہ کو مَعۡبَد بتلا کر یہود کو یہ بھی جتلا دیا گیا کہ کعبہ تو بیت المقدس سے بھی قدیم تر ہے۔ بَکَّۃ مکّہ ہی کا دوسرا نام ہے (تفسیر کشاف لزمخشری)۔ عربی میں ایک قاعدہ ہے جس سے حرف م اور حرف ب میں اکثر تبادلہ ہوتا رہتا ہے مثلاً لازم اور لازِب۔ راتم اور راتِب۔ نمیط اور تبیط۔ اِسی قاعدہ کا عمل یہاں بھی ہوا۔

چونکہ خانہ کعبہ کی افضلیت و اوّلیت دونوں کے یہود منکر تھے، اس لئے اِس آیت کو اِنَّ کے تاکیدی لفظ سے شروع کیا گیا۔ عربی میں اوّل وہ فرد ہے جو اپنے ماسواء سے پہلے اور سابق ہو اس طرح کہ کوئی نہ اُس سے پہلے ہو اور نہ اُس کے ساتھ اور نہ بعد میں کچھ ہو۔ جیسے آخر وہ ہے جس کے بعد اور ساتھ کوئی نہ ہو۔ بَیۡت چھت والی عمارت کو کہتے ہیں جس میں بَیۡتُوۡتَت یعنی شب گزاری جائے۔ حجرہ یا کمرہ والے پورے گھر کو جس میں صحن وغیرہ بھی ہو، دار کہا جاتا ہے اور پوری گڑھی کو جس میں اصطبل وغیرہ بھی ہوں، مَنۡزِل کہا جاتا ہے۔ چونکہ خانہ کعبہ صرف چھتی ہوئی عمارت کا نام ہے جس میں صحن وغیرہ نہیں، اس لئے اُسے بَیۡت کہا گیا اور چونکہ وہاں نہ کوئی رہتا ہے، نہ وہ کسی کی ملکیّت ہے اور نہ وہاں کسی قسم کا کام ہوتا ہے، صرف اللہ کا کام حج یا نماز ہوتی ہے، اِس لئے اُسے بَیۡتُ اللہ کہا جاتا ہے۔ لَلَّذِیۡ میں ل تاکیدی پھر اِسی لئے لایا گیا تاکہ یہود کے انکار کا ردّ ہو جائے کہ وہ اس کی افضلیت اور اقدمیت کے منکر تھے۔ تفسیر خازن اور کبیر نے مکہ معظمہ کے سولہ نام گنوائے ہیں۔ اسی طرح کعبہ کے بہت سے نام ہیں: کعبہ، بیت العتیق، بیت اللہ، بیت الحرام۔ ان تمام ناموں کے معانی اور وجہ تسمیہ اسی مقام پر تفسیر کبیر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مُبَارَک بَرَک سے بنا بمعنیٰ بیٹھ جانا، لازم ہو جانا۔ اصطلاح میں اس کے معنیٰ بڑھنا اور زیادہ ہونا بھی ہیں اور بقائے دوام بھی۔ چونکہ مکہ مکرّمہ میں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے اور وہاں ہر طرف سے لوگ اور پھل و دانے کھنچ کر پہنچتے ہیں اور کعبہ مثلِ مرکز ہے، اس لئے اسے مُبَارَک فرمایا گیا۔ ھُدًی بمعنیٰ ہدایت دینے والا یا باعثِ ہدایت۔ چونکہ کعبہ معظمہ انسان، جنّات بلکہ فرشتوں کا بھی قبلہ ہے، اس لئے اسے عالمین کی ہدایت فرمایا گیا۔

نــوٹ : سب سے پہلے اور سب سے پیچھے ہونا بھی وجہِ افضلیت ہے۔ رب تعالیٰ نے کعبہ کی افضلیت اُس کی اوّلیت سے ثابت فرمائی اور ہمارے نبیِ مکرّم کی افضلیت آپ کی خاتمیت یعنی آخریّت خَاتم النَّبِیّٖن کہہ کر ثابت فرمائی۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اوّلیت و آخریّت میں کوئی فضیلت نہیں' غلط ہے اور اِس آیت کے خلاف ہے۔

اوّلیتِ کعبہ اور اُس کی تعمیر: ''الازرقی نے ''اخبارِ مکّہ'' میں لکھا کہ کعبے کو سب سے پہلے فرشتوں نے اُس وقت تعمیر کیا جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ سے منقول ایک روایت پیش کرتے ہیں۔ مزید براں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت اِس سلسلے میں منقول ہے۔ النووی نے بھی اپنی کتاب ''تہذیب الاسماء واللغات'' میں فرشتوں کی تعمیر کعبہ کا ذکر کیا اور اُسے کعبے کی اوّلین تعمیر قرار دیا۔ اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے کعبے کو تعمیر کیا۔ اس کے ثبوت میں البیہقی نے ''دلائل النبوّۃ'' میں ایک مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حضرت آدم و حوّا کی طرف بھیجا اور اُنہیں کعبے کی تعمیر کا حکم دیا۔ چنانچہ اُنہوں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ جب تعمیر مکمل ہوگئی تو اُنہیں طواف کا حکم دیا گیا۔ پھر مرورِ زمانہ کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے کعبے کا حج کیا۔ الازرقی نے بھی آدم علیہ السلام کی تعمیرِ کعبہ کا ذکر کیا اور اس کی تائید میں دو روایات نقل کی ہیں۔ مشہور محدّث عبدالرزاق اپنی کتاب ''المصنف'' میں لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے کعبے کی تعمیر میں پانچ پہاڑوں یعنی لبنان' طورِ زیتا' طورِ سیناء' الجُودِی اور حراء کے پتھر استعمال کیے۔ آدم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد اُن کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام نے کعبے کی تعمیرِ ثانی میں حصّہ لیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کا ذکر تو خود قرآن مجید نے کیا ہے۔ الماوردی نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعمیر کے بعد قریش میں قصّی بن کلاب پہلا شخص تھا جس نے کعبے کو ازسرِ نو تعمیر کیا۔'' (اردو دائرہ معارف اسلامیہ دانش گاہ پنجاب لاہور' ج ۱۷' ص ۳۲۴' ۳۲۵)

ہدایت اور اس کا مفہوم : ''ہدایت بہ معنیٰ رہبری کرنا اور منزلِ مقصود کا پتہ ونشان دینا۔ ہدایت چند طرح کی ہے: (۱) ہدایتِ الہامی جو بغیر کسی کے بتائے خود بخود حاصل ہو جیسا کہ بچے کا شیرِ مادر چوسنا اور رو رو کر ماں کو اپنی طرف مائل کرنا (۲) ہدایتِ احساسی جو کہ حواس درست ہونے کے بعد حاصل ہو جیسے بچّہ ہوش سنبھالنے کے بعد اچھی بُری چیز میں فرق کرتا ہے۔ (۳) ہدایتِ عقلی (یا ہدایتِ نظری) جو عقل کی مدد سے حاصل ہو۔ یہ دلائل سے حاصل ہوتی ہے یعنی انسان اپنی عقل کی مدد سے دلائل قائم کرے اور پھر اُس سے نتیجہ نکالے۔ (۴) ہدایتِ الٰہیہ جو کہ پیغمبروں کی مدد اور حق تعالیٰ کے خاص کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی جن چیزوں کو ہم عقل اور دلائل سے معلوم نہیں کر سکتے' اُس کی رہبری کے لئے حق تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بھیجا۔'' (تفسیر نعیمی' ج ۱' ص ۸۷)

(ii) جَعَلَ اللهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ (المائدۃ : ۹۷)
''اللہ نے کعبہ کے مقدس گھر کو انسانوں کے باقی رہنے کا مدار ٹھہرایا ہے۔''

قِیٰمًا یعنی لوگوں کی حفاظت و نگہداشت کا ذریعہ اور واسطہ اور پھر قِیٰمًا الْمُعَرَب نہیں بلکہ قِیٰمًا الِّلنَّاس یعنی ساری کائناتِ انسانی اِسی کے نام سے قائم اور انسانیت کی سانس اِسی کے وجود سے وابستہ۔ گویا اس میں اس کا وعدہ بھی آ گیا کہ جب تک انسانی آبادی قائم ہے، خانہ کعبہ کا وجود بھی باقی رہے گا۔

''اسلام کا انتہائی مقدس شِعار اور عبادت گاہ یعنی کعبۃ اللہ رُوح کے عمودی خط اور انسانی وجود کی اُفقی سطح کے درمیان چوراہے کی علامت ہے۔ یہ اندر سے خالی پتھروں کی بنی ہوئی مکعب نما عمارت ہے اور اسلامی آفاقیات کا مرکز و محور ہے۔'' (The Encyclopedia of Religion ... Mircea Eliade, Vol. 1, p. 384)

''ہزار ہا سال سے انسانی کہکشاں کعبہ کے اردگرد گھومتی رہی ہے جو کہ ساری دُنیا کی محرابوں کا برقی سَیل ہے۔ ہر حاجی اس کے گرد یوں گھومتا ہے جیسے ایک سیارہ سورج کے گرد گھومتا ہے۔ دائمیّت اور ابدیّت (ہمیشہ رہنے والا) کا پہیّہ یوں گھومتا ہے جیسے ایک سحابیہ (ستاروں کے درمیان نظر آنے والا مدھم روشن اور گیسوں یا چھوٹے ذرّات سے بنا ہوا اَبین الکواکبی بادل) گھومتا ہے۔ یہاں پہنچ کر انسان کی انفرادیت گم ہو جاتی ہے اور تمام لوگ ایک ہی وحدت میں پروئے ہوئے اس طرح نظر آتے ہیں جیسے اناج کے بیج آپس میں گتھے ہوئے مربوط ہوتے ہیں۔۔۔۔ کعبہ اپنے سنہری سوزن کاری کئے ہوئے کالے ریشمی غلاف میں اپنی اردگرد کی دنیا کے امتیازات کو مٹا دیتا ہے اور اپنے جھنڈے کو سیاہ، غیر متحرک اور لامتناہی آفاقیت میں لہراتا ہے۔'' ("The Mosque -- Mirror of Islam" --- W. A. France, pp. 74, 76) 1985 Edition.

(۲۴) سیڑھی:

أَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ○ (الطُور:۳۸)
''کیا اُن کے پاس کوئی سیڑھی ہے کہ اُس کے ذریعے سے وہ (آسمانی) باتیں سن لیا کرتے ہیں؟ تو اُن میں سے جو سن آتا ہو وہ (اپنے دعوٰی پر) کوئی کھلی دلیل لائے۔''

یعنی کیا آسمانی اور قطعی علم کے دعویداروں کے پاس اپنے خرافاتی دعووں پر کوئی وزنی دلیل بھی ہے؟

(۲۵) تہہ خانہ :

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ (الانعام : ۳۵)

''(اے نبی مکرّم!) اگر آپ پر اُن کی رُوگردانی گراں گزرتی ہے تو اگر آپ کے بس میں ہو کہ زمین (میں جانے) کے لئے کوئی سُرنگ یا آسمان (پر جانے کے لئے) کوئی زینہ ڈھونڈ لیں تو اُن کے لئے ضرور کوئی نشانی لے آئیں۔''

معجزہ نبی کے اختیار میں ہوتا ہے یا نہیں؟ آیت مذکورہ کے لفظ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ (اگر آپ کے بس میں ہو) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے مقابلہ میں کسی نشانِ اور معجزہ کو ظاہر کرنا نبی ﷺ کے اختیار میں نہیں ہے۔ نبی کے ہاتھوں کسی معجزے کا ظاہر کرنا یا نہ کرنا اُس ذاتِ کردگار پر موقوف ہے اور یہی عقیدہ حقیقتِ ثابتہ اور برحق ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو قدرت اور اختیار عطا فرمایا ہے لیکن اِس قدرت اور اختیار کا یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں قادر ومختار ہیں حتّٰی کہ جس کام کو اللہ نہ چاہے' آپ اُسے کرسکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نہ یہ کہنا درست ہے کہ کوئی معجزہ نبی ﷺ کے اختیار میں نہیں ہے اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے کہ تمام معجزات نبی ﷺ کے اختیار میں ہیں۔ مثلاً قرآنِ حکیم نبی ﷺ کا معجزہ ہے لیکن اُس کا نزول آپ کے اختیار میں نہیں ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے امام غزالی سے نقل کیا کہ بعض خصائص کی وجہ سے نبی عام انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے اور اُن خصائص میں سے ایک یہ ہے کہ جس طرح عام انسانوں کے اختیار میں افعالِ عادیہ ہوتے ہیں' اُسی طرح نبی کے اختیار میں افعالِ غیر عادیہ یعنی معجزات ہوتے ہیں (فتح الباری: ج ۱۲' ص ۶۷' طبع لاہور ؛ احیاء العلوم : ج ۵' ص ۵۳ طبع بیروت بحوالہ تبیان القرآن' ج ۳)

(۲۶) مزدوری کا معاوضہ (Wages): سورۂ الکھف کی یہ آیت ۷۷۔

فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ' قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا٥

''پھر دونوں (موسیٰ وخضر علیہما السلام) کو اُس (بستی) میں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی' سوخضر نے اُسے سیدھا کر دیا۔ (موسیٰ نے) کہا اگر آپ چاہتے تو اِس (کام) پر اجرت ہی لے لیتے۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنا حق وصول کرنا خواہ کسی شکل اور کسی طریقے سے ہو' جائز اور ضروری ہے (سورۂ القصص: ۷۷) لیکن طریقت اور تصوّف میں حق چھوڑ دینا زیادہ افضل ہے جیسا کہ مذکورہ آیت ۷۷ کے آخر الفاظ سے معلوم ہو رہا ہے۔

انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا کی جلد دوم صفحات ۲۸۵، ۲۸۶ پر فنِ تعمیرات کی حسب ذیل پانچ قسمیں ملتی ہیں:
(۱) صنعتی عمارات (جن میں تجارتی تعمیرات شامل ہیں)
(۲) سماجی عمارات (جن میں مکانات، کمرے، فلیٹ اور ہوٹل شامل ہیں)
(۳) تعلیمی عمارات (سکول، کالج اور یونیورسٹیز اِس قسم میں آتے ہیں)
(۴) سرکاری عمارات (جیسے اقوامِ متحدہ کی عمارت)
(۵) مذہبی اور یادگاری عمارات۔

اسلامی روایات کی تشہیر اور اسلامی ثقافت و تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمان حکمرانوں نے اپنی قلمرو میں فنِ تعمیرات کی تاریخ میں اَن مٹ نقوش چھوڑے۔ ہسپانوی مسلم حکمرانوں کا ذوقِ تعمیرات خوب تھا اور اُنہوں نے وہاں عمارات، شاہراہوں، عبادت گاہوں اور دریاؤں کی شکل میں متعدد باقیات چھوڑی ہیں۔ سپین سول انجینیرنگ میں اقوامِ عالم میں سب سے آگے تھا۔ ہمارے آباء و اجداد کی بنائی ہوئی اِن عمارات میں سے چند توصیفی عمارات کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے :۔

(۱) مسجدِ قرطبہ: یوں لگتا ہے کہ قرطبہ کی عظیم و عالیشان مسجد میں جنت کی دلبریں موسیقی کانوں میں رَس گھول رہی ہے۔ یہ مسجد حسرتناک خواب کی پیداوار ہے جسے آخری اُموی شہزادے نے تعمیر کرایا جو اُس قتلِ عام سے بچ نکلا تھا جس میں نئے خاندانِ عباسیہ نے اُس کے خاندان کو ۷۵۰ عیسوی میں دمشق میں تباہ و برباد کر دیا تھا۔ یہ واقعہ خلافت پر اُن کے قبضہ کرنے اور اُس کے دارالخلافہ کو بغداد منتقل کرنے سے پہلے کا ہے۔

''ہسپانوی مسلم فن مسلمانوں کے سپین میں پہنچنے کے پچھتر سال بعد ۷۸۵ء میں اِس مسجد کی تعمیر سے شروع ہوا۔ جلاوطن عبدالرحمٰن اوّل (الداخل) نے اسے ۷۸۵ء میں تعمیر کرایا اور اُس کے جانشینوں نے ۸۳۲ تا ۸۴۸ء، پھر ۹۱۲ء میں اور بالخصوص ۹۶۱ء میں حَکَم ثانی نے اس کی توسیع کی۔ مسجد کے حیرت زا محرابوں اور گنبدوں کا تمام تر سہرا اِسی حَکَم ثانی کے سر ہے۔ ۹۸۷ء میں عباسی خلیفہ منصور نے مسجد کے رقبہ میں اضافہ کیا اور نماز پڑھنے کے ہال کے سائز کو دوگنا کر دیا اور اب اس میں تقریباً چھ سو ستون ہیں۔''

''نیم دائروی آرائشی محرابیں، گھوڑے کے سُموں جیسی محرابیں، پانچ سے زائد آرائشی محرابوں کا مجموعہ جو اپنے مخملی آرائشی جھالروں میں چھوٹی چھوٹی موجوں کو ظاہر کرتا ہے، ستونوں کے بالائی حصّوں پر ایک پائدار جیومیٹریکل ساخت کا کام اور پھول جن کا تصوّر صرف خواب ہی میں ہوسکتا ہے، یہ سب اُس کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔''

مسجدِ قرطبہ پر علامہ اقبال کی ایک طویل نظم اُن کے مجموعہ کلام ''بالِ جبریل'' میں ملتی ہے۔ یہ نظم اُن مخفی رازوں کو عیاں کرتی معلوم ہوتی ہے جو مسلمانوں کے عروج و زوال کے پسِ پردہ کارفرما تھے اور آج کے مسلمان کو انقلابِ عظیم کا سبق مہیا کرتی ہے۔

ایک انگریز مؤرخ کے الفاظ میں ''جو کچھ بھی انسانی آنکھ نے مشاہدہ کیا ہے' مسجدِ قرطبہ اُن سب میں بڑھ کر دلکش اور دل آویز ہے۔ اِس جیسی کاریگری' صنّاعی اور عظمتِ شان کسی بھی قدیم یا جدید آثار میں نہیں ملتی۔''

(۲) الحمرا: ''آسمان اور زمین کے درمیان الحمراء سورج کی روشنی میں نہائے ہوئے اپنے میناروں اور فصیلوں میں سنہرے شمع دان لئے یوں لگتا ہے کہ وہ سائرہ کے برفانی علاقے سے اُتر آیا ہوا اُس فانوس کی طرح جسے روشنی پکڑنے اور اسے منعطف کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ اُس کے زیریں حصّے میں صنوبر کے درخت ملتجیانہ انداز میں اپنے باز و شہر کی طرف' پہاڑوں کی طرف اور آسمان کی طرف پھیلائے ہوئے یوں لگتے ہیں جیسے کانسی کی موم بتیاں ہوں جن پر آفتاب اپنے غروب ہوتے وقت سبز شعلے روشن کر رہا ہو۔''

''اگرچہ الحمراء کوئی مذہبی عمارت نہیں بلکہ یہ ایک شاہی رہائش گاہ ہے۔ اس کے وسطی صحن میں تالاب ہیں جو یا تو آئینوں کی طرح خاموش ہیں' یا چشموں کی طرح سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ کمروں کی چھتیں قبّوں تک بلند ہیں۔ ناصری بادشاہوں کا مقولہ کہ ''ہر فتح و کامرانی صرف اللہ تعالیٰ کی ہے'' ہر دیوار پر آویزاں ہے۔ الحمراء جس میں اسلامی ذوقِ جمالیات مترشح ہے' ہم میں خوش کن وحشت پیدا کرتا ہے اور ہم ایک اور زمان و مکان میں منتقل ہو جاتے ہیں جس کی ساخت اور خوش آہنگی ہمارا تعلق دوسری دنیا اور دوسری زندگی سے جوڑ دیتی ہے جو اُس زندگی سے ممتاز اور ارفع ہے جس سے ہم متعارف ہیں۔''

(۳) تاج محل : شہنشاہ شاہجہان نے اپنی چہیتی بیوی ارجمند بانو بیگم کے لئے یہ خوبصورت مقبرہ آگرے کے مقام پر بنوایا تھا۔ ''تاج محل'' بیگم کے لقب ''ممتاز محل'' کی تحریف ہے۔ ایک لڑکی کی پیدائش کے بعد حالتِ زچگی میں جون ۱۶۳۱ء میں وہ برہان پور میں فوت ہوگئی۔ زین آباد (نواح برہان پور) میں اُسے امانتۃً دفن کیا گیا لیکن شاہجہان نے جسے اُس کی موت کا شدید قلق ہوا' یہ عہد کیا کہ وہ اُس کی شان کے مطابق مقبرہ تیار کرا کے باہمی محبت کی یاد کو زندہ جاوید کردے گا۔ اس لئے اُس کی میّت آگرے میں لائی گئی جہاں راجہ جے سنگھ سے ایک قطعہ زمین حاصل کر کے اُسے اس میں دفن کیا گیا اور اسی موقع پر مقبرہ تاج بہ صَرف پچاس لاکھ روپیہ تعمیر ہوا۔ اِس مقبرے کی تعمیر اپنی ملحقہ عمارتوں کے ساتھ بائیس برس سے زیادہ مدت تک جاری رہی اور

اس مدت میں بیس ہزار کاریگر لگاتار کام کرتے رہے۔ ملک بھر کے بہترین ماہرینِ عمارات کی ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں نقشے پیش ہوئے اور بالآخر جو نقشہ منظور ہوا' وہ استاد عیسیٰ کا تھا۔''

''مقبرہ جو جودھ پوری سنگِ مرمر سے تعمیر ہوا' ایک اونچے چبوترے پر قائم ہے جو ۱۸ فٹ اونچا اور ۳۱۳ فٹ مربع ہے۔ اس کے ہر کونے پر ایک نہایت خوبصورت تناسب کا مینار ہے جو ۱۳۳ فٹ بلند ہے اور جس کے اردگرد تین چھجے ہیں اور چوٹی پر ایک کھلی قبہ دار چھتری ہے۔ اس چبوترے کے عین وسط میں مقبرہ ہے جو ۱۸۶ فٹ مربع ہے جس کے کونے ۳۳ فٹ ۹ اِنچ کی گہرائی تک تراش دیے گئے ہیں۔ مقبرے کے وسط میں سب سے بڑا گنبد ہے جس کا قطر ۵۸ فٹ ہے اور جو چھت سے ۷۴ فٹ یعنی چبوترے سے ۱۹۱ فٹ بلند ہے۔ عمارت کے ہر رخ پر بلند محراب دار رِواق ہے اور ہر رخ پر ایک چھوٹا سا دو منزلہ نشیمن ہے جس پر قبہ دار چھتری ہے اور ہر رِواق میں باہر والے تین رخوں میں چھ محراب دار طاق ہیں جو دو منزلوں میں منقسم ہیں اور جن سے جالی دار کھڑکیوں میں روشنی آتی ہے۔ اِن طاقوں اور بڑے رِواقوں پر محرابی چھتیں ہیں۔ گنبد کے نیچے عین وسط میں ممتاز محل کی قبر کا تعویذ ہے اور اس کے پہلو میں شاہجہان کی قبر کا۔ دونوں تعویذ کتبوں سے مزین ہیں۔ ان کے عین نیچے تہہ خانے میں جو زمین کی سطح کے برابر ہے' اصلی قبریں ہیں جن پر نقش و نگار تعویذوں کی نسبت کم ہیں۔ ساری عمارت کی خوبصورتی کو پچی کاری کی مفرط اور دلآویز آرائش سے چار چاند لگ گئے ہیں۔ روشنی صرف سفید سنگِ مرمر کے دوہرے باریک جالی دار پردوں کے ذریعے اندر آتی ہے۔ جالی کا کام بے حد نازک اور نفیس شکل کا ہے۔ ایک جالی دیوار کے بیرونی اور ایک اندرونی طرف ہے۔ مقبرے اور اس کے چبوترے سے پرے دائیں اور بائیں بازو کی عمارتیں ہیں جن میں سے ایک نہایت خوبصورت مسجد ہے۔ اِن عمارتوں کے مجموعے سے باغ کے صحن کا ایک پہلو ترکیب پاتا ہے۔ یہ صحن ۸۸۰ فٹ مربع ہے اور اس سے پرے بیرونی صحن ہے جس کی چوڑائی تو اتنی ہی ہے لیکن اس کی لمبائی (گہرائی) اس سے نصف کے قریب ہے۔ فرگوسن نے سچ کہا ہے کہ ''اتنے محاسن کے اجتماع نے اور اس اسلوبِ کامل نے جس سے ایک خوبی کو دوسری خوبی کے تابع رکھا گیا ہے' ایسی مکمل چیز پیدا کر دی ہے جس کا جواب دنیا میں نہیں مل سکتا۔'' (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ' دانش گاہ پنجاب لاہور' جلد ۶' صفحات ۲۱' ۲۲)

(۴) <u>قصرِ زہرا</u>: یہ محل عبدالرحمٰن اوّل (الداخل) نے اپنی بیوی زَہراء کی یاد میں دریائے گوادلیمار کے کنارے بنوایا جو قرطبہ سے ۴۰۰ میل غربی جانب ہے۔ اِس محل کا اس کے تعمیراتی شان و شوکت کے لحاظ سے کسی بھی عظیم تاریخی عمارتوں سے موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ محل کی تعمیر میں بغداد اور قسطنطنیہ جیسے دُور دراز علاقوں کے تجربہ کار مستری اور ماہر انجینئر لگائے گئے جنہوں نے کام میں ایسی ماہرانہ روح پھونکی

جس نے سیاحوں کی بے مثال مدح و ستائش حاصل کی۔ دُور دراز کے پہاڑوں کو کاٹ کر ایک نہر محل میں گزاری گئی جہاں وہ چھوٹی اور دائمی ندیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور نہ صرف محل کے تالابوں اور چشموں کو پانی مہیا کرتی ہے بلکہ مدینۃ الزہرا کی قریبی آبادی کو بھی۔ مدینۃ الزہرا اُس شہر کا نام ہے جو محل کے اردگرد اس کی تکمیل کے بعد آباد ہوا۔ مؤرّخین کے بیان کے مطابق محل دس ہزار مزدوروں کی محنت سے چار سال میں مکمل ہوا۔"

ایک ترک مؤرّخ مصطفیٰ صبا کے الفاظ میں "یہ محل دنیا کے ایسے عجائبات میں سے ہے کہ اس قسم کے ڈیزائن کا خیال روزِ آفرینش سے لے کر آج تک کسی کے دامانِ تصوّر کو چھو تک نہیں گیا اور انسانی ذہن ہر زمانے میں اس کے ڈیزائن کے حُسن کے متوازی یا کم از کم اس کے قریب تر پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے۔"

("Some Glittering Aspects of the Islamic Civilization")

اسلامی سپین کی سول انجینیئر نگ عالمِ اسلام میں ایک نمایاں مقام کی حامل ہے۔ ایک مشہور مستشرق منٹگمری واٹ کے الفاظ میں:

"تاہم یہ عربوں کی ہی ثقافت تھی جو نئی اسلامی تہذیب کا قالب بنی اور قدیم تر اور اعلیٰ تر ثقافت میں جو کچھ بھی عمدہ اور بہتر بات تھی' نئی ثقافت میں جذب ہو گئی۔" ("A History of Islamic Spain" p. 166)

(۵) سلیمانیہ مسجد: استنبول (ترکی) میں یہ مشہور مسجد دنیا کی عمدہ ترین مذہبی عمارتوں میں سے ایک ہے جسے ایک عظیم ترک معمار سنان نامی نے سولھویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا۔ اس کے بڑے مینار کی بلندی ۱۷۴ فٹ اور اس کا قُطر ۱۰۵ فٹ ہے۔ مسجد اپنی طرزِ تعمیر میں ہیئت ظاہری اور باطنی ہر لحاظ سے ممتاز مقام کی حامل ہے۔" ("A-One Comprehensive Gen. Knowlege" -- Mirza Muhammad Yusuf, p. 702)

(۶) بادشاہی مسجد: لاہور میں واقع ہے اور بجا طور پر اسے دنیا کی طویل ترین مسجد سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی سماجی زندگی میں اس مسجد نے ہمیشہ نمایاں اور فعّال کردار ادا کیا ہے۔ اسے اورنگ زیب عالمگیر نے ۷۴-۱۶۷۳ء میں تعمیر کرایا۔ صحن کا رقبہ ۵۲۸x۵۳۰ فٹ ہے اور بنیادوں سے قد آور میناروں کا فاصلہ ۶۷ فٹ ہے۔ (ایضاً' صفحہ ۷۰۳) مسجد ہٰذا کے پائدار دائمی دروازے ایک کشادہ چبوترے کی طرف کھلتے ہیں جس کے نیچے نبی اکرم ﷺ کے تبرّکات رکھے ہوئے ہیں۔

اسی طرح لال قلعہ دہلی' مقبرہ جہانگیر (لاہور) اور ملتان میں بہاء الدین زکریا سہروردی (متوفّی ۱۲۶۳ء/۶۶۱ھ) اور رکن الدین عالم (متوفّی ۱۳۳۷ء/۷۳۵ھ) کے مقبرے مسلمان حکمرانوں کے فنِ تعمیر میں ذوقِ جمالیات کے واضح آئینہ دار ہیں۔

(۵) آکسیجن رکاربن ڈائی آکسائیڈ کا اشارتاً ذکر قرآن میں ہے: ہوابازی کے تعارف اور ارتقائی بلندی کے تحقیقی عمل میں یہ حقیقت ہم پر کھلی کہ بلند تر اونچائی پر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینے میں دشواری محسوس محسوس ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں ہوائی انسان ایک خاص قسم کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ لہٰذا اس تکلیف دہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے ہوائی مسافروں کو آکسیجن ماسک دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ بہ آسانی سانس لے سکیں۔ ایک غیر خواندہ' جاہلی ماحول میں صدیوں پہلے قرآن مجید نے اس خیال سے متعلق ایک نمایاں تشبیہ اس طرح بیان کی ہے:۔

وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّه' يَجْعَلْ صَدْرَه' ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (الانعام : ۱۲۵)
''اور جس کے متعلق وہ گمراہ رکھنے کا ارادہ کر لیتا ہے تو اُس کے سینہ کو وہ تنگ اور بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے اُسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہو۔'' (۶ : ۱۲۵)

یقیناً یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرۂ ہوائی یا کرۂ قائمہ (سطح زمین سے تقریباً ۵۰ کلومیٹر بلند کرۂ اوّل stratospheric کی سیر (Excursions) سے بھی قبل کوہ پیما اس مفروضہ سے واقف تھے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اُس جاہلی ماحول میں ایسی بڑی حقیقت کا بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن واقعی اللہ کا کلامِ برحق ہے۔

''زیریں فضا میں وہ ہوا جو ہم بطورِ سانس لیتے ہیں' آکسیجن سے ترکیب پائی ہوئی ہے۔ زیریں فضا میں آکسیجن مالیکیولز دو ایٹموں سے ترکیب پائے ہوئے ہیں۔ تاہم بعض اوقات آکسیجن مالیکیولز تین ایٹموں سے بھی ترکیب پائے گئے ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں یہ مالیکیول آکسیجن نہیں بلکہ ''اوزون'' کہلائے گا۔ آکسیجن زیریں فضا میں پائی جاتی ہے جو عملِ تنفس (سانس لینے) کے ذریعے تمام جاندار چیزوں کی زندگی کا موجب ہے۔ اوزون ایک زہریلی' بدبودار گیس ہے جو فضا کے انتہائی بلند حصّہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر ہم آکسیجن کی بجائے اوزون گیس کو بطور سانس لیتے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچتا۔'' ("The Miracle in the Atom" .. Harun Yahya, pp. 82, 83)

(۶) قرآن مجید نے علمِ کیمیا کے حاصل کرنے میں انسان کی جو حوصلہ افزائی کی اور جو شوق دلایا' اس کے متعلق افضال الرحمن اپنی کتاب ''قرآنک سائنز'' کے صفحہ ۳۰۳ پر یوں رقمطراز ہیں:۔

''انسان اور اُس کا پورا ماحول عناصر اور مختلف مادّوں سے الٰہی قانون کے تحت ترکیب پایا ہوا ہے۔ انسان کی تخلیق مٹی سے ہوئی۔ آسمانوں اور زمین کی پیدائش چھ الٰہی مرحلوں میں اور کائنات کی پیدائش پانی سے ہوئی۔ آسمانوں' زمین اور انسان کی تخلیق میں الٰہی تخلیقی عمل سے متعلق قرآنی آیات نے سائنسی ذہن کو مختلف عناصر کے باہم اجتماع اور ایسی ترکیبات کے کیمیائی ردِّ عمل کے مطالعہ کی طرف راغب کیا ہوگا۔ مندرجہ ذیل آیت نے

(۹) فنونِ لطیفہ (ART)

"انسانی ہنرمندی اور فطری صلاحیت کے اظہار کا نام آرٹ ہے بالخصوص جبکہ وہ بصری شکل (دیکھے جانے کے قابل) میں ہو مثلاً پینٹنگ یا مجسمہ سازی (Oxford Advanced Learner's Dictionary)

بطورِ آغاز ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جو بہ یک وقت پیغمبر بھی تھے اور بادشاہ بھی، فنونِ لطیفہ کے عظیم سرپرست تھے اور جن کی نگرانی میں کام کرنے والے کاریگر جنات تھے (سورہ سبا: ۱۲، ۱۳)۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اُن کے لئے پگھلے ہوئے تانبے کا چشمہ بہادیا (سورہ سبا: ۱۲)۔ پھر اسی سورہ سبا کی آیت ۱۳ میں اُن کی بابت فرمایا:۔

يَعۡمَلُوۡنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنۡ مَّحَارِيۡبَ وَتَمَاثِيۡلَ وَجِفَانٍ كَالۡجَوَابِ وَقُدُوۡرٍ رّٰسِيٰتٍ

"جنات سلیمان علیہ السلام کے لئے وہ وہ چیزیں بنادیتے جو اُنہیں (بنوانا) منظور ہوتیں (مثلاً) بڑی عمارتیں اور مجسمے اور لگن جیسے حوض اور (بڑی بڑی) جمی ہوئی دیگیں۔"

مَحَارِيۡب جمع ہے مِحۡرَاب کی جسے عنوانِ سابق "فنِ تعمیرات" کے صفحات ۲۸۶، ۲۹۱ میں تفصیلاً دیا جاچکا ہے۔ تَمَاثِيۡل جمع ہے تِمۡثَال کی (بمعنیٰ مورت)۔ یہ لفظ سورۃ الانبیاء کی آیت ۵۲ میں بھی آیا ہے جہاں یہ اُن بتوں کے بارے میں ہے جن کی پرستش حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چچا (آزر) کیا کرتا تھا۔ یہ مجسمے یا تو انسانوں کے تھے یا حیوانوں کے، بہرحال وہ بت ہی تھے۔ جِفَان بمعنیٰ دستہ دار پیالہ۔ قُدُوۡر بمعنیٰ ہانڈیاں اور وہ برتن جن میں کوئی چیز پکائی جائے۔ یہ سب الفاظ صرف اِسی آیت ۱۳ میں استعمال ہوئے ہیں۔

بتوں کی ممانعت سے متعلق سورۃ الانعام کی آیت ۷۴ ہے جس میں ابراہیم علیہ السلام اپنے بت پرست چچا آزر سے فرماتے ہیں:۔

أَتَتَّخِذُ أَصۡنَامًا آلِهَةً إِنِّيۤ أَرَاكَ وَقَوۡمَكَ فِيۡ ضَلَالٍ مُّبِيۡنٍ ۝

"کیا تم بتوں کو معبود بنائے ہوئے ہو؟ بے شک میں تو تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں (مبتلا) دیکھتا ہوں۔"

ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام کی تحقیق: جیسا کہ مذکورہ آیت ۷۴ سے معلوم ہوا کہ آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا باپ (أب") کہا گیا ہے۔ حالانکہ آپ کے والد کا نام آزر نہیں بلکہ تارخ تھا۔ آزر چچا کو

باپ کہنے کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ عرب میں "أب" کا اطلاق چچا پر مجازاً بہ کثرت کیا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں اس کی تائید میں بکثرت آثار دئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) قَالُوا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ آبَآءِ كَ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا (البقرۃ:۱۳۳)
''یعقوب علیہ السلام کے بیٹے بولے کہ ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کے (ایک) معبود کی عبادت کریں گے۔''

یہاں اسمٰعیل علیہ السلام کو یعقوب علیہ السلام کے آباء میں ذکر کیا گیا حالانکہ وہ یعقوب علیہ السلام کے باپ نہیں بلکہ چچا ہیں۔ امام ابوالعالیہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اِس آیت میں چچا پر باپ کا اطلاق کیا گیا ہے اور اُنہوں نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا کہ ماموں والد ہے اور چچا والد ہے اور اِس آیت کی تلاوت کی۔ (الحاوی للفتاوی۔۔۔امام جلال الدین السیوطی، ج ۲، ص ۲۱۴، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ لائلپور پاکستان)

(۲) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ فرمایا تھا: رُدُّوا عَلَیَّ أَبِی (میرے باپ کو میرے پاس لاؤ) یہاں "أب" سے مراد چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہیں۔ (خزائن العرفان)

(۳) قرآن کریم نے ہر جگہ آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا "أب" کہا ہے حالانکہ والِد کا عربی لفظ بھی تو کہا جا سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ قرآن نے "أب" کے لفظ میں مجازی معنیٰ باپ کے لئے ہیں۔

(۴) شیخ محمد ادریس کاندھلوی (متوفّٰی ۱۳۹۴ھ) لکھتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کے اس چچا پر باپ کا اطلاق اس لئے کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا اختلاط اور اُن کی الفت اپنے اِس چچا کے ساتھ بہت زیادہ تھی اور وہ مشرکین کا رئیس تھا اور اِسی کے ساتھ اُن کا مناظرہ ہوا تھا۔ (التعلیق الصبیح، ج ۶، ص ۳۰۱)

اگر آزر کو ابراہیم علیہ السلام کا سگا والد مانا جائے تو اِس میں عصمتِ انبیاء پر بھی حرف آتا ہے اور اللہ پاک کی غیرت پر بھی، کہ نبی کو ایک مشرک کی پشت میں رکھا گیا کہ بتوں کے آگے جھکنے کی صورت میں نطفہِ نبی بھی (معاذ اللہ) اُس کے ساتھ جھکے گا۔ حالانکہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے: لَمۡ أَزَلۡ أُنۡقَلُ مِنۡ أَصۡلَابِ الطَّاهِرِيۡنَ اِلٰى أَرۡحَامِ الطَّاهِرَاتِ وَالۡمُشۡرِكُوۡنَ نَجَسٌ (میں ابتداء سے آخر تک پاک لوگوں کی پشتوں سے پاک خواتین کے رِحموں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہوں اور مشرک نجس ہیں)

(۵) جنابِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کی جو قبول ہوئی اور ردّ نہ ہوئی۔ سورہ ابراہیم میں اُن کی دعا یوں نقل فرمائی: رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَ لِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ۔ خیال رہے کہ یہاں وَالِدَیَّ ہے نہ کہ أب "یاأمّ" اور دعا کی تردید کا ذکر نہیں۔ اگر آزر آپ کا والد تھا تو وہ تو مشرک تھا اور مشرک کے لئے دعائے استغفار منع ہے۔ لہٰذا یہ دعا اپنے والد تارخ کے لئے تھی نہ کہ چچا آزر کے لئے۔ چچا آزر کے لئے آپ نے یوں کہا تھا وَاغْفِرْ لِاَبِیْ اِنَّہٗ کَانَ مِنَ الضَّآلِّیْنَ اور اس دعا کی تردید سورۃ التوبۃ کی آیت ۱۱۳ میں ہوئی کہ ابراہیم علیہ السلام کا اپنے چچا آزر کے لئے دعائے مغفرت کرنا اس لئے تھا کہ آزر نے آپ سے ایمان لانے کا وعدہ کیا تھا لیکن جب وہ کفر پر مرگیا تو آپ اس سے بیزار ہو گئے۔

(۶) سورۃ الشعراء کی آیت ۲۱۹ میں ارشاد ہوا: وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ جس کا ایک معنیٰ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عابدین، ساجدین میں منتقل ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے جس سے معلوم ہوا کہ آپ کے سارے دادے، دادیاں مؤمنین وساجدین ہیں اور اُن میں سے کسی نے بھی بت کو سجدہ نہیں کیا۔

(۷) آزر کی موت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت سے پہلے ہوئی۔ چنانچہ ابن المنذر نے بہ سندِ صحیح حضرت سلیمان بن صرو سے روایت کی کہ جب نمرود کی آگ حضرت خلیل پر گلزار ہوئی تو آزر بولا کہ یہ میری برکت سے گلزار ہوئی۔ اُس کا یہ کہنا تھا کہ ایک شعلہ اُس پر پڑا اور وہ وہیں راکھ کا ڈھیر ہو گیا (روح المعانی)

(۸) ابراہیم علیہ السلام کے والدین کے لئے دعائے مغفرت بعد ہجرتِ فلسطین بلکہ اسماعیل علیہ السلام کی پیدائش کے بعد ہوئی۔ سورہ ابراہیم کے رکوع ۶ میں ارشاد ہوا کہ جب آپ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل کو بیت اللہ کے پاس چھوڑ کر چلے تب چند دعائیں مانگیں جن میں سے ایک وہ تھی جس کا اوپر ذکر ہوا۔

<u>ابراہیم علیہ السلام کے والد کے نام کی تحقیق پر مقتدر علماء کی آراء:</u>

(۱) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام تارخ ہے اور مقاتل بن حیان نے کہا کہ یہ آپ کے باپ کا نام نہیں بلکہ اُس کا لقب ہے۔ (''زاد المسیر'' للجوزی م ۵۹۷ھ)

(۲) نسب بیان کرنے والوں کے درمیان اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر نہیں بلکہ تارخ تھا (معانی القرآن واعرابہ للزجاج، ج ۲، ص ۲۶۵)

(۳) حضرت مجاہد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آزر اِبراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام نہیں' وہ بت کا نام ہے۔(جامع البیان لا مام ابن جریر' جز ۷' ص ۳۱۶ مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

(۴) امام جلال الدین السیوطی' علامہ نیشاپوری' علامہ آلوسی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی تحقیق یہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام آباء واجداد شرک اور کفر کی آلودگی سے پاک اور منزہ ہیں۔ اُن کے نزدیک آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا ہیں اور انہیں مجازاً باپ کہا گیا ہے۔

اوپر بیان کردہ سورۃ 'الانعام کی آیت ۷۴ کو سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۰ سے جوڑا جا سکتا ہے جس میں بتوں (اَنصاب) کو شراب اور جوئے جیسی خرافات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ شیطانی کام ہیں۔ اَصنام اور اَنصاب دونوں لفظوں کا ایک ہی معنیٰ یعنی بت ہے خواہ وہ انسانی شکل میں ہوں یا جانوروں کی شکل میں۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۹۰ اور سورۃ الانعام کی آیت ۷۴ دونوں میں بتوں کے خلاف نفرت ظاہر کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور قدرتِ مطلقہ کی عمدہ مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وجودِ باسعود میں ملتی ہے جب آپ بنی اسرائیل کے پاس یہ پیغام لے کر آئے:۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ (آل عمران : ۴۹)

''اور وہ بنی اسرائیل کے لئے پیغمبر ہوگا (اور کہے گا) میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی مانند صورت بنا دیتا ہوں' پھر اُس میں دَم کر دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔''

رَسُوْلًا فرما کر یہ بتا دیا کہ آپ معاذ اللہ نہ ساحر وشعبدہ باز ہوں گے جیسا کہ بدتمیز یہود نے آپ کو سمجھا اور نہ ہی معاذ اللہ آپ خود خدا یا فرزندِ خدا ہوں گے بلکہ آپ کا مرتبہ پیغمبری کا ہوگا۔ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اس بات میں بالکل واضح ہے کہ آپ کی دعوت بنی اسرائیل تک محدود تھی اور دوسرے بنی اسرائیلی پیمبروں کی طرح آپ بھی صرف قومی نبی تھے۔ مِنْ رَّبِّكُمْ اور بِاِذْنِ اللّٰهِ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ معجزہ کا ظہور حق تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے نہ کہ پیغمبر کے اختیار وقدرت سے۔ یہ اور بات ہے کہ اس سے مقصود پیغمبر ہی کی تائید ونصرت ہوتی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس معجزہ کا جناب عیسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا جانا بطور ''نمائندگی'' تھا اور نمائندگی کا اظہار صرف اُسی صورت میں بامعنیٰ ہوتا ہے جب امرِ ''نمائندگی'' میں جان ڈال دی جائے۔ چونکہ زندگی کا دیا جانا

صرف اور صرف اللہ کا خاصہ ہے' لہٰذا صرف اُسی کے حکم سے سہ جہتی اور زندگی سے پُر پرندے کا وجود میں آنا ممکن ہے۔''

''نمائندگی'' سے متعلق ایسی آیات اِس معنیٰ میں خاص سبق مہیا کرتی ہیں کہ انہوں نے اُس دور میں اور بعد کے زمانوں میں بت سازی کی مخالفت کی کیونکہ بت سازی' بت پرستی کی طرف راہ دکھا سکتی تھی اور خالقِ حقیقی اللہ بزرگ و برتر کی وحدانیت پر ایمان کو متزلزل کر سکتی تھی۔''

''فنونِ لطیفہ سے متعلق اصطلاحات میں ایک محتاط تحقیق و تدقیق کی اشد ضرورت ہے۔ أصنام (بمعنیٰ بُت :سورۃ الانعام:۷۴؛ سورۃ الاعراف:۱۳۸؛ سورۃ الانبیاء:۵۷)' أنصاب (بمعنیٰ بُت :سورۃ المائدۃ:۹۰)' تَماثِيل (بمعنیٰ مجسمے :سورۃ الانبیاء:۵۲؛ سورۃ سبا:۱۳)' صُورَة (سورۃ الانفطار:۸)' هَيئَة (سورہ آلِ عمران :۴۹؛ سورۃ المائدۃ:۱۱۰) جیسے الفاظ نے جو دراصل اصطلاحات ہی ہیں اور جن کا ذکر قرآن حکیم اور قدیم عربی شاعری اور بعد کے اَدوار میں ہوتا آیا ہے' وحیِ الٰہی کے اس نظریے کو پیش کرنے میں خاصی مدد دی ہے کہ اُس دَور میں فنونِ لطیفہ کا کیا مطلب سمجھا جاتا تھا۔''

''قرآنی متن کی مختلف قسموں اور طرزوں میں تزیین اور جمالیت نے کہ جس سے دیکھنے والوں اور خریداروں کو جاذبیّت اور خوشی محسوس ہو' لوگوں کے ذوقِ جمالیات کی ترویج و ترقی اور فنّی ذوق کے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہزاروں پیشہ ور خطّاطوں اور فن کاروں نے ہر زمانے میں قرآنِ مجید کے متن کو مختلف انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرِ دست یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاشیے کی تزیین جیسا جمالیاتی پہلو صرف قرآن مجید تک محدود رہا ہے۔ اس طرح جاذبیت پیدا کرنے کے لئے مختلف طریقوں کے استعمال' قرآنِ حکیم کے مسوّدات کے اعزاز اور اُنہیں قیمتی متاع قرار دینے نے فنّی ذوق کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔''

''قرآنِ حکیم کی صحیح تلاوت کے لئے یہ بھی ضروری ہوا کہ اس کے الفاظ پر اعراب (زبر' زیر' پیش) اور دوسرے رموز واوقاف بڑی احتیاط سے لگائے جائیں اس طرح کہ اصل متن میں کسی قسم کا سُقم واقع نہ ہو۔''

بعد کے فنّی اَدوار میں قرآنی آیات کا استعمال :کوئی شک نہیں کہ قرآنِ حکیم کی تحریر کے مختلف الانواع طریقوں نے تمام مسلم ممالک میں نمایاں کردار ادا کیا قطع نظر اِس کے کہ وہ فنی طریقہ دنیاوی تھا یا مذہبی تھا۔ طول طویل قرآنی آیات کا عمارات اور دوسری چیزوں کی تزیین میں خاصا حصّہ ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اِن نوشتوں میں تزیینی اور جمالیاتی اقدار پنہاں ہیں اور ہمیں اس بات سے سروکار نہیں کہ اُس تزیین کا آخر مطلب کیا ہے۔

اگرچہ باضابطہ اصول کے طور پر نہ سہی' لیکن یہ بات ضرور ہے کہ قرآنِ حکیم کی نقاشی اسلام کے ابتدائی زمانے یعنی اموی دور میں (۴۱ھ/۱۳۲ھ بمطابق ۶۶۱ء/۷۵۰ء) ترقی پذیر ہو گئی تھی' بلکہ اس کا تعلق خلیفہ عبدالملک (۶۵ھ-۸۶ھ بمطابق ۶۸۵ء/۷۵۰ء) کے ساتھ جوڑنا زیادہ مناسب ہے جس نے عربی کو سرکاری زبان بنایا اور سکّوں پر عربی کندہ نویسی کو متعارف کرایا۔ عبدالملک نے ہی سورۃ التوبہ کی تبلیغی آیت ۳۳:
هُوَالَّذِیْ أَرْسَلَ رَسُوْلَه' بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَه' عَلَی الدِّیْنِ كُلِّه وَلَوْكَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ o
''وہ اللہ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا کہ وہ اُسے سارے بقیہ دینوں پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو (کیسا ہی ناگوار) لگے۔''
کو ہزاروں لاکھوں سکّوں پر کندہ کرا کے اسے ایک معیاری کلّیہ بنا دیا۔

یہ بات بھی ابتدائی دور کی ہے کہ ترازوؤں اور تجارتی ناپ تول کے پیمانوں پر سورۃ الشعراء کی یہ آیت ۱۸۱ (جو تجارتی اخلاق و شائستگی کی تعلیم پر مشتمل ہے) بہ طور تزیین لکھی ہوئی ملتی ہے: أَوْفُوا الْكَیْلَ وَلَاتَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِیْنَ (پورا ناپا کرو اور نقصان پہنچانے والے نہ بنو)

عمارت پر قرآنی آیات کا ابتدائی دور میں انتہائی غیر معمولی اور حیرت خیز استعمال ۷۱ھ/۶۹۱ء میں یروشلم کے مقام پر ایک ہشت پہلو چٹانی گنبد پر ملتا ہے جہاں اموی کتبے ۲۴۰ میٹر کے رقبے میں اوپر سے نیچے کو لکھے ہوئے ملتے ہیں اور جو سات غیر مساوی حصّوں میں منقسم ہیں اور ہر حصّے پر بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم لکھا ہوا ہے۔ پہلے پانچ حصّوں پر اسلامی بنیادی عقیدہ لَآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَه' لَاشَرِیْكَ لَه' (اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں' وہ یکتا اور اکیلا ہے' اُس کا کوئی شریک نہیں) لکھا ہوا ہے۔ چھوٹی چھوٹی قرآنی آیات کو بطور حوالہ لیا گیا مثلاً سورۃ بنی اسرائیل کی آخری آیت ۱۱۱ كَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا (اُس کی بڑائیاں خوب بیان کیجئے)؛ سورۃ الحدید کی آیت ۲ لَه' مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین میں اُسی کی بادشاہت ہے)' سورۃ التّغابن کی اوّل آیت لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (تمام تر حکومت اُسی کی ہے اور ہر تعریف اُسی کی ہے)' سورۃ الاخلاص کی چاروں آیات قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ'' o اَللّٰهُ الصَّمَدُ o لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ o وَلَمْ یَكُنْ لَّه' كُفُوًا اَحَدٌ'' o (اے نبیِ مکرّم! فرما دیجئے کہ وہ اللہ ایک ہے' تمام کائنات کو اُس کی ضرورت ہے اُسے کسی کی ضرورت نہیں۔ اُس نے کسی کو نہیں جنا اور نہ ہی وہ کسی سے جنا گیا اور نہ کوئی اُس کے برابر کا ہے۔) چھٹا حصّہ تاریخی معلومات پر مشتمل ہے۔ ساتواں حصّہ جس نے نصف جگہ گھیری ہوئی ہے' سورہ آلِ عمران کی آیات ۱۸' ۱۹' سورۃ النساء کی آیات ۱۷۱' ۱۷۲ اور سورہ مریم کی آیات ۳۳ تا ۳۶ پر مشتمل ہے۔''

(انسائیکلوپیڈیا آف دی قرآن' جلد اوّل' صفحات ۱۶۲ تا ۱۶۴)

(۱۰) الٰہی کرشمہ سازیاں (ARTISTRY OF ALLAH)

ربّ ذوالجلال والاکرام کے مظاہرِ قدرت اور اُس کی محیّر العقل کرشمہ سازیاں اِس پورے عالم میں اور انسانی جسم میں اِس فیاضی سے بکھری ہوئی ہیں کہ اُن کا شمار ممکن ہی نہیں جیسا کہ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۴ میں فرمایا: وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوْهَا (اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گِنتا چاہو تو اُنہیں شمار نہیں کر پاؤ گے)۔ اُس خالقِ لم یزل کی قدرتِ کاملہ کا معائنہ اور مطالعہ دو طرح سے کیا جا سکتا ہے یعنی کائنات میں اور انسانی جسم میں جیسا کہ سورہ فُصِّلَتْ کی آیت ۵۳ میں فرمایا: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىْٓ اَنْفُسِهِمْ (ہم اُنہیں اپنی نشانیاں اِس دنیا میں دِکھائیں گے اور خود اُن کی اپنی ذات میں بھی) اور سورۃُ الذّٰرِیٰت کی آیت ۲۱ میں بھی یہی فرمایا: وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (اور خود تمہاری اپنی ذات میں بھی، تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا!)

ایک دانشور کا قول ہے: "اگر ہم ایٹم کی محیّر العقل ساخت پر اور پھر اُس سے بھی زیادہ حیران کن انسانی دماغ کی معجزانہ ماہیّت پر غور کریں تو ہمیں لازمی طور پر ایک ماہر صنّاع، ایک ہمہ بیں ہستی کے وجود اور اُس کی قدرتِ مطلقہ کو بہر حال ماننا پڑے گا۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق پر حد درجہ مہربان اور شفیق ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ حضرتِ انسان جہالت اور کفر کی دلدل میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے اور اِس طرح شیطان کے زہر آلود نشتر سے اپنی خداداد صلاحیتوں کو ضائع کرتا رہے۔ کتنی روح پرور بات ہے کہ اُس نے قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کے جانی دشمنوں کو بھی جنہوں نے آپ اور آپ کے صحابہ کرام پر مصائب وآلام کے پہاڑ ڈھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، سورۃ الزُّخرُف کی آیت ۵ میں یہ مژدہ جانفزا سنایا: اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ (کیا ہم اِس نصیحت نامے کو تم سے اِس لئے ہٹا لیں گے کہ تم حد سے گزر جانے والے ہو؟) نہیں بلکہ یہ فیض برابر جاری رہے گا۔

چنانچہ وہ رحیم وکریم ہر کونہ اور ہر زاویہ سے حضرتِ انسان کو اپنی طرف بلا رہا ہے۔ انسانی فکر وعمل کی ہر لہر کو اپنی طرف موڑنے کے لئے اُس نے اِس رنگ رنگیلی کائنات کے دولہا حضرتِ انسان کو انبیائے کرام کے ذریعے صراطِ مستقیم دکھانے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ کبھی تو وہ انسان کو شمس وقمر کے طلوع وغروب کی حکمت کی طرف متوجہ کر کے اپنے آپ کو منواتا ہے اور کبھی لیل ونہار کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے، موسموں کے تغیّر وتبدّل، بارانِ رحمت کا مژدہ لانے والی باردار ہواؤں کے ذکر، عملِ تلقیح (Pollination)، پودوں کی ضیائی تالیف

(Photosynthesis)' موت و حیات کے ذکر اور زندگی کے نامساعد اور گمبھیر حالات میں انسان کا اُس بارگاہِ بیکس پناہ میں دعا اور زاری کے لئے جھک جانے کے لحات کو یاد دلا کر اپنی لاشریک وحدانیت کے پرچم لہراتا ہے۔ الٰہی نظام کی یہ ساری کرشمہ سازیاں اُس حکیم مطلق اور بے غرض ہستی کی رحمت کے بحرِ مواج کی آئینہ دار ہیں تاکہ شرف اور ناموسِ انسانی کا پاسبان ۔۔۔ حضرتِ انسان ۔۔۔ کج روی سے باز رہے' اپنے خالق و مالک کو پہچانے' اُس کی فیاضانہ نعمتوں کا نہاں خانہِ دل سے معترف ہو اور اس طرح اپنی بے بسی اور عجز کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے سرِ نیاز کو اُس کے حضور جھکا دے۔

مترجم کے لئے اُس ماہرِ کامل کی صناعی کے چند نمونے پیش کرنا باعثِ صد عز و افتخار ہے:۔

(الف) کائنات میں الٰہی کرشمہ سازیاں

(ا) درختوں میں: درخت کی جڑیں اور تنا ہر درخت کے دو اہم حصّے ہوتے ہیں۔ قدرتی طور پر تنا اوپر کو جاتا ہے جبکہ جڑیں نیچے کو جاتی ہیں۔ اب اگر لکڑی میں قدرتی طور پر اوپر جانے کا رُجحان ہے تو جڑیں نیچے کیوں جاتی ہیں اور اگر اس کے برعکس لکڑی نے قدرتی طور پر نیچے کو جانا ہے تو پھر تنا اوپر کیوں جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لکڑی اپنے نمو میں بے بس ہے اور کسی اور کے اختیار میں ہے۔ دستِ قدرت کاملہ نے درخت کے جس حصّے کو اوپر لے جانا چاہا' اوپر لے گیا اور جس حصّے کو نیچے لے جانا چاہا' نیچے رہنے دیا۔ اسی لئے فرمایا: یَخْلُقُ اللّٰہُ مَایَشَآءُ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر'' (اللہ جو چاہتا ہے' پیدا فرماتا ہے کہ ہر چیز اُس کے بس میں ہے)۔

''محض ایک بیج کا پھلنا پھولنا اور پھر اُس کا درخت بن جانا بساطِ انسانی سے باہر ہے۔ جب اُس بیج کو حُسن و شادابی کے ایک بڑے منظم باغ میں بویا جائے تو یہ تصوّر کرنا ممکن ہی نہیں کہ وہ ماہر باغبان کی ماہرانہ توجّہ کے بغیر از خود اُگ آئے گا۔ باغ کثیر الانواع درختوں کو شامل ہوتا ہے اور درختوں کے نظم و ترتیب میں ایک خاص ماہرانہ فن کارفرما ہوتا ہے۔ اُن کی جڑوں کی نشو و نما کے لئے درختوں کے درمیان مناسب خالی جگہ چھوڑی جاتی ہے تاکہ زمین کے بالائی پرت سے تحت الارض کو ہوا ملتی رہے اور ہوا اور روشنی کی آمد و شُد اُن کی شاخوں کے درمیان جاری رہے۔ اِن حقائق کے پیشِ نظر کیا کوئی یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ اس حیران کن کائنات کا نظام بغیر کسی خلل کے از خود چل رہا ہے اور اس کے پیچھے کسی عقلِ کل اور ماہر صناع کا دستِ قدرت نہیں؟'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ ۳۲۹۴)

شہتوت کے درخت میں: شہتوت کا درخت قدرتِ مطلقہ کا ایک اور منہ بولتا مظہر ہے۔ اگر اُس کے

پتوں کو بکریاں چریں تو دودھ حاصل ہوتا ہے۔ اِن پتوں کو اگر شہد کی مکھی چاٹ لے تو شہد بنتا ہے۔ ریشم کا کیڑا اِن پتوں کو کھا لے تو اس سے ریشم حاصل ہوتا ہے اور اگر ہرن کھا لے تو اس سے مُشک حاصل ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اِن پتوں کی طبیعت کا تقاضا دودھ ہے تو اس سے ریشم، شہد اور مُشک کیسے حاصل ہوا اور اگر اُن کی طبیعت کا تقاضا ریشم ہے تو اُن سے مُشک، شہد اور دودھ کس طرح حاصل ہوا۔ معلوم ہوا کہ یہ پتے اپنی ذات میں کسی چیز کا تقاضا نہیں رکھتے اور دراصل اِس تمام نظام کی باگ ڈور خالقِ کائنات کے قبضۂ قدرت میں ہے: وہ چاہے تو اُس پتے کو بکریوں کی منہ میں ڈال کر اُن سے دودھ نکال دے اور چاہے تو شہد کی مکھیوں سے ان پتوں کو چُسوا کر اُنہیں شہد بنا دے اور اگر چاہے تو ان پتوں کو ریشم کے کیڑوں کی خوراک بنا کر اس سے ریشم بنا دے۔ غرض اس کائنات کی روشن حقیقتوں میں سے جس حقیقت پر بھی غور کیا جائے تو یہی نتیجہ نکلے گا کہ ہر حقیقت کے پیچھے اُسی مؤثرِ حقیقی کا دستِ غیب کارفرما ہے اور اسی حقیقت کو سورۃ الرّوم کی آیت ۴۰ میں ظاہر کرتے ہوئے اُن کور باطنوں سے سوال کیا گیا جو اللہ کی لاشریک وحدانیت میں رخنے ڈالتے ہیں:

> هَلْ مِنْ شُرَكَآءِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝
>
> ''کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی بھی ایسا ہے جو اِن کاموں میں سے کچھ بھی کر سکے؟ وہ اللہ اُن کے شرک سے پاک و برتر ہے۔''

(۲) زرعی پیداوار میں: کسان ایک دانۂ گندم کو زمین میں دبا کر چلا جاتا ہے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو اُس دانۂ گندم کو پھاڑ کر اُس سے باریک کونپل نکالتی ہے اور وہ اس قدر باریک اور نازک ہوتی ہے کہ اگر ہم اُسے ہاتھ میں لے کر مسل ڈالیں تو ختم ہو جائے۔ پھر اُس کونپل کو اس قدر قوّت کون دیتا ہے کہ وہ سخت سے سخت زمین کا سینہ چیر کر زمین کے اندر جا کر اپنی مستحکم جڑیں بنا لیتی ہے۔ پھر شبنم کے قطرے اور نسیمِ سحر کے نرم و نازک جھونکے اُس میں بالیدگی پیدا کرتے ہیں، سورج کی کرنیں اُس میں پختگی لاتی ہیں اور وقتِ مقررہ پر ہونے والی بارشیں اُس میں ذائقہ لاتی ہیں اور سورج کی تیز دھوپ اس فصل کا قوام تیار کر کے اسے مکمل کرتی ہے اور فصل کٹ جانے کے بعد تند و تیز آندھیاں دانہ کو بھوسہ سے الگ کرنے کے لئے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

مقامِ فکر ہے کہ زمین و آسمان کی یہ تمام قوّتیں اگر ہماری فصلوں میں اپنا اپنا کردار ادا نہ کرتیں تو کیا ہم زمین سے ایک دانۂ گندم بھی حاصل کر سکتے تھے؟ پھر بیج بونے سے لے کر فصل کی کٹائی تک اس مربوط نظام کو کون چلا رہا ہے۔ کیا کسی بے جان بُت نے یہ نظام وضع کیا ہے یا نظامِ شمسی کے پابند سیارے یہ نظام چلا رہے ہیں؟ اور جب یہ واضح ہو گیا کہ عناصرِ کائنات میں سے کوئی چیز اس نظام کی واضع اور خالق نہیں اور نہ ہی یہ قرینِ عقل ہے کہ کسی ناظم کے بغیر کوئی نظام عمل میں آ جائے یا کسی مقنّن کے بغیر کوئی قانون تشکیل پا جائے یا کسی خالق کے بغیر

کوئی مخلوق وجود میں آجائے تو پھر کیوں نہیں مان لیتے کہ اس کائنات کے ماوراء ایک زبردست حکیم اور قادر و قیوم کی ذات کارفرما ہے جس کی عجیب و غریب حکمت اور زبردست طاقت سے زرعی پیداوار کا یہ سلسلہ رواں دواں ہے۔ اسی لئے تو وہ فرماتا ہے:

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ○ ءَ أَنتُمْ تَزْرَعُونَهٗ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ○ لَوْنَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ○ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ○ (الواقعة : ۶۳ تا ۶۷)

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جو کچھ تم بوتے ہو اُسے تم اُگاتے ہو یا (اُس کے) اُگانے والے ہم ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اُس (پیداوار) کو چُورا چُورا کر دیں پھر تم حیران ہو کے رہ جاؤ کہ (اب کی تو) ہم پر تاوان پڑ گیا بلکہ ہم (بالکل ہی) محروم رہ گئے۔''

زمین میں یہ صلاحیت کہ دانہ کو نشو و نما دے سکے اور دانہ میں یہ استعداد کہ مٹی سے نمو حاصل کر سکے۔ گرمی، روشنی، ہوا اور پانی وغیرہ سے استفادہ کی قابلیت، ان سب کو قوت سے فعل میں لانا، وقت مناسب پر مقدارِ مناسب میں بارش، اوقاتِ مقرر پر مقدارِ مقرر میں آفتاب کی تپش، غرض نظامِ زراعت کی ساری عظیم الشان مشینری کو حرکت میں لانا بندے کی قدرت میں ہے یا اللہ کی!

آیتِ مذکورہ میں اللہ تعالیٰ نے حَـــرث (کھیتی باڑی اور کاشت کرنے) کی نسبت بندوں کی طرف کی ہے اور زَرع (اُگانے) کی نسبت اپنی طرف کی ہے کیونکہ کاشت کرنا بندوں کا فعل ہے اور اُگانا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے، اِس اگانے میں بندوں کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ بندے بیج کو کاشت کریں لیکن اللہ تعالیٰ فصل اگانا نہ چاہے تو کچھ بھی نہیں اُگتا۔ جنابِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی یہ نہ کہے کہ میں نے اگایا ہے بلکہ اُسے یوں کہنا چاہئے کہ میں نے کھیتی باڑی کی ہے کیونکہ اُگانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود سورۂ الفتح کی آیت ۲۹ میں مخلوق کو بھی زارع (اُگانے والا) کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حقیقی اور خاص افعال کی مخلوق کی طرف نسبت کرنا بالکل جائز ہے۔

سورۂ النّمل کی آیت ۶۰ میں انسان کو اُس کی خود فراموشی کی نیند سے جگاتے ہوئے اُسے کائنات کے حُسن و جمال، نظم و ترتیب اور عظمتِ شان کی طرف توجہ دلائی کہ وہ مقصدِ حیات کو سمجھ کر اپنے خالق کے حضور سرنگوں ہو جائے:

أَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَأَنزَلَ لَكُم مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَنۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ أَن تُنۢبِتُوْا شَجَرَهَا ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ○

''آیا (یہ بُت بہتر ہیں) یا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا

جس میں الٰہی بپتسمہ کی قوت کا بیان ہے، سائنسدانوں کو کچھ عناصر کو ایک مناسب تناسب میں باہم ملانے کے ذریعے کیمیائی بپتسمہ کے امکان اور استعمال کا اشارہ دیا ہوگا :-

صِبْغَةَ اللهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللهِ صِبْغَةً (اَلْبَقَرة : ۱۳۸)

"(ہمارے اوپر) اللہ کا رنگ ہے اور اللہ سے بہتر کون رنگ (دینے والا) ہے؟" (۲:۱۳۸)

(۷) سیارگان کی گردش : سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۳ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا :-

وَهُوَالَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَوَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ٥

"اور وہ وہی تو ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کر دیا، سب (اپنے اپنے) دائرہ میں تیر رہے ہیں۔" (۲۱ : ۳۳)

خود کار حرکت کے لئے عربی کا لفظ سَبَحَ آتا ہے (اور یَسْبَحُوْنَ اُسی سے ہے)۔ اگر یہ حرکت پانی میں ہو تو "تیرنا" کہلاتی ہے، اگر خشکی میں ہو تو اُسے "چلنا" کہیں گے اور اگر یہ حرکت خلا میں ہو تو یہ "گردش" کہلائے گی۔ دراصل سورج مدار میں ہے۔ وہ زمین کے گرد نہیں بلکہ کہکشاں کے مرکز میں ہے، لہٰذا بیان واضح اور غیر مبہم ہے کیونکہ قرآن مجید سورج کے مدار کی تخصیص نہیں کرتا۔

(۸) مدار اور متحرک سورج : سورج اور چاند کے بیان میں قرآن مجید بتاتا ہے کہ اُن میں سے ہر ایک خاص مدار میں حرکت کرتا ہے اور یہ کہ سورج ساکن نہیں ہے بلکہ ایک خاص مدار میں حرکت کرتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

(i) وَهُوَالَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَوَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ٥ (الانبیاء:۳۳)

"اور وہ وہی تو ہے جس نے رات، دن، سورج اور چاند کو پیدا کر دیا، سب (اپنے اپنے) دائرہ میں تیر رہے ہیں۔" (۲۱ : ۳۳)

(ii) وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ـــ لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِىْ لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ٥ (یٰسٓ :۳۸، ۴۰)

"اور ایک نشانی آفتاب کی بھی ہے کہ اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے۔۔ نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے اور سب ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔" (۳۶:۴۰،۳۸)

یعنی "آفتاب ۔۔۔ مجال نہیں کہ کسی دن قبل از وقت طلوع ہو جائے یعنی خورشید خاور بایں جاہ و جلال اور سورج دیوتا باوجود اپنی "دیوتائیت" کے تمام تر اُسی قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں مسخر اور تابع ہے۔"

یہ قرآنی حقائق سائنس کے موجودہ روشن دور میں فلکیاتی مشاہدات کی آزمائش پر پورے اُترے ہیں۔ "ماہرینِ فلکیات کے حساب کے مطابق سورج "سولر اپیکس" نامی خاص مدار میں "ویگا Vega" نامی ستارے کے رُخ روزانہ سات لاکھ بیس ہزار (۷۲۰،۰۰۰) کلومیٹر فی گھنٹہ کی انتہائی زبردست رفتار سے دَوڑ رہا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ روزانہ ایک کروڑ بہتر لاکھ اَسّی ہزار کلومیٹر طے کرتا ہے (۷۲۰،۰۰۰ x ۲۴ = ۱۷،۲۸۰،۰۰۰)

اور اُس کے ذریعہ سے بارونق باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ اُن کے درختوں کو اُگاؤ۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے؟ مگر ہاں یہ لوگ ہیں ہی حق سے منہ موڑنے والے۔"

مَا كَانَ لَكُمْ أَنْ تُنْبِتُوْا شَجَرَهَا یعنی انسان خوب غور کر کے دیکھ لے' کاشتکاری ہو یا باغبانی' اِس عظیم الشان نظام کے کسی جزء پر بھی انسان کو قدرت حاصل ہے؟ کیا زمین میں قبول کی صلاحیت رکھنا اُس کا کام ہے؟ کیا خاک میں قوتِ نمو رکھ دینا اُس کے بس کی بات ہے؟ کیا وقتِ مناسب پر اور مقامِ مناسب پر بارش لانا اُس کے اختیار میں ہے؟ کیا بارش کے قطروں میں یہ اثر رکھ دینا کہ وہ نباتات اُگائیں' اُس کے دخل و تصرف کی چیز ہے؟ درختوں' پودوں' سبزیوں کو آفتاب کی گرمی ایک خاص درجہ میں پہنچانا کیا اُس کے اختیار کی چیز ہے؟ غرض کھاد' سورج' پانی وغیرہ میں پیداواری کی صلاحیتیں اور تاثیرات رکھ دینا اور ان ساری استعدادوں کو ایک متعین درجہ میں اور مناسب حد تک قوت سے فعل میں لانا' ان میں سے کوئی بھی شے بیچارے انسان کے تصرف میں ہے؟ جب اس کی نفی ہوگئی کہ اس نظامِ نباتی کی کوئی سی کڑی بھی انسان کے اختیار کی ہے تو اب معاً سوال یہ اٹھا کہ اچھا تمہارے اپنے بس کی نہ سہی تو پھر کیا کوئی اور غیر اللہ خدائی میں شریک ہے؟ غرض قرآنِ حکیم کے اور بھی بے شمار مقامات پر کائنات اور اُس کے اجزاء و عناصر پر نظر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

<u>درختوں کے عملِ زیرگی (Pollination) میں الٰہی کرشمہ سازی:</u> زردانوں کو زردان سے حاصل کر کے زیرہ گیر (سٹگما) تک منتقل کرنے کا عمل جس کے بعد باروری کا عمل شروع ہو جاتا ہے' عملِ زیرگی کہلاتا ہے۔ یہ عمل ہوا اور حشرات کی مدد سے انجام پاتا ہے۔

عالمِ نباتات میں تولیدی عمل کا ذکر قرآنِ حکیم میں متعدد بار اِس پیرایہ میں ہوا ہے کہ خالقِ کائنات نے اپنی ہر مخلوق کو نر اور مادہ دو جنسوں میں پیدا فرمایا ہے وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ (سورۃ الرّعد:۳) اور وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ (سورۃ الذّاریٰت:۴۹)۔ عالمِ نباتات میں یہ عملِ تولید اس طرح ہوتا ہے کہ ہوا یا حشرات نر پودے کے تولیدی اجزاء کو لے کر مادّہ پودے میں منتقل کرتے ہیں جس سے وہ بارآور ہو جاتی ہے اور اُس پر پھل' پھول کھلنے لگتے ہیں۔ قرآنِ مجید میں اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(i) وَأَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَسْقَيْنٰكُمُوْهُ (الحجر:۲۲)

"اور ہم ہی پانی سے لدی ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں' پھر وہی (پانی) ہم تمہیں پلاتے ہیں۔"

لَوَاقِح جمع ہے لَاقِحة کی بمعنیٰ حاملہ۔ لَوَاقِح کا معنیٰ ہے وہ ہوائیں جو پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو اٹھائے ہوئے ہوں (مفردات امام راغب اصفہانی) لَوَاقِح کا لفظ ہی عملِ زیرگی بتا رہا ہے۔

(ii) وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجْنَابِه أَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ○ (طٰهٰ : ۵۳)
"اور اُس نے آسمان سے پانی اتارا' پھر ہم نے اس کے ذریعے مختلف قسم کے طرح طرح کے نباتات پیدا کیے۔"

(iii) وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيْجٍ ○ (الحج : ۵)
"اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ خشک ہے' پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوشنما نباتات اُگاتی ہے۔"

نوٹ: "بارش اور دیگر پانیوں میں پانچ طرح کا فرق ہے: (۱) بارش ہر اونچی نیچی جگہ پہنچتی ہے' دوسرے پانی نہیں پہنچ سکتے (۲) بارش چل کر آتی ہے لہٰذا یہ بلا محنت وخرچ مفت انعام ہے۔ دوسرے پانی محنت ومشقت اور خرچہ کر کے لانے پڑتے ہیں۔ (۳) بارش سے پتے دُھل جاتے ہیں' کیڑے مر جاتے ہیں' جڑوں میں بارش کا پانی غذائی کھاد کا کام دیتا ہے جبکہ دیگر پانیوں سے صرف سیرابی ہوتی ہے۔ (۴) بارش رب تعالیٰ کی حکمت ہے' دیگر پانی بندوں کی صوابدید پر موقوف ہے۔ (۵) بارش کے بعد کسی پانی کی ضرورت نہیں رہتی جبکہ دیگر پانیوں کے بعد بھی بارش کی اشد ضرورت رہتی ہے۔" (تفسیر نعیمی' ج ۱۷' ص ۶۰۵)

(iv) سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ (یٰسٓ : ۳۶)
"پاک ہے وہ ذات جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے"

"اگر اناج کے پھولوں کا زیرہ سیب کے درخت میں لگایا جائے تو درخت سیب پیدا نہیں کرے گا۔ اس موقع پر رک جانا اور اس کی غیر معمولی فطرت پر غور کرنا مفید ہوگا۔ پودے کی ایک ہی نوع کا پھول اُس زیرے کو پہچانتا ہے جو اُسی نوع کے پھول سے لیا گیا ہو۔ اگر تو زیرہ اس کی اپنی نوع سے ہے تو تولیدی عمل شروع ہو جائے گا ورنہ تولیدی عمل رک جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ مادہ پھول کے سگما کو اپنے اور غیر زیرہ میں فرق کیسے معلوم ہوا اور اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ خارجی زیرہ کی صورت میں اُسے اپنی میکانیت بروئے کار نہیں لانی۔ کوئی شک نہیں کہ اُس عقلِ کل نے جو پودے کے ہر جزء کو کنٹرول کر رہی ہے' پھول میں اس میکانیت کو ایسے نازک

اور نفیس ترین طریق پر وضع کیا ہے کہ نسل در نسل انواع کا تسلسل برقرار رہے۔"

("The Miracle of Creation in Plants" -- Harun Yahya, p. 60)

پودے کے پتوں میں ضیائی تالیف (Photosynthesis) کا عمل :انسانوں اور جانوروں کے برعکس پودوں کے خلیات شمسی توانائی کو براہِ راست استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ شمسی توانائی کو کیمیائی توانائی میں بدل کر اپنے مختلف غذائی اجزاء میں جمع کر لیتے ہیں۔ اس عمل کو ضیائی تالیف (Photosynthesis) کہتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر ضیائی تالیف نام ہے پودوں کا اپنی خوراک خود مہیا کرنا جو اُنہیں دوسری جاندار چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ عمل پودوں میں موجود چھوٹے اجزاء کلوروپلاسٹ کی وجہ سے انجام پاتا ہے جو اُن کے سبز رنگ کا باعث بھی ہیں۔ یہ چھوٹے جیسے صرف خوردبین سے ہی نظر آتے ہیں اور زمین پر موجود واحد لیبارٹری ہیں جو حیاتیاتی طریقے سے شمسی توانائی کو محفوظ کرتے ہیں۔

ضیائی تالیف اتفاقی حادثہ نہیں ہوسکتا: ضیائی تالیف کا مکمل نظام ایک بار پھر ہمیں حقیقتِ تخلیق کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ پیچیدہ نظام اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہی وجود میں آسکتا ہے۔ ایک بے مثل اور عظیم فیکٹری کو پتوں کے خوردبینی خلیوں تک سکیڑ دیا گیا ہے۔ یہ بے عیب اور ماوراء النقص اور بے فتور نظامِ تخلیق خداوندِ قدوس جو تمام جہانوں کا خالق اور پالنہار ہے' کے وجود کی ناقابلِ تردید شہادت ہے۔

(۳) انسانی تخلیق کے مراحل میں کرشمہ سازیاں : عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اِس عالمِ اسباب میں مرد و زن کے باہم ملاپ سے انسان کی پیدائش وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک عام قانون ہے اور اللہ تعالیٰ قانون کا پابند نہیں ہے۔ اُس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو بغیر باپ کے' حضرت حوّا کو بغیر عورت کے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اُس نے انسان کی تخلیق کے لئے مرد و عورت کے باہم ملاپ کو ایک عام سبب ضرور بنایا ہے لیکن اس کی عظیم قدرت ان تمام اسباب سے بالاتر ہے۔ وہ چاہے تو مٹی کے ایک ڈھیر سے حضرت آدم جیسے عظیم الشان نبی کی تخلیق کر دے اور وہ چاہے تو نطفہ کی ایک حقیر بوند سے انسانوں کی پیدائش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دے۔

اب سوچئے کہ نطفہ کی ایک بے جان بوند سے یہ جیتا جاگتا انسان کس طرح وجود میں آ گیا۔ عملی تحقیقات اور سائنس کے روزافزوں تجربات کے باوجود سائنسدان آج تک کسی بے جان مادّے سے کسی جاندار شے کو وجود میں نہیں لا سکے۔ اب تک جو ثابت ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ نطفہ جوہرِ حیات تو ہے لیکن خود زندگی سے خالی ہے

اور جو چیز خود حیات سے عاری ہو وہ ایک صاحبِ حیات کی موجد کیسے ہو سکتی ہے۔

انسان کی تخلیق اُس کے نطفہ میں موجود ایک انتہائی باریک جرثومہ سے ہوتی ہے اور جب مرد کا نطفہ عورت کے رِحم تک پہنچتا ہے تو یہ جرثومہ عورت کے رِحم میں کسی وقت اُس نسوانی انڈے سے جا ملتا ہے جو اُس جرثومہ کی طرح بہت باریک ہوتا ہے۔ پھر ان دونوں کے باہمی ملاپ سے ایک باریک خلیہ بن جاتا ہے اور یہی خلیہ حیاتِ انسانی کا نقطۂ آغاز ہے اور اس خلیہ کا وجود میں آ جانا ہی استقرارِ حمل کی علامت ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس خلیے کو عَلَقہ یعنی جمے ہوئے خون کی شکل میں لاتا ہے۔ پھر اس عَلَقہ کو تدریجاً مُضغہ یعنی گوشت کی ایک بوٹی میں تبدیل کرتا ہے۔ پھر اس مُضغہ کی صورت گری کی جاتی ہے اور گوشت کے اس لوتھڑے کو انسانی اعضاء کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے اور اُسے مرد یا عورت کی ساخت عطا کی جاتی ہے۔ استقرارِ حمل کے چار ماہ بعد بروئے حدیث اس میں روح ڈال دی جاتی ہے۔ پھر عورت کے پیٹ میں اُسے غذا پہنچا کر اس کی جسامت بڑھنا شروع ہوتی ہے اور اس کے دماغ میں وہ تمام صلاحیتیں رکھی جاتی ہیں جن کے سبب سے وہ آگے چل کر اپنی زندگی میں تعلیم و تربیت اور ماحول کے زیرِ اثر کسی ڈاکٹر' پروفیسر' انجینئر' سیاست دان' عالمِ دین' ولیِ کامل' تاجر یا ایک جاہل مزدور اور بدمعاش غنڈے کی شخصیت میں معاشرے کے اندر ابھرتا ہے۔ (قرآنی متن کے حوالہ کے لئے رجوع کیجئے صفحات ۱۹۶' ۱۹۷ کتاب ہٰذا)

انسانی تخلیق کے ان تمام مراحل میں انسان کا صرف اتنا کام ہے کہ وہ اپنے نطفہ کو عورت کے رِحم تک پہنچاتا ہے۔ اس کے بعد اس کے نطفہ سے ایک خاص جرثومہ کو نسوانی بیضہ سے کون ملاتا ہے۔ پھر اس باہمی ملاپ کے نتیجہ کو پہلے عَلَقہ پھر مُضغہ کی شکل میں کون لاتا ہے۔ پھر اس مُضغہ کو الگ الگ انسانی صورتوں کا لباس پہنا کر چار ماہ بعد اس میں روح کون پھونکتا ہے اور یہ فیصلہ کرنا کس کا کام ہے کہ اس شخص کو سلیم الاعضاء بنانا ہے یا محتاج اور اپاہج۔ پھر اُس کے ذہن اور دماغ میں مختلف شعبوں کی الگ الگ صلاحیتوں کو کون رکھتا ہے اور نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں اُسے مسلسل غذا اور نشو و نما کا مادّہ کون فراہم کرتا ہے۔ کیا یہ تمام کام وہ عورت خود کرتی ہے یا کوئی ڈاکٹر اور حکیم اپنی ادویات سے اس عمل کو جاری رکھتا ہے یا پھر یہ کسی سائنسدان کا شاہکار ہے یا بے جان بُت جو خود سے ہل بھی نہیں سکتے' وہ نطفہ کی ایک بے جان بوند کو جیتا جاگتا انسان بنا دیتے ہیں۔ پھر آخر یہ کس کا کارنامہ ہے؟ کیا اب بھی عقل یہ فیصلہ نہیں کر پاتی کہ خدائے واحد کے سوا اِن افعال کا کوئی اور خالق نہیں ہے!

اِن روشن حقائق کے پیشِ نظر اگر اب بھی کوئی شخص ڈھٹائی سے کہہ دے کہ محض اتفاق سے یہ سارا عمل خود بخود ہو رہا ہے تو ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ اگر تخلیقِ انسانی محض ایک اتفاقی حادثہ ہے تو اس میں ابتداءً مرد

اور عورت کے باہمی ملاپ کی قید کیوں ہے؟ محض ایک مرد یا صرف ایک عورت سے بچہ پیدا کیوں نہیں ہو جاتا؟ اور تمام دنیا میں انسان کی پیدائش کے لئے ایک ہی ضابطہ کیوں مقرر ہے؟ ہمیشہ ایک مکمل بچہ پیدا ہونے کے لئے ایک مخصوص عرصہ کیوں درکار رہوتا ہے۔ لادینیت اور دہریت کی بنیاد پر ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے اگر کوئی شخص عقل سے بالکل اندھا اور ہوش و حواس سے قطعاً عاری نہیں ہو چکا تو اُسے لازماً ماننا پڑے گا کہ اِس عالم کے ماوراء ایک قادر و قاہر ہستی ہے جو خلاق اور جواد ہے جس نے نسلِ انسانی کے ارتقاء کے لئے ایک سبب بنایا اور اُس سبب میں اس قدر کشش رکھ دی کہ مرد اپنے شہوانی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنا نطفہ عورت کے رِحم تک پہنچا دے اور بس! غور کا مقام ہے کہ جو بچہ پیٹ سے باہر آ کر ہوا کے ایک جھونکے اور دودھ کی چند چسکیوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا' وہ مسلسل نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں ہوا' پانی اور خارجی غذا کے بغیر کیسے زندہ رہا اور جیتا جاگتا رہا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ انسان کی زندگی اور اُس کی نشوونما کے لئے ہوا' پانی اور خارجی غذا مؤثر ہیں یا نہیں؟ اگر ان چیزوں کا اس کی زندگی میں کوئی دخل نہیں تو دنیا میں انسان اِن چیزوں کے بغیر زندہ کیوں نہیں رہ سکتا اور اگر یہ چیزیں اُس کی حیات اور بقاء میں مؤثر ہیں تو اُن کے بغیر وہ ماں کے پیٹ میں کس طرح زندہ رہ سکا۔ معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے اور نہ ہی فطرت اور طبیعت کا تقاضا ہے بلکہ وہ خالصۃً اللہ تبارک و تعالیٰ کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اِسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا ہے:۔

(i) هُوَالَّذِیْ یُصَوِّرُکُمْ فِی الْاَرْحَامِ کَیْفَ یَشَآءُ (آل عمران : ٦)

"وہ (وہی) خدا ہے جو رحموں کے اندر تمہاری صورت بناتا ہے جس طرح وہ چاہتا ہے۔"

(ii) أَوَلَا یَذْکُرُ الْاِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ یَكُ شَیْئًاo (مریم : ٦٧)

"کیا انسان کو یہ یاد نہیں کہ ہم ہی اُسے اس سے پہلے پیدا کر چکے ہیں جبکہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔"

یعنی اللہ تعالیٰ اُسے عدم سے وجود میں لایا تھا اور کسی چیز کو دوبارہ بنانا پہلی بار بنانے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ لَمْ یَكُ شَیْئًا میں جاہلیین' معقولین و نا معقولین کے فلسفے کا رد بھی آ گیا جو تخلیقِ انسانی سے قبل ہیولیٰ وغیرہ کا وجود فرض کئے ہوئے ہیں۔

(iii) یٰاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْکَرِیْمِo الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَo فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَكَo (الانفطار : ٦ تا ٨)

"اے انسان! تجھے (آخر) کس چیز نے اپنے کریم پروردگار سے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے (وہ پروردگار) جس نے تجھے پیدا کیا' پھر تجھے درست کیا' پھر تجھے اعتدال پر بنایا اور جس صورت میں بھی چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔"

اِس آیت میں رب کے ساتھ اُس کی صفتِ کریمی کا ذکر فرمایا اور یہی انسان کو دھوکے میں رکھنے کی وجہ ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے انسان کے گناہ پر فوراً گرفت نہیں کرتا اور اُس سے درگزر فرماتا ہے یا اپنی گرفت کو مؤخر کر دیتا ہے۔ اس سے انسان یہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو ہمیشہ معاف فرماتا رہے گا۔ اگر گناہ کے ارتکاب کے فوراً بعد ہی اللہ تعالیٰ اُسے سزا دے دیتا تو پھر وہ دوبارہ یا بار بار گناہ نہ کرتا۔ پس اُس کا عذر یہ ہے کہ وہ کہے گا کہ اے پالنہار! مجھے بار بار گناہ کرنے پر تیرے کرم نے اُبھارا۔

کسی نے حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' سے کہا کہ مُوجدِ شطرنج کا کمال تو دیکھئے کہ اُس نے ایک مربع فٹ کے تختے میں چونسٹھ خانے بنا دئے اور اگر اِن خانوں میں لاکھ مرتبہ بھی شطرنج کھیلی جائے تو ہر مرتبہ چال مختلف ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خالق کا کمال تو دیکھو کہ اُس نے بالشت بھر چہرہ میں پانچ سوراخ کئے: دو آنکھوں کے' دو ناک کے اور ایک منہ کا' مگر اُس پر کروڑوں نقشے کھینچ دئے۔ ان میں کوئی دوسرے سے نہیں ملتا۔ اور چہرہ تو بہت دُور کی بات ہے' انسان کے ہاتھ میں دوڈھائی انچ کا انگوٹھا ہوتا ہے اور کسی انگوٹھے کی لکیریں دوسرے سے نہیں ملتیں بلکہ ایک ہی انسان کے دائیں انگوٹھے کی لکیریں بائیں انگوٹھے سے نہیں ملتیں۔

حضرت علی کرّم اللہ وجہہ' فرماتے تھے کہ پاک ہے وہ ذات جس نے چربی کی ایک بوٹی سے دِکھایا' نرم ہڈی سے سُنوایا اور گوشت کے ایک ٹکڑے کو گویا (بولنے والا) کر دیا۔ جو لوگ انسان کو محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھتے ہیں' وہ اس بات کی کیا توجیہ کریں گے کہ انسان کے جسم میں ہر جگہ گوشت ہے' پھر بولنے کا خاصہ صرف زبان میں کیوں ہے اور کیوں ضروری ہے کہ دیکھنے کے لئے صرف آنکھیں مخصوص ہیں۔ جسم کے کسی اور حصّہ کی چربی بینائی کا آلہ کیوں نہیں بن جاتی۔ اس لئے اگر کوئی شخص محض ہٹ دھرمی پر نہیں اُتر آیا تو اُسے اقرار کرنا پڑے گا کہ انسان کی تخلیق نہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے اور نہ کسی فطری ارتقائی عمل کا نتیجہ ہے بلکہ وہ مکمل طور پر اُس خلاّقِ واحد کی قدرت و حکمت کا حسین و بے مثال شاہکار ہے۔

(۴) ماں کے دودھ میں الٰہی کرشمہ سازی: جب ایک عورت ماں بن جاتی ہے اور اُس کی گود میں بچہ کھیلنے لگتا ہے تو اُس کے سینے سے دودھ اُتر آتا ہے۔ جو غذا وہ پہلے کھاتی تھی' اب بھی وہی غذا کھاتی ہے۔ نہ غذا میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ کھانے والی میں کوئی تبدیلی ہوئی۔ پھر یہ دودھ کہاں سے آگیا۔ اگر تو یہ غذا کا اثر تھا تو کسی اور شخص کے کھانے سے اُس کے سینے میں دودھ کیوں نہیں اترتا اور اگر اُس عورت کی خاصیت ہے تو بچّہ کی پیدائش سے پہلے اُس کے سینے سے دودھ کیوں نہیں نکلا؟ معلوم ہوا کہ یہ اثر نہ غذا کا ہے اور نہ غذا کھانے والی کا۔ یہ صرف اُس قادرِ مطلق کی کارفرمائی ہے جو رنگ برنگ ترکاریوں کو خون کی رنگت دیتا ہے اور جب چاہتا ہے اُس

خون کو دودھ کی سفید دھاروں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ پھر ہمارے پاس کوئی ایسا خارجی عمل نہیں جس کے ذریعے ہم ماں کے سینے سے جاری ہونے والے دودھ کو روک سکیں۔ مبدأ فیّاض کے نزدیک جب تک بچے کو دودھ کی ضرورت ہوتی ہے' وہ ماں کے سینہ میں دودھ اتارتا رہتا ہے اور جب ضرورت ختم ہو جاتی ہے تو دودھ کے جاری ہونے کا یہ سلسلہ اپنے آپ ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک اور توجہ طلب اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ بچے کے پیدا ہونے پر ماں کا دودھ انتہائی پتلا اور زود ہضم ہوتا ہے کیونکہ بچے کا معدہ اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ گاڑھے دودھ کو ہضم کر سکے۔ اب جوں جوں بچہ عمر میں بڑھتا ہے' اُسی تناسب سے رفتہ رفتہ دودھ بھی گاڑھا ہونا شروع ہو جاتا ہے کیونکہ معدہ اب اُس گاڑھے اور کثیف دودھ کو ہضم کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ کیا انسان کے جسمانی نظام میں اللہ کی ذات اور اُس کی حکمت اور قدرت کی یہ بہترین نشانیاں نہیں ہیں؟

(۵) <u>جانوروں کے دودھ میں کرشمہ سازیاں</u> : جانوروں سے ہم جو دودھ حاصل کرتے ہیں' یہ اُس چارے سے حاصل ہوتا ہے جسے جانور کھاتے ہیں۔ جب جانوروں کی اوجھڑی میں یہ چارہ پہنچتا ہے تو اوجھڑی میں ہضمِ اوّل کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اوجھڑی کے اوپر کے حصّہ میں خون' نچلے حصّہ میں گوبر اور درمیانی حصّے میں دودھ کا قوام تیار ہوتا ہے اور اس قوام کو اللہ تعالیٰ ہضم کے مختلف مراحل سے گزارتا ہوا جانوروں کے تھنوں تک پہنچا دیتا ہے۔ دودھ کے نیچے گندگی اور غلاظت ہوتی ہے اور اس کے اوپر سرخ رنگ کا سیّال خون دَوڑ رہا ہوتا ہے۔ آخر وہ کون سی حقیقت ہے جو جانوروں کے پیٹ میں تصرّف کر کے سرخ رنگ کے سیّال خون اور بدبودار گوبر کے درمیان سے صاف وسفید' شیریں اور مزیدار دودھ کو اس طرح باہر نکال لیتی ہے کہ نہ گوبر کا کوئی ذرّہ اس میں داخل ہوتا ہے اور نہ خون کا کوئی قطرہ اس میں نظر آتا ہے۔ کیا یہ صاف اور پاکیزہ دودھ اُس خالقِ کائنات کی قدرتِ مطلقہ کی طرف اشارہ نہیں کرتا جو فرماتا ہے:۔

وَاِنَّ لَكُمۡ فِى الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَةً نُسۡقِيۡكُمۡ مِّمَّا فِىۡ بُطُوۡنِهٖ مِنۡۢ بَيۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيۡنَ○ (اَلنَّحل : ٦٦)

"بے شک مویشیوں میں بھی تمہارے لئے بڑا سبق ہے۔ اُن کے پیٹ میں جو کچھ ہوتا ہے گوبر اور خون (کے قسم) سے اُس کے درمیان سے صاف اور پینے والوں کے لئے خوشگوار دودھ ہم تمہیں پینے کو دیتے ہیں۔"

دودھ کا یہ حصول چارے کا طبعی خاصہ نہیں ہے ورنہ نر جانور بھی یہی چارہ کھاتے ہیں لیکن اُن سے دودھ کا کوئی قطرہ نہیں ملتا اور نہ ہی یہ مادہ جانور کی طبعی خصوصیت ہے کیونکہ بچہ کے مرجانے کے بعد بھی وہ ایک مدت مقررہ تک دودھ دیتی رہتی ہے۔ معلوم ہوُا کہ جانوروں سے دودھ کے حصول کے نظام میں چارہ' جانور اور بچہ کوئی مرکزی کردار ادا نہیں کرتے بلکہ اس کے پسِ پردہ ایک ایسی ذات کارفرما ہے جو عالَم کے ذرّہ ذرّہ میں اپنا تصرف فرما رہی ہے۔

دودھ کی خلقت میں حشر و نشر کے وقوع کی دلیل: محققین نے کہا کہ جس طرح دودھ کے پیدا کرنے کے نظام میں غور و فکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے وجود اور اُس کی وحدانیت کا پتہ چلتا ہے' اسی طرح اس میں غور و فکر کرنے سے حشر و نشر کا وقوع بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ گھاس جسے حیوان کھاتے ہیں' زمین اور پانی سے پیدا ہوتی ہے۔ اُس قادر و قیوم اور حکیم مطلق نے اس زمین کی مٹی کو سبزہ اور گھاس بنا دیا۔ پھر جب اس گھاس کو حیوان کھا لیتے ہیں تو اُس نے ایک اور تدبیر سے اُس گھاس کو خون بنا دیا۔ پھر ایک اور تدبیر سے اُس خون کو دودھ بنا دیا۔ پھر اُس دودھ میں چکنائی کا عنصر پیدا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ قادر و قیوم اور حکیم مطلق اس پر قادر ہے کہ وہ اجسام کو ایک صفت سے دوسری صفت کی طرف اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کرتا ہے اور جب وہ اس پر قادر ہے تو اس پر بھی قادر ہے کہ وہ مردہ جسموں کے اجزاء میں حیات منتقل کر دے اور اُن میں عقل اور شعور پیدا کر دے جس طرح موت سے پہلے ان اجزاء میں حیات اور عقل و شعور کو پیدا فرمایا تھا۔ ان حقائق پر غور و فکر کرنے سے معلوم یہ ہوا کہ قیامت کو قائم کرنا اور مُردوں کو زندہ کرنا ایک ممکن امر ہے (تفسیر کبیر' ج ۷' ص ۲۳۴)

(۶) پانی کی فراہمی میں کرشمہ سازیاں: پانی انسان کی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ سمندر کا پانی اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ اُس کے چند گھونٹ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارے جا سکتے۔ پھر یہی پانی جب بخارات کی شکل میں طبقہ زمہریر یہ تک پہنچتا ہے اور موسلا دھار بادلوں سے ٹھنڈا' میٹھا اور شفاف پانی بن کر برستا ہے تو وہ کون ہے جو اُس کڑوے پانی میں شکر گھول دیتا ہے۔ دریاؤں سے جو اکثر و بیشتر پانی حاصل ہوتا ہے' وہ بھی بادل اور بارش کا فیضان ہوتا ہے اور پہاڑوں کی بلند بانگ چوٹیوں پر جو برف جمی ہوتی ہے' وہاں اس برف کو اُن چوٹیوں پر کون جماتا ہے۔ کیا پہاڑوں کی چوٹیوں سے برفانی گھاٹیوں تک برف گرنے کا انتظام اور بادلوں کے ذریعے پانی کی بہم رسانی کا نظام یونہی خود بخود وجود میں آ گیا ہے؟ جب کارپوریشن کا ایک نل بھی ایک مستری اور چند مزدوروں کے بغیر نہیں لگ سکتا تو پانی کی اس قدر عظیم الشان ترسیل کا انتظام کسی منتظم کے بغیر کیسے ممکن ہے! پھر یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ کارپوریشن جو ایک محلّہ کو ٹیکس لے کر پانی فراہم کرے' اُس کی نظامت کو تو ہم تسلیم کر لیں اور جو ساری دنیا کو بغیر کسی ٹیکس کے پانی مہیا کر رہا ہے' اُس کے نظام اور اُس کی قدرت کا ہم انکار کر دیں۔ جبھی تو وہ فرماتا ہے:

أَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِىْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَ أَنْتُمْ أَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝ لَوْنَشَآءُ جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ۝ (الواقعة : ۶۸ تا ۷۰)

''اچھا پھر یہ بتاؤ کہ جس پانی کو تم پیتے ہو' اُسے بادل سے تم برساتے ہو یا (اُس کے) برسانے والے ہم ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو اُسے کڑوا کر ڈالیں' تو تم شکر کیوں نہیں کرتے؟''

پانی کے حصول کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ زمین کے نیچے گہرائی میں پانی رکھا گیا ہے جسے ہم ہینڈ پمپ اور ٹیوب وَیل سے نکال کر اپنے کام میں لاتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس پانی کو زمین کی تہہ میں رکھا کس نے اور اتنے ہزاروں فٹ کی گہرائی میں جا کر رکھ بھی کون سکتا ہے! جن علاقوں میں دریاؤں اور نہروں کا پانی نہیں پہنچ سکتا وہاں اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس پانی کو دریائی پانی کا بدل بنا دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَصْبَحَ مَآءُ كُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّأْتِيكُم بِمَآءٍ مَّعِينٍ ۝ (المُلك : ۳۰)

''فرما دیجئے کہ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تمہارا پانی نیچے کو غائب ہی ہو جائے تو کون ہے جو تمہارے پاس بہتا ہوا پانی لا کر دے گا۔''

جس جگہ زمین کی گہرائیوں سے پانی نکالنے کی ضرورت تھی' وہاں اسے زمین کے اندر گہرائیوں میں رکھا اور جہاں سخت پہاڑی اور پتھریلی زمینیں ہیں اور زمین کو کھودنا مشکل ہے' اُس نے وہاں پانی کے چشمے جاری کر دیئے۔ کہیں برفانی چوٹیوں اور بادلوں کی لگا تار برسات سے دریاؤں کو رواں دواں کر دیا' کہیں کنوؤں اور ندیوں کا انتظام کر دیا۔ غرض جس جگہ پانی کی بہم رسانی کی ضرورت جس طرح پوری ہو سکتی تھی' اُس طریقہ سے پانی کو وہاں پہنچایا گیا۔ کیا پانی کی یہ حکیمانہ ترسیل کسی جلیل القدر حکیم اور زبردست قادر اور عظیم خالق کے وجود کا تقاضا نہیں کرتی؟ کیا اب بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ خلقِ خدا کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق ہر جگہ اُن کے مقام کے مناسب یہ پانی خود بخود بغیر کسی پہنچانے والے کے پہنچ رہا ہے؟

(۷) عالمِ حیوانات میں کرشمہ سازیاں : اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے روشن مظاہر چار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مکھی اور مچھر جیسی ننھی مخلوق سے لے کر عظیم الجثہ ہاتھی تک اُس نے ہر مخلوق کی جسمانی ساخت اُس کی ضرورت کے مطابق بنائی ہے۔ عظیم الجثہ ہاتھی کے تمام اعضاء مکھی جیسی ننھی مخلوق میں موجود ہیں۔ رینگنے والے جانوروں سے لے کر درندوں تک' چوپایوں سے لے کر دوپایہ جانوروں اور پرندوں تک ہر مخلوق میں بے نقص پیدائش کی نشانیاں اور حیران کن دانش کارفرما ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُس نے ہر مخلوق کے لئے خوراک اور چارے کا مناسب بندوبست کیا اور اُنہیں اپنی روزی حاصل کرنے کے طریقے سجھا دیئے۔ شمال مغربی سرد علاقوں کے جانوروں کے جسموں پر لمبے گھنے اونی بال اُگا دیئے تاکہ بالوں کی کثرت شدید سردی کے مقابل اُن کی محافظ بن جائے۔ مشرقی اور گرم علاقوں کے جانوروں پر ایسے بال نہیں ہوتے کہ اس صورت میں وہ گرمی سے تڑپ کر مر جائیں۔ مچھلی کے جسم کو ایسا بنا دیا جو آبی مخلوقات کے لائق تھا اور زندگی بھر پانی میں رہنے سے اُس کا جسم گلنے سے محفوظ رہتا ہے جبکہ انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مچھلی خشکی (زمین) میں نہیں رہ سکتی اور انسان پانی میں نہیں رہ سکتا۔ اُن کے جسموں کی ساخت اُن کی

ضرورت کے مطابق بنائی گئی ہے۔ اونٹ صحرا کا جہاز ہے اور حیران کن جسامت والا ہے۔ وہ ریتلے صحرا میں پیاسا ہوتے ہوئے بھی کچھ دنوں تک بہ آسانی چل سکتا ہے۔ اس کے بالوں کو بُننے کے کام میں لایا جا سکتا ہے۔ اُس کی کوہان کو پانی کا ذخیرہ بنایا گیا ہے۔ اُس کی گردن کو اتنا لمبا اور طویل بنایا گیا ہے کہ وہ ناقابلِ رسائی خاردار جنگلی جھاڑیوں تک پہنچ جاتا ہے۔ اُس کے گوشت اور دودھ کو حلال کیا گیا۔ اُسے نقل وحمل میں استعمال کیا جاتا ہے اور دور دراز علاقوں اور مسافتوں کو طے کرنے میں اس سے سواری کا کام لیا جاتا ہے۔ سوار ہوتے وقت دوسرے جانوروں کے برعکس وہ بیٹھ بھی جاتا ہے اور انسانوں اور سامان کو اٹھا لیتا ہے۔ پانچ چھ سال کے چھوٹے بچے سے وہ قابو میں آجاتا ہے جو اُسے جدھر چاہے لے کر پھرتا رہے۔ وہ ایسا شریف ومعصوم جانور ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے ہماری توجہ اُس کی انہی خصوصیات کی طرف مبذول کرائی اور فرمایا:

أَفَلَا يَنظُرُونَ إِلَى الْإِبِلِ كَيْفَ خُلِقَتْ (الغاشية: ۱۷)

''یہ لوگ کیا اونٹ پر نظر نہیں کرتے کہ وہ کیسی (عجیب) طرح پیدا کیا گیا ہے۔''

افریقی اور گرم علاقوں کے لوگوں کا مزاج ایسا بنایا گیا کہ وہ شدید گرمی کو برداشت کر سکیں۔ اور شمال مغربی لوگوں کے مزاج میں جہاں درجہ حرارت نقطہ انجماد تک پہنچ جاتا ہے' شدید سردی کے مقابل دفاع کا عنصر دیکھا جا سکتا ہے۔

تو کیا ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے ''اتفاقی حادثہ'' کا مفروضہ اِن روشن حقائق کے چیلنج کو قبول کر سکتا ہے اور کیا اُس میں یہ جرأت ہے کہ وہ اس عمدہ' منظم' خوش آہنگ اور متوازن نظامِ کائنات سے عقلِ کُل اور قدرتِ مطلقہ کے دستِ غیب کو نکال باہر کرے؟ (العیاذ باللہ)

(۸) زمین کی تخلیق میں کرشمہ سازیاں: سورۃ الذّاریٰت کی آیت ۲۰ میں فرمایا گیا:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ٥

''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔''

سورۃ الانعام کی آیت ۷۳ میں ارشاد ہوا:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ

''وہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو صحیح تناسبات میں پیدا فرمایا۔''

بِالْحَقِّ یعنی صحیح تناسبات کے مفہوم کو واضح اور شفاف کرتے ہوئے نیویارک سائنس اکیڈمی کے صدر اے سی موریسن کا حوالہ دیا جاتا ہے:-

سورج کے ساتھ ساتھ تمام سیارگان اور طفیلی سیارے (Satellites) سورج کے نظامِ کشش کے اندر رہتے ہوئے اُتنا ہی فاصلہ طے کرتے ہیں۔ مزید برآں کائنات میں واقع تمام ستارے اُسی حرکی نظام کے تابع ہیں۔'' ("Islam and Karma" ... Harun Yahya, pp. 100, 101)

(۹) تمام خلا راستوں اور مداروں سے پُر ہے : جس کا ذکر سورۃ الذاریات: ۷ میں ہے :
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷ : ۵۱) (قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں)

''کائنات میں تقریباً دو سو اَرب کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں تقریباً دو سو اَرب ستارے ہیں۔ اِن ستاروں میں سے اکثر کے سیارے ہیں اور اُن سیاروں میں سے اکثر کے طفیلی سیارے (Satellites) ہیں یہ تمام اجرامِ فلکی کمپیوٹرائز کئے ہوئے مداروں میں بالکل ٹھیک طور سے حرکت کرتے ہیں۔ لاکھوں سالوں سے اُن میں سے ہر ایک مکمل ہم آہنگی اور نظم و ضبط سے اپنے اپنے مدار میں ''تیر رہا ہے''۔ علاوہ ازیں بہت سے دُمدار تارے (Comets) بھی اپنے مخصوص مداروں میں حرکت کر رہے ہیں۔ کائنات میں مدار صرف اجرامِ فلکی ہی کے نہیں ہیں۔ کہکشائیں بھی کمپیوٹرائز ڈ اور منصوبہ بندی کئے ہوئے مداروں میں انتہائی تیز رفتاری سے حرکت کرتی ہیں۔ اِن حرکتوں کے دوران اِن اجرامِ فلکی میں سے کوئی بھی دوسرے کی راہ کو نہیں کاٹتا یا دوسرے سے نہیں ٹکراتا۔'' (ایضاً صفحہ ۱۰۱)

جب قرآن مجید نے اس حقیقت کو بے نقاب کیا تو انسان کے پاس لاکھوں کلومیٹر پھیلی ہوئی خلا کو دیکھنے کے لئے نہ تو ٹیلی سکوپ اور ترقی یافتہ مشاہداتی ٹیکنالوجی تھی اور نہ ہی طبعیات یا علم الافلاک کا جدید علم تھا۔ لہٰذا اُس وقت سائنسی طور پر یہ معلوم کرنا ممکن ہی نہ تھا کہ خلا راستوں اور مداروں سے پُر ہے جیسا کہ قرآن مجید نے بتایا ہے۔ تو کیا یہ تمام بات اس ناقابلِ انکار حقیقت کی مضبوط دلیل نہیں کہ قرآن مجید اللہ بزرگ و برتر کا کلام ہے!!

علم آفاقیات (Cosmology) میں ایک غلط فہمی کا ازالہ : ناقدین قرآن کہتے ہیں کہ سورہ حٰم السجدہ کے مطابق اللہ نے دو مرحلوں میں زمین، چار مرحلوں میں اہلِ زمین کے لئے غذا اور دو مرحلوں میں آسمان پیدا کئے یعنی ان تمام چیزوں کو اُس نے آٹھ مرحلوں میں پیدا کیا حالانکہ دوسری آیتوں میں بتایا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو چھ مرحلوں میں پیدا کیا (الم السجدۃ: ۴؛ الفرقان: ۵۹؛ ق: ۳۸)۔ اس اعتراض سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر یہ الٰہی کلام ہوتا تو اس میں تضاد نہ ہوتا۔ تضاد کی موجودگی میں وہ اسے خدائی کلام ماننے کو تیار نہیں ہیں۔

اُن کا یہ اعتراض محض لاعلمی اور ضد و عناد پر مبنی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چار دنوں میں اہلِ زمین کے لئے غذا پیدا کرنے کا جو ذکر ہے، اُس میں وہ دو دن بھی شامل ہیں جن دو دنوں میں زمین پیدا کی گئی۔ (تبیان القرآن، ج ۱۰

ناقدین اور دشمنانِ قرآن سے یہ جاندار سوال بجا طور پر کیا جا سکتا ہے کہ اگر ہمارے پیغمبر (معاذ اللہ) اللہ

”زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکّر کاٹ رہی ہے۔ اگر اُس کی رفتار ایک ہزار کی بجائے ایک سومیل ہوتی تو دن اتنے لمبے ہوتے کہ سورج کی تپش تمام کھیتوں کو بھون کر رکھ دیتی اور راتیں اتنی لمبی اور سرد ہوتیں کہ زندگی کی اگر کچھ رمق سورج کی تپش سے بچ جاتی تو رات کی سردی اُسے منجمد کر کے رکھ دیتی۔ سورج کا درجہ حرارت بارہ ہزار ڈگری فارن ہیٹ ہے لیکن زمین کو اس سے اتنی مناسب دُوری پر رکھ دیا گیا ہے کہ وہاں سورج کی حرارت اِس قدر ہی پہنچتی ہے جو حیات بخش ہے۔ لیکن اگر سورج کا درجہ حرارت بارہ ہزار ڈگری کی بجائے چھ ہزار ڈگری ہوتا تو کرۂ زمین برف کے نیچے دب جاتا اور اگر اٹھارہ ہزار ڈگری ہوتا تو ساری زمین اُس کی تمازت سے جل کر راکھ ہو جاتی۔ زمین کا جھکاؤ ساڑھے ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہے اور اسی جھکاؤ سے ہمارے موجودہ موسم مناسب وقفوں کے بعد باری باری آتے ہیں۔ اگر اس میں یہ جُھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اُٹھنے والے بخارات جنوب اور شمال میں حرکت کرتے اور اتنی زور سے برف باری ہوتی کہ ساری زمین ڈھک جاتی۔ اگر چاند کی دُوری زمین سے اتنی نہ ہوتی جتنی اب ہے بلکہ صرف پچاس ہزار میل ہوتی تو سمندروں میں مدّ و جزر اِس شدّت سے آتا کہ پہاڑوں تک کو بھی بہا کرلے جاتا۔ اگر زمین کی سطح موجودہ سطح سے صرف دس فٹ زیادہ موٹی ہوتی تو یہاں آکسیجن ہی نہ ہوتی اور کوئی جانور زندہ نہ رہتا۔ اگر سمندر چند فٹ اور گہرے ہوتے تو ساری کاربن ڈائی آکسائڈ اور آکسیجن صَرف ہو جاتی اور روئے زمین پر کوئی سبز پتہ نظر نہ آتا۔ اس حکیمانہ نظام پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کارخانۂ ہستی اتفاقاً معرضِ وجود میں نہیں آ گیا بلکہ ایک حکیم و دانا خالق نے اس کی تخلیق فرمائی ہے ورنہ زندگی کا کوئی امکان نہ تھا۔“ (Reader's Digest : October, 1960)

یہ اقتباس پڑھ لینے کے بعد اب آیتِ مذکورہ کو دوبارہ پڑھئے اور اُس کے نازل کرنے والے مولائے برحق کے حضور میں سربسجود ہو جایئے اور جس ذاتِ قُدس صفات نے اُمّی ہوتے ہوئے اس حقیقتِ پنہاں کے رُخ سے نقاب اٹھایا ہے‘ اُس پر زبان‘ دل اور روح سے صلوٰۃ وسلام عرض کیجئے:

اُمّیئے بُود کہ ما از اثرِ حکمتِ او ۔۔۔ واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم (اقبالؒ)

(۹) <u>لیل و نہار میں کرشمہ سازیاں</u> : رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا سورج کی حرکات سے وجود میں آتا ہے۔ سورج کی حرکت سے زمین کا جو حصّہ اس کے بالمقابل ہو‘ وہاں دن ہوتا ہے اور جب سورج حرکت کرتا ہو‘ا زمین کے اُس حصّہ سے غروب ہو جاتا ہے تو اُس حصّہ میں رات ہو جاتی ہے اور اسی طرح پیہم اور لگاتار کرۂ ارض کے ہر حصّہ میں سورج کے طلوع و غروب سے دن اور رات کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ سورج کو کون حرکت دے رہا ہے اور دن اور رات کا سلسلہ قائم کرنے کے لئے رُحل

مُشتری، مرّیخ اور دوسرے کواکب سیارہ میں سے صرف سورج کی تخصیص کس نے کی ہے، کسی اور سیارہ سے یہ کام کیوں نہیں لیا گیا؟ کیا سورج کی حرکت، روشنی اور توانائی کا یہ سلسلہ کوئی اتفاقی حادثہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس میں ضبط، تسلسل اور دوام کیوں ہے اور اگر سورج از خود یہ عمل کرتا ہے تو اس جیسے دوسرے سیارگان جو فی نفسہ جسم ہونے اور متحرک رہنے میں اُس جیسے ہیں، یہ عمل کیوں نہیں کرتے؟ پھر سورج میں روشنی، توانائی اور ایک خاص محور پر متواتر گردش کا نظام کس نے بنایا ہے اور یہ کس کی حکمت ہے جس نے سورج کو زمین سے ایک خاص اور مناسب فاصلہ پر ایسے مدار میں رکھا ہے جس میں حیاتِ انسانی و حیوانی ممکن ہوئی۔ سورہ یٰسٓ میں ارشاد ہوا:

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ (یٰسٓ : ۳۸)

''اور ایک نشانی آفتاب بھی کہ اپنے مرکز کے گرد گردش کرتا رہتا ہے اور یہ بہت غالب، بے حد علم والے کا بنایا ہوا انظام ہے۔''

''سورج کی حرکات سے محض دن اور رات کا وجود ہی عمل میں نہیں آتا بلکہ دن اور رات کا اختلاف بھی وجود میں آتا ہے۔ گرمی، سردی، بہار اور خزاں یہ تمام موسم دن اور رات کے اختلاف سے رُونپذیر ہوتے ہیں اور انسانوں اور حیوانوں کی جسمانی نشوونما اور مختلف فصلوں، پھلوں اور پھولوں کی پیداوار اور افزائش کے لئے موسم کا اختلاف بے حد ضروری ہے۔ اگر موسموں کا یہ حکیمانہ اختلاف نہ ہوتا تو نہ زمین پر فصل اُگتی اور نہ باغوں میں پھول مہکتے۔ یہ موسمی اختلاف صرف نباتات کے بقاء کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی اور حیوانی بقاء کے لئے بھی ضروری ہے۔''

''یہ کس قدر زبردست حکمت ہے کہ موسموں کا یہ اختلاف اچانک اور فوراً نہیں ہوتا بلکہ تدریجاً سردی کم ہوتی جاتی ہے اور گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ اگر دسمبر، جنوری کی سخت سردی کے بعد اچانک مئی، جون کی گرمی آجاتی تو اس اچانک تبدیلی سے انسان کے اعصاب پر کس قدر گہرا اثر پڑتا اور مشکل سے ہی کوئی ذی نفس زندہ رہ سکتا۔''

دن اور رات کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے جانے میں حکمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے ہر حصّہ کے لئے سورج کے الگ الگ طلوع کی جگہ مقرر کی تاکہ زمین کے باطن میں رطوبتیں جمع ہوتی رہیں اور سبزہ اور درخت برقرار رہیں پھر بتدریج سورج کی سمت کو ہر روز زمین کے قریب کرتا رہا تاکہ کھیتوں میں غلّہ اور باغوں میں پھل پک سکیں۔ پھر سورج کو اس سمت سے بتدریج دُور کرتا رہا تاکہ زمین کی پیداوار اور نباتات جل نہ جائیں اور ظاہر ہے کہ یہ بے حد غالب اور بہت علم والے کا بنایا ہوا انظام ہے۔

رات اور دن میں مکمل تضاد ہے اور دو متضاد چیزیں ہمیشہ فساد کا موجب ہوتی ہیں لیکن قدرت نے رات

اور دن کے خوبصورت اور حسین تضاد میں منافع اور مصالح کو حاصل کرنے کے لئے مکمل معاونت رکھی ہے۔ دن بنایا تا کہ اس میں انسان وحیوان اپنی معیشت کا سامان حاصل کر سکیں اور رات پیدا کی تا کہ دن بھر کا تھکا ماندہ انسان یا حیوان رات کی آغوش میں اپنے تھکے ہوئے اعصاب کو آرام پہنچا سکے اور رات میں اُسے ایسی میٹھی اور گہری نیند عطا کی جس سے اُس کی دن بھر کی کلفتیں دُور ہو گئیں۔ سورۃ القصص میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہوا اور فرمایا:

قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ أَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ٥ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ النَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ٥ (القصص: ۷۲،۷۳)

''فرمادیجئے بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو اللہ کے علاوہ کون معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آئے جس میں تم آرام پاؤ؟ تو کیا تم دیکھتے نہیں؟ اور یہ اُس کی رحمت ہی تو ہے کہ اُس نے تمہارے لئے رات اور دن بنادئے کہ تم اس میں آرام بھی کرو اور تا کہ اُس کی روزی بھی تلاش کرتے رہو اور تا کہ تم شکر کرتے رہو۔''

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ روزی کمانے کے دھندے کو مِنْ رَّحْمَتِهٖ رحمتِ الٰہی کے تحت میں لانا صاف اِس امر پر دلیل ہے کہ معاشی مشغلے اسلام میں کتنی فضیلت کا درجہ رکھتے ہیں۔ حقیر و ذلیل نہیں، معزّز و مکرّم ہیں۔

معروف انگریز ڈرامہ نگار شیکسپیئر نے اپنے ہیرو میکبتھ کی زبانی کس خوبصورتی سے نیند کی ستائش کی ہے!

''معصوم اور بے خطا نیند
وہ نیند جو دن بھر کے پریشان کُن تفکرات کو ٹانک دیتی ہے
وہ نیند جو ہر دن کی حیات کے اختتام کا پیغام ہے، پُر آزار جفاکشی کو دھونے (مٹانے) کا ذریعہ ہے۔
زخم خوردہ ذہنوں کا مرہم ہے، فطرتِ عظیمہ کے مسلسل آگے بڑھنے کا ثانوی راستہ ہے۔
زندگی کی ضیافت اور تلذّذ کو عظیم پروان چڑھانے والی ہے۔'' (Macbeth .. Act 2, Sc. 2)

(۱۰) کشتیوں اور جہازوں میں: چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے لے کر دیو پیکر جہازوں تک جو دریاؤں اور سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں، یہ سب انسانی عقل اور اس کے ہاتھوں کی تراش وخراش کا نتیجہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اُن کی تیاری کے لئے لکڑی، لوہا اور دوسرے میٹیریل کو کس نے پیدا کیا۔ بادبانی کشتیوں کو متحرک رکھنے کے لئے ہوائیں کس نے چلائیں اور دخانی جہازوں کی حرکت کے لئے ایندھن کس نے پیدا کیا۔ لکڑی کی طبیعت میں یہ خاصہ کس نے رکھا کہ وہ ہزاروں ٹن بوجھ اٹھانے کے باوجود

بھی سطح سمندر پر تیرتی رہتی ہے۔لوہا اور لکڑی دونوں جسمیت میں متماثل (ایک جیسے) ہیں۔ پھر اُن میں یہ فرق کس نے رکھا ہے کہ لوہا ایک تولہ بھی ہو تو پانی میں ڈوب جاتا ہے اور لکڑی ہزاروں ٹن کی بھی ہو تو سطحِ آب پر تیرتی رہتی ہے۔ پھر انسانوں کے دلوں میں سکون اور طمانیت کس نے رکھا ہے کہ وہ بحری سفر کے لئے بے خوف و خطر تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر علاقہ کو کسی خاص جنس کے ساتھ کس نے خاص کیا جس کی وجہ سے بحری سفر کی ضرورتیں پیش آتی ہیں اور جب غیظ و غضب سے بھرپور طوفانی لہریں اٹھتی ہیں تو ان طوفانوں سے جہازوں کو سلامتی کے ساتھ کون پار لے جاتا ہے اور جب جہاز خطرات سے گھر جاتا ہے تو مسافروں کی نگاہیں کس کی طرف اٹھتی ہیں اور دعاؤں کے لئے ہاتھ کس کی بارگاہ میں اٹھتے ہیں؟ نقوش اور فطرت کے عجیب و غریب کرشمے شب و روز ہمارے سامنے آتے ہیں لیکن فاطر اور نقاش کی طرف ہماری نظریں نہیں اُٹھتیں۔ صنعت و خلقت کے بہترین نمونے ہر وقت ہمارے پیشِ نظر رہتے ہیں لیکن صانع اور خالق کی طرف ہم متوجہ نہیں ہوتے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں متوجہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ الْفُلْكُ فِیْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (الجاثیة : ۱۲)

"اللہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا تاکہ اُس کے حکم میں اُس میں کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اُس کی (دی ہوئی) روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔"

فَضْل یہاں بہت وسیع معنیٰ میں ہے۔ بحری تجارت، بحری شکار، جہاز رانی، سیپی موتی، مونگے کا کاروبار، غوّاصی سب کچھ اس میں آجاتا ہے (تفسیر بیضاوی)۔ بِاَمْرِہٖ میں اشارہ کر دیا کہ سمندر کا اتنا مسخر ہو جانا تمام تر احسانِ خداوندی ہے۔ بندہ اُسے اپنی قابلیت و قوتِ ایجاد کی طرف منسوب کر کے اپنے اوپر نازاں نہ ہو۔

انسان کے لئے سمندر کی تسخیر کے یہ معنیٰ ہیں:۔

(۱) ہواؤں کو اس سمت پر چلانا جس سمت کشتی جا رہی ہو کیونکہ اگر ہوا مخالف ہو تو کشتی کا سفر دشوار ہو گا۔

(۲) پانی کو اس کیفیت پر برقرار رکھا کہ کشتی پانی کی سطح پر ٹھہر سکے اور سفر کر سکے۔ کیونکہ لوہے کا معمولی وزن کا ٹکڑا پانی میں ڈوب جاتا ہے جبکہ ہزاروں ٹن کے بحری جہاز سطحِ سمندر پر رواں دواں رہتے ہیں۔ پس سبحان ہے وہ ذات جو لوہے کے معمولی ٹکڑے کو سطحِ آب پر ٹھہرنے نہیں دیتا اور ہزاروں ٹن وزنی بحری جہازوں کو سمندر میں رواں دواں رکھتا ہے۔

(۳) اللہ نے ہی وہ ایندھن پیدا کیا جس سے دخانی کشتیوں کا انجن اور موٹر چلتا ہے۔ اُس نے زمین میں

قدرتی گیس اور تیل پیدا کیا جس سے بحری جہاز کے انجن چلتے ہیں اور اس نے یورینیم پیدا کیا جس سے ایٹمی بحری جہاز چلتے ہیں۔

(۴) اُس نے انسان کو ایسی عقل وفہم عطا کی جس نے بحری جہازوں کے انجن بنائے اور قدرتی گیس‘ تیل اور یورینیم کو بہ طور ایندھن استعمال کرنے کی صلاحیت عطا کی۔ ایک دَور میں انسان چپوؤں سے کشتی چلاتے تھے پھر ہوا کی طاقت سے اور اس کے زور سے بادبانی جہاز چلانے لگے۔ پھر اللہ نے انسانی دماغ کو مزید ترقی کی راہ پر ڈالا اور وہ انجن سے جہاز چلانے لگے اور تیل اور گیس کو بطور ایندھن استعمال کرنے لگے اور اب یورینیم کی طاقت سے ایٹمی انجن سے بحری جہاز چلائے جاتے ہیں۔ پس سبحان ہے وہ ذات جس نے زمین میں اِن چیزوں کو پیدا کیا اور انسان کو ان سے فائدہ اٹھانے کی سمجھ اور صلاحیت عطا کی۔

(۱۱) __ہواؤں میں__: انسانی زندگی کو اپنی بقاء کے لئے ہوا‘ پانی اور خوراک کی ضرورت ہے۔ اب آپ نظامِ قدرت پر غور کیجئے کہ انسان کو اپنی بقاء کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت تھی اور جس کے بغیر وہ ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا‘ اس کا حصول اللہ پاک نے سب سے آسان کر دیا ہے کہ انسان ہو یا حیوان‘ وہ بغیر کسی مشقت کے ہروقت اور ہر جگہ ہوا کو بہ آسانی حاصل کر سکتا ہے اور اُس کے حاصل کرنے کے لئے اُسے نہ تو کوئی قیمت یا ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی کے زیر بارِ احسان ہونا پڑتا ہے۔ بقائے انسانی کے لئے پانی کی ضرورت ہوا کی نسبت کم ہے‘ اس لئے اس کا حصول بھی اس قدر عام نہیں ہے تاہم ایک ذی رُوح دن میں متعدد بار پانی پینے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لئے پانی اگرچہ ہروقت اور ہر جگہ دستیاب نہیں ہوتا تاہم اس کی متوسط ضرورت کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے ایسے ذرائع پیدا کر دئے ہیں کہ وہ بعض صورتوں میں بغیر کسی مشقت اور قیمت کے پانی حاصل کر لیتا ہے اور بعض صورتوں میں معمولی مشقت اور قیمت سے اسے ضرورت کے مطابق پانی حاصل ہو جاتا ہے۔ غذا اور خوراک کی ضرورت چونکہ ہوا اور پانی کی بہ نسبت کم ہوتی ہے‘ اس لئے اُسے غذا کے حصول کے لئے بہرحال مشقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسانی ضروریات کے مطابق ہوا‘ پانی اور خوراک کی ترسیل کو کیا کوئی شخص ایک اتفاقی حادثہ قرار دے سکتا ہے؟

ہواؤں سے ہم صرف سانس ہی نہیں لیتے۔ دریاؤں میں روانی‘ سمندروں میں تلاطم‘ اطراف عالَم میں کھیتوں اور باغات کی نشوونما‘ سمندروں میں جہازوں کی آمدورفت‘ بادلوں کی گردش اور بارشوں کا حصول یہ تمام امور اُس صناعِ مطلق کی پیدا کردہ ہواؤں کے سبب سے ہیں۔ اگر وہ چند ساعتوں کے لئے بھی ہواؤں کو چلنے سے روک دے تو ساری کائنات کا نظام معطّل ہو کر رہ جائے۔ اسی حقیقت کو اِس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

وَمِنْ آيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ o اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ (اَلشُّورٰى : ۳۲' ۳۳)

''اور اُس کی (قدرت کی) نشانیوں میں سے سمندر میں پہاڑ جیسے جہاز ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے تو وہ جہاز سطحِ سمندر پر کھڑے کے کھڑے رہ جائیں۔''

سورۃ الرّوم کی آیت ۴۶ میں فرمایا:

وَمِنْ آيٰتِهٖ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ o

''اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو خوشخبری دیتے ہوئے بھیجتا ہے اور تا کہ وہ تمہیں اپنی رحمت کی لذّت چکھائے اور تا کہ تم اُس کے فضل کی تلاش کرو تا کہ تم شکر کرو۔''

ربّ ذوالجلال والاکرام نے ہوائیں دو قسم کی پیدا فرمائی ہیں: آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ۔ ہم سانس کے ذریعے آکسیجن لیتے ہیں۔ پھر ہمارے جسم اور خون میں جو گندے اور زہریلے مادّے ہیں' وہ اس آکسیجن کو کاربن ڈائی آکسائڈ میں تبدیل کر دیتے ہیں اور جب ہم سانس باہر چھوڑتے ہیں تو وہ ہوا کاربن سے بھری ہوتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے درختوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کر لیتے ہیں اور تازہ آکسیجن چھوڑتے رہتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر درختوں کا وجود نہ ہوتا یا درختوں میں کاربن ڈائی آکسائڈ کو جذب کرنے کی خصوصیت نہ ہوتی تو یہ فضا ہمارے سانسوں کے ذریعے چھوڑی ہوئی کاربن ڈائی آکسائڈ سے پراگندہ ہو جاتی' سانس لینے کے لئے تازہ آکسیجن کا ملنا محال ہو جاتا اور زہریلی اور بدبودار ہواؤں میں ہم گھٹ کر مر جاتے۔ ہماری ضرورت کے مطابق درختوں میں کاربن کو جذب کرنے اور آکسیجن کو چھوڑتے رہنے کی خصوصیت کیا خود بخود پیدا ہوتی ہے یا یہ کسی اتفاقی امر کا نتیجہ ہے یا کسی جلیل الشان مدبّر اور رفیع المرتبت حکیم کی عظیم ترین حکمت اور قدرت کا ثمرہ ہے؟ اگر ہم انصاف کا خون کرنے پر آمادہ نہیں ہو گئے اور ہٹ دھرمی پر نہیں اتر آئے تو لامحالہ ہمیں ماننا پڑے گا کہ ہواؤں میں جو خصوصیات' حکمتیں اور فوائد پوشیدہ ہیں' نہ یہ کسی دیوی یا دیوتا کا کارنامہ ہے' نہ خود تراشیدہ بتوں کی کاوش ہے اور نہ کسی انسان کی محنت کا ثمرہ ہے۔

(۱۲) بادلوں میں کرشمہ سازی : بادل بخارات کا ایک مجموعہ ہیں جو مختلف مقدار حجم میں فضا میں تیرتے پھرتے ہیں۔ یہ بخارات عموماً اپنے اندر پانی کو اور بسا اوقات برف اور اولوں کو لئے پھرتے ہیں۔ غور کا مقام ہے کہ پانی ہو یا برف اور اولے' اُن کا طبعی تقاضا اوپر سے نیچے گرنا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ کششِ ثقل

(Gravitation Force) اُنہیں نیچے لانا چاہتی ہے۔ لیکن وہ کونسی طاقت ہے جو بادلوں کے اندر پانی کو جب تک چاہے روکے رکھتی ہے اور جب چاہے چھوڑ دیتی ہے۔ معلوم ہوا کہ بارش کے ہونے یا نہ ہونے میں نہ تو پانی کے طبعی تقاضا کا دخل ہے اور نہ کششِ زمین کا بلکہ اِن تمام امور پر کوئی غالب و قاہر ہستی ہے جو جب چاہے' بادلوں سے پانی برسادے اور جب چاہے اُن سے پانی روک لے۔ پھر اُس کی قدرت کے ساتھ حکمت پر غور کیجئے کہ اگر وہ چاہتا تو تمام فضا پر بادلوں کو مسلّط کر دیتا اور ہم سورج کی روشنی کو ترس جاتے اور لگاتار بارش سے فصلیں برباد ہو جاتیں' مکانات منہدم ہو جاتے اور انسان کا روئے زمین پر زندہ رہنا دشوار ہو جاتا اور اگر وہ چاہتا تو سرے سے بادلوں کا وجود ہی نہ ہوتا' لوگ تپتی ہوئی دھوپ میں سائے کو ترس جاتے' کھیتیاں پروان نہ چڑھتیں اور بعض علاقوں میں پینے تک کے لئے پانی میسر نہ ہوتا۔ پھر وہ بادلوں کو کسی ایک جگہ پر معلق نہیں رکھتا بلکہ ہواؤں کے ساتھ اُنہیں رواں دواں رکھتا ہے اور جس وقت اور جس علاقہ میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے' وہاں پانی برسا دیتا ہے۔

بعض زمینوں میں پٹ سن' پان' چاول اور چائے کی کاشت ہوتی ہے جنہیں لگاتار بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض زمینوں میں غلّہ کی دوسری اجناس کی کاشت ہوتی ہے جنہیں ایک خاص موسم میں بارش کی ضرورت ہوتی ہے۔ اِن تمام امور پر غور کیجئے اور سوچئے کہ بارش کا یہ نظام کیا خودبخود چل رہا ہے یا کوئی ''اتفاقی حادثہ'' ہے یا کسی انسان' موہوم دیوتا اور خود تراشیدہ بُت کی کوشش ہے یا اُس قادر و قیوم علام الغیوب اور قدیر و حکیم کی قدرت اور حکمت کا ثمرہ ہے جو دنیا کے تمام انسانوں کی ضروریات کا کفیل ہے' جو ہر علاقہ کی ضروریات کو جانتا ہے اور ہر زمین کی کیفیت' استعداد اور صلاحیت کا علم رکھتا ہے۔ پھر ان تمام انسانوں' علاقوں اور زمینوں کی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق بادلوں کے ذریعے بارش نازل کرنے کا نظام قائم فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

هُوَالَّذِیْٓ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۝ لِّنُحْیِۦَ بِهٖ بَلْدَةً مَّیْتًا وَّنُسْقِیَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِیَّ كَثِیْرًا (الفرقان: ۴۸' ۴۹)

''اور وہ وہی ہے جو اپنی رحمت (بارش) سے پہلے خوش کرنے والی ہواؤں کو بھیج دیتا ہے اور ہم آسمان سے خوب پاک وصاف پانی برساتے ہیں تاکہ اس کے ذریعے سے مردہ بستی میں جان ڈال دیں اور اپنے پیدا کئے ہوؤں میں سے بکثرت مویشیوں اور انسانوں کو سیراب کر دیں۔''

مَآءً طَهُوْرًا اُس پانی کو کہتے ہیں جو فی نفسہ پاک ہو اور نجس اشیاء کو پاک کرنے والا ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بارش کا پانی طاہر اور مطہّر ہے۔ پانی کے اس وصفِ مخصوص سے فقہاء نے یہ استنباط کیا ہے کہ

حکمی نجاستوں کے ازالہ اور طہارت کا کام صرف آبِ خالص ہی دے سکتا ہے۔ آبِ غیر خالص مثلاً عرق کیوڑہ، عرق گلاب، شربت انار گو کیسے ہی لطیف ہوں، صرف طاہر (پاک) ہیں مطہّر (پاک کرنے والے) نہیں۔

(۱۳) مایوسی کے وقت مشرکوں کے رجوع الی اللہ سے استدلال: جب انسان مصیبتوں کے جنجال میں پھنس جاتا ہے اور اُسے نجات کا کوئی راستہ نہیں ملتا، اُس وقت کٹر سے کٹر کافر بھی اللہ کی طرف رجوع کر لیتا ہے۔ جب خشکی اور تری کے سفروں میں لوگ مبتلائے آفات ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں اور ایسی شدید صعوبتیں اور ہولناک طوفان پیش آتے ہیں جن سے ذہن پریشان، دل مضطرب اور بدن کا رُواں رُواں خوف سے کانپنے لگتا ہے، ایسے ہولناک سفر میں بُت پرست اور ضدی سے ضدی مشرک بھی اپنے بتوں کو بھول جاتا ہے اور بڑے سے بڑا دہریہ بھی اپنے الحاد سے توبہ کر لیتا ہے اور ایسے تمام لوگوں کو اُس وقت اپنے خود تراشیدہ باطل بُت ٹوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اُنہیں اُس وقت خدائے واحد کے سوا کسی کے دامن میں پناہ نظر نہیں آتی اور چارو ناچار سب کے سب اُسی اللہ کے حضور گڑگڑاتے ہیں اور اُس کی رحمت کے سوالی ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

(i) قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَةً لَئِنْ اَنْجَانَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِیْنَ○ قُلِ اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ○ (الانعام: ۶۳، ۶۴)

”فرما دیجئے کہ تمہیں خشکی اور سمندر کی تاریکیوں سے کون نجات دیتا ہے (اور) اُسے تم عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارتے رہتے ہو کہ اگر وہ ہمیں ان مصیبتوں سے نجات دے دے تو ہم یقیناً شکر گزاروں میں داخل ہو کر رہیں۔ فرما دیجئے کہ اللہ ہی تمہیں اُن (مصیبتوں) اور ہر غم سے نجات دیتا ہے، اس کے بعد بھی تم شرک کرنے لگتے ہو۔“

(ii) وَاِذَا غَشِیَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمَا یَجْحَدُ بِاٰیٰتِنَاۤ اِلَّا كُلُّ خَتَّارٍ كَفُوْرٍ○ (لقمٰن: ۳۲)

”اور جب اُنہیں پہاڑوں جیسی موجیں ڈھانپ لیتی ہیں تو اُس وقت اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں اُس کے لئے اپنے عقیدہ کو خالص کرتے ہوئے۔ پھر جب وہ اُنہیں ساحل تک بچا لاتا ہے تو اُن میں سے (چند ہی) حق پر رہتے ہیں۔ اور ہماری آیتوں کا وہی انکار کرتا ہے جو غدار ناشکرا ہے۔“

علامہ قرطبی نے یہاں بڑے نکتہ کی بات رقم فرمائی کہ نفسیاتِ انسانی کے اس تجزیہ سے معلوم ہوا کہ یہ چیز انسانی فطرت میں رکھ دی گئی ہے کہ جب تکالیف کے مہیب سائے اُسے گھیر لیتے ہیں تو اُس کے دل میں اُس وقت صرف اپنے ربِّ حقیقی کا ہی خیال پیدا ہوتا ہے اور اُسی کے دامنِ رحمت میں پناہ کی امید بندھتی ہے

(۱۴) آسمانی اور فلکیاتی تزیین میں کرشمہ سازی : افلاک کی اُن بلندیوں پر جہاں انسان کے وہم وخیال کی بھی رسائی نہیں، وہاں کروڑوں ستارے کس نے روشن کئے ہیں؟ اگر ایک چراغ سے تیل ختم ہو جائے تو وہ بجھ جاتا ہے۔ شہر کا بجلی گھر فیل ہو جائے تو پورا شہر تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو ان آسمانی روشنیوں کا انتظام کس نے کیا ہے جن کی روشنی میں آج تک ذرّہ بھر کمی نہیں ہوئی۔ اسی سلسلہ میں فرمایا:۔

(i) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ۝ (الحجر : ۱۶)

''اور بالیقین ہم نے آسمان میں بُرج بنائے اور اُنہیں دیکھنے والوں کے لئے ہم نے مزیّن کر دیا''

بُروُج جمع ہے بُرج کی بمعنیٰ بلند عمارت اور محل۔ آسمان کا بارہواں حصّہ جو رصدگاہوں سے دکھائی دیتا ہے اُسے بُرج کہتے ہیں۔ علمائے ہیئت کہتے ہیں کہ سات آسمانوں میں ہر آسمان میں ایک سیارہ ہے جن کے نام یہ ہیں: قمر، زحل، عُطارد، شمس، مُشتری، مرّیخ اور زُہرہ۔ ستاروں کے اجتماع سے جو مختلف شکلیں بنتی ہیں، اُنہیں رصدگاہوں میں دیکھا جاتا ہے۔ کہیں یہ شکل شیر کی سی بن جاتی ہے، اُسے برجِ اسد کہتے ہیں۔ کہیں ترازو کی سی شکل بنتی ہے جسے برجِ میزان کہتے ہیں۔ کہیں یہ شکل بچھو کی سی بنتی ہے، اُسے برجِ عقرب کہتے ہیں۔ یہ کل بارہ بُرج ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سُنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔ سورج ہر ماہ میں ایک بُرج اور ایک سال میں بارہ بروج کی مسافت طے کرتا ہے۔ گرمی، سردی، بہار اور خزاں کے چاروں موسم سورج کی اسی حرکت سے وجود میں آتے ہیں (روح المعانی جز ۱۴ ص ۳۲، ۳۳ ملخصًا بحوالہ تبیان القرآن، ج ۶)

ڈاکٹر وہبہ زحیلی اپنی ''تفسیر منیر'' کی جلد ۱۴ صفحہ ۲۰ پر لکھتے ہیں:

''اہلِ عرب ستاروں اور بروج کے علم کو بہت عظیم علوم میں سے شمار کرتے تھے اور ان سے راستوں، اوقات اور اُن سے خشک سالی اور فصل کی سرسبزی اور زرخیزی پر استدلال کرتے تھے۔ مرّیخ کا برج الحمل اور العقرب ہے۔ زہرہ کا برج الثور اور المیزان ہے۔ عطارد کا برج الجوزا اور السُنبلہ ہے۔ القمر کا برج السرطان ہے اور الشمس کا برج الاسد ہے۔ مشتری کا برج القوس اور الحوت ہے اور زحل کا برج الجدی اور الدلو ہے۔''

(ii) وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۝ (حٰمٓ السجدة: ۱۲)

''اور ہم نے اِس قریب والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے رونق بھی دی اور حفاظت بھی کی۔ یہ خدائے ہمہ قوت وہمہ علم کا انتظام ہے۔''

قریب والے آسمان سے مراد اہلِ زمین سے قریب ترین آسمان ہے، یہی جو زمین سے دکھائی دیتا ہے۔

اس کی حفاظت سے مراد تاثیراتِ شیطانی سے حفاظت ہے جو فرشتوں کی باتیں سننے کے لئے آسمانوں پر جاتے تھے۔ ان کے اوپر آگ کے گولے مارے جاتے ہیں جو دُور سے شہابِ ثاقب دکھائی دیتے ہیں (الجامع لاحکام القرآن لقرطبی' جز ۱۵' ص ۳۰۸' دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ)

حرفِ آخر: دن اور رات کا یہ تسلسل' یہ سورج کا طلوع وغروب' یہ نباتات میں روئیدگی اور جانوروں اور انسانوں کی نسل میں باقاعدگی کا مربوط نظام' یہ نیلگوں فضائیں' یہ تاروں بھری روشن راتیں' یہ اودی گھٹائیں' یہ بلند کہسار اور سرسبز وادیاں' یہ ابلتے ہوئے چشمے اور بہتے ہوئے دریا' یہ لہلہاتے ہوئے کھیت اور مہکتے ہوئے باغات اور مرغزار' کیا یہ سب کے سب خدائے واحد کے موجود ہونے کی شہادت نہیں دیتے؟ کیا اس کائنات کے نظام کی یکسانیت اور وحدت میں اُس عظیم خالق کی وحدت نظر نہیں آتی۔ ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ آخر کیکر کے درخت میں کبھی سیب کیوں نہیں لگتا' کبوتر کے انڈے سے کبھی کوّا کیوں نہیں نکلتا؟ انسان سے انسان ہی کیوں پیدا ہوتا ہے۔ ذرّہ سے لے کر آفتاب تک یہ تمام کائنات نظامِ واحد میں مربوط ہے اور اس ربط اور نظم وضبط کا آخر خالق کون ہے؟ اور ہمیں کہنے دیں کہ جس شخص کو اِس حسین کائنات میں ربّ ذوالجلال والاکرام کے حُسن کا جلوہ نظر نہیں آتا' اُسے قیامت کے دن بھی وہ نظر نہیں آئے گا اور وہ گمرہی کی اتھاہ تاریکیوں اور ظلمتوں میں بھٹکتا پھرے گا۔

(ب) انسانی جسم میں الٰہی کرشمہ سازیاں

سورۃ الذّاریات کی آیت ۲۱ میں قرآنِ حکیم نے اِس حقیقت پر زور دیا:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝

''اور خود تمہاری ذات میں بھی (ہماری) نشانیاں ہیں' تو کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟''

اور سورہ فُصِّلَتْ کی آیت ۵۳ میں فرمایا: سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ (ہم اُنہیں اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دِکھائیں گے اور خود اُن کی اپنی ذات میں بھی)

ایمان کی تازگی اور تابندگی کے لئے آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کونسی نشانیاں ہیں اور اُنہیں ہمارے جسموں میں کیسے مرتّب ومنظّم کیا گیا ہے۔ ہمارے جسموں کا جہان بھی ایک محیرالعقل' معجزاتی جہان ہے جو ہمیں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے:۔

(۱) ہمارے جسموں کے خلیے: ہمارے جسم کھربوں خلیوں سے ترکیب پائے ہوئے ہیں۔ چونکہ

کے رسول نہیں ہیں اور اُنہوں نے قرآن اپنی طرف سے گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر دیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟ کیونکہ مذہب میں جعلسازی، اختراع (گھڑنا) بلکہ معمولی سی تحریف بھی ناقابلِ معافی گناہ ہیں۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی عظمت وصداقت کو اجاگر کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ ۝ لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ ۝ (اَلْحَاقَّة : ۴۴ تا ۴۷)

''اور اگر (یہ پیغمبر) ہمارے ذمہ کچھ باتیں (گھڑ کر) لگا دیتے تو ہم اُن کا دایاں ہاتھ پکڑ لیتے، پھر ہم اُن کی رگِ دل کاٹ ڈالتے اور تم میں سے کوئی بھی اُنہیں اس (سزا) سے بچانے والا نہ ہوتا۔'' (۶۹:۴۴۔۴۷)

قارئینِ کرام! انسائیکلو پیڈیا جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، قِسما قسم کے مختلف موضوعات پر مشتمل ہے جس میں استاذ، طالب علم اور ایک عام شخص پہلی بار مختلف عنوانات کو جامع اور اکمل انداز میں قرآنِ حکیم کی روشنی میں زیرِ بحث پائیں گے جس کا مقصدِ وحید بیچاری، گم کردہ راہ انسانیت کو اُس الٰہی روشنی کی ابدی تابندگی کے قریب سے قریب تر لانا ہے جو نبی آخرالزماں ﷺ پر اُن کے خالق و مالک کی جانب سے نازل کی گئی تاکہ اُس کی مافوق الفطرت جدّت طرازی (Originality) اور صداقت کے قائل ہو کر اُن کے سر بے اختیار اپنے پالنہار کے حضور جھک جائیں!

آخر میں مجھے یہ بات تسلیم ہے کہ میں نہ تو علوم اسلامیہ کا کوئی عالم ہوں اور نہ ہی اس انسائیکلو پیڈیا کے تحریر کرنے میں میرا علم وفضل میں پختہ کاری کا کوئی دعویٰ ہے۔ یہ کام قرآنِ حکیم کی اُن صداقتوں کا مجموعہ ہے جو کتابوں میں اِدھر اُدھر بکھرا ہوا تھا۔ میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ اُنہیں یکجا کر دیا ہے۔ بڑی حزم واحتیاط کے ساتھ میں نے حوالہ جات/اقتباسات کو اُن کے ماخذ سمیت قوسین کے اندر دے دیا ہے۔ اگر اس ضمن مجھ سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو تو اسے میری خودنمائی، علمی تفاخر یا سرقہ پر محمول نہ کیا جائے بلکہ ''انسان خطا کا پُتلا ہے'' کے مصداق صرفِ نظر کر لیا جائے۔

زبانِ عربی سے معمولی سدھ بدھ رکھنے کے باوجود میں ساحلِ مراد پر ہرگز نہ پہنچ پاتا اگر خلاقِ عالم کی دستگیری اور عنایت میرے شاملِ حال نہ ہوتی، جس کی وجہ یہ ہے کہ قرآنی علوم میں تحقیق کا کام کوئی خالہ جی کا گھر تو ہے نہیں بلکہ قرآن کے اَن گنت کثیر الموضوعاتی بحرِ مواج سے ایک ''قطرہ'' نکالنے کے لئے پُرلگن، والہ وشیدا اور باصلاحیت لوگوں کے پینل کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو انتہائی خوش نصیب سمجھوں گا اگر یہ ناچیز کوشش اُس قطرے کا جزوِ قلیل بھی ہو جائے اور میں سمجھوں گا کہ میری محنت کا صلہ مجھے مل گیا اگر یہ کوشش اُن لوگوں کے دلوں میں صدائے بازگشت پیدا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جن کے لئے یہ تحریر کی گئی ہے۔

ہزار ہا سجدہ ہائے شکر کے ساتھ راقم الحروف اُس ذات کردگار کے حضور فریاد کناں ہے کہ وہ اپنے فضلِ خاص سے اس ناچیز کوشش کو شرفِ قبول بخشے اور اسے میرے اور میرے والدین اور اساتذہ کے لئے سببِ نجات بنائے! آمین

29 فروری 2012 — آئی۔اے خان

ہمارے جسم بڑی جسامت کے نہیں' اس لئے یہ خلیے بہت چھوٹے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہمارے جسموں کے یہ خلیے اگر لاکھوں کی تعداد میں اکٹھے کئے جائیں تو وہ سوئی کی ایک نوک سے بھی زیادہ جگہ نہیں گھیرتے۔ تاہم اِن خلیوں کے اس قدر چھوٹا ہونے کے باوجود خلیے کی ساخت کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا۔ خلیے کے سسٹم پر سائنسدان مسلسل تحقیق کر رہے ہیں۔''

''پہلا خلیہ جس سے ہماری تشکیل ہوئی' اُس کی ابتداوالدہ کے رِحم میں دوخلیوں کے ملاپ سے ہوئی: ایک والدہ کے جسم سے اور دوسرا والد کے جسم سے خارج ہوُا۔ یہ خلیہ برابر تقسیم کے مدارج طے کرتا ہوُا کچھ دیر بعد گوشت کا ایک ٹکڑا بن گیا۔ پھر وہ خلیے جنہوں نے اِس گوشت کو بنایا تھا مسلسل نئے خلیے بناتے رہے یہاں تک کہ تدریج کے مراحل سے گزرتے ہوئے انسانی جسم تشکیل پا گیا۔''

''ہر نئے خلیے کی مختلف صورتیں ہوئیں: اُن میں سے کچھ تو خون کے خلیے' کچھ ہڈیوں کے اور کچھ عصبی خلیے بن گئے۔ ہمارے جسموں میں مختلف خلیوں کی دوسو اقسام ہیں۔ دراصل یہ تمام خلیے باہم ملتے جلتے اجزاء سے ترکیب پائے ہوئے ہیں لیکن اُن میں سے ہر ایک مختلف کام سرانجام دیتا ہے۔ مثلاً ٹانگوں میں موجود اعصابی خلیے بٹی ہوئی رسی کی طرح ہیں جس سے چلنا اور دوڑنا ممکن ہے۔ جس ساخت پر وہ بنائے گئے ہیں' اُس پر اللہ کا شکر ہے۔ گیند کھیلتے ہوئے ہمارے بازوؤں اور ٹانگوں کے اعصاب بہت زیادہ کھنچنے کی وجہ سے ٹوٹتے نہیں۔ خون کے خلیے کروی شکل کے گول ہوتے ہیں اور اُن کا کام آکسیجن کو خون کی نالیوں کے ذریعے منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اُن کی ساخت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی آکسیجن سمیت خون کی نالیوں میں بہ آسانی گزر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جلد کے خلیے آپس میں بندھے ہوتے ہیں اور ایک ہی قطار میں ترتیب دئے ہوئے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہماری جلد پانی وغیرہ کے لئے غیر جاذب ہے۔ اسی طرح دوسرے تمام خلیوں کی ساخت بھی بالکل ایسی ہی مثالی ہے جو اُن کے تفویض کردہ کام کے بالکل موافق ہے۔''

''ہمارے خلیے ٹیلیویژن یا کسی اور قسم کی ٹیکنالوجیکل مشینری سے زیادہ کام کرنے والے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے خلیے ایک عقلِ کُل اور اعلیٰ ذہانت کی ہستی نے تخلیق فرمائے ہیں جس نے ہمیں ہر طرح مکمل انسان بنادیا۔'' ("Miracles in Our Bodies" ... Harun Yahya, pp. 18-21, 23)

<u>ایک عظیم پھیلا ہوُا جال ہمارے جسموں کو گھیرے ہوئے ہے</u> : ہمارے دماغوں کے خلیے ہماری ٹانگوں کے اعصابی خلیوں سے جڑے ہوئے ہیں اور جسم کے تمام خلیے ایک دوسرے سے رابطہ کئے ہوئے

ہیں۔ تاہم ہمارا اَعصابی نظام شاہراہوں کے کلومیٹرز سے زیادہ جامع ہے جس میں مختلف سمتوں میں گاڑیوں کے گزرنے کے لئے دوراہے‘ سہ راہے اور چوراہے ہوتے ہیں۔ جیسا کہ شاہراہوں پر گاڑیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتی ہیں‘ اسی طرح ہمارے جسم میں پھیلے ہوئے اعصابی نظام میں اعصابی برقی لہریں دوڑتی ہیں۔ یہ لہریں ایک مقام سے دوسرے مقام کو پیغام منتقل کرتی ہیں۔۔۔ یہ تمام عمل بغیر کسی مداخلت اور رکاوٹ کے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ آپ اُس کام کو فوری طور پر کر گزرتے ہیں جو آپ نے ابھی سوچا تھا‘ آپ اُس چیز کو عین اُسی وقت دیکھتے ہیں جس وقت آپ کی نظر اُس پر گئی تھی‘ آپ اُن الفاظ کو عین اُسی وقت سن لیتے ہیں جب وہ بولنے والے کے منہ سے نکلے تھے اور آپ کسی چیز کے گرم یا ٹھنڈا ہونے کا احساس اُس چیز کے چھونے پر کر لیتے ہیں۔ یہ تمام حقائق اللہ تعالیٰ کی مہربانی کا نتیجہ ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ آپ کے دماغ اور اعصابی نظام کے مابین مکمل موافقت اور ہم آہنگی ہے۔'' (ایضاً صفحات ۲۴ تا ۲۸)

(ج) <u>دانتوں کی مختلف شکلوں میں الٰہی حکمت</u> : ہمارے دانتوں کی مختلف شکلیں ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہر دانت کا اپنا اپنا دائرۂ عمل ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے کے دانت تیز ہیں جس سے ہم ایک سیب کو بہ آسانی کاٹ لیتے ہیں۔ کیا ہوتا اگر ہمارے چبانے اور پیسنے والے دانت (Molar Teeth) سامنے اور آگے ہوتے تو ہم سیب کے ایک ٹکڑے کو بھی اِن دانتوں سے نہ کاٹ سکتے۔ اسی طرح اگر ہمارے سامنے کے نکیلے دانت (Incisors) پچھلے حصّے میں ہوتے تو ہم اپنے کھانے کو پیس اور چبا نہ سکتے۔ جسم کے باقی تمام حصّوں کی طرح ہمارے منہ میں دانت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسی ترتیب میں رکھ دئے ہیں جس سے کھانا کھانے میں سہولت اور دیگر فوائد ہیں۔'' (ایضاً صفحہ ۳۸)

(د) <u>مفید بیکٹیریا ہماری زبان کی پشت پر موجود ہیں</u> : عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بیکٹیریا بیماریوں کو جنم دیتے ہیں اور اُن کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے لوگوں کو اپنے جسم اور اپنے ماحول کو پاک و صاف رکھنا چاہئے۔ تاہم زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ سائنسدانوں نے انسانی جسم میں اور بالخصوص زبان کے پیچھے کچھ مفید بیکٹیریا کی موجودگی کو دریافت کیا ہے۔ ہماری زبان کے پیچھے بیکٹیریا کا کام اُن مضر چھوٹے چھوٹے زندکوں (microbes) کو ختم کرنا ہے جو مرض پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یقیناً یہ کوئی آسان کام نہیں اور یہ کئی سلسلہ ہائے عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ ہماری زبان کے پیچھے موجود بیکٹیریا زندکوں جیسے زہریلے مواد کو مارنے میں مدد کرتے ہیں اور اس طرح ہم ان بیکٹیریا کی وجہ سے بیماریوں سے بچ جاتے ہیں۔ گویا یہ بیکٹیریا اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک مظہر ہیں جس نے ہمارے جسموں کو مکمل طور پر بنایا اور ہمیں اَن گنت احسانات اور نعمتوں سے نوازا (سورۃ النحل: ۱۸)

(ر) نظامِ ہضم میں کرشمہ سازیاں : ہمارے جسموں کو قوت اور توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ توانائی ہم اُس خوراک سے حاصل کرتے ہیں جو ہم کھاتے ہیں۔ وہ غذا جس کی ہمارے جسم کو ضرورت ہوتی ہے، سادہ اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ہونی چاہئے تا کہ وہ خون کی نالیوں سے بہ آسانی گزر جائے، وگرنہ وہ خلیوں میں سرایت نہیں کر پاتی۔ تاہم اگر ہم خوراک بڑے ٹکڑوں کی شکل میں لیتے ہیں، تو ہمیں ایک ایسی مشین کی ضرورت ہوتی ہے جو ہماری لی ہوئی خوراک کو پیس کر ہمارے معدے میں پہنچا دے۔ مختصراً ہم اِس مشین کو گرائنڈر کہہ سکتے ہیں جو بنیادی طور پر ہماری خوراک کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کر دیتی ہے۔ ہمارے جسم میں اِس پیسنے والی مشین کو ''نظامِ انہضام'' کہا جاتا ہے۔''

''تمام مشینی نظاموں کی طرح یہ نظام بھی متعدد اجزاء سے ترکیب پایا ہوا ہے اور ہر جزء اپنا اپنا کام بہ احسن طریق انجام دے رہا ہے جس کے نتیجے میں ہم خوراک کو چبا سکنے کے قابل ہوتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ نظامِ انہضام کے تمام اجزاء باہم موافق اور مکمل ہوں کیونکہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔''

''آیئے ایک مثال سے واضح کریں کہ ایک نظام کے تمام اجزاء کو کیوں مکمل اور ہم آہنگ ہونا چاہئے تا کہ وہ نظام صحیح طور پر کام کر سکے۔''

''ایک کار جسے ریموٹ سے کنٹرول کیا جاتا ہے پہیوں، کنٹرولنگ طریق، بیٹریوں، گیئر، کنڈلی اور انٹینا جیسے حصّوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اسی طرح نظامِ انہضام بھی متعدد حصّوں پر مشتمل ہوتا ہے یعنی دانت، زبان، معدے کی نالی، معدہ اور انتڑیاں۔ اب ذرا غور کیجئے کہ کیا ریموٹ کنٹرولڈ کار انٹینا اور پہیوں کے بغیر چل سکے گی؟ بالکل نہیں۔ کار اُسی صورت میں چلے گی جبکہ اس کے تمام پرزے اس میں موجود ہوں۔ یہی بات نظامِ ہضم پر صادق آتی ہے۔ معدے کا وجود بے معنیٰ ہوگا جب تک وہ نالی نہ ہو جو خوراک کو اُس تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح انتڑیوں کا اُس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک معدہ موجود نہ ہو کیونکہ معدہ میں ہضم کی ہوئی خوراک انتڑیوں کو جاتی ہے جہاں اُنہیں جسم کے خلیوں تک پہنچنے کے لئے ایک خاص شکل دی جاتی ہے۔''

''اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خالق نے ہمارے لئے ایک ایسا نظام بنایا ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے رب کے سوا کوئی اور رب ہے ہی نہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ○ (طٰهٰ : ۹۸)

''تمہارا معبود تو بس وہی ایک اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اُس نے ہر شے کو (اپنے) علم سے گھیر رکھا ہے۔''

انہضامی مشین اپنا کام کرنا شروع کرتی ہے : ہاضمے کا عمل منہ سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ وہ نامیاتی مرکبات (Carbohydrates) جو ہماری خوراک میں موجود ہوتے ہیں' پہلے پہل ہمارے منہ میں لعاب کے ذریعے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ منہ میں توڑے ہوئے یہ ٹکڑے معدے کی نالی کے ذریعے معدے تک پہنچتے ہیں۔ معدے میں ایک اور معجزاتی قسم کا توازن ہوتا ہے۔ معدے میں ہاضمے کا عمل ایک مضبوط اور ٹھوس سیّال (مائع) سے ہوتا ہے۔ یہ سیّال مادّہ ہائیڈروکلورک ایسڈ کہلاتا ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ ایسڈ (تیزاب) گلا دینے والے ہوتے ہیں اور وہ اُن چیزوں کو تحلیل اور غائب کر دینے والے ہوتے ہیں جو بھی اُن سے ملتی ہیں۔ لیکن یہ کیا بات ہے کہ یہ ایسڈ معدے کو ختم نہیں کرتا کہ جو خود گوشت کا بنا ہوا ہے؟ یہاں ایک بار پھر ہمارے رب کی تخلیق کی عمدگی آشکار ہوتی ہے' وہ اللہ جس نے ہر چیز مکمل طور پر پیدا فرمائی اور ایک حفاظتی حصار بنایا تاکہ معدہ بھی ہضم کا شکار نہ ہو جائے۔''

''اس حفاظتی حصار کو مختصراً یوں سمجھئے: ''میوکس'' نامی ایک اور سیّال' ہاضمے کے عمل کے دوران خارج ہوتا ہے جو ہائیڈروکلورک ایسڈ کو معدے کے ختم کرنے سے روکتا ہے۔ ایک خاص میوکس کی تہہ معدے کی اندرونی لائننگ کو ڈھانپتی ہے اور اس طاقتور ایسڈ کے ذریعے معدے کو ہر نقصان سے بچاتی ہے اور اس طرح معدہ اپنے آپ کو ہضم نہیں کرتا۔''

''خوراک کا ہضم ہونا بہت مشکل ہو جاتا اگر یہ میکانیت مکمل طور پر کام نہ کرتی۔ پہلے پہل تو یہ دیکھئے کہ اگر ہمارے دانت نہ ہوتے تو ہم کھانے کو صحیح طور پر چبا سکنے کے قابل نہ ہوتے اور وہ ہمارے گلے کے نیچے تک نہ جا سکتا۔ اگر کھانا گلے کے نیچے چلا بھی جاتا تو وہ معدے کی نالی کو بری طرح نقصان پہنچاتا۔ اگر ہمارا معدہ کھانے کو ہضم کرنے کے قابل نہ ہوتا' تو معدہ میں پہنچی ہوئی ہر چیز ایک بڑا تودہ بن جاتی اور پریشانی کا موجب بنتی۔ علاوہ ازیں خوراک ہضم نہ کر سکنے کے نتیجہ میں ہمارے جسموں کو وہ غذائیت نہ ملتی جو اُنہیں چاہیے۔ لیکن یہ باتیں ہمارے تجربے میں نہیں آتیں کیونکہ ہمارے خالق نے ہمارے جسم کے ہر حصّے کو مکمل اور ہر قسم کے نقص سے پاک بنایا ہے۔ یہ عمدہ نظام بغیر کسی خلا یا نقص کے رواں دواں ہے جبکہ ہم خود اس سے بے خبر ہیں۔ تخلیق کی اس عمدگی کو اس آیت میں بیان کیا گیا :

هُوَاللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَافِى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَهُوَالْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (الحشر : ۲۴)

''وہی اللہ تو پیدا کرنے والا ہے' ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے' صورت گری کرنے والا ہے' اُسی کے اچھے اچھے نام ہیں' آسمانوں اور زمین میں جو بھی چیزیں ہیں' اُسی کی تسبیح کرتی ہیں اور وہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔''

سورۃ الحشر کی اِن دونوں آیتوں کے جوشِ بلاغت اور زورِ کلام کو حال کے ملحد اور مسیحی ماہرینِ عربیت نے بھی سراہا ہے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جس شخص نے رات یا دن میں سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھیں اور اُس رات یا دن میں اللہ تعالیٰ نے اُس کی روح قبض کر لی تو اللہ تعالیٰ نے اُس کے لئے جنت کو واجب کر دیا۔'' (شعب الایمان: رقم الحدیث: ۲۵۰۱؛ الکامل لابن عدی: ج ۳' ص ۳۱۸)

''عملِ انہضام کے علاوہ معدے کا ایک اور کام ذخیرہ اندوزی کا ہے۔ معدہ میں پہنچنے والی خوراک کچھ دیر کے لئے وہاں رہتی ہے۔ پھر وہ مزید توڑ پھوڑ کے لئے تھوڑی تھوڑی مقدار میں چھوٹی آنت کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ اگر ہماری کھائی ہوئی خوراک معدہ میں جمع نہ ہوتی تو ہمیں ہر بیس منٹ بعد کھانے کی ضرورت پیش آتی کیونکہ ہمارا معدہ ہر وقت خالی رہتا اور ہم ہر وقت اپنے آپ کو بھوکا محسوس کرتے۔'' (ایضاً ص ۴۴ تا ۴۹)

(ز) <u>دل -- جسمِ انسانی کی موٹر</u> : مسلسل حرکت کے لئے ہر چیز کو موٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ کاریں' ہوائی جہاز' موٹر کشتیاں یہاں تک کہ ریموٹ سے کنٹرول کئے جانے والے کھلونے بھی موٹروں کے ذریعے چلتے ہیں۔ وہ موٹر جو رات دن اور مہینوں اور سالوں ہمارے خون کو رواں دواں رکھتی ہے' وہ ہمارا دل ہے۔''

''ہمارا دل ایک منٹ میں ستر بار دھڑکتا ہے اور ہماری تمام زندگی میں ۱۵۲ ملین لٹر (۴۰ ملین گیلن) خون پمپ کرتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ آپ نے ایک منٹ میں ستر مرتبہ پانی ایک بالٹی سے دوسری بالٹی میں ڈالنا ہے تو آخر میں آپ کے بازو اور ہاتھ کے اعصاب درد کرنے لگیں گے اور آپ کو آرام کی ضرورت ہوگی۔ لیکن ہمارا دل یہ کام ہماری تمام زندگی میں انجام دیتا ہے اور کبھی آرام نہیں کرتا۔ دن بھر میں یہ تمام خون کو ہمارے جسم میں پورے ایک ہزار چکر دیتا ہے۔''

''دل گوشت کا بنا ہوا ایک پمپ ہے جو تقریباً آدمی کی ہتھیلی جتنی جسامت کا ہے۔ تاہم اپنی صلاحیت کے لحاظ سے یہ تمام دنیا میں مضبوط ترین' پائیدار ترین اور انتہائی باکفایت انجن ہے۔ دل کی قوّت کو اس طرح بیان کرنے میں ہمارے پاس کئی طریقے ہیں جن میں اہم ترین یہ ہے کہ دل اپنے دھڑکنے میں خاصی توانائی استعمال کرتا ہے۔ توانائی کو استعمال کرتے ہوئے خون تین میٹر اونچا چلا جاتا ہے۔'' (ایضاً ص ۶۲' ۶۳)

دل اپنے آپ کو خود سہارتا ہے : ہر مشینری کو گاہے گاہے اپنی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کارکردگی کے کچھ عرصہ بعد اُسے شکست و ریخت سے بچنے کے لئے تیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشینری کی طرح دل کو بھی جو ہر وقت مائل بہ عمل رہتا ہے' نگرانی اور سہارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم دل اپنے آپ کو خود سہارتا ہے اور اپنی تدہین (تیل کے ذریعے چکنا کرنا) خود کرتا ہے۔''

''دل اپنی تدہین خود کیسے کرتا ہے؟ دل کی بیرونی سطح ایک جھلّی کے ذریعے ڈھکی ہوتی ہے جس کے دو پردے ہوتے ہیں۔ اِن دو پردوں کے درمیان چکنا سیّال مادّہ ہوتا ہے۔ یہ سیّال مادّہ موٹر آئل کا سا کام کرتا ہے اور دل کی کارکردگی کو آسان بناتا ہے۔ دل میں یہ خود حفاظتی نظام ایک بار پھر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اُس کی صنّاعی اور کرشمہ سازی کس قدر مکمل اور اتم ہے!'' (ایضاً ص ۶۵)

(س) دل -- ایک معجزاتی سیّال جس کی پیداواری تجدید میں کوئی ثانی نہیں : سائنسدانوں نے خون سے ملتا جلتا سیّال پیدا کرنے میں خاصا مطالعہ کیا ہے لیکن اس میں ناکام ہوتے ہوئے اُنہوں نے خون کی نقالی کی کوشش کرنا چھوڑ دی اور دوسرے میدانوں میں تحقیق کرنا شروع کی۔ سائنسدان خون کی نقالی نہیں کر سکے کیونکہ خون کی نالیوں سے حاصل شدہ خون کے نمونے اور اس کی ساخت معائنہ کے لئے غیر موزوں ہوتے ہیں۔ اِن نمونوں کو شیشے کی ٹیسٹ ٹیوب میں بھی محفوظ نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ خون کے خلیے ٹیوبوں میں مکمل طور پر باقی نہیں رہتے۔ اس لئے سائنسدانوں کو خون کے خلیوں کو علیحدہ کرنا پڑتا تاکہ وہ انفرادی طور پر ان کا معائنہ کریں۔ بلا شک وشبہ یہ دعویٰ کرنا انتہائی غیر معقول اور غیر منطقی ہوگا کہ اتنا مکمل مواد جس کی نقالی سائنسدانوں کی برسوں کی معلومات کے باوجود بھی نہیں ہوسکی' وہ خود بخود اور اتفاقی طور پر وجود میں آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے خون کو بے مثل مواد بنایا۔ خون کا خلیہ جس کے اندر متعدّد حیران کن صلاحیتیں ہیں' جسمِ انسانی میں اللہ تعالیٰ کی لامتناہی ذہانت و دانش کا ایک مظہر ہے۔'' (ایضاً ص ۶۱)

خون جو زخموں کو مندمل کرتا ہے : آپ نے اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ جلد پر معمولی سا زخم کچھ دیر بعد خود بخود بہنا بند ہو جاتا ہے۔ دراصل یہ بات فکر انگیز ہے کیونکہ عام حالات میں ایک سوراخ سے بہنے والی چیز ممکنہ حد تک خود بخود بہنا بند نہیں ہو جاتی۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا ہے تو فرض کریں کہ آپ کے پاس پانی سے بھرا ہوا ایک غبارہ ہے۔ اگر آپ اس غبارہ میں سوئی سے سوراخ کر دیں تو غبارے سے پانی رِسنا شروع ہو جائے گا۔ کیا آپ کی مداخلت کے بغیر پانی کچھ دیر بعد خود بخود رِسنا بند ہو جائے گا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ غبارے کا پانی سے خالی ہونے کے وقت تک سارا پانی رِستا رہے گا۔ بند جگہوں پر اس اصول کا اطلاق تمام مائعات پر ہوتا ہے۔''

''خون رگوں کے ایک بند دائروی مقام میں حرکت کرتا ہے اور معمولی سے زخم کی صورت میں رِسنا شروع ہوتا ہے۔ تاہم حفظانِ صحت کے لئے اس کا روکنا بہت اہم ہے۔ زخم بہنے کے کچھ دیر بعد جو چیز زخم کو بہنے سے روکتی ہے اُسے ''بلڈ کلاٹنگ'' (جمے ہوئے خون کی پھٹکی) کہا جاتا ہے جو ہمارے جسموں میں خود کار حفاظتی نظاموں میں سے ایک نظام ہے۔ الحمدللہ! خون میں پھٹکی بننے کی اس صلاحیت نے حد درجہ خون بہنے کو روک دیا۔ خون میں کچھ خلیوں کو متاثرہ رگ یا حصّے کی فوری اطلاع ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے وہ زخم تک پہنچتے ہیں اور ایک جالا بُننے کے ذریعے خون کی بندش کرتے ہیں۔ یہ جالا وقت کے ساتھ ساتھ سخت ہوتا جاتا ہے اور اُس شکل میں آجاتا ہے جسے ہم SCAR (چیرے کا نشان) کہتے ہیں۔''

''کیا منصوبہ بندی کا یہ سارا عمل اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے؟ خون کے کچھ خلیوں کو خون کی نالیوں میں واقع ہونے والے نقصان کا معلوم ہو جانا کیسا ہے؟ اِن خلیوں کو خون کی بندش کرنا کس نے بتایا؟''

''خلیوں کو یہ تمام باتیں اتفاقی طور پر معلوم نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ اپنی ذاتی صوابدید سے یہ کام انجام دیتے ہیں۔ یقینی طور پر اِن خلیوں سے ظاہر شدہ ذہانت اُن کی اپنی نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں سمجھاتا ہے اور وہ ایک مکمل منصوبہ بندی کے تحت کام کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۵۷ تا ۶۰)

(ش) دماغ کیسے کام کرتا ہے؟ دماغ آنکھوں، ناک، کانوں، جلد اور منہ وغیرہ سے معلومات لیتا ہے اور (اپنے طور پر) اُن کی تعبیر کرتا ہے۔ یہ تعبیر ایک سو اَرب اُن عصبی خلیوں کا مجموعہ ہوتی ہے جو ہمارے خون میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ خلیے مسلسل اپنا کام جاری رکھتے ہیں اور ہمیں اُس سیب کا رنگ دیکھنے کے قابل بناتے ہیں جو ہم کھا رہے ہوتے ہیں، اپنے بہترین دوست کی آواز کو پہچاننے میں بھی اور گرما گرم چاکلیٹ کے ذائقے کو محسوس کرنے کے بھی قابل بناتے ہیں۔''

''درحقیقت دماغ جس چیز کو شامل ہے، وہ عصبی خلیے ہیں جو خوردبین کے ذریعے ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ عصبی خلیے آپ کے پسندیدہ کھلونے کو دیکھ سکتے ہیں یا چاکلیٹ آئسکریم کی خوشبو کا ذائقہ چکھ سکتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عصبی خلیے گوشت کے نفیس ٹکڑوں سے ترکیب پائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ایک ایسی ہستی کا پایا جانا ضروری ہے جو زبردست قوّت کی مالک ہو اور جس نے یہ حیران کُن نظام بنایا۔ یہ ہستی اللہ تعالیٰ کی ہے جو ہر چیز کا مالک ہے، ہر چیز مکمل طور پر پیدا کی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کو ایک خوبصورت زندگی عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں ہمیں ہر آن اس کا شکر گزار رہنا چاہئے۔ مثال کے طور پر اُس نے ہمیں آنکھیں اور کان عطا کر کے ہمیں بتایا کہ ہمیں اُس کا شکر ادا کرنا چاہئے:

وَهُوَ الَّذِيٓ أَنشَأَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ ۝ (المؤمنون : ۷۸)
''اور وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے (لیکن) تم بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو۔''

(ص) ہڈیوں پر مشتمل جسمانی ڈھانچہ: ہمارے جسم میں ۲۰۶ ہڈیاں ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ جسم میں اتنی کثیر ہڈیوں کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہماری انگلیوں میں صرف ایک ہڈی ہوتی تو ہم اپنی انگلیوں کو موڑنے کے قابل نہ ہوتے اور جس کے نتیجہ میں ہم چیزوں کو پکڑ سکنے اور گرفت میں لینے کے قابل نہ ہوتے' اسی طرح ہم لکھنے یا کھانے کے بھی قابل نہ ہوتے۔ یہ اس وجہ سے کہ ایک سخت ہڈی موڑی نہیں جا سکتی اور اگر ہم اسے زبردستی موڑنا چاہیں تو یہ ٹوٹ جائے گی۔ لہٰذا جو چیز ہمیں بہ یک وقت چیزوں کو گرفت میں لینے اور کوئی چیز پینے کے قابل بناتی ہے' وہ باہم مربوط ۲۷ ہڈیوں کا وجود ہے اور اُن میں ہمارے ہاتھ کی انگلیوں کی ہڈیاں بھی شامل ہیں۔''

''ہمارے جسم میں دو سو چھ ہڈیاں ایک دوسرے سے ایسے جُڑی ہوئی ہیں جیسے ہاتھوں کی ہڈیاں۔ اِن میں سے ہر ہڈی ایک حکیمانہ منصوبے کے تحت اپنی اپنی جگہ پر واقع ہے۔ اسی مکمل اور بے خطا منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے کہ ہم اپنے جسم کو آگے جھکا سکتے ہیں' گھٹنوں پر جھک سکتے ہیں اور اپنے ہاتھوں کو اِدھر اُدھر ہلا سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ سارے عمل اپنی ہڈیوں کے استعمال سے نہیں کر سکتے کیونکہ ہڈیاں تو نہیں جھکائی جا سکتیں۔ ہماری ہڈیوں کے مقامِ اتصال پر جوڑ ہیں اور انہی جوڑوں کی وجہ سے ہم اپنے بازو کو بہ آسانی جھکا سکتے ہیں' اپنی ٹانگ کو اوپر اٹھا سکتے ہیں اور اپنی انگلیوں کو استعمال کر سکتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۶۶' ۶۷)

''ہڈیاں اپنے آپ کو خود سہارتی ہیں: ہم اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو جھکا سکتے ہیں اور سیدھا کر سکتے ہیں اُن جوڑوں کی وجہ سے جو ہماری کہنیوں اور گھٹنوں پر ہیں۔ اگرچہ ہماری ہڈیوں کے درمیان جو جوڑ ہیں وہ ہر وقت استعمال میں رہتے ہیں لیکن ہم کبھی انہیں (تیل وغیرہ سے) چکنا نہیں کرتے جبکہ مشینوں کو باقاعدہ نگرانی کے دوران اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

''اس کا جواب یہ ہے کہ ایک جوڑ میں ایک سخت ربڑ نما Cartilage نامی زربفت (tissue) ہوتا ہے جو مقاماتِ اتصال پر ہڈیوں کے کونوں کو سہارا دیتا ہے۔ ایک باریک پردہ جوڑ کے تمام خلا کو ڈھانپے ہوئے ہوتا ہے جو خاص قسم کا مائع سیال مادّہ خارج کرتا ہے۔ جونہی ہڈی' جوڑ پر دباؤ ڈالتی ہے تو یہ سیال مادّہ پردے سے باہر نکل آتا ہے اور جوڑ چکنا ہو جاتا ہے۔''

یہ تمام حقائق اس بات کے گواہ ہیں کہ جسمِ انسانی ایک انتہائی عمدہ ڈیزائن اور اعلیٰ و ارفع تخلیق کا نتیجہ ہے۔ الحمد للہ! اسی بے مثال عمدہ ڈیزائن کی وجہ سے ہم کئی مختلف حرکتیں بہ آسانی اور جلدی جلدی کر سکتے ہیں۔ ہڈیوں کے یہ اوصاف ہمارے رب نے پیدا کیے ہیں' جو لوگوں کو ہڈیوں کی تخلیق پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے:۔

وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَکْسُوْهَا لَحْمًا (البقرۃ: ۲۵۹)

''اور ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ ہم اُنہیں کیسے ترتیب دیتے ہیں اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں۔''

<u>شکستہ ہڈی کیسے صحت یاب ہوتی ہے؟</u> ہڈیاں بہت ہی سخت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ تاہم اگر اُن شدید دباؤ ڈالا جائے تو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔ پھر کیا ہوتا ہے؟ ڈاکٹر شکستہ ہڈی کے علاج میں پلستر استعمال کرتے ہیں جس سے ہڈی صحیح طور پر جڑ جاتی ہے۔ ڈاکٹروں نے اب کچھ بھی نہیں کرنا کیونکہ ہڈی کی اپنی سنوارنے کی ایک میکانیت ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ ایک شکستہ ہڈی جڑ جاتی ہے جس کے بعد وہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہ معجزاتی عمل ذیل کے طریق سے رُوبہ کار ہوتا ہے:۔

''شکستہ ہڈی کے اردگرد کا خون جم جاتا ہے اور جمے ہوئے خون کی ایک بڑی پھٹکی بن جاتی ہے جسے Haematoma کہتے ہیں۔ یہ پھٹکی ہمارے جسم میں بننے والے اُس کھرنڈ کی طرح ہوتی ہے جو چیرا آنے کے بعد زخم پر بن جاتا ہے۔ ہڈی کے تعمیری خلیوں سے خارج ہونے والا جھاگ دار مادّہ اِس پھٹکی کو سخت ہڈی میں بدل دیتا ہے۔ جب یہ عمل مکمل ہو جاتا ہے' تو ہڈی کے تحلیل کرنے والے خلیے اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ ایک پیشہ ور سنگتراش کی طرح کام کرتے ہوئے یہ خلیے ہائیڈروکلورک ایسڈ کے ساتھ نئی ہڈی کو جسامت میں کم کرتے ہیں۔ یہ ایسڈ خاصا مضبوط ایسڈ ہوتا ہے اور ہڈی کو ایک خاص شکل دیتا ہے۔ یہ عمل جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ہڈی اپنی اصل شکل میں آجاتی ہے۔ ایک سال بعد بھی ہڈی کو تحلیل کرنے والے یہ خلیے ماہر سنگتراشوں کی طرح ہڈی کی جسامت کو کم کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنی اصلی شکل میں آجائے۔''

''ہڈیوں کے خلیوں سے انجام دیئے ہوئے یہ تمام کام جو اس قدر چھوٹے اور باریک ہوتے ہیں کہ ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھے جاسکتے' ایک اعلیٰ و ارفع ذہانت کا پتہ دیتے ہیں کہ اِن خلیوں نے ایسی حیران کن استعداد کیسے حاصل کر لی جبکہ متعلقہ شخص کو اس کی بالکل خبر نہیں ہوتی؟ خلیوں کو کیسے معلوم ہوتا ہے کہ اُنہیں شکستہ ہڈی کی مرمت کرنے میں کس چیز کی ضرورت ہے اور اسے صحت یاب کرنے کے لئے اُنہیں کیا کچھ کرنا ہے؟ جب کچھ خلیوں نے ہڈیوں کی مرمت کی صلاحیت حاصل کر لی ہے تو دوسرے خلیے اُن کو شکل دینے میں لگ جاتے ہیں۔ یہ کام اُنہیں کس نے تفویض کیے؟ اور کیا وجہ ہے کہ ہر ایک خلیہ اپنے فرض کو بالکل اپنے مناسب اور ٹھیک وقت میں انجام دیتا ہے؟ کیا اِن خلیوں نے یہ تمام چیزیں از خود سیکھ لی ہیں؟'' (ایضاً ص ۷۶ تا ۷۹)

(ض) عضلاتی پٹھے ۔۔ جسمِ انسانی کی خوردبینی موٹریں: عضلاتی پٹھے ہمارے جسم کا پاور سٹیشن ہیں ۔ اہلیتِ کار (Energy) کو قوتِ کار (Power) میں تبدیل کرنے کے وہ انچارج ہیں اور یہ کام وہ ہماری زندگی بھر بہ احسن طریق انجام دیتے ہیں ۔ کچھ پٹھے سکڑ جاتے ہیں حالانکہ ہم شعوری طور پر کوئی ایسی کوشش نہیں کرتے ۔ دل اور معدہ کے پٹھے اِسی قسم کے ہوتے ہیں ۔ اُن کا دائرہ عمل ہمارے اختیار سے باہر ہے ۔ وہ پٹھے جو ہمارے ارادے سے سکڑتے ہیں' ہمارے جسمانی ڈھانچے سے منسلک ہوتے ہیں ۔ انسانی جسم میں ۶۵۰ اِختیاری پٹھے ہیں ۔ ہماری حرکت کرنے سے یہ پٹھے سکڑ جاتے ہیں اور اُن ہڈیوں کے ساتھ وہ استراحت پذیر ہو جاتے ہیں جن کے ساتھ وہ جڑے ہوتے ہیں ۔ پٹھوں سے خون کی نالیوں اور رگوں کے ذریعے کام لیا جاتا ہے ۔ خون کی نالیاں آکسیجن اور غذائی اجزاء کو پٹھوں کی طرف لے جاتی ہیں جبکہ رگیں پٹھوں کی حرکت میں مدد دیتی ہیں ۔''

''اگر ہمارے پٹھوں کا کنٹرول تمامی طور پر ہمارے اختیار میں ہوتا تو کیا ہوتا؟ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ہمارے دل کے پٹھے اگر ہمارے شعوری کنٹرول سے سکڑ جائیں تو ہم تو اُن کے سکڑنے اور کام نہ کرنے پر ہی غور کرتے رہ جائیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہمارے دل کے پٹھے ایک منٹ کے لئے بھی نہ سکڑیں تو ہم موت کو گلے لگا لیں اور ہمارے سوتے میں موت ہمارے لئے ناگزیر ہو جائے کیونکہ دل کی کارکردگی ہمارے اختیار میں نہ ہوگی ۔ تاہم یہ بات کبھی واقع نہیں ہوئی اور ہمیں ایسی بات سوچنی بھی نہیں چاہئے کیونکہ یہ مکمل جسمانی نظام ایک ماہرِ کامل حکیم نے بنایا ہے ۔''

''عضلاتی پٹھے خوش آئند طور پر کام کرتے ہیں: جب ہم مسکراتے ہیں تو ہمارے چہرے پر ۱۷ پٹھے بہ یک وقت سکڑ جاتے ہیں ۔ اگر اِن میں سے ایک پٹھہ بھی نہ سکڑے یا کام کرنا چھوڑ دے تو ہم مسکرا نہیں سکیں گے اور ہمارے چہرے پر خالی خولی تاثرات ہوں گے ۔''

''ہمارے چہرے کے تاثرات کو ۲۸ پٹھے کنٹرول کرتے ہیں ۔ اِن پٹھوں کے اکٹھے سکڑنے سے ہم چہرے میں سینکڑوں مختلف تاثرات دے سکتے ہیں ۔ غصہ' پریشانی' خوشی' شادمانی اور اسی طرح کے دوسرے جذبات اِنہی پٹھوں کے رہینِ منت ہیں ۔ چہرے کے پٹھوں کے علاوہ ہمارے جسم میں دوسرے پٹھے بھی خوش آئندگی سے کام کرتے ہیں ۔ مثلاً صرف ایک قدم رکھنے کے لئے بہ یک وقت ۵۴ پٹھے بائل بہ عمل ہو جاتے ہیں ۔ اس طرح ہم سینکڑوں ایسی حرکات کر سکتے ہیں جو ہمیں معمولی نظر آتی ہیں ۔۔۔ اگر عضلاتی پٹھے صحیح طور پر کام نہ کریں تو ہمارے لئے ایک قدم چلنا بھی ممکن نہ ہو' دوڑنا' تیرنا یا بائیسکل سوار ہونا تو دُور کی بات ہے ۔ لہٰذا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

''قرآنک انسائیکلو پیڈیا'' کے مربوط سلسلہ ہائے کتب کا واحد مقصد آخری الہامی کتاب (قرآنِ حکیم) کے اِس دعوٰی کو ذہن نشین کرانا ہے کہ علم کی اِس لوح میں سب کچھ لکھ دیا گیا ہے :۔

(۱) مَا فَرَّطۡنَا فِی الۡکِتٰبِ مِنۡ شَیۡءٍ (الانعام : ۳۸)

''ہم نے (اِس) کتاب میں کسی چیز کو نظر انداز نہیں کیا۔''

(۲) وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَۃٍ اِلَّا یَعۡلَمُھَا وَلَا حَبَّۃٍ فِیۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیۡ کِتَابٍ مُّبِیۡنٍ (الانعام:۵۹)

'' اور کوئی پتہ نہیں گرتا مگر یہ کہ وہ اُسے جانتا ہے اور کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں موجود ہیں۔''

(۳) وَنَزَّلۡنَا عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ تِبۡیَانًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ (اَلنَّحل : ۸۹)

''اے نبی مکرّم! ہم نے آپ پر یہ کتاب اتاری ہے جس میں ہر بات کا تفصیلی بیان ہے۔''

(۴) وَ کُلُّ صَغِیۡرٍ وَّ کَبِیۡرٍ مُّسۡتَطَرٌ○ (القمر:۵۳)

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات اِس میں لکھی ہوئی ہے۔''

چنانچہ دَرجِ بالا آیات میں کیا گیا خدائی دعوٰی کائنات کی ہر چیز حتّٰی کہ قدیم وجدید تمام علوم پر حاوی ہے۔ایک معروضی اور حقیقت پسند محقق ہونے کے ناطے سے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ علوم وفنون کے اِس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے عمیق سمندر سے مختلف مضامین اور انواع واقسام کے علوم ۔۔طبعی اور مافوق الطبعیاتی ۔۔۔کیسے نکلے۔چنانچہ یہ عاجزانہ کوشش اُس عظیم کام کا ایک جزوِ قلیل ہے جس کا بیڑہ اُٹھانا محض سنجیدہ ومتین متبحر علماء اور پُر خلوص محققین کی جماعت کا کام ہے۔

(۱) جمالیات (Aesthetics)

تعریف: لفظ 'جمالیات' جمیل سے ہے بمعنٰی حسین وخوب صورت۔لٰہذا جمالیات کا موضوع حُسن وزیبائی سے متعلق ہے۔

(۱) ''حُسن کا مطالعہ بالخصوص آرٹ میں حُسن'' (Longman Dictionary of Contemporary Thought" p. 21)

(۲) ''جمالیات سے شغف رکھنے والا وہ ہے جو علم کی روشنی اور زندگی کی لطافت دونوں کے لئے کام کرتا ہے تاکہ معقولیت اور مرضیٔ الٰہی کی حکمرانی ہو۔'' ("Culture and Anarchy" -- Matthew Arnold)

ہمیں اس انتہائی اہم صداقت کو ذہن نشیں کر لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم میں ایک مکمل نظام بنایا ہے اور یہ ہمارے رب کی جانب سے ایک تحفہ اور عطیہ ہے۔ اس کے بدلے میں ہمیں اللہ تعالیٰ کی غیر مختتم رحمت اور اس کی عظمتِ شان کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اُس کے حضور شکر کے جذبات کے ساتھ جھک جانا چاہیے۔

(ط) ''ہاتھ جو ہر چیز کو پوری مہارت سے پکڑ لیتے ہیں: کتاب کی ورق گردانی کرنا' کار کا دروازہ کھولنا' اپنے ہاتھ دھونا--- یہ اُن کاموں میں سے چند ایک کام ہیں جو بغیر کسی مشکل کے اپنے ہاتھ استعمال کرتے ہوئے ہم اکثر کرتے ہیں۔ ہم سینکڑوں دوسرے کام کرنے میں اپنے ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔''

''انسانی ہاتھ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ وہ مٹھی بھینچے بغیر ایک چیز پر ۴۵ کلوگرام (۱۰۰ پونڈ) تک دباؤ ڈال سکتا ہے۔ اِس طاقت کے علاوہ اگر ہم چاہیں تو ہم اپنے ہاتھوں سے سوئی میں دھاگا ڈالنے جیسے نفیس اور عمدہ کام بھی کر سکتے ہیں۔ جبکہ کام کی ایک نوعیت خاصی قوت چاہتی ہے تو کوئی دوسری نوعیت کام میں شدید درستی چاہتی ہے۔ تاہم ہمیں اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ ہمارے ہاتھ دراصل کیا کیا کارکردگیاں انجام دیتے ہیں۔ ہم ایک میز سے کاغذ کا ٹکڑا اٹھانے میں ۵۰۰ گرام (۱.۱ پونڈ) طاقت لگانے یا ایک گیند کو پھینکنے میں ۵ کلوگرام (۱۱ پونڈ) طاقت استعمال کرنے میں شعوری طور پر فیصلہ نہیں کر پاتے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں مکمل طور پر بنایا ہے' اس لئے ہم یہ تمام کام بغیر کسی شعوری خیال کے خود بخود کر گزرتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کی نمایاں استعداد اللہ تعالیٰ کی بے مثل تخلیق کا نتیجہ ہے۔''

''کیا آپ کو معلوم ہے کہ سائنسدانوں کی سب سے بڑی کوشش انسانی ہاتھ سے ملتا جلتا مصنوعی ہاتھ بنانے کی رہی ہے۔ طاقت کے حوالے سے اب تک بنائے گئے روبوٹ ہاتھ انسانی ہاتھوں جیسے ہیں لیکن ان میں قوتِ لامسہ کی اور بہ یک وقت مختلف کام کرنے کی اہلیت کی کمی ہے۔''

''دراصل کئی سائنسدانوں کی رائے یہ ہے کہ انسانی ہاتھ کی تمام خصوصیات کا حامل روبوٹ ہاتھ نہیں بنایا جا سکتا۔ انجینئر ہینس جے شنیلی نے جس نے روبوٹ ہاتھ ڈیزائن کیا' بیان دیا کہ روبوٹ ہاتھ تیار کرنے میں جتنی زیادہ میں نے محنت کی' اتنی ہی زیادہ میں نے انسانی ہاتھ کی تعریف کی۔ اُس نے مزید یہ بھی کہا کہ انسانی ہاتھوں سے انجام پانے والے چند کاموں سے نمٹنے کے لئے ہمیں اچھے خاصے وقت کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاتھ جو آج کی (ترقی یافتہ) ٹیکنالوجی سے بھی نقل نہیں کیے جا سکے' اللہ تعالیٰ کے تیار شدہ ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں اس کی کرشمہ سازی کے مظہر ہیں۔'' (ایضاً ص ص ۸۸ تا ۹۱)

(ظ) نان سٹاپ ایئر کنڈیشنر جو ہمارے جسم میں چل رہا ہے : سانس لینا اُن کاموں میں سے ایک ہے جسے ہم دن بھر لاشعوری طور پر کرتے رہتے ہیں۔ اس عمل کے دوران کئی کیفیات واقع ہوتی ہیں جن میں ناک' سانس کی نالی اور پھیپھڑے شریک ہیں۔ سانس لینے کا مطلب دراصل ہمارے جسم کے خلیوں کو آکسیجن بہم پہنچانا ہے۔ اسی لئے ہم اپنی سانس کو ایک مختصر سے وقت کے لئے روک سکتے ہیں۔ اگر سانس روکنے کا یہ دورانیہ لمبا ہو جائے تو ہمارے خلیے مرجائیں جس کا نتیجہ جسم کی موت ہوگا۔"

''وہ ہوا جو ہم بطور سانس لیتے ہیں' پہلے پہل ہمارے ناک میں صاف ہوتی ہے جس میں سانس لینے کے حوالے سے ایئر کنڈیشنر چل رہا ہوتا ہے۔ ناک میں چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جو چھانی کا کام دیتے ہیں۔ یہ بال گندی یا ٹھنڈی ہوا کو پھیپھڑوں کی ضرورت کے مطابق بناتے ہیں۔ یہ بات اِنہی بالوں کی رہینِ منت ہے کہ جو ہوا ہم بطورِ سانس لیتے ہیں' وہ چھن کے' صاف ہو کے' مرطوب ہو کے' گرم ہو کے اور بیکٹیریا سے پاک وصاف ہو کے اندر جاتی ہے۔ دراصل یہ چھوٹے چھوٹے بال روزانہ تقریباً بیس اَرب خارجی مواد سے ہمارے جسموں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ اجزاء ممکنہ حد تک پہچانے نہیں جا سکتے اور ناک میں اتفاقی طور پر داخل ہونے سے روکے بھی نہیں جا سکتے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرتِ تخلیق کی گواہی دیتی ہے۔ ارتقاء پسندوں کا یہ دعوٰی کس قدر غیر معقول ہے کہ کائنات میں تمام کچھ اٹکل پچو وقوعات کا نتیجہ ہے اور ایسا دعوٰی کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔'' (ایضاً ص ص ۹۲'۹۳)

''نظامِ تنفّس (سانس لینے کا نظام) ہمارے شعوری اختیار میں نہیں : ذرا غور کیجئے اگر سانس لینا ہمارے شعوری اختیار میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ ہم اِس عمل کو بے خطا بروئے کار لانے کے قابل نہ ہوتے' ہم تھک جاتے اور بالآخر کچھ دیر بعد سانس لینا چھوڑ دیتے۔ ہمارا رب اس بات کو جانتا ہے کہ ہم اس کام کو اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اُس نے نظامِ تنفّس کی تخلیق کی جو دوسرے تمام نظاموں کی طرح کامیابی سے چل رہا ہے۔ یہ بات اُس کے تحفوں اور عطیّات میں سے ایک ہے جس کا ذکر اِس آیت میں آیا ہے:

وَآتَاكُم مِّنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَاتُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ'' ۝ (ابراہیم: ۳۴)

''اور جو کچھ تم نے اُس سے مانگا' اُس نے تمہیں وہ عطا کیا۔ اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہیں کر پاؤ گے' بے شک انسان بڑا ہی ناانصاف' بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ سورہ ابراہیم میں اللہ نے انسان کے دو وصف بیان کئے ہیں اور

سورۃ النحل میں اپنے دو وصف ذکر کئے ہیں اِنَّ اللّٰہَ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْم o تو گویا سورہ ابراہیم کی آیت سورۂ النحل کی آیت کے ٹھیک مقابل ہے اور انسان کی ناانصافی کے مقابلہ میں اللہ کی مغفرت اور انسان کے کفرانِ نعمت کے مقابلہ میں اللہ کی رحمت ہے۔

نظریہ ارتقاء کی سائنسی موت: اُنیسویں صدی میں نظریہ ارتقاء کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی۔ سب سے اہم ترقی جس نے اِس نظریے کو سائنسی دنیا میں چوٹی کا مقام دلایا' وہ چارلس ڈارون کی کتاب بہ عنوان ''جانداروں کی ابتداء بذریعہ فطری انتخاب'' ("The Origin of Species by means of Natural Selection") تھی جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ڈارون نے اِس بات کی تردید کی کہ زمین پر رہنے والی مختلف انواع کی مخلوقات اللہ نے جداگانہ اور علیحدہ علیحدہ پیدا کیں۔ ڈارون کے نظریہ کے مطابق تمام جانداروں کا مشترک اور ایک ہی باپ دادا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں کے ذریعے تقسیم ہو گئے۔''

''ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی بنیاد کسی ٹھوس سائنسی تحقیق پر نہیں تھی جیسا کہ اُس نے خود بھی اِس بات کا اعتراف کیا ہے بلکہ یہ محض ایک مفروضہ تھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ڈارون نے اپنی کتاب کے ایک طول طویل باب بہ عنوان ''نظریہ کی مشکلات'' ("Difficulties of the Theory") میں اِس حقیقت کو تسلیم کیا' اس لئے بہت سے تنقیدی سوالات کے مقابل یہ نظریہ پروان نہ چڑھ سکا اور ناکام ہو کے رہ گیا۔''

''سائنسی دلائل کے مقابل ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی ناکامی کا مندرجہ ذیل تین بنیادی عنوانات کے تحت جائزہ لیا جا سکتا ہے:۔

(۱) یہ نظریہ کسی طرح بھی اس بات کی وضاحت نہیں کرتا کہ زمین پر زندگی کی ابتدا کیسے ہوئی۔

(۲) اس بات پر کوئی سائنسی تحقیق نہیں ہے کہ نظریہ کی طرف سے پیش کردہ ''ارتقائی میکانیت'' میں تدریجاً آگے بڑھنے کے ثبوت میں کوئی جان بھی ہے۔

(۳) فوصل (رکاز) ریکارڈ نظریہ ارتقاء کی پیش کردہ جزئیات کے بالکل برعکس ثبوت پیش کرتا ہے۔''

("The Miracle of Creation in Plants" ... Harun Yahya, pp. 188, 189)

(۱۱) علمِ نجوم (ASTROLOGY)

تعریف: سیاروں کی تاثیرات یعنی سعادت ونحوست اور آئندہ واقعات کی حسب گردش پیش گوئی یا معاملاتِ تقدیر اور اچھے بُرے موسم کی خبر دینے کا علم ''علمِ نجوم'' کہلاتا ہے۔

''یہ عقیدہ کہ لوگوں اور قوموں کی اچھی، بُری تقدیریں ستاروں اور سیاروں کی حرکت سے متاثر ہوتی ہیں، قدیم بابل (عراق کا ایک قدیم شہر) کے لوگوں میں خوب پھلا پھولا۔'' (انسائیکلوپیڈیا بری ٹینیکا، ج ۲، ص ۵۹۰)

دائرہ معارفِ اسلامیہ میں لکھا ہے:۔

''علمِ نجوم کی بنیاد اِس اُصول پر ہے کہ اِس جہان میں جتنی بھی تبدیلیاں ہوتی ہیں، اُن سب کا اجرامِ سماوی (سیارگان) کی مخصوص طبائع اور اُن کی حرکات سے قریبی تعلق ہے۔ انسان عالمِ اصغر ہونے کی حیثیت سے پورے عالمِ اکبر کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے، بالخصوص وہ سیاروں کی تاثیرات کے تابع ہے۔ اس میں ہم خواہ بطلیموس کی پیروی میں واضح طور پر اس عملی نظریہ کو تسلیم کریں کہ اجسامِ فلکی کی نکلی ہوئی شعاعوں سے ایسی قوتیں یا اثرات خارج ہوتے ہیں جو معمول (قابل) کی طبیعت کو عامل (فاعل) کی طبیعت کے مطابق بنا دینے کی صلاحیت رکھتے ہوں یا راسخ العقیدہ مسلمانوں کا ہم خیال ہونے کی غرض سے اجسامِ سماوی کو آئندہ ہونے والے واقعات کا اصل فاعل نہ مانتے ہوئے محض اُن واقعات کی نشانیاں (دلائل) تصوّر کریں۔ ستاروں کا اثر اُن کی انفرادی نوعیت پر، نیز زمین یا دوسرے ستاروں کے لحاظ سے اُن کے مقام پر منحصر ہے، لہٰذا اس عالم کے واقعات اور انسانی زندگی کے نشیب وفراز ہمیشہ لاتعداد اور نہایت متنوع بلکہ متناقض سماوی اثرات کے نہایت پیچیدہ اور متغیرہ امتزاج کے تابع ہوتے ہیں۔ ان اثرات کو جاننا اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ نظر میں رکھ کر دیکھنا منجم کا محنت طلب کام ہے۔'' (اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، ج ۱۴، ص ۳۰۵ مطبوعہ لاہور)

''منجم اپنے مؤکل کی تاریخ اور وقتِ پیدائش کی بنیاد پر ایک زائچہ (جنم پتری) بناتا ہے یعنی ایک نقشہ کھینچتا ہے جس میں اُس وقت سورج، چاند، سیارگان اور منطقۃ البروج (راس منڈل) کی بارہ علامات کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اجرام فلکی مختلف خصوصیات اور تاثرات کی نمائندگی کرتے ہیں اور منجم اُن کی حالت اور اُن کے باہمی تعلق کا مشاہدہ کرنے کے بعد متعلقہ آدمی کے کردار اور اس کے سفرِ حیات کے موٹے موٹے

اشارات کی پیش گوئی کرتا ہے۔'' (Hutchinson 20th Century Encyclopedia, p. 87) 7th edn.

منطقۃ البروج کی علامات (Zodiac Signs) جنہیں علامات النجوم یعنی ''ستاروں کی علامات'' بھی کہا جاتا ہے' کو علمِ نجوم اور زائچوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش آپ کی علامت کا تعین کرتی ہے اور اس چیز کا اثر آپ کی شخصیت پر پڑتا ہے۔ مستقبل کی پیش گوئی کے لئے منطقۃ البروج کی علامات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔''

''منطقۃ البروج آسمان کا ایک خیالی علاقہ ہے جو بارہ مساوی حصّوں میں تقسیم ہے جنہیں منطقۃ البروج کی علامات بھی کہا جاتا ہے' جن میں سے سورج' چاند اور سیارگان سال میں ایک مرتبہ باری باری گزرتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔ منطقۃ البروج کی بارہ علامات یہ ہیں:۔

(۱) برجِ حمل (میش راس .. Aries or Ram) --- ۲۱ مارچ تا ۲۰ اپریل

(۲) برجِ ثور (Taurus) --- ۲۱ اپریل تا ۲۰ مئی

(۳) برجِ جوزا (Gemini) --- ۲۱ مئی تا ۲۰ جون

(۴) برجِ سرطان (Cancer) --- ۲۱ جون تا ۲۰ جولائی

(۵) برجِ اسد (Leo or Lion) --- ۲۱ جولائی تا ۱۹/۲۲ اگست

(۶) برجِ سُنبلہ (Virgo) --- ۲۰/۲۳ اگست تا ۲۲ ستمبر

(۷) برجِ میزان (Libra) --- ۲۳ ستمبر تا ۲۲ اکتوبر

(۸) برجِ عقرب (Scorpio or Scorpion) --- ۲۳ اکتوبر تا ۲۱ نومبر

(۹) برجِ قوس (Archer or Sagitarius) --- ۲۲ نومبر تا ۲۰ دسمبر

(۱۰) برجِ جدی (Capricorn) --- ۲۱ دسمبر تا ۲۰ جنوری

(۱۱) برجِ دلو (Aquarius) --- ۲۱ جنوری تا ۱۹ فروری

(۱۲) برجِ حُوت (Pisces) --- ۲۰ فروری تا ۲۰ مارچ

(Oxford Advanced Learner's Dictionary, p. 1392)

اِن بارہ قسموں کو چار عناصر میں تقسیم کیا جاتا ہے: آگ' مٹی' ہوا اور پانی۔ اور ہر عنصر میں بارہ علامات میں سے تین علامات پائی جائیں گی۔ یہ عناصر ایک علامت کی بنیادی خصوصیت کو بیان کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً:
آگ کی علامات (حمل' اسد' قوس) میں آتشیں خصوصیات' مزاج کا تیز ہونا' جذباتیت' تخلیقی اُپج اور جرأت و بہادری کی خصوصیات۔

مٹی کی علامات (ثور‘ سنبلہ‘ جدی) پختہ ارادے کے مالک‘ کفایت پسند‘ کم خور‘ شہوانی طبیعت کے اور اپنے جیون ساتھی کو ٹوٹ کر چاہنے والے ہوتے ہیں۔

جو لوگ ہوائی اثرات (جوزا‘ میزان‘ دلو) کے تحت پیدا ہوتے ہیں وہ ذہین‘ حالات کے مطابق تبدیل ہونے والے اور مضبوط اعصاب کے مالک ہوتے ہیں۔

جو لوگ آبی اثرات (برج سرطان‘ عقرب‘ حوت) کے تحت پیدا ہوتے ہیں وہ وجدانی (کشفی)‘ روحانی طبیعت کے مالک اور رازداری برتنے والے ہوتے ہیں۔
("Birthday Secrets" ... Jill M. Phillips, pp. 8-9)

بُرجوں کا ذکر سورۃ الحجر کی آیت ۱۶ میں آیا ہے :
وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ٥
”اور بالیقین ہم نے آسمان میں بُرج بنائے اور ہم نے اُنہیں دیکھنے والوں کے لئے مزیّن کر دیا۔“

بروج سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت پر استدلال : بروج اللہ تعالیٰ کی الوہیت پر اس طرح دلالت ہیں کہ ہر برج دوسرے برج سے مختلف ہے اور اُن کا اختلاف اس پر دلالت کرتا ہے کہ قادر و مختار اور صناعِ ازل نے جس برج کو جس ہیئت پر چاہا‘ اُس ہیئت پر بنا دیا اور ضروری ہے کہ اُن کا بنانے والا واجب اور قدیم ہو کیونکہ اگر وہ ممکن اور حادث ہو تو اُسے خود اپنے وجود میں کسی سبب کی ضرورت ہوگی اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ واجب اور قدیم واحد ہو۔ لہٰذا آسمانوں میں بروج کا ہونا اس بات کو مستلزم ہے کہ اُن کا کوئی خالق ہو اور ضروری ہے کہ وہ خالق واجب‘ قدیم اور واحد ہو۔“ (تبیان القرآن ـ ـ علامہ غلام رسول سعیدی‘ ج ۶‘ ص ۲۵۵)

ملکِ عرب میں پہلے کاہنوں کا بہت چرچا تھا اور لوگ مستقبل کی باتیں معلوم کرنے کے لئے اُن کے پاس بالعموم جایا کرتے تھے حتیٰ کہ اس کا سبب منقطع کر دیا گیا اور شیاطین جو چوری سے فرشتوں کی باتیں سنا کرتے تھے اُن کے سننے کے درمیان آگ کے شعلے حائل کر دئے گئے جیسا کہ سورۃ المُلک اور سورۃ الجنّ میں ارشاد ہوا:

(i) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (المُلک : ۵)
”اور بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کر دیا اور اُن ستاروں کو شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بھی بنایا۔“ *

* آیت سے میزائل کا تصور بھی ملتا ہے۔

(ii) وَّاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰهَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِيۡدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ فَمَنۡ يَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ يَجِدۡ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن: ۸، ۹)

"اور یہ کہ ہم نے آسمان کو چھوا تو ہم نے اُسے اِس حال میں پایا کہ اُسے سخت پہرہ داروں اور آگ کے انگاروں سے بھر دیا گیا ہے۔ اور ہم پہلے (فرشتوں کی باتیں) سننے کے لئے آسمان کی کچھ جگہوں پر بیٹھ جاتے تھے۔ پس اب جو کان لگا کر سنتا ہے تو وہ اپنی گھات میں آگ کا شعلہ تیار پاتا ہے۔"

امام الانبیاء ﷺ کے زمانۂ رسالت میں آسمان پر بہت سے شہابِ ثاقب وغیرہ ہوا کرتے تھے جو اُن شیاطین کو مارے جاتے تھے جو آسمان پر جا کر فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے تھے اور انہی کا ذکر اوپر کی آیات اور دیگر آیات میں آیا مثلاً سورۃ الصّٰفّٰت کی آیات ۶ تا ۱۰ میں، سورۃ الطارق کی ابتدائی چار آیات میں۔

علمِ غیب کا معلوم کر لینا: (منجمین زائچہ یا جنم پتری کے ذریعے مستقبل کا حال جاننے کا دعوٰی کرتے ہیں)

علمِ نجوم کے برعکس قرآن حکیم کی تعلیمات یہ ہیں کہ علمِ غیب صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا خاصا ہے۔ قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے علم الغیب کی اپنے غیر سے مطلقاً نفی کی ہے چنانچہ فرمایا:

قُلۡ لَّا يَعۡلَمُ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ الۡغَيۡبَ اِلَّا اللّٰهُ (النّمل ۶۵)

"فرما دیجئے کہ آسمانوں اور زمینوں میں اللہ کے سوا کسی کو علم الغیب نہیں ہے۔"

لیکن اُس کے منتخب رسولوں کو بھی اُس کی جانب سے علمِ غیب دیا جاتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ثابت ہے:

(i) وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطۡلِعَكُمۡ عَلَى الۡغَيۡبِ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَجۡتَبِىۡ مِنۡ رُّسُلِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (آلِ عمران: ۱۷۹)

"اور اللہ تمہیں غیب پر مطلع کرنے والا نہیں ہے البتہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے رسولوں میں سے انتخاب کر لیتا ہے۔"

(ii) عَالِمُ الۡغَيۡبِ فَلَا يُظۡهِرُ عَلٰى غَيۡبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارۡتَضٰى مِنۡ رَّسُوۡلٍ (الجن: ۲۶، ۲۷)

"اللہ غیب کا جاننے والا ہے، وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں کسی برگزیدہ پیغمبر کو اگر مطلع کرنا چاہے۔"

(iii) وَمَا هُوَ عَلَى الۡغَيۡبِ بِضَنِيۡنٍ ۝ (التکویر: ۲۴)

"وہ (نبی) غیب کے بتانے میں بخیل نہیں ہے۔"

شرح عقائد اور علمِ کلام کی کتابوں میں مذکور ہے کہ علم کے تین اسباب ہیں: خبرِ صادق، حواسِ سلیمہ اور عقل۔ اور وحی بھی خبرِ صادق ہے تو جب انبیاء علیہم السلام کو اللہ نے غیب کی خبریں دیں تو انہیں علمِ غیب حاصل ہو گیا۔ اس لئے صحیح یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو وحی سے علمِ غیب حاصل ہوتا ہے لیکن یہ علم محیط یا علمِ ذاتی نہیں ہوتا۔

امام احمد رضا خاں بریلوی (م ۱۳۴۰ھ) لکھتے ہیں:

''علم جب مطلق بولا جائے خصوصاً جبکہ غیب کی طرف مضاف ہو تو اس سے مراد علمِ ذاتی ہوتا ہے۔ کوئی شخص کسی مخلوق کے لئے علمِ ذاتی مانے وہ یقیناً کافر ہے۔'' (الملفوظ ج ۳، ص ۶۷، مطبوعہ نوری کتب خانہ لاہور)

علومِ نبوّۃ: اللہ تعالیٰ کا رسول اللہ کی ذات وصفات، اُس کے احکام اور اپنی طرف وحی شدہ کتاب کے مخفی معانی کا عارفِ کامل ہوتا ہے۔ وہ اپنی اُمّت کے عقائد و ایمان کو بھی جانتا ہے، قول و فعل میں اُن کے دو رنگی رویّے اور اُن کی نیکیوں، بدیوں کو بھی بخوبی جانتا ہے۔ عالم الشہادۃ اور عالَم الغیب پر اُس کی برابر کی نگاہ ہوتی ہے۔ نبوّت کے جوہر پر روشنی ڈالتے ہوئے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

وَرَاءَ الْعَقْلِ طَوْرٌ'' آخَرُ تَنْفَتِحُ فِيهِ عَيْنٌ'' أُخْرٰى يُبْصِرُ بِالْغَيْبِ وَمَا سَيَكُوْنُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ أَلْعَقْلُ مَعْزُوْلٌ'' عَنْهَا (اَلْمُنْقِذُ مِنَ الضَّلَالِ ص ۵۴، بحوالہ ''مقالاتِ سعیدی'' ص ۶۵)

''انسانی عقل سے ماوراء ایک اور مقام ہر چیز کے جاننے کا ہے جہاں قوّتِ مشاہدہ کی آنکھ کھل جاتی ہے جس کے ذریعے اللہ کا رسول مستقبل کے حالات کی پیش گوئی کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور اُن حقائق کی بھی جہاں عقل و فہم کی رسائی نہیں ہو سکتی۔''

شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی نے غیب کی دو قسمیں بیان کی ہیں: غیبِ اضافی اور غیبِ مطلق۔ اوّل الذکر وہ غیب ہے جو سب کے لئے چھپا ہوا نہیں ہوتا، کچھ لوگوں کے لئے یہ مخفی ہوتا ہے اور کچھ کے لئے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً رنگ اور شکل ایک نابینا شخص کے لئے غیب ہیں لیکن دوسروں کے لئے نہیں۔ جنّت، جہنّم، فرشتے اور جنّات انسانوں کے لئے غیب ہیں لیکن فرشتوں کے لئے نہیں۔ بھوک، پیاس، غصّہ اور شہوانی خواہشات فرشتوں کے لئے غیب ہیں لیکن انسانوں کے لئے نہیں۔ اِن تمام کا تعلق غیب کی پہلی قسم سے ہے۔

غیب کی دوسری قسم یعنی غیبِ مطلق وہ غیب ہے جو تمام مخلوقات سے چھپا کے رکھا گیا ہے۔ وہ حکیم و عقلِ کل یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ غیب کی یہ قسم اپنے نبیوں اور رسولوں کو عطا کرتا ہے۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس توضیح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیب کی پہلی قسم یعنی غیب اضافی عوام الناس اور فرشتوں سب کو حاصل ہے لیکن وہ غیب جو رسولوں کو حاصل ہے' وہ نمایاں طور پر غیبِ اضافی سے مختلف ہے جو دوسرے لوگوں کو حاصل نہیں اور محولہ بالا سورہ آلِ عمران کی آیت ۱۷۹ اور سورۃ الجن کی آیات ۲۶' ۲۷ کا یہی مفہوم ہے۔

شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جو علم اور طاقت دی ہے' اُس کا ذکر سورۃ الاعراف میں اس طرح ہے:۔
اِنَّہ' یَرٰکُم ھُوَ وَقَبِیْلُه' مِنۡ حَیۡثُ لَا تَرَوۡنَھُمۡ (سورۃ الاعراف : ۲۷)
''بے شک وہ خود اور اُس کا لشکر تمہیں ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم اُنہیں نہیں دیکھتے۔''

یعنی شیطان کو پوری دست اندازی کا موقع تو بس وہیں ملتا ہے جہاں ایمان کا فقدان ہو۔ پس یہ از بس ضروری ہوا کہ رسول کا علم شیطان کے علم سے کہیں زیادہ وسیع ہو' وگرنہ شیطان علم میں (معاذ اللہ) رسول سے بڑھ جائے گا اور یہ بات لغو اور عقل سے بعید ہے چند وجوہ سے (i) اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اور میرے رسول ضرور بالضرور غالب آ کر رہیں گے (سورۃ المجادلۃ :۲۱) (ii) اگر شیطان کو علم میں رسول سے (معاذ اللہ) فائق مانا جائے تو وہ رسولوں کو بھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) گمراہ کرنے کے قابل ہو گا جس طرح کہ وہ دوسرے لوگوں کو گمراہ کرتا ہے حالانکہ رب تعالیٰ کے حضور روزِ ازل میں اُس نے اس بات کو تسلیم کیا تھا کہ وہ اُس کے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں کر سکے گا (سورہ صٓ :۸۲' ۸۳)۔ (iii) بروئے حدیث شیطان حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سائے سے بھی بھاگتا ہے یعنی امام الانبیاء کے ایک غلام سے خوف کھاتے ہوئے اُس سے دور بھاگتا ہے' تو امام الانبیاء علیہ السلام کی شانِ ارفع کا کیا کہنا!

مندرجہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ اگر دشمنِ خدا یعنی شیطانِ لعین کو یہ طاقت دی گئی ہے کہ وہ تمام کائنات کے انسانوں کو دیکھتا ہے تو پیغمبر کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی بھی چیز مخفی نہیں رکھی گئی۔ شیطان تو شیطان' فرشتوں کا علم بھی پیغمبروں کے علم کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ (تفسیر کبیر)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا نبی اور رسول ناقابلِ رسائی حد تک اعلیٰ و ارفع مقام پر فائز ہوتا ہے جس پر دنیا اور آخرت کے تمام حقائق عیاں کر دیئے جاتے ہیں۔ اپنے خداداد اوصاف کی رُو سے وہ پیش آنے والے واقعات کو نیند میں یا عالمِ بیداری میں معلوم کر لیتا ہے۔ اسی اختصاص سے وہ لوحِ محفوظ کو پڑھنے کے قابل ہو جاتا ہے (احیاء علوم الدین' ج ۴' ص ۸)

<u>ایک غلط فہمی کا ازالہ</u> : کچھ لوگ سوال کرتے ہیں کہ اگر پیغمبر کا علم ایسا ہی ہے جیسا کہ بیان کیا گیا ہے تو (۱) آدم علیہ السلام نے علم کے ہوتے ہوئے ممنوعہ دانۂ گندم کیوں کھایا؟ (۲) جب حضرت یعقوب علیہ السلام کو بخوبی علم تھا کہ اُن کا بیٹا کنویں میں کلی طور پر محفوظ ہے تو آپ یوسف پر روتے کیوں رہے؟ (۳) نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کو بئرِ معونہ کیوں بھیجا اگر انہیں اس بات کا علم تھا کہ وہاں وہ صحابہ شہید کر دیئے جائیں گے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر کا علم نسیان (بھول) اور ایسے حوادث سے آزاد نہیں ہوا کرتا جنہیں اُن کے علم کی نفی قرار دیا جا سکے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو بخوبی علم تھا کہ ممنوعہ دانۂ گندم لینے میں رب کی نافرمانی ہے لیکن آپ نے اُسے بھول چوک سے (سہواً) لیا تھا اور اس میں آپ کے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا جبکہ گناہ وثواب صرف ارادے پر مرتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے اُن کی صفائی میں فرمایا :

وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًاo (طٰہٰ : ۱۱۵)

"اور (بہت قبل) ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے سو اُن سے بھول ہوگئی اور ہم نے اُن میں قصد وارادہ نہ پایا۔"

عہد لینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے آدم کو اُس پودے کے قریب جانے یا اُس کے پھل کھانے سے منع کیا تھا۔ "اس سے پہلے" سے مراد یہ ہے کہ سیّدنا محمد ﷺ سے پہلے یا قرآن مجید کو نازل کرنے سے پہلے۔ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (ہم نے اُن میں قصد وارادہ نہ پایا) فرما کر اپنے پیارے بندے حضرت آدم علیہ السلام کے دامن سے گناہ و عصیان کا داغ دھو دیا گیا۔

<u>نسیان کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام پر عتاب کیوں</u>؟ عتاب اس لئے کیا گیا کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کے منع کرنے کو ہر وقت ذہن میں حاضر کیوں نہیں رکھا اور ایسے امور میں کیوں مشغول ہوئے جن کی وجہ سے اُن پر عتاب نازل ہوا۔

دوسرے سوال کا جواب علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی میں یہ دیا ہے کہ حُسنِ یوسف کو آپ کے لئے جمالِ الٰہی کا آئینہ بنا دیا گیا تھا۔ وہ اُس طلعتِ زیبا کے آئینہ میں تجلّیاتِ الٰہی کا مشاہدہ فرمایا کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف آپ کی نگاہوں ..... اوجھل ہو گئے تو انوارِ خداوندی کی لذّتِ دید سے محروم ہو جانے کے باعث آپ بے چین اور بے قرار ہو گئے اور آپ کا رونا اسی بے چینی کی وجہ سے تھا۔

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہود کی فطرتِ خبیثہ کے علم کے باوجود آپ نے اپنے صحابہ کو ارادۃً

آرنلڈ اُنہیں کسی فنکار کے بنیادی اوصاف قرار دیتا ہے۔

(۳) ''جمالیات سے شغف رکھنے والا وہ ہے جو فن، موسیقی اور ادب میں خوبصورتی کا متلاشی ہو۔''

(Dictionary of Literary Terms and Literary Theory -- J. A. Cuddon, p. 13)

(۴) جمالیات چونکہ فلسفۂ حُسن وفن ہے لہٰذا اِس میں اہم مسئلہ حُسن و جمال کی نوعیت کا ہوتا ہے۔

(http://www.answers.com/topic/aesthetics?method=8)

حُسن وزیبائش کا ذکر قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں: یہ بات ذہن نشین رہے کہ اسلام اشیاء کے جمالیاتی پہلو کو کہیں بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ اپنے ماننے والوں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ ہر کام خوش اُسلوبی اور دل آویزی سے انجام دیں۔ چنانچہ سورۃ النّمل میں ارشاد ہوا:۔

صُنْعَ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ کُلَّ شَیْءٍ (اَلنَّمل: ۸۸)

''یہ کاریگری اللہ ہی کی ہے جس نے (اپنی حکمت سے) ہر چیز کو مضبوط بنایا۔''

جب اللہ جلّ جَلالُہٗ ہر شے میں اپنی ماہرانہ کاریگری، اکملیّت اور پائیداری کو ملحوظ رکھے ہوئے ہے تو وہ اپنی مخلوق بالخصوص مؤمنین سے بھی یہی توقع کرتا ہے کہ وہ اپنے کام میں اکملیّت، زیبائش اور پائیداری کا مظاہرہ کریں۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:۔

''اللہ اپنے بندے سے امید کرتا ہے کہ وہ اپنا کام کاریگری اور زیبائش سے کرے اور (حتی الوسع) اپنی پوری خداداد صلاحیت اس میں صَرف کر دے۔'' (صحیح مسلم)

کاریگری اور پائیداری کے ساتھ ساتھ لوگوں کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ اس تیار کردہ چیز میں خوبصورتی اور نفاست کا بھی خیال رکھیں (صحیح مسلم)

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ وَّ یُحِبُّ الْجَمَالُ (صحیح مسلم)

''کوئی شک نہیں کہ اللہ بزرگ و برتر خود حسین وجمیل ہے اور حُسن و جمال کو پسند کرتا ہے۔''

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام چیزوں میں حُسن وزیبائش کے پہلو سے بخوبی واقف تھے اور اُنہوں نے اپنے پیروکاروں کو بہر نوع ہر کام کو دل آویزی سے کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ایک حدیث ہے ''اللہ جلّ جلالہٗ نے تم پر فرض کر دیا ہے کہ اپنے ہر کام میں حُسن و جمال اور نفاست پیدا کرو۔''

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام ہر کام میں نہ صرف حُسنِ کارکردگی پر زور دیتا ہے بلکہ اس کے پہلو بہ

بئر معونہ بھیجا (۱) یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ موت کے خوف کو تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے۔(۲) قضاو قدر پر مکمل ایمان رکھتے ہوئے آپ نے ایسا کیا۔(۳) اگر آپ ﷺ دشمنوں کی دعوت پر اُن قاری صحابہ کو وہاں نہ بھیجتے تو دشمن روزِ قیامت اللہ کے حضور یہ عذر کر سکتے تھے کہ اُن کی درخواست کی پذیرائی نہیں کی گئی۔

<u>اللہ ربّ العزت اور نبی کے علمِ غیب میں فرق</u>: (۱) اللہ تعالیٰ کا علم قدیم، دائمی، غیر منحصر اور لامحدود ہے جبکہ نبی کا علم حادث (یعنی پہلے نہیں تھا)، رب کے دینے نہ دینے پر منحصر اور محدود ہوتا ہے۔(۲) اللہ تعالیٰ کا علم ذاتی ہے جبکہ نبی کا علم عطیّہِ خداوندی ہوتا ہے۔(۳) اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط کے ساتھ حضور ﷺ کے علم کی نسبت اتنی بھی نہیں جتنی پانی کے ایک قطرہ کو دنیا بھر کے سمندروں سے ہے۔

ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ حادث، عطائی اور محدود علم اتنا محدود بھی نہیں جتنا بعض حضرات نے سمجھ رکھا ہے۔اس کی وسعتوں کا یا تو دینے والا جانتا ہے یا لینے والا۔جبریلِ امین بھی وہاں دَم نہیں مار سکتا۔اس علم و معرفت کی وہ وسعتیں اور بے کرانیاں جن پر بیان کا ہر جامہ تنگ ہے، اُس کی حد براری اگر ہم کرنے لگیں تو ٹھوکریں کھانے کے سوا کچھ نہیں ملے گا جبکہ رب نے فرمادیا: فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ [اللہ نے اپنے (محبوب) بندے پر جو وحی کی، سو وحی کی] لہٰذا بندے کے پاس اُس علمِ عطائی کے ناپ تول کا پیمانہ کہاں!

علمِ نجوم میں مسلمان سائنسدانوں کی شاندار خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ایک عظیم مسلمان منجم عبدالرحمٰن صوفی نے "ہیئتِ نجوم" (Figures of the Stars) نامی ایک کتاب لکھی جس میں اجرامِ فلکی کی گردش اور حیثیت کی تفصیل ملتی ہے۔بعد کے ادوار میں یہ کتاب جدید علمِ ہیئت کی بنیاد ثابت ہوئی۔فلپ کے ہٹی اس ضمن میں لکھتے ہیں:۔

"یورپی زبانوں میں نہ صرف کئی ستاروں کے نام عربی زبان سے لئے گئے بلکہ اسی طرح کئی تکنیکی اصطلاحات بھی عربی سے لی گئیں جو اِس بات کے ثبوت میں ہے کہ عیسائی یورپ کو اسلام نے بھرپور ورثے سے مالامال کیا ہے۔"
("History of the Arabs" pp. 568-69)

<u>علمِ نجوم (ستاروں کی تاثیرات ماننے) کا شرعی حکم</u>: سورۃ الصّافّات کی آیات ۸۸،۸۹ کی تشریح میں علامہ محمود آلوسی البغدادی (م ۱۲۷۰ھ) نے علمِ نجوم کے جواز اور اسلام میں اس کی صحیح حیثیت پر تفصیلی بحث کی ہے۔۲۳ صفحات پر مشتمل اُن کی طول طویل بحث کا خلاصہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"فَنَظَرَ نَظْرَةً فِی النُّجُوْمِ (آیت ۸۸): تو آپ (یعنی ابراہیم علیہ السلام) نے ستاروں کی طرف ایک نظر ڈالی یعنی آپ نے بظاہر ستاروں کی طرف دیکھ کر تامّل اور غور وفکر کیا جس سے اُن کی قوم نے یہ سمجھا کہ آپ ستاروں کی چال اور اُن کی مخصوص گردش کی وضع اور ہیئت سے مستقبل میں پیش آنے والے کسی واقعہ یا سانحہ کو اخذ کر رہے ہیں اور دراصل تو آپ آسمانوں اور زمینوں کی خِلقت اور بناوٹ پر غور وفکر فرما رہے تھے اور کاملین کے طریقہ کے مطابق آثار سے موثر اور مخلوق سے خالق پر استدلال فرما رہے تھے اور یہی چیز حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شان کے لائق ہے لیکن آپ نے اپنی قوم کے ذہنوں میں یہ وہم ڈالا کہ آپ سیاروں کی گردش کی وضع قطع میں غور کر کے مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو معلوم کر رہے ہیں۔ ستاروں کی طرف دیکھنے کا آپ کا یہ عمل "تعریض" کہلاتا ہے (یعنی ایسا عمل جو اصل حقائق سے یکسر خالی ہو اور اُس کا مقصد دوسرے کو راہِ راست پر لانا ہو) اور یہ عمل جنابِ یوسف علیہ السلام کے قصہ سے ملتا جلتا ہے جب اُن کے بھائیوں کی بوریوں کی تلاشی لی گئی۔ یوسف علیہ السلام کو بخوبی معلوم تھا کہ گندم ناپنے کا پیالہ اُن کی بوریوں میں نہ تھا لیکن تاہم تلاشی لی گئی۔ یوسف علیہ السلام کے سوتیلے بھائیوں کی تلاشی پہلے جبکہ آپ کے حقیقی بھائی (بنیامین) کی تلاشی بعد میں لی گئی کیونکہ یوسف علیہ السلام کو معلوم تھا کہ پیالہ بنیامین کی بوری میں ہے لیکن آپ نے ظاہر یہ کیا کہ گویا آپ کو معلوم ہی نہیں کہ پیالہ کہاں رکھا ہے۔ تلاشی کی ابتداء بنیامین سے شروع نہ کرنے کے پسِ پردہ مقصد بنیامین کو چوری کے الزام سے بَری کرنا تھا۔ تو اس سارے واقعہ میں تعریض ہے۔"

"ابن ابی حاتم نے حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی سند پر بیان کیا کہ آسمان کی طرف نظر دوڑانا عربوں کے ہاں ایک محاوراتی بات ہے اور یہ اصطلاح اُس وقت استعمال کی جاتی ہے جب انسان بہت غور وخوض سے کام لے۔ جنابِ ابراہیم علیہ السلام کا ستاروں کی طرف دیکھنے میں تعریض نہیں ہے بلکہ آپ کے فرمان اِنِّیْ سَقِیْمٌ" (آیت ۸۹) میں تعریض ہے کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔ کچھ واقعات کو ثابت کرنے کے لئے ستاروں کی طرف دیکھنا شریعتِ اسلامیہ میں ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ ایمان یہ ہو کہ خالقِ کائنات نے اُنہیں انسانوں کے مفاد کے لئے رہبری کے نشانات بنائے ہیں (سورۃ النحل: ۱۶)۔ ممانعت یہ اعتقاد رکھنے میں ہے کہ اجرام فلکی خالقِ کائنات کی مداخلت اور رضا کے بغیر بذاتِ خود انسانوں کی تقدیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہ کہنے میں کہ میں بیمار ہونے والا ہوں' علمِ نجوم کا سہارا لیتے ہوئے مستقبل کے واقعات کی پیش گوئی کی' جدّ الانبیاء اور خلیل اللہ علیہ السلام کے حق میں سراسر بے ادبی اور توہین ہے۔ اگر علمِ نجوم کا دروازہ انبیاء علیہم السلام پر کھول دیا جاتا تو مستقبل کے متعلق اُن کے علم کی بنیاد وحیِ الٰہی کی بجائے ستاروں اور سیاروں کی گردش پر ہوتی۔"

"ستاروں کے بارے میں لوگ مختلف الآراء ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کچھ ستارے اچھی قسمت کے

جبکہ کچھ بدقسمتی کے ہوتے ہیں۔لیکن میرا اعتقاد یہ ہے کہ نہ تو خوش قسمتی میں' نہ ہی بدقسمتی میں اور نہ ہی کسی دوسرے معاملے میں ستاروں کا کوئی اثر ہوتا ہے۔لوگوں کی باتیں بغیر کسی ٹھوس دلیل کے سب قیاس آرائیاں ہیں۔'' (روح المعانی--علامہ محمود آلوسی)

ستاروں کی طرف نظر دوڑانے کے بعد ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: اِنِّیْ سَقِیْم '' (آیت ۸۹) کہ میں بیمار ہونے والا ہوں۔اُس وقت ابراہیم علیہ السلام بیمار نہیں تھے لیکن اُنہوں نے فرمایا کہ میں بیمار ہوں۔بظاہر یہ کلام خلافِ واقعہ (اور سچ کے خلاف) ہے لیکن یہاں بھی تعریض اور توریہ ہے۔ابراہیم علیہ السلام کے یہ کہنے کی وجہ مفسرین نے اس طرح بیان کی ہے:۔

''امام عبدالرحمن بن محمد ابی حاتم رازی (متوفّٰی ۳۲۷ھ) لکھتے ہیں کہ سفیان رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر میں کہا کہ اس کا معنی ہے کہ مجھے طاعون ہے'' (تفسیر امام ابن ابی حاتم رقم الحدیث: ۱۸۲۱۷)

''زید بن اسلم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ شاہِ وقت نے ابراہیم علیہ السلام کو کہلا بھیجا کہ کل ہماری عید ہے' تم بھی اس میلے میں شریک ہونا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستارے کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ ستارہ جب بھی طلوع ہوتا ہے تو میں بیمار ہو جاتا ہوں' تو یہ سن کر بادشاہ کے کارندے چلے گئے۔'' (تفسیر امام ابن ابی حاتم: ۱۸۲۱۹)

''امام الحسین بن مسعود الفرّاء البغوی (المتوفّٰی ۵۱۶ھ) لکھتے ہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کی قوم ستارہ شناس اور ستارہ پرست تھی' اس لئے آپ نے اُن کے ساتھ اُن کے طریقہ کے مطابق معاملہ کیا اور اِس طور سے حیلہ کیا جو اُن کے رسم و رواج کے مطابق تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ اُن کے بتوں کو توڑنے کے لئے حیلہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اُن کی بُت پرستی کو باطل کیا جا سکے' دوسرے یہ کہ اُن کی عید اور میلہ تھا اور وہ لوگ میلہ میں جانے سے پہلے بتوں کے سامنے قربانیاں پیش کرتے تھے اور کھانے پینے کی چیزیں رکھتے تھے تاکہ اس سے بُتوں کا تقرّب اور تبرّک حاصل ہو اور وہ میلہ سے واپس آنے کے بعد اُن چیزوں کو کھائیں۔اُنہوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ ہماری عید اور میلے میں آپ ہمارے ساتھ چلیں۔آپ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا کہ میں بیمار ہوں۔حضرت ابن عباس نے کہا سَقِیْم سے مراد طاعون زدہ ہونا ہے اور وہ لوگ طاعون سے بہت گھبراتے تھے اور اس سے بہت دُور بھاگتے تھے۔پھر وہ لوگ پیٹھ پھیر کر چلے گئے اور آپ نے اُن کے بتوں کو توڑ ڈالا۔'' (تفسیر معالم التنزیل: ج ۴' ص ۳۴' دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۲۰ھ)

اِنّیِ سَقِیْم" (میں بیمار ہوں) کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ تمہارے کفر و شرک اور بے راہروی سے میرا دل پژمردہ اور بیمار ہے۔'' (تبیان القرآن۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' ج ۹' ص ۹۰۱)

امام محمد بن اسماعیل بخاری (م ۲۵۶ھ) وَلَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْیا بِمَصَابِیْحَ (سورۃ المُلک کی آیت ۵) [ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں (ستاروں) سے مزیّن فرما دیا ہے] کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان ستاروں کو تین کاموں کے لئے پیدا فرمایا ہے: ان ستاروں کو آسمان کی زینت بنایا' اُنہیں شیاطین پر رجم کرنے کے لئے بنایا اور انہیں راستوں کی ہدایت کی علامات بنایا (سورۃ النحل: ۱۶) اور جس نے اِن ستاروں کا کوئی اور مقصد قرار دیا' تو اُس نے خطا کی اور اپنا حصّہ ضائع کیا اور جس چیز کا علم نہ تھا' اُس میں تکلف کیا۔ رزین نے یہ اضافہ کیا ہے کہ انبیاء اور فرشتے اس علم سے کوتاہ اور عاجز نہ تھے۔'' (کتاب: بَدْءُ الخَلْق' باب: ۳' مشکوٰۃ رقم الحدیث: ۴۶۰۲)

''مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کو معلوم کرنے کی غرض سے نبیِ مکرّم ﷺ نے علمِ نجوم کا سہارا لینے سے منع فرمایا ہے۔ یہ ممانعت اِس بُرائی کے سدِّ باب کے لئے ہے کہ لوگ کہیں لغویات اور خُرافات میں پھنس کے نہ رہ جائیں۔ سُنن ابی داؤد اور ابنِ ماجہ کی ایک حدیث اِس ممانعت کو تقویّت دیتی ہے جس میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جو شخص علم نجوم میں سے کچھ حاصل کرتا ہے وہ علمِ سحر (جادو کا علم) حاصل کرتا ہے۔

''لیکن اوقاتِ نماز کو معلوم کرنے اور قبلہ کی سمت معلوم کرنے کی غرض سے علمِ نجوم حاصل کرنے کی ممانعت نہیں اور یہ معلوم کرنا کہ دن اور رات کا کتنا حصّہ گزر چکا ہے اور کتنا باقی ہے' یہ معلوم کرنا کہ اگلا شمسی مہینہ کب شروع ہونا ہے اور سورج گرہن اور چاند گرہن کے اوقات معلوم کرنے کے لئے بھی علم نجوم حاصل کرنے میں کوئی ممانعت نہیں ہے اور ایسی صورتوں میں علمِ نجوم کا حصول فرضِ کفایہ کے زمرے میں آتا ہے۔''

''علماء کی اکثریت نے علمِ نجوم کے حصول کو چند وجوہ سے حرام قرار دیا ہے: (۱) یہ علم لغویات اور خرافات کو عام کرتا ہے۔ (۲) جہلاء' توہم پرست' خودسر اور بے لگام لوگ ہی علمِ نجوم پر یقین رکھتے ہیں۔ (۳) اجرام فلکی' ستاروں اور سیاروں کو اللہ کی مرضی کے بغیر انسانوں کی تقدیر پر اثرانداز ہونے کا اعتقاد کفر باللہ ہے۔ اگر اللہ پر ایمان پختہ اور غیر متزلزل ہے تو علم نجوم کے سیکھنے کی اجازت ہے بالخصوص اس پختہ یقین کے ساتھ کہ تمام اجرام فلکی اور سیارگان دوسری مخلوقات کی طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کے طور پر اور لوگوں کے راستوں کی راہبری کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور یہ کہ انسانی تقدیروں کے اچھا یا برا ہونے میں اُن کا کوئی دخل نہیں ہے۔''

''صاحب ہدایہ نے مختاراتِ نوازل میں لکھا ہے کہ علمِ نجوم فی نفسہ اچھا علم ہے' مذموم نہیں ہے۔ ایک علم حسابی ہے اور یہ برحق ہے۔ سورۃ الرَّحمٰن:۵ میں ہے: اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (سورج اور چاند مقرر حساب سے گردش کر رہے ہیں) یعنی اُن کی رفتار اور اُن کا گردش کرنا حساب سے ہے اور اس کی دوسری قسم استدلال ہے یعنی وہ ستاروں کی رفتار اور افلاک کی حرکت سے اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر استدلال کرتے ہیں اور یہ جائز ہے جیسے طبیب نبض کی رفتار سے صحت اور مرض پر استدلال کرتا ہے اور اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر پر استدلال نہ کرے بلکہ خود غیب جاننے کا دعویٰ کرے تو اُسے کافر قرار دیا جائے گا۔''

''<u>فرعون اور کاہن (Soothsayers)</u>: جہاں تک ابنِ اسحاق کی بیان کردہ اِس روایت کا تعلق ہے کہ فرعون اس پیش گوئی پر بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کرا دیا کرتا تھا کہ اُن کے ہاں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جو اُسے اور اُس کی بادشاہت کو تباہ و برباد کر دے گا' تو جیسا کہ اہلِ کتاب کے مستند علماء اور مفسرین کے اقوال سے ثابت ہے' یہ بات فرعون کو کاہنوں سے معلوم ہوئی تھی۔''

''ایک چیز جس کا ذکر میں مستند اور نامور علماء کے حوالے سے کرنا چاہوں گا' وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بے کار' بے فائدہ اور حکمتِ کاملہ سے خالی پیدا نہیں فرمائی۔ اُس نے تمام چیزیں خواہ وہ اعلیٰ درجے کی ہیں یا کمتر درجے کی' سب کو اپنی ناقابلِ پیمائش اور وسیع دانش کے تحت پیدا فرمایا کہ جن سے انسانوں کو حد و شمار سے باہر فوائد حاصل ہوں اور اُس نے ہر مخلوق کو مخصوص قسم کے خصائل عطا فرمائے جو دوسری مخلوقات میں نہیں پائے جاتے صرف اس لئے کہ اُس کا وجودِ مسعود' اُس کی وحدانیت' اُس کا علم اور اُس کی قدرتِ مطلقہ ثابت ہو جائے۔''

''لہٰذا اجرامِ فلکی میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی ایک مخصوص خاصیت عطا کی گئی ہے جن میں سے ہر ایک اللہ کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ستاروں کی پوزیشن' اُن کی تخصیصات اور اُن کے اثرات بالکل اسی طرح ہیں جس طرح سبزیوں' نباتات' معدنیات اور حیوانوں کے اثرات ہیں۔ مجھے آخری بات جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اِن اجسامِ سماوی کو ایسے اثرات بخشے ہیں جیسے اُس نے زمینی پھولوں وغیرہ کو عطا کئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر اُن کا کوئی اثر نہیں ہوتا جیسا کہ علت و معلول کے ضمن میں ہمارے پیشرو بیان کر گئے ہیں۔'' (روح المعانی -علامہ سید محمود آلوسی' ص ص ۱۰۱ تا ۱۲۳)

<u>تعریض اور توریہ کی تعریفات اور اُن کے ثبوت میں احادیث</u>: تعریض کا معنیٰ ہے صراحۃً فعل کا اسناد جس کی طرف ہو' وہ مراد نہ ہو بلکہ کسی قرینہ کی بناء پر کسی اور کا ارادہ کیا جائے جیسے کوئی عورت اپنی بہو کے

بارے میں کہے کہ میری بیٹی سالن خراب پکاتی ہے اور بیٹی سے مراد اُس کی بہو ہو۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑنے کی نسبت بڑے بُت کی طرف کی تھی (سورۃ الانبیاء: ۶۳) لیکن مراد خود اُن کی اپنی ذات تھی۔''

''توریہ یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنیٰ ہوں: قریب اور بعید۔ متکلم بعید معنیٰ کا ارادہ کرے اور مخاطب کے ذہن میں قریب معنیٰ کو القاء کرے جیسے راحت اور آرام کا قریب معنیٰ بیماری سے شِفایاب ہونا ہے جس کا القاء درجِ ذیل واقعہ میں حضرت اُمِّ سلیم نے حضرت ابوطلحہ کے ذہن میں کیا تھا۔ اس کا بعید معنیٰ موت ہے جس کا اُمِّ سلیم نے ارادہ کیا تھا۔ اسی طرح سَقِیم کا بعید معنیٰ قوم کا بیمار ہونا ہے جس کا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارادہ کیا تھا اور اس کا قریب معنیٰ خود بیمار ہونا ہے جو اُن کی قوم نے سمجھا تھا۔''

''حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بے شک تعریض میں جھوٹ سے بچنے کی گنجائش ہے۔'' (السنن الکبریٰ لاحمد بن حسین البیہقی: ج ۱۰، ص ۱۹۹؛ الکامل لابن عدی، ج ۳، ص ۵۶۷)

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ کا بیٹا بیماری میں فوت ہو گیا۔ حضرت ابوطلحہ گھر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی بیوی نے فوت شدہ بچے کو گھر کی ایک جانب لِٹا دیا۔ جب حضرت ابوطلحہ گھر آئے اور بچے کے متعلق پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ اُسے آرام ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ راحت میں ہے اور حضرت ابوطلحہ نے انہیں سچی گمان کیا۔'' (صحیح البخاری: ۱۳۰۱؛ صحیح مسلم: ۲۱۴۴)

''حضرت اُمِّ سلیم نے اپنے بچے کی موت کو دائمی سکون سے تعبیر کیا جو اُس کا بعید معنیٰ ہے۔ جبکہ اُنہوں نے قریب معنیٰ (یعنی بیماری سے شِفایاب ہونا) کا القاء اپنے خاوند کے ذہن میں کیا تھا۔''

<u>ضرورت اور مصلحت کے تحت جھوٹ بولنے کے متعلق فقہائے اسلام کی آراء</u>: علامہ محمد بن علی بن محمد الحصکفی الحنفی (م ۱۰۸۸ھ) لکھتے ہیں کہ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے اور اپنی ذات سے ظلم کو دور کرنے کے لئے جھوٹ بولنا مباح ہے اور اس سے مراد تعریض ہے کیونکہ بعینہٖ جھوٹ بولنا حرام ہے۔'' (الدُّرُّ المختار علی ھامش ردُّ المختار: ج ۹، ص ۵۳۵، داراحیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۹ھ)

''علامہ سید محمد امین بن عمر بن عبدالعزیز ابن عابدین الدمشقی الحنفی (م ۱۲۵۲ھ) لکھتے ہیں:

''جھوٹ بولنا کبھی مباح اور کبھی واجب ہوتا ہے۔ احیاء علوم الدین میں اس کا یہ ضابطہ مذکور ہے کہ ہر

وہ نیک مقصود جسے صدق اور کذب دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہو‘ ان کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر اُس نیک مقصود کو صرف جھوٹ بول کر حاصل کیا جا سکتا ہو تو اُس کے حصول کے لئے جھوٹ بولنا مباح ہے۔ اگر اُس نیک مقصود کا حصول واجب ہو تو اُس کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہے۔ مثلاً کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو دیکھے جو ایسے ظالم سے چھپا ہوا ہے جو اُسے قتل کرنا یا ایذاء پہنچانا چاہتا ہے تو اُس کے بچانے کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کی امانت چھیننا چاہے تو اُسے چھپانے کے لئے بھی جھوٹ بولنا واجب ہے۔ اگر دو شخصوں میں صلح کرانے کا مقصود یا کسی تکلیف زدہ شخص کو آرام پہنچانے کا مقصود بھی جھوٹ بولنے کے سوا حاصل نہ ہو تو اُس کے حصول کے لئے بھی جھوٹ بولنا مباح ہے۔‘‘ (احیاء علوم الدین: ج ۳‘ ص ۱۲۳‘ ۱۲۴)

’’عادتاً جو مبالغہ کیا جاتا ہے‘ وہ جھوٹ نہیں ہے جیسے کہا جائے کہ میں تمہارے پاس ہزار مرتبہ آیا ہوں کیونکہ اس کلام سے مبالغہ کو بیان کرنا مقصود ہے نہ کہ عدد کو۔ اور مبالغہ کے جواز پر یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے فرمایا: رہے ابو جہم تو وہ تو اپنے کندھے سے لاٹھی اتارتا ہی نہیں (یعنی بہت مارتا ہے) [صحیح مسلم: ۱۴۸۰]

’’علامہ ابن حجر مکی نے کہا ہے کہ اشعار میں جو جھوٹ ہوتا ہے‘ جب اُسے مبالغہ پر محمول کیا جا سکے تو اُسے بھی حرام قرار دینے سے مستثنیٰ کرنا چاہئے‘ جیسے ایک شعر میں ہے کہ میں دن رات تمہارے لئے دعا کرتا ہوں اور میں کسی مجلس کو تمہارے شکر سے خالی نہیں رکھتا۔‘‘

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تین مقامات کے سوا ہر جگہ لامحالہ جھوٹ لکھا جاتا ہے: میاں بیوی کے درمیان صلح صفائی کی غرض سے جھوٹ بولنا‘ دو آدمیوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے جھوٹ بولنا اور جنگ میں دشمن کو دھوکا دینے کے لئے جنگی چال چلنے میں کوئی جھوٹ کی بات نہیں ہے۔‘‘ (صحیح البخاری: ۲۶۹۲‘ ۳۰۳۰؛ صحیح مسلم: ۱۷۳۹‘ ۲۶۰۵؛ سنن ابی داؤد: ۴۹۲۱؛ سنن الترمذی: ۱۹۳۸)

’’امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں فرمایا کہ مذاق میں دوسرے کا دل خوش کرنے کے لئے تعریض کے ساتھ کلام کرنا جائز ہے‘ جیسے ایک بڑھیا نبی اکرم ﷺ کے پاس آئی اور کہنے لگی: یا رسول اللہ! دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دے‘ تو آپ نے فرمایا: اے اُمِّ فلاں! بے شک جنت میں کوئی بڑھیا جنت میں نہیں جائے گی۔ وہ عورت پیٹھ پھیر کر روتے ہوئے جانے لگی تو آپ نے فرمایا: اُسے بتاؤ کہ کوئی بڑھیا بڑھاپے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرما دیا ہے: إِنَّا أَنشَأْنٰهُنَّ إِنشَاءً o فَجَعَلْنٰهُنَّ

أَبْكَارًاo عُرُبًا أَتْرَابًا (سورۃ الواقعۃ:۳۵ تا۳۷) [یعنی بے شک ہم نے اُن عورتوں کو خاص طرز سے پیدا کیا ہے سو ہم نے اُنہیں کنواری بنایا' اپنے شوہروں سے محبت کرنے والیاں اور آپس میں ہم عمر] (شمائل ترمذی: ۲۴۰ ؛ مصنف عبدالرزاق:۱۹۶۸۸؛ مسند احمد' ج ۳' ص ۱۶۱؛ مسند ابویعلیٰ: ۳۴۵۶؛ صحیح ابن حبان:۲۲۷۶)

''حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ! مجھے کسی سواری پر سوار کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم تمہیں اونٹنی کے بچے پر سوار کریں گے۔ اُس نے کہا کہ میں اونٹنی کے بچے کا کیا کروں گا! آپ نے فرمایا کہ ہر اونٹ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔''
(سنن ابی داوٗد: ۴۹۹۸ ؛ سنن الترمذی :۱۹۹۱ ؛ مسند احمد' ج ۳' ص ۲۶۷ ؛ شرح السنۃ: ۳۶۰۵)

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کلام (بَلْ فَعَلَه' كَبِيْرُهُمْ هذا اور اِنِّيْ سَقِيْم اور اور اپنی بیوی کو بہن کہہ دینا جو بظاہر جھوٹ ہے (اور مراد اس سے دینی بہن لینا) ' دراصل تعریض اور توریہ پر مشتمل ہے جبکہ حقیقۃً جھوٹ بولنا حرام ہے۔

(۱۲) علمِ ہیئت (ASTRONOMY)

''علم کی وہ شاخ جو اجرامِ فلکی سے تعلق رکھتی ہے جیسے سورج' چاند' سیارے اور نظامِ شمسی کے دیگر ارکان: ستارے اور کہکشائیں' علم ہیئت کہلاتا ہے۔ علمِ ہیئت اِن اجرام کی نقل و حرکت اور پوزیشن کا جائزہ لیتا ہے اور اُن کی حرکات کی وضاحت کرتا ہے اور یہ دیکھتا ہے کہ اُن کی جسامت اور حجم کیا ہے' اُن کے درمیان فاصلہ کتنا ہے' اُن کے طبعی حالات کیا ہیں اور وہاں کا درجہ حرارت کیا ہے۔'' (Hutchinson 20th Century Encyclopedia, p. 776) Great Britain, 1986.

منطقۃ البروج (Zodiac Signs) کا ذکر قرآنِ حکیم میں بہ صراحت موجود ہے :۔

(۱) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَo
''اور بالیقین ہم نے آسمان میں بُرج بنائے اور ہم نے اُنہیں دیکھنے والوں کے لئے مزیّن کر دیا۔''

(۲) تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًاo (الفرقان: ۶۱)
''بہت عالیشان ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنا دیا۔''

حسن، مجاہد اور قتادہ نے کہا کہ بُروج سے مراد بڑے بڑے ستارے ہیں۔ اُنہیں بروج اس لئے فرمایا کہ یہ بہت ظاہر ہیں اور بُرج کا معنیٰ ظہور ہے۔

عطیہ العوفی نے کہا کہ برج کا معنیٰ قلعہ اور محل ہے جس میں پہرے دار ہوں جیسا کہ سورۃ النساء: ۷۸ میں ہے: وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (اگر چہ تم مضبوط قلعوں میں ہو)

عطاء نے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ اس سے مراد وہ بارہ برج ہیں جو سات کواکب سیارہ کی منازل ہیں۔ وہ بارہ برج یہ ہیں: الحمل (بھیڑ کا بچہ)، الثّور (بیل)، الجوزا (وہ سیاہ بکری جس کے وسط میں سفیدی ہو)، السرطان (کیکڑا)، الاسد (شیر)، السُّنبلہ (گندم کا خوشہ)، المیزان (ترازو)، العقرب (بچھو)، القوس (کمان)، الجدی (بکری کا بچہ)، الدلو (ڈول)، الحوت (مچھلی)

''الحمل اور العقرب مریخ کی منزل ہے، الثور اور المیزان زھرہ کی منزل ہے، الجوزا اور السُّنبلہ عطارد کی منزل ہے، السرطان قمر کی منزل ہے، الاسد شمس کی منزل ہے، القوس اور الحوت مشتری کی منزل ہے، الجدی اور الدلو زُحل کی منزل ہے۔'' (معالم التنزیل للبغوی، ج ۴، ص ۴۵۴، مطبوعہ بیروت ۱۴۲۰ھ)

''اگر ثوابت ستاروں کے اجتماع سے مینڈھے کی شکل بن جائے تو اُسے برج حمل کہتے ہیں اور اگر ثوابت ستاروں کے اجتماع سے شیر کی شکل بن جائے تو اُسے برجِ اسد کہتے ہیں اور اگر ان ستاروں کے اجتماع سے ترازو کی شکل بن جائے تو اُسے برج المیزان کہتے ہیں علیٰ ہٰذا القیاس (قائد اللغات ص ۱۷۹ مطبوعہ لاہور)

علمِ ہیئت دراصل تسخیرِ خلاء میں انسان کا معاون رہا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ قرآنِ حکیم اس علم کی بابت کیا کہتا ہے۔

افلاک : مندرجہ ذیل آیات اس اعتقاد کی تردید کرتی ہیں کہ افلاک کے محراب کو ستونوں نے سہارا دے رکھا ہے ورنہ زمین اس کے نیچے آ کر کچلی جاتی:

(i) اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (اَلرَّعد : ۲)

''اللہ تو وہ ذات ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلند فرمایا (جیسا کہ) تم اُنہیں دیکھ رہے ہو۔''

(ii) وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (الحجّ : ۶۵)

''اور وہی آسمان کو زمین پر گر پڑنے سے روکے ہوئے ہے مگر ہاں کہ اُسی کا حکم ہو جائے۔''

(iii) خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (لقمٰن : ۱۰)
''اُسی نے آسمانوں کو بلاستون بنایا ہے تم اُنہیں دیکھ رہے ہو۔''

فقرہ کے یہ معنیٰ بھی ہو سکتے ہیں: ''بغیر ایسے ستونوں کے جنہیں تم دیکھ سکو' بنایا''۔ اِس صورت میں تَرَوْنَهَا کا تعلق اَلسَّمٰوٰت سے نہیں بلکہ عَمَدٍ سے ہوگا۔ مفسرین نے یہ ترکیب بھی جائز رکھی ہے (دریابادی)

ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ مادّے ایک دوسرے سے جتنے دُور ہوں' تو کشش کی طاقت اُتنی ہی کمزور پڑ جاتی ہے اور جتنا وہ ایک دوسرے کے قریب ہوں' اُتنی ہی ایک دوسرے سے کشش زیادہ اور قوی ہوتی ہے۔ یہ بات چاند کے بارے میں درست اور صحیح ہے جو زمین سے قریب تر ہے اور کشش کے اصولوں کے مطابق اُس کا اثر سمندر کی لہروں پر ہوتا ہے اور اسی سے مدّ و جزر بنتے ہیں۔ اگر دو اَجرام فلکی ایک دوسرے کے بہت قریب آ جائیں تو لازمی طور پر ٹکراؤ ہوگا (حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا)۔ اِس حقیقت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے نظام کے تابع ہیں جس میں گڑ بڑ کا نہ ہونا شرطِ لازم ہے۔ قرآنِ حکیم میں اس بات کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے کہ آسمان نظام الٰہی کے تابع ہیں اور یہ کہ روشنی کے دو عظیم ذرائع (سورج اور چاند) انسان کی خدمت گزاری کے لئے ہیں' اس لئے نہیں کہ اُن کی پرستش کی جائے یا کسی طرح اُن کی خدمت کی جائے۔ چنانچہ کئی مقامات پر اس حقیقت کو بیان فرمایا گیا۔ مثلاً:

(i) وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا (الانعام : ۹۶)
''اور اُسی نے رات کو راحت کی چیز بنایا اور سورج اور چاند کو حساب سے رکھا ہے۔''

یعنی رات کی سکونی کیفیت' سورج اور چاند کی نپی تُلی گردش' اُس کی شرح رفتار اور مقدار یہ سب اُسی قادرِ مطلق و حکیمِ برحق کے دستِ قدرت میں ہیں جو ہر شعبہ موجودات کا اکیلا حاکم و ناظم ہے۔ اُس کے حضور میں کسی سورج دیوتا اور کسی چندرماں اور کسی رات کی دیوی کا وجود فرض کرنا خرافات کی انتہاء ہے۔ حُسْبَانًا کے لفظ میں بتا دیا کہ اُس کا قائم کردہ نظام مخلوقات کے مفاد کے بالکل متناسب اور ایسے حساب کے مطابق ہے جس میں نہ کمی کا احتمال ہے اور نہ زیادتی کا۔

اللہ تعالیٰ نے دن کام کاج کے لئے اور رات آرام کے لئے بنائی ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ سنتِ نبوی کے مطابق دوپہر کو تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ کر لیا کرے (کہ شیطان کبھی قیلولہ نہیں کرتا) اور رات میں کچھ کام کرے تو عارضی طور پر۔ رات کو جلد سو جائے اور صبح کو جلد اُٹھ کھڑا ہو۔ جو لوگ بلا وجہ رات کو جاگتے ہیں اور دن کو سوتے ہیں وہ قدرتی نظام کے خلاف کرتے ہیں' اس لئے دن بھر اُن کے دل و دماغ اور پورے بدن پر سستی' مُردنی اور یبوست چھائی رہتی ہے۔

پہلو ہر کام میں حُسن و جمال اور زیبائش کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔
اب ہم مختلف شعبہ ہائے حیات میں جمالیاتی فکر کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیتے ہیں:۔

فنِ تعمیر: جمالیاتی فکر کو عمارت سازی' عمارتی ڈھانچے اور اس سے متعلق جزئیات پر لاگو کرنا خاصا پیچیدہ مسئلہ ہے کیونکہ جگہ کے ڈیزائن کے خارجی عوامل (مثلاً عمارتی سالمیت' لاگت' عمارتی مواد کی نوعیت اور عمارت کی عملی افادیت) ڈیزائن کے عمل پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ لاہور میں شاہی مسجد و شاہی قلعہ اور ملتان میں مقبرہ شاہ رکنِ عالم رحمۃ اللہ علیہ فنِ تعمیر کے جمالیاتی پہلو کا بہترین نمونہ ہیں۔

فلم: فلم کے فن میں بے شمار قسم کی تکنیک استعمال کی جاتی ہیں جیسے روشنی' متحرک تصویریں' قصہ گوئی اور اداکاری وغیرہ۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں ہیں جو ناظرین کے جمالیاتی احساسات کو محور رکھتی ہیں جیسے ایکشن کی تصویر' کردار اور سیٹنگ وغیرہ۔ (غیر شرعی فلمیں ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔)

فنِ طباخی (کھانا پکانے اور انتخاب کرنے کا عمل): خوراک' حیات کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے جس سے ہر شخص واقف ہے۔ کھانے میں جمالیاتی پہلو کا لحاظ رکھنے سے کھانے کی چیزوں کا لطف اور مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ باورچی ہمارے لذّتِ طعام و ذہن کو بصری احساسات سے ابھارتے ہیں جیسے رنگوں کا صحیح استعمال' باورچی خانے کی اشیاء کی صحیح ترتیب' کھانے والوں کی قوّتِ شامہ کے لحاظ سے کھانے کی مہک اور خوش بُو کا خیال (مناسب مصالحہ جات کے استعمال سے) اور سجاوٹ ایسی ہو کہ کھانے والوں کو اپنی طرف مبذول کر لے۔

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے تمام پہلوؤں کے استعمال سے انسان نے کمپیوٹر میں بہت ترقی کی ہے

ادب: ہمارے جمالیاتی ذوق کو متاثر کرنے اور اُسے جلا بخشنے کے لئے ادیب حضرات شاعری' افسانوں اور نثر میں مختلف قسم کی تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ تحریر کی مناسبت سے ایک ادیب موسیقی' تلمیحات' تصوّرات' خیالات' تجنّس' تجزیہ' مزاح' زندگی سے بیزاری اور بلند سوچ کو استعمال کرتا ہے جو

چاند کے (قمری) مہینے محرم، صفر وغیرہ اور سورج کے (شمسی) مہینے جنوری، فروری دونوں برحق ہیں اور دونوں ہی کارآمد ہیں۔ قمری مہینوں سے بہت سی اسلامی عبادات وغیرہ قائم ہیں جیسے رمضان کے روزے، حج، عیدین، زکوٰۃ کا سال (حولانِ حول)، عورتوں کی عدت وغیرہ۔ شمسی مہینوں سے موسموں وغیرہ کا حساب لگتا ہے۔

(ii) وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ o (ابراہیم: ۳۳)
''اور تمہارے نفع کے لئے اُس نے سورج اور چاند کو (اپنی قدرت کے) تابع کر دیا جو دوام رکھنے والے ہیں اور تمہارے نفع کے لئے اُس نے دن اور رات کو (اپنی قدرت کے) تابع کر دیا۔''

دَآئِبَيْنِ یعنی اپنی عادتِ جاریہ پر ثبات و دوام (ہمیشگی) رکھنے والے، اپنی روشنی، اپنی گرمی، اپنی شرحِ رفتار اور اپنی دوسری طبعی خصوصیات سے ہمیشہ فائدہ پہنچاتے رہنے والے۔

نـــوٹ: (i) یہاں فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے چاند، سورج، رات اور دن کو مسخر کیا حالانکہ مسخر تو وہ ہوتا ہے جو مطیع و فرماں بردار ہو جیسے گھوڑا، ریل گاڑی، موٹر، کشتی، جہاز وغیرہ کہ جب چاہو چلا لو اور جب چاہو روک لو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چاند، سورج، دن اور رات کے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے چل یا رُک نہیں سکتے۔ ہمارے لئے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کے سب فائدے اور منفعتیں ہمارے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے لئے مسخر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ روک بھی سکتا ہے، اُلٹا چکر بھی چلا سکتا ہے اور ان تمام کی باگ ڈور اپنے انبیاء و رُسُل کے ہاتھوں میں بھی دے سکتا ہے (حوالہ: معجزہ شق القمر، سورج کا پلٹانا) (ii) رات کا ذکر پہلے اور دن کا ذکر بعد میں تین وجوہ سے کیا گیا: (۱) رات رب کے لئے اور دن بندوں کے لئے ہے۔ (۲) رات معراجِ عشق و معرفت کے لئے اور دن مخلوقات میں مشغولیت کے لئے ہے۔ (۳) رات سترِ ذات کے لئے اور دن ظہورِ صفات کے لئے ہے۔

(iii) وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَات" بِأَمْرِهٖ (اَلنَّحل:۱۲)
''اور اُسی نے تمہارے فائدے کے لئے (اپنا) مسخر کیا ہے رات اور دن کو، سورج اور چاند کو اور ستارے بھی اُسی کے حکم سے مسخر (قدرت) ہیں۔''

صاف بتایا جا رہا ہے کہ تمام مخلوقات جو اپنے فرائضِ تکوینی انجام دے رہی ہیں، اُن سے مقصود خلیفۃ اللہ یعنی نوعِ بشری کی خدمت ہے تو یہ کیسی اُلٹی سمجھ اور کس درجہ حماقت و سخافت ہے کہ خود اُنہی خادموں کو دیوی، دیوتا

کے مرتبہ تک پہنچا دیا۔ مُسَخَّرَات" بِأَمْرِہ میں بتایا کہ سارے اجرامِ فلکی باایں عظمت و بے نہایتی اللہ کے قوانینِ طبعی ہی کے پابند ہیں اور اُن سے بال بھر اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے۔

(iv) وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (الجاثیة : ١٣)
"اور اُسی نے مسخر بنایا جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے۔"

اِس آیت نے صاف بتا دیا کہ سورج، چاند، ستارے، ہوا، خشکی، تری کی جتنی بھی قوتیں ہیں، انسان ان سب کو اپنے کائناتی تصرّف میں لائے گا اور جوں جوں قوانینِ فطرت کا وہ زیادہ رازدار ہوتا جائے گا، منشائے فطرت اور زیادہ پورا ہوتا جائے گا۔ مِنْهُ کے لفظ نے اسے بھی صاف کر دیا کہ تسخیرِ فطرت کی یہ ساری نعمت تمام تر اللہ ہی کی دی ہوئی ہے، کوئی دیوی دیوتا اُس میں شریک نہیں ہے۔

نوٹ: آسمانوں کا ذکر پہلے اور زمین کا ذکر بعد میں ہونے کی دو وجوہ ہیں: (۱) آسمان فیض دینے والا اور زمین فیض لینے والی ہے۔ (۲) آسمانوں کو پہلے پیدا کیا گیا اور زمین کو بعد میں۔ (تفسیر نعیمی، ج ۱۳، ص ۵۵۲)

کئی مقامات پر قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ آسمان میں کوئی خامی، دراڑ یا سوراخ نہیں ہے:۔
(i) أَفَلَمْ يَنْظُرُوْا إِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ٥ (ق : ٦)
"کیا اُنہوں نے اپنے اوپر آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کیسا بنایا اور ہم نے اُسے آراستہ کیا کہ اُس میں کوئی رخنہ (تک) نہیں۔"

آسمان کی طرف تو مشرکین دن اور رات میں کئی بار دیکھتے تھے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ وہ غور و فکر اور تدبّر سے آسمان کی طرف دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ جب اس عظیم آسمان کو بنانے پر قادر ہے جو ہر طرح مکمل ہے اور جس کی آراستگی اور زیبائی سورج، چاند، ستاروں اور سیّاروں سے کی گئی ہے، بلکہ اس ساری کائنات کو بنانے پر قادر ہے تو انسان کے مرنے کے بعد اُسے دوبارہ کیوں نہیں بنا سکتا!!

(ii) اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ٥ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ هُوَ حَسِيْرٌ" ٥ (المُلك : ۳، ۴)

''وہ وہی تو ہے جس نے سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کر دئے' تو (خدائے) رحمان کی صنعت میں کوئی نقص نہ دیکھے گا' سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھے کوئی خلل نظر آتا ہے؟ پھر بار بار نگاہ لوٹا کر دیکھ' نگاہ ہی (آخر) تھکی درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔''

طِبَاقًا کا معنیٰ ہے ایک دوسرے کے اوپر تہ بہ تہ۔ اور تہ بہ تہ کا مطلب ہے کہ ساتوں آسمان بے ہنگم اور بکھری ہوئی صورت میں نہیں بلکہ ایسی عمدگی سے اُنہیں ترتیب دی گئی ہے کہ ایک دوسرے کے اوپر منطبق نظر آتے ہیں۔ ''نگاہ لوٹانا'' کا مطلب یہ نہیں کہ ایک مرتبہ' دو مرتبہ' تین مرتبہ یا چار مرتبہ نگاہ ڈالی جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہر دَور اور تمام زمانوں میں تا قیامت دیکھا جائے۔ لہٰذا کَرَّتَیْن کا صیغہ تثنیہ محض اظہارِ تعدّد کے لئے ہے' دو کا متعین عدد مراد نہیں (تفسیر بیضاوی)

آیت میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنے کا حکم دیا ہے کیونکہ جب انسان کسی چیز کی طرف صرف ایک بار دیکھے تو اُس کے نزدیک اُس کے عیوب اور قبائح ظاہر نہیں ہوتے حتّٰی کہ جب وہ کسی چیز کی طرف بار بار گہری نظر سے دیکھتا ہے تو اُس کی پوری حقیقت کھل کر اُس کے سامنے آ جاتی ہے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ محققین نے کہا کہ یہ پہلی نظر عوام کی ہے جو صرف وجود اور حُسنِ ظاہر دیکھ کر کمالِ صانع کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ اہلِ نظر نے کہا کہ یہ دوسری نظر اہلِ نظر و اہلِ حکمت کی ہے جو ہر ہر مخلوق کے مصالح کو دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ موجودہ نظامِ تکوینی سے بہتر ہونا محال تھا اور اس پر حرف گیری کی مجال نہیں۔ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ عارفین نے کہا کہ یہ تیسری نظر خواصِ اہلِ حق کی ہے جو اپنی نظر سے خود نادم ہو کر اپنے عجز و جہل کے معترف ہو جاتے ہیں۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ امر فَارْجِعِ تکلیفی و تشریعی نہیں' تعجیزی (عاجز کر دینے والا) ہے یعنی تم دیکھ لو اور تجربہ کر لو' آخر خود ہی تھک جاؤ گے۔

سورۃُ الفرقان میں قرآنِ حکیم نے واضح طور پر اِس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ سورج آسمان کا عظیم الشان چراغ ہے جبکہ سورہ نوح میں ہم آسمانوں کی تخلیق میں ہم آہنگی کا اظہار دیکھتے ہیں:۔

(i) تَبَارَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرَاجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًاo (الفرقان: ٦١)

''بہت ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اُس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنایا۔''

فِیْهَا سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ اجرامِ فلکی فلک کے اندر ہی ہوں۔

سورج کو عربی میں شمس کہتے ہیں۔ اسے سِراج بھی کہا جاتا ہے بمعنی مشعل (Torch) ۔سورۃ النّبا میں اسے وَھاج (جلتاہوا چراغ) کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ تمام الفاظ سورج کے لئے مناسب ہیں کیونکہ سورج اِحتراق (جلانے) کے عمل کی بدولت روشنی اور حرارت مہیا کرتا ہے۔ جبکہ عربی میں چاند کو قمر کہتے ہیں اور اسے قرآن کریم میں مُنیر کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے یعنی وہ جو منعکس شدہ روشنی دیتا ہو۔ یہاں پھر قرآنی وضاحت چاند کی اصل ماہیت سے میل کھاتی ہے جو کہ خود روشنی نہیں دیتا بلکہ محض سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ قرآن کریم میں کسی بھی جگہ چاند کے لئے سراج یا وھّاج کے الفاظ استعال نہیں کئے گئے اور نہ ہی سورج کے لئے نور یا منیر کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم سورج اور چاند کی روشنیوں کی نوعیت میں فرق رکھتا ہے اور اس فرق پر قرآن مجید اور جدید سائنس مکمل طور پر متفق ہیں۔

(ii) اَلَمْ تَرَوْا کَیْفَ خَلَقَ اللّٰہُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاo وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْھِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاo (نوح : ۱۵، ۱۶)

’’ کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کئے ہیں اور اُن میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور آفتاب کو چراغ کی طرح روشن بنایا۔‘‘

اِس آیت میں فرمایا گیا کہ آسمان اوپر تلے ہیں اور ایک دوسرے کے اوپر منطبق ہیں جبکہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے (سنن ترمذی: ۳۲۹۸؛ مسند احمد، ج ۲، ص ۳۷۰)

اس کا جواب یہ ہے کہ آسمانوں کے ایک دوسرے پر منطبق ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ایک دوسرے سے مماس ہوں اور پیاز کے چھلکوں کی طرح ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ دو آسمان ایک دوسرے سے منفصل ہونے کے باوجود اوپر تلے اور ایک دوسرے پر منطبق ہو سکتے ہیں۔

(ب) آفتاب اور ماہتاب :

(i) ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ نُوْرًا وَّقَدَّرَہٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ (یونس : ۵)

’’وہ (اللہ) وہی ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا اور چاند کو روشن بنایا اور اُس کے لئے منزلیں مقرر کیں تا کہ تم برسوں کا شمار اور حساب جان لیا کرو۔‘‘

''یہاں ایک امر غور طلب ہے کہ سورج کی روشنی کے لئے ضِیَــاء کا لفظ اور چاند کی روشنی کے لئے نُوْر کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ ضِیَاء اُس روشنی کو کہتے ہیں جو ذاتی ہو اور نُوْر اُس کو کہتے ہیں جو ذاتی نہ ہو بلکہ کسی دوسری چیز سے حاصل ہو۔ کیونکہ سورج کی روشنی ذاتی ہے اس لئے اُس کے لئے ضِیَاء کا لفظ استعمال کیا اور قمر کی روشنی سورج سے حاصل شدہ ہے اس لئے اُس کے لئے نُوْر کا لفظ مستعمل ہوا۔''

''چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور اپنی گردش کے فلک کو ۲۷ دن' ۷ گھنٹوں اور ۴۳ منٹوں میں طے کرتا ہے لیکن اُسے اُس جگہ پر پہنچنے کے لئے جہاں وہ سورج سے نور حاصل کر سکے' مزید ایک دو دن لگتے ہیں۔ اس لئے نیا چاند اُنتیس' تیس دن کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ علمائے فلک نے چاند کے لئے ۲۸ منزلیں مقرر کی ہیں اور ہر منزل کو اُس کے ستارے یا ستاروں کے مجموعہ سے موسوم کیا ہے جہاں وہ ہر رات پہنچ جاتا ہے۔ جب تک چاند اِن منزلوں میں ہوتا ہے وہ آنکھوں سے دکھائی دیتا ہے۔ پھر اگر مہینہ ۲۹ کا ہو تو ایک رات اور اگر ۳۰ کا ہو تو دو رات نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے اور پھر از سرِ نو منزلِ اوّل سے گردش شروع کر دیتا ہے۔''

''آیت کے دوسرے حصّے میں منزلیں متعیّن کرنے کی حکمت بتائی جا رہی ہے کہ تم سالوں کی گنتی کر سکو۔ اپنی کھیتی باڑی' کاروبار کے لئے مہینے اور دن مقرر کر سکو۔ دن رات کا تعیّن سورج کی یومی گردش سے ہوتا ہے اور مہینوں اور سالوں کی پہچان چاند سے ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنے بیشتر احکام کی بنیاد قمری سال پر رکھی ہے کیونکہ اس کا جاننا ہر ایک کے لئے یکساں طور پر آسان ہے۔ ہلال طلوع ہوتا ہے تو سب کو معلوم ہو جاتا ہے کہ نیا مہینہ شروع ہو گیا۔'' (ضیاء القرآن۔۔۔جسٹس کرم شاہ الازہری' ج ۲' ص ص ۲۸۰' ۲۸۱)

(ii) تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًاO (الفرقان: ۶۱)

''بہت ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے اور اُس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنایا۔''

(iii) اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاO وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاO (نوح: ۱۵' ۱۶)

''کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کیے ہیں اور اُن میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور آفتاب کو چراغ کی طرح روشن بنایا۔''

(iv) وَبَنَیْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًاO وَّجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًاO (النّبا: ۱۲' ۱۳)

''اور ہم نے ہی تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور ہم ہی نے ایک روشن چراغ بنا دیا۔''

بَنَیْنَا کا معنیٰ ہے: ''ہم نے بنیاد رکھی'' اور بنیاد مکان کے نیچے ہوتی ہے اور چھت اوپر ہوتی ہے۔ بَنَیْنَا کے لانے میں حکمت یہ ہے کہ بنیاد ٹوٹ پھوٹ سے محفوظ ہوتی ہے جبکہ چھت میں ٹوٹ پھوٹ کا خطرہ ہوتا ہے۔ تو بَنَیْنَا کا لفظ لا کر یہ ظاہر فرمایا ہے کہ یہ چھت بھی بنیاد کی طرح مضبوط ہے اور ٹوٹ پھوٹ کے خطرہ سے محفوظ ہے۔

بعض علماء نے کہا اَلْوَھْج کا معنیٰ ہے مَجْمَعُ النُّورِ والحرارۃ یعنی روشنی اور حرارت کا مجموعہ۔ گویا بیان کا مقصود یہ ہے کہ سورج حد درجہ روشن اور انتہائی درجے کا گرم ہے۔ الخلیل کی کتاب العین میں لکھا ہے کہ اَلْوَھْج آگ اور سورج کی گرمی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ اَلْوَھَّاج حرارت کا مبالغہ ہو یعنی انتہائی گرم اور روشن۔

مندرجہ ذیل آیت میں قرآن مجید وقت کے تعیّن کے لئے چاند کی حرکات کے مشاہدے کی افادیت پر زور دیتا ہے:۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (التّوبة : ۵)

''سو جب حرمت والے مہینے گزر جائیں' تو اُن مشرکوں کو قتل کرو جہاں کہیں تم اُنہیں پاؤ اور اُنہیں پکڑو' باندھو اور ہر گھات کے موقع پر اُن کی تاک میں بیٹھو۔''

حُرمت والے مہینے جن میں جنگ و جدال اور قتل و غارت کی شدید ممانعت ہے' چار ہیں: رجب' ذی قعدہ' ذوالحجہ اور محرّم۔ مشرکین سے مراد عام مشرکین نہیں بلکہ وہی عہد والے مشرکین عرب ہیں جن سے ترکِ جنگ کا معاہدہ ہوا تھا اور جنہوں نے دشمنوں کی مدد کر کے مسلمانوں سے غدّاری کی تھی لیکن یہ قتل اِباحت (جواز) کے لئے ہے کیونکہ ممانعت کے بعد ہے (تفسیرِ نعیمی' جزء ۱۰' ص ۱۶۲)

''سورج گردش کرتا ہے: عرصہ دراز تک یورپی فلاسفر اور سائنس یہ بات تسلیم کرتے رہے کہ زمین کائنات کے مرکز میں واقع ہے اور ساکت ہے اور باقی تمام اجسام بشمول سورج اُس کے گرد گھومتے ہیں۔ مغرب میں زمین کے مرکز ہونے کا نظریہ (Geocentric Theory) دوسری صدی قبل از مسیح' بطلیموس (Ptolemy) کے زمانے سے رائج تھا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ مختلف دریافتوں کے بعد یہ خیال کیا جانے لگا کہ سورج ساکن ہے اور زمین کی طرح اپنے محور پر حرکت نہیں کرتا۔ آیئے دیکھتے ہیں قرآن اس بارے میں کیا فرماتا ہے:۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝ (الانبیاء: ۳۳)

''وہ وہی (اللہ) ہی تو ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا فرمایا۔ (اُن میں سے ہر ایک) اپنے اپنے مدار میں تیرتا پھرتا ہے۔''

''آیتِ مذکورہ میں یَسْبَحُوْنَ کا لفظ سَبَحَ سے لیا گیا ہے جو اپنے اندر کسی متحرک جسم سے اخذ کردہ حرکت کا تصوّر رکھتا ہے۔ اگر اس لفظ کو کسی فلکی جسم (مثلاً سورج) کے لئے استعمال کریں تو اُس کا مطلب محض یہ نہیں ہوگا کہ وہ خلا میں حرکت کر رہا ہے بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ وہ خلا میں حرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے محور پر بھی گردش کر رہا ہے۔۔۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ سورج میں دھبے ہیں جو ۲۵ دنوں میں اپنا چکر مکمل کرتے ہیں یعنی سورج تقریباً ۲۵ دنوں میں اپنے محور کے گرد چکر مکمل کرتا ہے۔ سورج خلا میں ایک اندازے کے مطابق دوسو چالیس کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتا ہے۔''

مندرجہ ذیل آیت ایک اہم حقیقت کو سامنے لاتی ہے جو صرف کچھ عرصہ پہلے جدید فلکیات کے مطالعہ سے سامنے آئی:

لَاالشَّمْسُ یَنۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ و كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ٥ (یٰسٓ : ۴۰)

''نہ تو سورج کی یہ مجال کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ ہی رات دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔''

اور وہ یہ کہ سورج اور چاند کے انفرادی طور پر مخصوص مدار ہیں اور خلا میں اُن کا سفر بھی مخصوص راستے پر گامزن ہے۔ وہ مخصوص جگہ جس کی طرف سورج اپنے نظامِ شمسی سمیت گامزن ہے' جدید فلکیات نے ڈھونڈ نکالی ہے' جسے Solar Apex کا نام دیا گیا ہے۔''

''چاند اپنے محور کے گرد چکر مکمل کرنے میں اتنا وقت لیتا ہے جتنا کہ زمین کے گرد چکر لگانے میں۔ چاند تقریباً ساڑھے اُنتیس دنوں میں ایک چکر مکمل کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص قرآنی آیات کی درست سائنسی توجیہات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا ہمیں اس سوال میں غور نہیں کرنا چاہئے کہ قرآن میں بیان کئے گئے علم کا ماخذ کیا ہے؟'' (قرآن اور جدید سائنس ۔۔۔ ڈاکٹر محمد عبدالکریم ذاکر نائیک' ص ص ۷۷ تا ۸۰)

''سورج ختم ہو جائے گا: سورج کی روشنی اُس کیمیاوی عمل کی وجہ سے ہے جو گزشتہ پانچ اَرب سالوں سے سورج میں مسلسل ہو رہا ہے۔ یہ مستقبل میں کسی وقت اپنے خاتمے کو پہنچے گا اور جب سورج بجھ جائے گا تو زمین پر زندگی کو مٹا ڈالے گا۔ قرآن مجید سورج کے فانی ہونے کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ٥ (یٰسٓ : ۳۸)

''اور سورج اپنے مقررہ راستے پر چلتا رہتا ہے' وہ بہت غالب' بے حد علم والے کا بنایا ہوا انظام ہے۔''

اِس مُسْتَقَر سے مرادظرفِ زمان ہے اوروہ قیامت تک کا وقت ہے یعنی قیامت آنے تک سورج مسلسل چلتا رہے گا اور قیامت آنے کے بعد اُس کی حرکت منقطع ہو جائے گی۔ (تبیان القرآن' ج ۹' ص ۶۳)

<u>بین النجوم مادّہ (Interstellar Matter)</u> : پہلے یہ خیال عام تھا کہ منظم فلکیاتی نظام کے باہر صرف خلا (Vaccum) ہے۔ فلکی طبعیات کے ماہرین نے بعد ازاں اس درمیانی خلا میں ''مادّے کے پُل'' دریافت کئے جو پلازما کہلاتے ہیں اور یہ مکمل (Ionized) گیس پر مشتمل ہیں جن میں الیکٹرانز اور پروٹانز کی تعداد یکساں ہے۔ پلازما کو بعض اوقات مادّے کی چوتھی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے (مادّے کی تین دوسری حالتوں یعنی ٹھوس (Solid)' مائع (Liquid) اور گیس (Gas) کے علاوہ)

قرآن پاک اس آیت میں ستاروں کے درمیان موجود مادّے کی طرف اشارہ کرتا ہے:۔
اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا (اَلفُرقان : ۵۹)
''وہ جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اُسے بھی جو اُن دونوں کے درمیان ہے۔''

''کسی بھی شخص کا یہ خیال ظاہر کرنا نہایت ہی مضحکہ خیز بات ہوگی کہ آج سے چودہ سو سال قبل کسی کو اس بین النجوم فلکیاتی مادّے سے آگاہی حاصل رہی ہوگی۔'' (قرآن اور جدید سائنس۔۔ڈاکٹر محمد ذاکر عبدالکریم نائیک' ص ۸۲)

<u>کہکشاؤں کی تخلیق سے پہلے دھواں</u> : سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ کہکشاؤں (Galaxies) کے وجود میں آنے سے پہلے فلکیاتی مادّہ گیس کی صورت میں تھا یعنی گیس کے مرغولے یا بادل کہکشاؤں کی تشکیل سے پہلے موجود تھے۔ اس فلکیاتی مادّہ کے لئے دھوئیں کا لفظ گیس کی بہ نسبت زیادہ موزوں ہے۔ قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیت کائنات کی اس حالت کی طرف دُخَان (بمعنیٰ دھواں) کے لفظ کے ذریعے اشارہ کرتی ہے:۔
ثُمَّ اسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَان'' فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَo (حٰمٓ السجدۃ : ۱۱)
''پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی جبکہ وہ ایک دُھواں تھا اور اُس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے۔ اُن دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہیں۔''

یہ حقائق Big Bang کے منطقی نتیجے تک پہنچتے ہیں اور آپ ﷺ کی نبوّت سے پہلے کسی کو بھی اُن کا علم نہ تھا۔ سوال یہ ہے کہ اس علم کا ماخذ کیا ہوسکتا ہے؟'' (قرآن اور سائنس۔۔ڈاکٹر ذاکر نائیک' ص ص ۷۲' ۷۳)

''پھر اُس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا ناخوشی سے ۔ اُن دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہیں ۔'' اس سے زمین و آسمان کا آنا جانا یا معروف طریقے سے حاضر ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مالکِ کُنْ فَیَکُوْن نے زمین و آسمان سے فرمایا: تم وجود میں آجاؤ' سو وہ وجود میں آگئے جیسے اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کے متعلق فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔''

زمین و آسمان میں سے پہلے کس کی تخلیق ہوئی؟ مذکورہ بالا آیت ۱۱ سے معلوم ہوا کہ پہلے زمین بنائی گئی اور پھر آسمان بنایا گیا حالانکہ سورۃ النّازعٰت کی آیت ۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آسمان بنایا اور پھر زمین بنائی ۔ ارشادِ باری ہے:

رَفَعَ سَمْکَهَا فَسَوّٰهَا o وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحٰهَا o وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا o (۲۸ تا ۳۰)

''اُس نے آسمان کو بلند کیا پھر اُسے برابر کیا ۔ اُس کی رات کو تاریک کیا اور اُس کے روشن دن کو نکالا ۔ اور اس کے بعد زمین کو ہموار کیا اور اُسے پھیلایا۔''

اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ حٰمٓ السجدہ: ۱۱ میں جو زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کرنے کا ذکر ہے' اُس سے مراد یہ ہے کہ نفسِ زمین اور اُس کے مادّے کو آسمان سے پہلے بنایا اور اَلنّٰزعٰت: ۳۰ میں جو آسمان کے بعد زمین کے بنانے کا ذکر ہے' اُس سے مراد ہے زمین کو پھیلانا اور اُسے ہموار کرنا ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کی بیشتر آیات (مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی۔

تسخیرِ خلا کی پیش گوئی قرآنِ حکیم میں کر دی گئی ہے: سورہ الرّحمٰن میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَن تَنفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ فَانفُذُوا لَا تَنفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطٰنٍ o (الرّحمٰن : ۳۳)

''اے گروہِ جن و اِنس! اگر تمہیں یہ قدرت ہے کہ آسمانوں اور زمین کی حدود سے کہیں باہر نکل جاؤ تو نکل دیکھو (لیکن) بغیر زور کے نکل سکتے ہی نہیں ہو۔''

ظاہر ہے کہ وہ زور از خود تو کسی بھی مخلوق کو میسّر نہیں ۔ جہاں کہیں بھی انسان جائے' اُسی اللہ کی سلطنت ہے اور اُس کی دی ہوئی طاقت کے بغیر تو کوئی کام ہو نہیں سکتا ۔ لہٰذا تسخیرِ خلا بھی اِس آیت کی رُو سے اُسی کی دی ہوئی طاقت سے ہوئی۔

تسخیرِ قمر کی پیش گوئی بھی قرآنِ حکیم نے کر دی ہے: تسخیرِ خلا اور چاند کی مہم جوئی جیسے مباحث کو

زیرِ بحث لانا بعض لوگوں کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اِس بات پر بضد ہونا کہ اسلام ایسے مباحث کے خلاف ہے، پرلے درجے کی جہالت ہے۔ سیّارگان اور اجرامِ فلکی کے بارے میں قرآنِ حکیم کا نظریہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے اور اسے تنقید کا نشانہ نہیں بننا چاہئے۔ خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کے ہم ممنونِ احسان ہیں کہ اُس نے تمام اجرامِ فلکی کو اُن کا جائز مقام دیا ورنہ کئی لوگ تو اُنہیں تقدّس کا درجہ دے کر اُن کی پرستش کرتے رہے۔ اُن لوگوں سے جو اِن مظاہرِ فطرت کے آگے سجدہ ریز ہوئے اور اُنہیں معبود مان کر اُن کی پرستش کرتے قرآنِ حکیم سورہ حٰم السَّجدۃ : ۳۷ میں اِس طرح مخاطب ہوتا ہے:۔

لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ o

"تم لوگ نہ سورج کو پوجو نہ چاند کو بلکہ صرف اللہ ہی کو پوجو جس نے ان سب کو پیدا کیا اگر تم واقعی اُس کے پرستار ہو۔"

جولائی ۱۹۶۹ء میں تسخیرِ قمر کی جو مہم امریکہ کے خلائی ادارے NASA (نیشنل ایروناٹک سپیس ایجنسی) نے شروع کی تھی، وہ اپنے نتیجے پر پہنچی جب تین امریکی خلانوردوں (نیل آرمسٹرانگ، ایڈوِن بزاور کولنز) نے چاند پر قدم رکھا۔ قرآنِ مجید نے اس حیرت انگیز کامیابی کی پیشگوئی صدیوں پہلے کردی تھی۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے خیال میں قرآنِ حکیم کی مندرجہ ذیل آیت تسخیرِ قمر کی پیشگوئی کرتی ہے۔ تاہم اُنہوں نے اس بات کو بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ سورت (الانشقاق) روزِ محشر سے قبل پیش آنے والے واقعات سے متعلق ہے:۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ o وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ o وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ o لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ o فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ o (الانشقاق : ۱۶ تا ۲۰)

"میں قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی اور رات کی اور اُن چیزوں کی جنہیں وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تمہیں ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر چڑھنا ہے، سو اُنہیں کیا ہوا ہے کہ ایمان نہیں لاتے۔"

نزولِ قرآن کے غیر سائنسی دَور میں آیت کو حقیقی معنی دینا ممکن نہ تھا بلکہ اس کے ظاہری معانی کو ہی حقیقی معنوں میں لیا جاتا رہا۔ لیکن آج کے اس سائنسی تحقیق و ترقی کے دَور میں ہم اپنے آپ کو اس کے ظاہر معانی تک کیوں محدود کریں؟ اس سلسلے میں کچھ اہم نکات ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں:۔

(۱) "تمہیں چڑھنا ہے" ترجمہ ہے قرآنی لفظ لَتَرْكَبُنَّ کا۔ رَکِبَ کا معنی کسی چیز پر چڑھنا ہوتا ہے۔

جمالیات کا ایک رُخ ہے۔

ریاضی: اکثر ماہرین ریاضی عموماً ریاضی سے جمالیاتی حظ حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات ریاضی دان ریاضی کی تخلیقی سرگرمیوں کو آرٹ کی ایک شکل قرار دیتے ہیں۔ موسیقی اور شاعری سے اکثر موازنے کیے جاتے ہیں۔

اعصابی جمالیات: یہ کسی عظیم کام کی عظمت کو واضح کرنے کا متلاشی ہوتا ہے جو دماغ کے حیاتیاتی خلیوں کا مجسمہ ہے۔

جمالیاتی علم کی وسعت کا احاطہ کرتے ہوئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ کی آخری کتاب میں حیاتِ انسانی کے مختلف مراحل میں جمالیات کی کس طرح روشنی ڈالی گئی ہے:۔

(۱) **اللہ جلّ جلالہٗ**: سورۃ النور اللہ تبارک وتعالیٰ کے عظیم حُسن کو اس طرح بیان کرتی ہے:۔

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاحٌ ” اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَبٌ “ دُرِّیٌّ ” یُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ زَیْتُوْنَۃٍ لَّا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ یَّکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْلَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ ”نُوْرٌ“ عَلٰی نُوْرٍ (اَلنُّور: ۳۵)

”اللہ (ہی) آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور (ہدایت) کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک طاق ہے اس میں ایک چراغ ہے، چراغ قندیل میں ہے، قندیل گویا ایک چمکدار ستارہ ہے۔ چراغ روشن کیا جاتا ہے ایک نہایت مفید درخت (یعنی) زیتون سے جو نہ پورب رخ ہے اور نہ پچھم رخ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ خود بخود جل اُٹھے گا اگرچہ آگ اُسے نہ بھی چھوئے۔ نور ہی نور ہے۔“

یعنی اللہ ہی جملہ مخلوقاتِ سماوی و اَرضی کو نورِ ہدایت بخشنے والا ہے۔ نہ اُس کے شرقی جانب کوئی آڑ ہے اور نہ غربی جانب۔ اُس کا فیض شرق وغرب کے ساتھ مخصوص نہیں اور وہ کسی جہت کے ساتھ مقید نہیں۔ روغنِ زیتون اپنی لطافت، صفائی اور روشنی کے لئے مشہور ہے اور عرب میں مشہور تر تھا۔ (اہلِ تحقیق نے یہاں لکھا ہے کہ اللہ کی صفات کی مثال بیان کرنا جائز ہے بشرطیکہ خلافِ آداب نہ ہو اور سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۱ میں جس چیز کی نفی کی گئی ہے، وہ مثل ونظیر کے وجود کی ہے۔) مطلب یہ کہ وہ روغن اپنی حد درجہ روشنی کی وجہ سے از خود روشن ہو جانے والا ہے اور اس لحاظ سے خود ایمان اپنے حد درجہ واضح ہونے کی وجہ سے کسی خارجی وضاحت کا محتاج نہیں ہوتا۔ نُوْر“ عَلٰی نُوْر کا مطلب یہ ہے کہ ایک تو اُس میں خود روشنی کی قابلیت اعلیٰ درجے کی تھی پھر اُدھر سے آگ کے ساتھ اجتماع ہو گیا اور پھر اجتماع بھی اِن کیفیات کے ساتھ کہ چراغ قندیل میں رکھا ہو جس سے بالمشاہدہ چمک بڑھ جاتی ہے اور پھر وہ ایسے طاق میں رکھا ہو جو ایک طرف سے بند ہے۔ ایسے موقع پر شعاعیں ایک جگہ تیز ہو

لفظ لَتَرْكَبُنَّ کا ماخذ یہ ظاہر کرتا ہے کہ سفر کا یہ عمل کسی سواری کے ذریعے سے ہوگا۔(۲) لَتَرْكَبُنَّ فعل ہے اور جمع کا صیغہ ہے جو کم از کم تین اشخاص کے لئے بولا جاتا ہے۔ پھر اس مہم جوئی کو لَتَرْكَبُنَّ کے ل اور نونِ ثقیلہ (نَّ) دونوں کی تاکید سے یقینی بنایا جا رہا ہے۔ ایسا کہنے میں قرآنِ حکیم یہ پیشگوئی کر رہا ہے کہ تین آدمی یقینی طور پر چاند پر چڑھیں گے اور وہ غیر مسلم ہوں گے جیسا کہ آیت فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ بتا رہی ہے۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ میں کئی طبقات کا ذکر ہے۔ چاند کی مہم جوئی میں پہلا طبقہ زمین سے شروع ہوتا ہے اور مختلف طبقات سے ہوتا ہوا بالآخر منتہائے مقصود یعنی چاند پر ختم ہوتا ہے۔ غور و فکر کی بات یہ ہے کہ اگر دوسرے طبقات اور سیارگان کی بجائے صرف چاند کے طبقہ کی بات کی جاتی تو تسخیرِ کائنات کو صرف تسخیرِ قمر تک محدود کر دیا جاتا۔ یہ بات مشیتِ ایزدی کے خلاف تھی کہ انسان کی ترقی کو صرف تسخیرِ قمر تک ہی محدود کر دیا جائے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو۔'' (اسلام اور جدید سائنس از پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری۔۔ص ص ۲۲۳ تا ۲۲۵)

تسخیرِ کائنات کے منکرین کے شبہات کا خلاصہ یہ ہے کہ چاند پہلے آسمان پر ہے اور آسمان تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ لہٰذا پانچ سو سال سے پہلے چاند پر پہنچنا ممکن نہیں خصوصاً کفار کے لئے کیونکہ اُن کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں جو کبھی نہیں کھولے جائیں گے (سورۃ الاعراف:۴۰) جواب یہ ہے کہ اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ کفار اس زندگی میں مادّی اسباب کے ساتھ آسمان پر نہیں پہنچ سکتے بلکہ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مرنے کے بعد کفار کی ارواح آسمان میں نہیں جا سکیں گی' یا اُن کی دعائیں اور ''نیک اعمال'' آسمانوں کے اوپر نہیں جا سکیں گے' یا اُن پر آسمان سے رحمتیں نازل نہیں ہوں گی۔ (تفسیر کبیر' ج ۴' ص ۲۰۹؛ بیضاوی' ج ۱' ص ۲۹۲؛ جلالین' خازن' ج ۲' ص ۸۷؛ مدارک علی ہامش الخازن' ج ۲' ص ۸۷)

دوسری آیت جس سے منکرین نے کفار کی آسمان پر رسائی کا انکار کیا وہ سورۃ المُلک:۵ کی یہ آیت ہے:
وَجَعَلْنَاهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (ہم نے اِن ستاروں کو شیاطین کو مارنے کا ذریعہ بنایا) وہ کہتے ہیں کہ اس آیت کی رُو سے جنات کا داخلہ آسمانوں میں بند ہے۔ حالانکہ یہاں صرف جنّات کا ذکر ہے' انسانوں کا نہیں۔ (تفسیر کبیر' ج ۸' ص ۱۷۳؛ جمل' ج ۴' ص ۳۷۶؛ خازن' ج ۴' ص ۲۹؛ مدارک علی ہامش الخازن' ج ۴' ص ۲۹۰؛ جلالین علی ہامش الجمل' ج ۴' ص ۳۷۶)

منکرین کی تیسری دلیل کا ماخذ بھی مندرجہ بالا دو آیات ہیں کہ چاند آسمان میں مرکوز ہے اور آسمان پر جانا ممکن نہیں' اس لئے تسخیرِ قمر اور تسخیرِ کائنات ناممکنات میں سے ہیں۔ آیئے تحقیق کریں کہ اصل حقیقت کیا ہے؟

چاند خلاء میں ہے یا آسمان میں مرکوز ہے؟ تحقیق یہ ہے کہ چاند آسمان میں مرکوز نہیں ہے اور قرآن و حدیث میں ایسی کوئی نصِ قطعی نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ چاند پہلے آسمان پر مرکوز ہے۔ البتہ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ تمام سیارے زمین و آسمان کے درمیان خلاء میں معلّق ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی فرماتے ہیں:۔

أَخْرَجَ اِبْنُ جَرِيْرٍ وَابْنُ أَبِيْ حَاتِمٍ عَنِ ابْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: كُلٌّ "فِيْ فَلَكٍ أَلْفَلَكُ الَّذِيْ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ مِنْ مَّجَارِي النُّجُوْمِ وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ وَفِيْ قَوْلِهٖ يَسْبَحُوْنَ قَالَ: يَجْرُوْنَ وَ أَخْرَجَ اِبْنُ أَبِيْ حَاتِمٍ وَأَبُو الشَّيْخِ عَنْ حَسَّانَ بْنِ عَطِيَّةَ قَالَ: أَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ مُسَخَّرَةٌ" فِيْ فَلَكٍ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ (دُرِّ منثور ج ۴ ص ۳۱۸)

"ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے ابنِ زید رضی اللہ عنہ سے روایت کیا۔ اُنہوں نے کُلٌّ" فِیْ فَلَک کی تفسیر میں فرمایا کہ فلک آسمان اور زمین کے درمیان مدار ہے' جس میں شمس و قمر اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں۔ اور ابنِ ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حسان بن عطیہ سے روایت کیا کہ اُنہوں نے فرمایا کہ شمس و قمر اور سیارگان آسمان اور زمین کے درمیان اپنے محور میں مسخر ہیں۔"

قَالَ عَبْدُاللّٰهِ اِبْنُ عُمَرَ اِنَّ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وُجُوْهُهُمَا اِلَى السَّمٰوٰتِ وَضَوْءُ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ فِيْهِنَّ جَمِيْعًا وَأَقْفِيَتُهُمَا اِلَى الْأَرْضِ وَيُرْوٰى هٰذَا عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَيْضًا (خازن ج ۴ ص ۳۱۳؛ جمل ج ۴ ص ۴۱۲؛ مدارک علی ہامش الخازن ج ۴ ص ۳۱۳؛ دُرِّ منثور ج ۶ ص ۲۶۸)

"عبداللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ سورج اور چاند کا چہرہ آسمانوں کی طرف ہے اور اُن کی روشنی تمام آسمانوں میں پہنچ رہی ہے اور اُن کی پشت زمین کی طرف ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی یہی فرمایا ہے۔"

علامہ نسفی حنفی فرماتے ہیں:

وَالْجُمْهُوْرُ عَلٰى أَنَّ الْفَلَكَ مَوْجٌ "مَّكْفُوْفٌ" تَحْتَ السَّمَاءِ تَجْرِيْ فِيْهِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ (مدارک علی ہامش الخازن ج ۳ ص ۲۵۹)

"جمہور مسلمین کا مسلک یہ ہے کہ فلک آسمانوں کے نیچے ایک خلاء ہے جس میں سورج' چاند اور دیگر ستارے گردش کر رہے ہیں۔"

علامہ خازن اور امام رازی فرماتے ہیں:

أَلْفَلَكُ مَوْجٌ "مَّكْفُوْفٌ" دُوْنَ السَّمَاءِ تَجْرِيْ فِيْهِ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ (لُبابُ التاویل ج ۳ ص ۲۵۹؛ تفسیر کبیر ج ۶ ص ۱۰۳)

''فلک آسمانوں کے نیچے خلاء کا نام ہے جس میں سورج' چاند اور دیگر ستارے گردش کرتے ہیں۔''

جن مفسرین نے چاند اور دوسرے سیاروں کے مرکوز فی السماء کا قول کیا ہے وہ اُن کا مذہب نہیں بلکہ علمائے ہیئت کا نظریہ ہے اور علمائے ہیئت خود اس پر متفق نہیں کہ آیا چاند سماء دنیا میں ہے یا خلا میں معلق ہے۔

<u>مخالفین کے دلائل کی ایک اور طرح تردید</u>: وہ حضرات جو یہ کہتے ہیں کہ چاند نچلے آسمان پر ہے' اپنے دعوٰی کی حمایت میں درج ذیل آیات پیش کرتے ہیں:۔

(i) تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًاO (الفرقان: ۶۱)

''بہت عالیشان ہے وہ جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنا دیا۔''

(ii) اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًاO وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًاO (نوح: ۱۵' ۱۶)

''کیا تم نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان تہ بہ تہ پیدا کیے ہیں اور اُن میں چاند کو نور (کی چیز) بنایا اور آفتاب کو چراغ کی طرح روشن بنایا۔''

اِن آیات سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ چاند آسمان میں واقع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لفظ السَّمَآءِ سے مراد آسمان نہیں جیسا کہ ہم عام طور پر اس کا یہی مطلب سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اصل مطلب بلندی اور اونچائی ہے۔ مثلاً قرآنِ حکیم نے فرمایا:

(i) وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً (البقرة: ۲۲)

یعنی ''اُس نے بلندی سے پانی اتارا'' (نہ کہ آسمان سے)

(ii) وَفِی السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (الذّٰریٰت: ۲۲)

یعنی ''(آسمانوں کی) بلندیوں میں تمہارا رزق موجود ہے۔'' (نہ کہ آسمان میں)

امام فخر الدین رازی کہتے ہیں کہ سَمَاء کو اُس کی بلندی کی وجہ سے ایسا کہا جاتا ہے کیونکہ ''سُمُوّ'' (جو اُس کا مادہ ہے) کا معنیٰ ہی بلندی کا ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ چیز جو آپ سے بلندی پر واقع ہے سَمَاء ہے۔ جب بارش بادل سے برستی ہے تو اسی دلیل کی بنیاد پر یہ کہنا درست ہے کہ وہ آسمان (یعنی بلندی) سے اترتی ہے۔ (تفسیر کبیر' ج ۱' ص ۲۱۸)

اگر سَمَاء کا معنیٰ آسمان کر بھی لیا جائے تو بھی آیت وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا (نوح: ۱۶) کے سمجھنے میں

کوئی دشواری پیش نہیں آتی کیونکہ اس میں فِيهِنَّ چاند کے لئے ظرفِ مکاں کے طور پر نہیں' بلکہ نُور کے لئے ظرفِ مکاں ہے۔لہٰذا آیت کا یہ مطلب نہیں کہ چاند آسمان میں (مرکوز) ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ ایک چاند تمام آسمانوں میں ہو بھی کیسے سکتا ہے۔ بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ چاند کی روشنی تمام آصمانوں میں ہے۔اِس بحث کے بعد صحیح طریقہ جو سامنے آیا' وہ یہی ہے کہ چاند آسمانوں کے نیچے ہے اور اُس کی روشنی آسمانوں کو منوّر کررہی ہے۔

امام جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں:

أَخْرَجَ اِبْنُ الْمُنْذِرِ عَنْ عِكْرَمَةَ فِي قَوْلِهِ وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا قَالَ: اِنَّهُ يُضِيءُ نُوْرُ الْقَمَرِ فِيهِنَّ كُلِّهِنَّ كَمَا لَوْ كَانَ سَبْعُ زُجَاجَاةٍ أَسْفَلَ مِنْهَا شِهَاب" أَضَاءَ تْ كُلُّهُنَّ فَكَذٰلِكَ نُوْرُ الْقَمَرِ فِي السَّمٰوٰتِ كُلُّهُنَّ لِصَفَائِهِنَّ (دُرِّ منثور ج ٦' ص ١٦٨)

''ابن المنذر نے جنابِ عکرمہ سے روایت کیا کہ اُنہوں نے آیت وَجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُوْرًا کی وضاحت میں فرمایا کہ جیسے کوئی ستارہ سات آئینوں کے نیچے ہو' تو بھی وہ ساتوں آئینوں کو روشن کردے گا۔اسی طرح چاند کی روشنی بھی سات آسمانوں کو اُن کے شفاف ہونے کی وجہ سے روشن کرتی ہے۔''

اِن حوالہ جات کی روشنی میں اِس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ چاند آسمانوں کے نیچے خلاء میں واقع ہے۔

''معاہدہ قمر : یہ وہ مقبول نام ہے جو اقوامِ متحدہ کے اُس مسودے کو دیا گیا ہے جس کی تجویز سوویت یونین نے دی تھی جس کے تحت چاند' سیارچوں یا دیگر اجرامِ فلکی کی آزادانہ کاروباری مہم جوئی کو محدود کر دیا گیا تھا۔۱۹۸۰ء میں امریکہ نے اس معاہدے کی پُرزور مخالفت کی تھی۔'' (Hutchinson 20th Century Encyclopedia, pp. 864, 865)

''کیا چاند پر رسائی کوئی قابلِ فخر کارنامہ ہے؟ سطورِ بالا میں جو تحقیق پیش کی گئی ہے' اُس کا مفاد صرف اتنا ہے کہ مادّی اسباب سے چاند تک جانا' ناممکنات میں سے نہیں اور یہ واقعہ قرآن کریم کے منافی بھی نہیں بلکہ آیاتِ قرآنیہ کی تصدیق کرنے والا ہے۔اس واقعہ کا مقصد چاند پر جانے والوں کی تحسین اور ان کی حوصلہ افزائی نہیں ہے بلکہ قرآن کی رُو سے داد و تحسین کے وہ کام ہیں جن سے خالقِ کائنات راضی ہو اور جن کاموں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی عبادت اور مخلوق کی خدمت کی جائے' وہ لائقِ صد تحسین ہیں۔برسہابرس کی کوشش اور لھربوں روپیہ کے اسراف کے بعد انسان چاند پر پہنچا لیکن اِس سے انسانیت کو کیا ملا؟ اگر یہی روپیہ دُنیا کے تمام انسانوں پر تقسیم کیا جاتا تو ایک محتاط اندازے کے مطابق ہر غریب و محتاج شخص کو پندرہ ہزار

روپیہ مل جاتا' اس طرح انسانیت کی ایک عظیم خدمت ہو جاتی ۔ اس لئے ہمارے نزدیک یہ واقعہ کسی طرح لائقِ تحسین نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کسی طرح اسلام کے منافی بھی نہیں ہے ۔'' (مقالاتِ سعیدی ۔۔۔ علامہ غلام رسول سعیدی' صفحہ ۴۹۳)

سورۃ الانشقاق کی آیاتِ مذکورہ (۱۶ تا ۲۰) کی توضیح میں عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں: ''انسان ایسی مخلوق نہیں جسے شروع سے لے کر آخر تک ایک حالت پر جامد رکھا جائے ۔ سارا نظامِ عالم گواہ ہے کہ انسان ایک ترقی پذیر مخلوق بنایا گیا ہے ۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کی امت کے لئے مخصوص ہے ۔ یہ مان لینے کے بعد آیت سے مراد مراتب قرب میں ترقی ہوگی ۔'' (حاشیہ ص ۱۱۸۵)

(ج) <u>ستارے</u> : یہ اجرامِ فلکی سورج کی طرح اپنی روشنی خود پیدا کرتے ہیں ۔ لفظ نجم جس کی جمع نجوم ہے' ستارہ کے معنیٰ میں ہے ۔ قرآنِ حکیم میں یہ لفظ تیرہ مرتبہ آیا ہے :۔

(i) وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (الانعام : ۹۷)
''وہ وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے ستارے بنائے تا کہ تم اُن کے ذریعے سے خشکی اور تری کی تاریکیوں میں راہ پاؤ ۔''

تاروں کی تخلیق کا مقصد بیان کیا جا رہا ہے کہ تم جنگلوں اور سمندروں میں سفر کر رہے ہو اور رات کی تاریکیاں آ جائیں تو ان تاروں سے وقت معلوم کرو کہ رات کتنی گزری اور کتنی باقی ہے' نمازِ عشاء کا وقت آیا کہ نہیں اور انہی سے تم سمت معلوم کر کے بہ آسانی سفر کر سکو ۔

نوٹ : معرفت دو قسم کی ہے: توحید اور ایمان ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مظاہرِ قدرت یعنی سورج' چاند' ستاروں' باغوں' مرغزاروں' کھیتوں' آبشاروں وغیرہ کے ذریعے پہچاننا توحید ہے اور اُسے حضرات انبیائے کرام بالخصوص امام الانبیاء ﷺ کی معرفت جاننا پہچاننا ایمان ہے ۔ (تفسیرِ نعیمی' جزء ۷' ص ۶۰۸)

(ii) وَعَلٰمٰتٍ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝ (اَلنَّحل : ۱۶)
''اور علامتیں بھی بنائیں اور ستاروں سے بھی لوگ راہ پاتے رہتے ہیں ۔''

ستاروں کی قدر و قیمت اِس حیثیت سے کوئی سمندر کے ملاحوں' جہاز رانوں' کشتی بانوں اور صحراو

ریگستان کے مسافروں سے پوچھے۔ اِس دَورِ ترقی میں بھی بڑے بڑے دُخانی جہازوں کے کپتانوں کا سہارا ابھی قطب نما ہی رہتا ہے یعنی وہ آلہ جو قطب ''ستارہ'' کی سمت متعیّن کرتا ہے۔

نـــوٹ : چاند' سورج' ستارے صرف علمِ توقیت اور علمِ جغرافیہ کے لئے بنائے گئے ہیں یعنی اُن کے ذریعے نماز' روزے' حج و قربانی کے اوقات و تاریخیں اور سال و ماہ و ہفتے اور دن رات کا اندازہ اور وقت معلوم کیا جائے۔ ستاروں سے قسمتیں یا غیب کا حال معلوم کرنا یا قسمت کو ستارے سے معلّق سمجھنا حرام ہے۔ علمِ نجوم سے مراد اگر علمِ توقیت و علمِ جغرافیہ یعنی راستے اور سمتیں معلوم کرنا لیا جائے تو یہ علم سیکھنا جائز بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اگر عرفِ عام والا علمِ نجوم مراد ہو تو اس کا سیکھنا' سکھانا اور نجومیوں سے قسمت کا حال پوچھنا اور اس پر یقین کرنا سب حرام ہے۔ (تفسیر نعیمی' جزء ۱۴' ص ۱۹۶)

(iii) وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ○ وَمَا أَدْرٰكَ مَا الطَّارِقُ ○ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ○ (الطارق: ۱ تا ۳)
''آسمان کی قسم اور رات کو طلوع ہونے والے ستارے کی اور آپ کیا سمجھے کہ وہ رات کو طلوع ہونے والا کیا ہے؟ (وہ) نہایت روشن ستارہ ہے۔''

طارق کا معنیٰ ہے رات کو آنے والا' خواہ وہ ستارہ ہو یا کوئی اور چیز ہو۔ دن میں آنے والے کو طارق نہیں کہتے۔ علاّمہ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی المتوفّٰی ۴۵۰ھ لکھتے ہیں:

''ستارے کو طارق اس لئے فرمایا ہے کہ وہ رات میں طلوع ہونے کے ساتھ مختص ہے اور عرب ہر اُس شخص کو طارق کہتے ہیں جو رات کا قصد کرے۔ طرق کا اصل معنیٰ ہے کوٹنا۔ اسی وجہ سے ہتھوڑے کو مِطرَقَة کہتے ہیں اور رات میں آنے والے کو بھی طارق اس لئے کہتے ہیں کہ وہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ کو کوٹنے اور کھٹکھٹانے کا محتاج ہوتا ہے۔''

النَّجْمُ الثَّاقِب بہت بلند مرتبے والا ستارہ ہے جس سے خشکی اور سمندر کے اندھیروں میں راستہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اس ستارے کو نہایت روشن اِن وجوہ سے فرمایا ہے: (۱) ثاقِب کا معنیٰ ہے سوراخ کرنے والا اور یہ ستارہ اپنی روشنی سے اندھیرے میں سوراخ کر دیتا ہے اور پھر اس میں نافذ ہو جاتا ہے۔ (۲) یہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور اس کی روشنی ہوا میں اس طرح نفوذ کر جاتی ہے جیسے کوئی چیز کسی چیز میں سوراخ کر دیتی ہے۔ (۳) جب شیطان اس ستارے کو دیکھتا ہے تو یہ شیطان میں سوراخ کر دیتا ہے یعنی شیطان میں نفوذ کر کے اُسے

جلا دیتا ہے۔(۴) الفرّاء نے کہا النَّجمُ الثَّاقِب کا معنیٰ ہے وہ ستارہ جو تمام ستاروں سے بلند ہے کیونکہ جو پرندہ بہت اونچی پرواز کر کے آسمان کے قریب جا پہنچے عرب اُسے ثاقب کہتے ہیں۔'' (تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ۶۷۷)

آسمانِ دنیا پر زینت کے علاوہ اَلنَّجمُ الثَّاقِب کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ سرکش شیاطین سے اس کی حفاظت کی جائے جیسا کہ سورہ الصّافّات: ۱۰ میں آیا: اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ'' (مگر جو شیطان (فرشتوں کی) کوئی بات اُچک کر بھاگے تو شہابِ ثاقب اس کا پیچھا کرتا ہے) پس جب شیطان آسمان پر فرشتوں کی کوئی بات سننے کے لئے جاتے ہیں تو ستارے اُن پر ٹوٹ کر گرتے ہیں جس سے بالعموم شیاطین جل جاتے ہیں۔

''بعثتِ نبوی سے قبل جنوں' بھوتوں اور دوسری خبیث روحوں کو آسمان کی بیرونی حدود تک رسائی حاصل تھی۔ وہ سخت محنت سے عالمِ بالا کے کچھ رازوں کی سُن گُن پا لیتے تھے جو وہ زمین کے نجومیوں اور کاہنوں تک پہنچا دیتے تھے۔ لیکن حضور ختمی مرتبت ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اُنہیں آسمانوں سے دھتکار دیا گیا اور جب کبھی انہوں نے آسمان تک جانے کی جرأت کی' تو اُن پر شعلے اور انگارے برسائے جاتے جو انسانوں کو ایسے لگتے کہ ستارے گر رہے ہیں۔'' (Mahmomet and Islam.. Sir William Muir, pp. 52, 53)

<u>شہابِ ثاقب سے مراد آگ کے گولے ہیں یا آسمانِ دنیا کے ستارے؟</u> فرشتے شیطانوں کو جو شہابِ ثاقب مارتے ہیں' آیا وہ ان ستاروں میں سے ہیں یا نہیں؟ اگر فرشتے اِنہی ستاروں سے شیطانوں پر ضرب لگاتے ہیں تو پھر ستاروں کی تعداد بتدریج کم ہونی چاہئے نیز اس سے آسمان کی زینت میں بھی بتدریج کمی آنی چاہئے۔ اور اگر وہ شہابِ ثاقب ان ستاروں سے نہیں بلکہ فرشتے کوئی اور آگ کے گولے اٹھا کر اُن شیطانوں پر مارتے ہیں تو یہ سورۃُ المُلک کی آیت: ۵ کے خلاف ہے جس میں فرمایا گیا کہ ''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے مزیّن فرما دیا اور انہیں شیطانوں کے مارنے کا ذریعہ بنایا ہے۔''

''اس کا جواب یہ ہے کہ شیطانوں کو جس شہاب ثاقب سے مارا جاتا ہے' وہ یہ ستارے نہیں جن سے آسمانِ دنیا کو مزیّن فرمایا ہے بلکہ کسی اور قسم کے آگ کے گولے ہیں اور سورۃُ المُلک کی آیت ۵ کی وضاحت یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو فضا کی بلندیوں میں روشن اور چمکتی ہوئی نظر آتی ہے وہ زمین والوں کو روشن چراغوں اور ستاروں کی طرح نظر آتی ہے' لہٰذا سورۃُ المُلک کی آیت ۵ میں شہابِ ثاقب کو چراغ اور آسمانِ دنیا کی زینت لوگوں کو دکھائی دینے کے اعتبار سے فرمایا ہے۔''

دوسرا سوال یہ ہے کہ از روئے سورہ الرحمٰن: ۱۵ جنّات اور شیاطین آگ سے بنائے گئے ہیں تو اُن پر آگ کے گولے مارنا یا اُنہیں آخرت میں دوزخ کی آگ سے عذاب دینا اُن کے لئے موجبِ عذاب کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان مٹی سے بنایا گیا ہے (سورۃ الکہف: ۳۷) اس کے باوجود جب اُسے مٹی کے ڈھیلے اور اینٹیں ماری جاتی ہیں تو اس سے اُسے بہر حال تکلیف ہوتی ہے۔ اسی قیاس پر جنّات اور شیاطین کو سمجھنا چاہیئے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جب شیطانوں کو یہ معلوم ہے کہ جیسے ہی وہ آسمانِ دنیا کے قریب پہنچیں گے تو اُن پر شہاب ثاقب پھینکا جائے گا اور اُنہیں اُن کا مقصود حاصل نہیں ہو سکے گا تو پھر وہ آسمانوں کے قریب کیوں جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ آسمانِ دنیا سے اُن پر شہابِ ثاقب مارنے کی ایک معیّن جگہ نہ ہو اور وہ ہر بار اس اُمید سے جگہ بدل کر جاتے ہوں کہ یہاں سے اُن پر شہابِ ثاقب نہیں گرایا جائے گا' یا اس کی وجہ یہ ہو کہ اُن پر شہابِ ثاقب گرائے جانے کے واقعات شاذونادر ہوں اور جنّات اور شیاطین کے درمیان وہ اس قدر مشہور نہ ہوں۔'' (تبیان القرآن۔۔علامہ غلام رسول سعیدی' ج۹' ص۸۶۳)

Fred Hoyle شہابِ ثاقب کے بارے میں لکھتا ہے:

''میں اس بات پر یقین نہیں رکھتا کہ کوئی بھی سائنسدان جس نے شہابِ ثاقب کا معائنہ کیا ہے' یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام رہا ہو کہ جوہری طبعیات کے قوانین اپنے اُن نتائج کے حوالے سے دانستہ طور پر تشکیل دئے گئے ہیں جو وہ ستاروں کے اندر پیدا کرتے ہیں۔'' (Religion and the Scientists.. p. 34) 1995

(ج) سیارگان: ان کی اپنی روشنی نہیں ہوتی۔ یہ سورج کے گرد گردش کرتے ہیں۔ قرآنِ حکیم اُن کے لئے لفظ کَوْکَب (جمع کَوَاکِب) استعمال کرتا ہے' جیسا کہ ذیل کی آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے:۔

اَللّٰہُ نُوْرُالسَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْھَا مِصْبَاح'' اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ اَلزُّجَاجَۃُ کَاَنَّھَا کَوْکَب'' دُرِّیّ'' (اَلنُّور: ۳۵)

''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے' اُس کی روشنی کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک طاق ہے' اُس میں ایک چراغ ہے' چراغ قندیل میں ہے' قندیل گویا ایک چمکدار سیارہ ہے۔''

''یہاں موضوع روشنی کی اُس جسم میں عکس اندازی (تظلیل) ہے جو قندیل کو منعکس کرتا ہے اور اُسے ایک سیارے کی روشنی دیتا ہے اُس سیارے کی طرح جو سورج کی روشنی سے چمکتا ہے۔'' (The Bible, the Qur'an and Science... Maurice Bucaille, p. 157)

''جدید طبعیات (Physics) ہمیں یہ بتاتی ہے کہ روشنی کی رفتار بڑھ نہیں سکتی اور تمام دیکھنے والوں کے لئے ایک جیسی رہتی ہے خواہ اُن کی حرکت کا نظام کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ اس طرح تغیر و تبدل کی دنیا میں روشنی اُس حقیقتِ مطلقہ تک پہنچنے کا قریب ترین ذریعہ ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے لئے روشنی کا جو استعارہ استعمال کیا گیا ہے' اُس کا مطلب علمِ جدید کے مدِّنظر حقیقتِ مطلقہ اور حقیقتِ منتظر (یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ) کے قرب کے لئے لیا جانا چاہئے۔''
(Reconstruction of Religious Thought in Islam... Dr. Muhammad Iqbal, p. 89)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے ملتے جلتے خیال کو ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں ۔۔۔ کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

ڈاکٹر مارس بکائل کے مطابق مندرجہ ذیل آیات میں یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ لفظ کَوْکَبْ سے مراد کون سے اجرامِ فلکی ہیں:۔

(i) فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا (الانعام : ۷۶)
''جب رات ابراہیم علیہ السلام پر چھا گئی تو اُنہوں نے ایک کَوْکَبْ دیکھا۔''

(ii) وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ہ (الانفطار : ۲)
''اور جب کواکب جھڑ پڑیں۔''

''سیارگان کی حرکت : ہر سیارہ بیضوی مدار میں سورج کے گرد گھومتا ہے۔ اپنی گردش میں یہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے۔ سیارہ جتنا سورج سے زیادہ قریب ہوگا' اُتنے ہی کم وقت میں وہ سورج کے گرد اپنا چکر مکمل کر لے گا یعنی اس کی محوری گردش اُتنی ہی تیز ہوگی۔ قریب ترین سیارہ عطارد (Mercury) اپنا چکر ۶۸ دنوں میں مکمل کرتا ہے اور اس کی رفتار ۴۸ کلومیٹر (۳۰ میل) فی سیکنڈ ہے۔ پلوٹو جو بعید ترین سیارہ ہے' اپنا چکر ۲۴۸ سالوں میں مکمل کرتا ہے اور اس کی رفتار ۴.۷ کلومیٹر (۲.۷) میل فی سیکنڈ ہے۔''

''زہرہ (Venus) اور یورینس (Uranus) گھڑی کی سوئیوں کی طرح گردش کرتے ہیں جبکہ دیگر سات سیارے گھڑی کی سوئیوں کی مخالف سمت (Anti Clockwise) میں گردش کرتے ہیں۔''

''سیارے حجم اور کثافت میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں اور اسی طرح کششِ ثقل میں بھی۔ زُحل

(Saturn) اور پلوٹو کی کثافت پانی سے بھی بہت کم ہے۔ مشتری (Jupiter) سیّارے کا حجم جو سب سے بڑا ہے' زمین سے ۳۱۸ گنا ہے۔ کسی سیّارے کی کششِ ثقل کا دارومدار اس کے قطر اور حجم پر ہوتا ہے۔ ایک آدمی جس کا وزن زمین پر ۵۴ کلوگرام (۱۲۰ پونڈ) ہے' اُس کا وزن عطارد (Mercury) یا مریخ (Mars) پر ۲۱ کلوگرام (۴۶ پونڈ) ہوگا' زہرہ (Venus) پر ۴۹ کلوگرام (۱۰۹ پونڈ) اور مشتری (Jupiter) پر ۱۳۸ کلوگرام (۳۰۴) پونڈ ہوگا۔"

(Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 15, pp. 1287,88)

"سیّاروں کی خصوصیات : یہ خصوصیات اُن کے سورج سے فاصلے کے تناسب سے ہیں۔ جو سیّارے سورج سے زیادہ قریب ہیں اُن کی فضا اُن سیاروں سے زیادہ بلند ہے جو سورج سے دُور ہیں۔ سیّارے کی فضا اس سے بھی متاثر ہوتی ہے کہ وہ سورج کی روشنی اور حرارت کتنی جذب کرتا ہے۔"

"زمین سے قریب ترین اور سورج سے دُور ترین سیّارہ پلوٹو (Pluto) ہے جو خاصی سرد جگہ ہے۔ یہاں کا درجہ حرارت منفی ۲۳۸ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ مختصر یہ کہ پلوٹو برف سے ڈھکا ہوا ہے۔"

"اگلا سیّارہ (Neptune) ہے۔ یہ بھی سرد ہے اور اس کا درجہ حرارت منفی ۲۱۸ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ اس کی فضا جو ہائیڈروجن' ہیلیم اور (آتش گیر) میتھین پر مشتمل ہے' زندگی کے لئے زہر آلود ہے۔ یہاں دو ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جھکڑ چلتے ہیں۔"

"اگلا سیّارہ یورینس (Uranus) ہے جو گیس کا مادہ ہے اور اس کی سطح پر چٹانیں اور برف ہیں۔ یہاں کا درجہ حرارت منفی ۲۱۴ ڈگری سنٹی گریڈ ہے اور یہاں کی فضا بھی ھائیڈروجن' ہیلیم اور میتھین پر مشتمل ہے جو انسانی زندگی کے لئے غیر موزوں ہے۔"

یورینس کے بعد آپ زُحل (Saturn) پر پہنچیں۔ نظامِ شمسی میں یہ دوسرا بڑا سیارہ ہے اور اسے خاص طور پر اس لئے جانا جاتا ہے کہ اس کے گرد دائروں کا نظام ہے جو اسے گھیرے رکھتے ہیں۔ یہ دائرے گیس' پتھر اور برف کے بنے ہوئے ہیں۔ زُحل کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتوں میں سے ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پورا سیارہ گیس کا بنا ہوا ہے جس میں ۷۵ فیصد ہائیڈروجن اور ۲۵ فیصد ہیلیم ہے اور اس کی کثافت پانی سے کم ہے۔ اگر آپ زُحل پر اترنا چاہیں تو آپ اپنے خلائی جہاز کو اس طرح بنائیں کہ اس میں ہوا بھری جا سکے۔ یہاں کا اوسط درجہ حرارت بھی بہت کم یعنی منفی ۱۷۸ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔"

(۱) مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (سورۃ الانعام :۳۸)

''ہم نے (اپنی اِس) کتاب میں کوئی چیز چھوڑ نہیں رکھی۔'' (۳۸ : ۶)

(۲) وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ (سورۃ الانعام :۵۹)

''اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر (یہ کہ یہ سب) روشن کتاب میں (موجود) ہیں۔'' (۵۹ : ۶)

(۳) وَکُلُّ صَغِیْرٍ وَّ کَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝ (سورۃ القمر : ۵۳)

''اور ہر چھوٹی اور بڑی بات (اس میں) لکھی ہوئی ہے۔'' (۵۳ : ۵۴)

قرآنک انسائیکلوپیڈیا (اُردو ترجمہ)

(جلد اوّل)

مؤلّف: پروفیسر اشفاق احمد خان

مترجمین : (ر) پروفیسر حنیف بیگ، شعبہ انگریزی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان
(ر) پروفیسر اشفاق احمد خان (مؤلف انسائیکلوپیڈیا)
سابق صدر شعبہ عربی۔ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان

ثاقب پرنٹرز اینڈ پبلشرز

5۔شالیمار کالونی، عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان

فون :061-6523251 موبائل : 0331-2220692
0301-7422684

کر بہت تیز روشنی ہوتی ہے اور پھر تیل بھی زیتون کا جو مزید روشنی بڑھانے اور کم دُھواں ہونے میں مشہور ہے۔ تو اِس قدر روشنی ہوگئی کہ جیسے بہت سی روشنیاں جمع ہوگئی ہوں۔ اِسے نُور" عَلیٰ نُور فرمایا گیا۔

اِسی طرح مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ جب نورِ ہدایت ڈال دیتا ہے تو قبولِ حق کے لئے اُس کی کشادگی (انشراح) روز بروز بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ ہر وقت احکام پر عمل کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور جب اُسے علم حاصل ہو جاتا ہے تو نورِ عمل کے ساتھ نورِ علم بھی منظم ہو جاتا ہے جسے وہ فوراً ہی قبول کر لیتا ہے۔ لہٰذا علم و عمل جمع ہو کر نُور" عَلیٰ نُور اُس پر صادق آجاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کعب الاحبار رضی اللہ عنہ سے مَثَلُ نُوْرِہٖ کَمِشْکٰوۃٍ فِیْهَا مِصْبَاح" -- الآیۃ کا مطلب پوچھا تو اُنہوں نے کہا کہ یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مکرّم ﷺ کے متعلق بیان کی ہے۔ مِشْکٰوۃ سے مراد سینہ مبارک' زُجَاجَۃ سے مراد قلبِ انور اور مِصْبَاح سے مراد نبوّت ہے۔ یعنی حضور علیہ السلام کی شانِ نبوّت لوگوں کے لئے خود بخود عیاں ہو رہی ہے' اگرچہ آپ اپنی نبوّت کا اعلان نہ بھی فرماتے۔ لَا شَرْقِیَّۃٍ وَّلَا غَرْبِیَّۃٍ فرما کر یہ بتا دیا کہ نبوّتِ مصطفوی کا فیض عام ہے۔ جس طرح زمانہ کی پابندی نہیں' اُسی طرح مکان کی بھی قید نہیں۔ اہلِ مشرق و مغرب اور اہلِ شمال و جنوب سب کے لئے درِ رحمت کُھلا ہے اور دامنِ لطف و کرم کُشادہ ہے۔

ایک نَومسلم انگریز خاتون قرآنِ حکیم کے ادبی حُسن اور بالخصوص اِس آیت کو بطورِ نمونہ پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں:

''اس میں ایسے نازک معانی ہیں جو روح کو بہالے جاتے ہیں جب اُسے اصلی حالت میں پڑھا جائے میرے نزدیک اس کا اسلوب' تصوّرات کا تنوّع اور الفاظ کی رنگینی قرآن مجید کو دوسری تمام الہامی کتابوں سے ممتاز کرتی ہے۔''
("Pilgrimage to Mecca" -- Lady Cobbold p.240)

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ہر شے کو اس کے متضاد سے پہچانا جاتا ہے۔ روشنی کو جمالیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ قرآنی رہنمائی ہے۔ سورۂ نور کی آیت ۴۰ میں نور کے متضاد ظُلمت کو بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتے ہیں وہ ظلمت سے بھی زیادہ تاریک ہیں (ایک ایسی چیز جو تمام انسانیت کے لئے بہر حال قابلِ نفرت ہے) اور سورہ یونس کی ایک آیت کے مطابق ظلمت' بدی کا بھدّا پن ہے جس میں ملوّث لوگوں کے متعلق قرآنِ حکیم یوں کہتا ہے:

وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّۃ" --- کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا

''اور جنھوں نے برے کام کئے تو برائی کی سزا اُس جیسی ہوگی اور اُن پر ذلت چھا رہی ہوگی --- گویا اُن کے چہرے کالی رات کے کسی ٹکڑے سے ڈھانپ دئے گئے ہیں۔'' (یونس: ۲۷)

''اس کے بعد مشتری (Jupiter) آتا ہے جو نظامِ شمسی میں سب سے بڑا سیارہ ہے۔ یہ زمین سے ۳۱۸ گنا بڑا ہے۔ زحل کی طرح مشتری بھی گیس سے بنا ہوا ہے۔ چونکہ اِن سیاروں پر سطح اور فضا میں امتیاز کرنا مشکل ہے تو یہ کہنا آسان نہ ہوگا کہ سطح کا درجہ حرارت کیا ہے لیکن فضا کے بالائی حصوں میں درجہ حرارت منفی ۱۴۳ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ مشتری کی فضا کا ایک خاص وصف ہے جسے عظیم سرخ دھبہ کہا جاتا ہے جسے آج سے تین سو سال قبل دیکھا گیا تھا۔ ماہرینِ فلکیات کو اب یہ معلوم ہے کہ یہ ایک بہت بڑا طوفانی نظام ہے جو آسمان کی فضا میں صدیوں سے دھاڑتا رہا ہے۔ یہ اتنا بڑا ہے کہ یہ زمین کی جسامت کے دو سیّارے نگل سکتا ہے۔ مشتری دیکھنے میں ایک جوشیلا سیارہ ہے لیکن اس میں انسان نہیں رہ سکتے جو اس کے منجمد درجہ حرارت' طوفانی جھکڑوں اور شدید قسم کی تابکاری سے فوراً مرجائیں گے۔''

''اس کے بعد مریخ (Mars) آتا ہے۔ مریخ کی فضا انسانی زندگی کو برقرار نہیں رکھ سکتی کیونکہ یہاں پر زیادہ تر کاربن ڈائی آکسائڈ ہوتی ہے۔ سطح پر ہر طرف آتش فشاں شہابِ ثاقب کے ٹکراؤ کے اثرات ہیں۔ سطح پر تیز ہوائیں چلتی رہتی ہیں جس سے آندھیاں چلتی ہیں جو بہ یک وقت کئی ہفتوں یا دنوں تک جاری رہتی ہیں۔ یہاں کا درجہ حرارت بہت حد تک تبدیل ہوتا رہتا ہے اور منفی ۵۳ درجہ ڈگری سنٹی گریڈ تک نیچے چلا جاتا ہے۔ اس پر بہت سی قیاس آرائیاں ہیں کہ مریخ پر زندگی موجود ہے لیکن تمام تر شواہد یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہاں کوئی زندگی نہیں ہے۔''

''مریخ سے ہوتے ہوئے اور سورج کی طرف جاتے ہوئے ہمیں ایک نیلگوں سیارہ ملتا ہے جسے زہرہ (Venus) کہا جاتا ہے۔ درجہ حرارت ۴۵۰ ڈگری سنٹی گریڈ ہے جس سے ہر چیز پگھل جائے گی۔ اس سیارے پر ہر طرف سے چمکتے ہوئے سفید بادل سایہ فگن رہتے ہیں۔ ماحول زیادہ تر کاربن ڈائی آکسائڈ کا ہے۔ سطح پر ماحولیاتی دباؤ ۹۰ زمینی دباؤ کے برابر ہے۔ زہرہ کے ماحول میں گندھک کے تیزاب کے گیس کی تہیں پائی جاتی ہیں جو نیچے کئی کلومیٹر تک جاتی ہیں۔ جب زہرہ پر بارش ہوتی ہے تو وہ یہ بارش نہیں ہوتی جسے آپ اور ہم جانتے ہیں بلکہ یہ تیزاب کی بارش ہوتی ہے۔ کوئی انسان یا جاندار اس جہنمی ماحول میں ایک سیکنڈ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔'' (The Creation of the Universe... Harun Yahya, pp. 80, 82)

''چاند کے علاوہ آسمان پر رات کے وقت چمکنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ چمکدار زہرہ ہے۔ اسے عام طور پر ''شام کا ستارہ'' (Evening Star) کہا جاتا ہے۔ یہ غروبِ آفتاب کے بعد تین گھنٹوں تک یا طلوعِ آفتاب سے تین گھنٹے پہلے تک دیکھا جا سکتا ہے۔'' (Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 15, pp. 1287, 1288)

''اور آگے بڑھیں تو ہم سورج سے قریب ترین عطارد (Mercury) پر پہنچیں گے۔ یہ وہ چٹانی دنیا ہے جو گرمی کی حدّت اور سورج کی تابکاری سے تباہ شدہ ہے۔ سورج کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی گردش اتنی کم ہے کہ یہ تین محوری گردشیں اِتنے وقت میں کرتا ہے جتنا اسے سورج کے گرد دو مرتبہ چکر لگانے میں کرنا پڑتا ہے۔ اِس طول طویل یومیہ گردش کی وجہ سے عطارد کا ایک حصّہ انتہائی گرم جبکہ دوسرا حصّہ انتہائی سرد ہوتا ہے۔ عطارد کے حصّوں میں دن اور رات کے اوقات میں کوئی ایک ہزار سنٹی گریڈ کا فرق ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ماحول زندگی کے لئے سازگار نہیں ہوسکتا۔'' ("The Creation of the Universe"... Harun Yahya, p. 83)

''زمین دوسرے سیارگان سے کئی لحاظ سے مختلف ہے۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ وہ واحد سیارہ ہے جو زندگی کو سہارا دے سکتی ہے اور جو آکسیجن جیسی حیات بخش ہوا سے مالا مال ہے۔''

(Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science, Vol. 15, p. 1288)

(د) نظامِ شمسی: اِس میں نو سیّارے ہیں جو سورج کے گرد خلا میں محوِ گردش ہیں۔ اپنے مداروں کی بڑھتی ہوئی ضخامت کی ترتیب کے لحاظ سے اُن کے نام یہ ہیں: عطارد (Mercury)' زہرہ (Venus)' زمین (Earth)' مرّیخ (Mars)' مشتری (Jupiter)' زُحل (Saturn)' یورے نَس (Uranus)' نیپچون (Neptune) اور پلوٹو (Pluto)۔ عطارد اور پلوٹو کے علاوہ باقی سب سیارگان ایک ہی مدار میں حرکت کرتے ہیں۔''

''ایک سیارے کے گرد ایک یا زیادہ چھوٹے ٹھوس اجسام حرکت کرتے ہیں جو سیٹلائٹ یا چاند کے نام سے موسوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ نَو میں سے سات سیارے ایسے ہیں جن کے گرد سیٹلائٹ (چاند) ہیں۔''

''جب زمین سے دیکھا جائے تو سیارے ستاروں کی طرح لگتے ہیں۔ سیاروں کی روشنی مستقل طور پر نکلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جبکہ ستارے جھلملاتے ہیں۔ چونکہ سیارے زمین سے نسبتاً زیادہ نزدیک ہیں' اس لئے اُن کی حرکت ستاروں کے پسِ منظر میں دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ ستارے بہت دُور ہیں لیکن وہ کسی بھی سیارے کی نسبت ہزاروں گنا تیز گردش میں ہیں۔''

''سیاروں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: اندرونی (یا ارضی) سیارے اور بیرونی (جووِیَن) سیارے۔ ارضی (اندرونی) سیاروں میں عطارد' زہرہ' زمین اور مرّیخ ہیں جو جسامت میں ایک جیسے ہیں اور ان کی سطح چٹانی اور ٹھوس ہے۔ بیرونی سیارے جوپیٹر (مشتری) سے مشابہ ہیں اور اسی لئے انہیں جووِیَن نام دیا گیا

ہے۔ان کا زیادہ تر حصّہ گیس کا ہے۔ پلوٹو کے سوا باقی تمام بیرونی سیّارے زمین کے چاند کی جسامت کے ہیں۔''

''پلوٹو اور نیپچون زمین سے اتنی دُور ہیں کہ دُوربین کے بغیر نہیں دیکھے جا سکتے۔ دیگر سیّارگان کو رات کے وقت آسمان پر دیکھا جا سکتا ہے۔ عطارد (Mercury) چونکہ سورج کے قریب ہے' اُسے غروبِ آفتاب کے بعد یا طلوعِ آفتاب سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے دیکھا جا سکتا ہے۔'' (ایضاً ص ص ۱۲۸۵'۱۲۸۶)

مندرجہ ذیل آیات میں سَماءِ دُنیا (نچلا آسمان) سے مراد واضح طور پر نظامِ شمسی ہے:

(i) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨ الْكَوَاكِبِ ۝ (الصّٰفّٰت : ٦)

''بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی آرائش کے ساتھ مزیّن کیا ہے۔''

(ii) وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا (حٰمٓ السجدة : ١٢)

''اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو فانوسوں کے ذریعے زینت بھی دی اور حفاظت بھی کی۔''

''نظامِ شمسی کی تشکیل میں ہمیں توازن کی ایک اور خوبصورت مثال ملتی ہے۔ سیّارے کی مرکز گریز قوّت (Centrifugal Force) کے مابین توازن بمقابلہ اس کے پرائمری کی کششِ ثقل۔ (علمِ فلکیات میں پرائمری وہ چیز ہے جس کے گرد کوئی جسم گھومتا ہے۔ زمین کی پرائمری سورج ہے اور چاند کی پرائمری زمین ہے) اِس توازن کے بغیر نظامِ شمسی کی ہر چیز بیرونی خلا کی سرد گہرائیوں میں اُڑ جائے گی۔ اِن دو قوّتوں کے درمیان باہمی توازن کا نتیجہ اُن راستوں (Orbits) کی صورت میں نکلتا ہے جو سیّارے اور دوسرے اجسام اُن کی پرائمری پر حرکت کرتے ہیں۔ اگر کوئی جسم سست رفتاری سے حرکت کرے تو وہ پرائمری میں گر جائے گا اور اگر بہت تیزی سے چلے تو پرائمری اسے پکڑ نہیں سکے گی اور وہ اُڑ کر خلا میں جا پڑے گا' جبکہ ایسا نہیں ہے بلکہ توازن کی برقراری کے لئے ہر جسم ایک مناسب رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہ توازن ہر جسم کے لئے مختلف ہوتا ہے کیونکہ سورج سے سیّاروں کا فاصلہ مختلف ہے۔ یہی حال اُن کی جسامتوں کا ہے۔ اسی لئے اُن کی مداروی رفتاریں مختلف ہوتی ہیں کہ نہ تو وہ سورج میں گرنے پائیں اور نہ ہی خلا میں اُڑ جائیں۔''

''مادیت پر مبنی علمِ فلکیات کے ماہرین کا خیال ہے کہ نظامِ شمسی کی ابتداء و بقاء کو ڈارون کے ''اتفاقی نظریہ'' کے ذریعے واضح کیا جا سکتا ہے۔ پچھلی تین صدیوں سے اِس نظریہ کے بہت سے حامیوں نے اِس پر غور و خوض کیا کہ یہ معجزاتی نظام کیسے معرضِ وجود میں آیا اور وہ کوئی نتیجہ پانے میں ناکام رہے ہیں۔ ایک مادّہ پرست شخص کے لئے نظامِ شمسی کا توازن اور اس کا نظم و ضبط ناقابلِ توضیح راز ہیں۔''

''کیپلر اور گلیلیو جیسے ماہرینِ فلکیات اُن لوگوں میں اوّلین تھے جنہوں نے یہ اعلیٰ ترین توازن دریافت کیا اور تسلیم کیا کہ یہ شعوری اور اِرادی نظام ہے اور تمام کائنات میں الٰہی عمل دخل کی علامت ہے۔'' ("The Creation of the Universe" ... Harun Yahya, pp. 73, 76)

''سر آئزک نیوٹن کو ایک جگہ پر یہ لکھنا پڑا : سورجوں، سیّاروں اور دُمدار ستاروں کا یہ عظیم الشان نظام کسی مقتدر، ذہین اور طاقتور ہستی سے ہی وجود میں آ سکتا تھا۔۔۔ وہ اُن سب پر حکمرانی کرتا ہے، ایک رُوح کے طور پر نہیں بلکہ سب کے آقا کے طور پر۔ اور اُس کے اس مقتدر ہونے کے باعث اُسے ''خداوندِ عظیم'' کہا جاتا ہے۔'' ("God and the New Cosmology : The Anthropic Design Argument" ... Michael A. Corey, p. 259) 1993 Edition.

''نظامِ شمسی میں زمین کا مقام : اِس حیران کن توازن کے علاوہ نظامِ شمسی اور کائنات میں زمین کا مقام اس بات کی ایک اور شہادت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تخلیق کا عمل ہر طرح مکمل طور پر کیا ہے۔''

''بعد کی فلکیاتی تحقیقات زمین کے لئے دوسرے سیّاروں کے وجود کی اہمیّت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً مشتری (Jupiter) کی جسامت اور حیثیت بہت نازک ہے۔ فلکی طبعیات کے اَعداد و شمار یہ ظاہر کرتے ہیں کہ نظامِ شمسی میں سب سے بڑے سیّارے کی حیثیت سے مُشتری کے ذریعے زمین اور باقی تمام سیّاروں کے مدار کو استحکام ملتا ہے۔ زمین پر مُشتری کے حفاظتی کردار کی وضاحت جارج ویتھرل نے اپنے مضمون میں یوں کی ہے:

''اگر بڑا سیارہ مُشتری نہ ہوتا تو ماضی میں ستارے، دُمدار ستارے اور شہابیے ہزاروں مرتبہ زمین سے ٹکرا چکے ہوتے۔ اگر مشتری نہ ہوتا تو ہم نظامِ شمسی کی ابتداء تک کا مطالعہ نہ کر پاتے۔'' ("How Special is Jupiter!" --- George W. Wetherill, Vol. 373, p. 470, quoted by H. Yahya)

''مختصراً یوں کہہ لیجئے کہ نظامِ شمسی کی تشکیل خصوصی حیاتِ انسانی کے لئے کی گئی۔''
("The Creation of the Universe" ... Harun Yahya, p. 76)

''کائنات میں نظامِ شمسی کا مقام: ہمارا نظامِ شمسی کہکشاں کے عظیم مرغولہ دار، اُفقی ہاتھوں میں واقع ہے جو مرکز کی نسبت اس کے کنارے سے زیادہ قریب ہے۔ اِس میں کیا افادیت ہے؟ مائیکل ڈینٹن (Michael Denton) نے اس کی وضاحت یوں کی ہے:۔

''کائنات کے بارے میں جو حیران کُن بات دکھائی دیتی ہے وہ یہ نہیں کہ یہ محض ہمارے وجود و حیات کے لئے انتہائی ضروری ہے بلکہ ہماری فہم کے لئے بھی۔۔ چونکہ ہمارا نظامِ شمسی کہکشاں کے دائرے کے بالکل کنارے پر واقع ہے' اس لئے ہم رات کے وقت دُور کی کہکشاؤں کو بھی دیکھ سکتے ہیں اور ہمیں کائنات کی مجموعی ساخت کا بھی علم ہو سکتا ہے۔ اگر ہم کہکشاں کے درمیان ہوتے تو ہم مرغولے دار کہکشاں کے حُسن کو نہ دیکھ پاتے اور نہ ہی ہمیں اپنی کائنات کی ساخت کا تصور تک حاصل ہوتا۔''

("Nature's Destiny"... Michael Denton, p. 262 quoted by Harun Yahya)

''کچھ لوگ اپنی کم علمی یا تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے اس عالمگیر سچائی کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ تمام شکوک و شبہات اور خود ساختہ مفروضات کو ترک کر دینے سے ہم لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کائنات کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانی حیات کے لئے موزوں طور پر بنایا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلاً ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا (صٓ:۲۷)

''اور ہم نے آسمان اور زمین اور جو اُن کے درمیان ہے' بے حکمت پیدا نہیں فرمایا' یہ تو اُن لوگوں کا خیال ہے جو کافر ہیں۔''

''یہاں مؤمن اور کافر کے بنیادی نقطۂ نظر کا فرق بیان کر دیا۔ مؤمن کی نظر میں تکوینی مصلحتوں اور حکمتوں کا جلوہ حوادثِ کائنات کے ایک ایک جزئیہ سے نمایاں رہتا ہے۔ بخلاف اس کے جس کا ایمان ہی نہیں' وہ اس سارے کارخانہ کو بس مادّی ہی قوانین کا محکوم و تابع سمجھتا ہے اور اُس کی نظر سے مقصدی حکمتیں بالکل گم ہو جاتی ہیں۔'' (اُردو تفسیر عبدالماجد دریابادی' حاشیہ صفحہ ۹۱۰)

''<u>شمسی توانائی</u>: سورج جوہری توانائی کا ایک انتہائی عظیم تعامل گر (Reactor) ہے' جو مستقل طور پر ہائیڈروجن کو ہیلیم میں تبدیل کرتا رہتا ہے اور اپنے اِس عمل میں حرارت پیدا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اسی لئے سورج کے لئے سورہ یونس کی آیت ۵ میں ضیـــاء کا لفظ استعمال کیا ہے جو روشنی اور حرارت دونوں کو شامل ہے جبکہ نور کے لفظ میں جو چاند کے لئے اُسی آیت میں استعمال ہوا' یہ بات نہیں۔

دنیا کو توانائی کے ایک ایسے ذریعے کی ضرورت ہے جو صاف ہو' ختم نہ ہونے والا ہو' جس کی پیش بینی کی جا سکے' فوری طور پر دستیاب ہو اور اُن تمام لوگوں کے لئے ہو جو اُس کے استعمال کے فن سے واقف ہوں۔ بحمدہ تعالیٰ ہمارے پاس پہلے ہی سے توانائی کا ایک ذریعہ سورج کی شکل میں موجود ہے۔ ایندھن کے سنگوارے (fossils) جن

پر ہم انحصار کرتے ہیں، اور جسے پودے استعمال کرتے ہیں، وہ بھی بالآخر سورج کی تابکار توانائی سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ شمسی توانائی سے براہِ راست فیض یاب ہونا ہمارے لئے زیادہ مفید ہوگا بہ نسبت اس کے کہ ہم پودوں پر انحصار کریں کہ وہ کوئلہ، تیل اور گیس کی طرح توانائی کو قابلِ استعمال حالت میں لے آئیں۔''

''شمسی توانائی کے براہِ راست استعمال کا تصوّر کوئی نیا نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم یونانی فلسفی ارشمیدس نے سورج کی کرنوں سے توانائی حاصل کر کے ایک حملہ آور بحری بیڑے کو آگ لگا دی تھی۔ اُس نے آئینوں کے استعمال کے ذریعے حدّت میں شدّت پیدا کی۔ ۱۹۷۰ء سے جب توانائی کے دباؤ کے ذرائع کا ظہور ہوا، شمسی توانائی کو ممکنہ ایندھن کے متبادل کے طور پر استعمال کرنے کی طرف توجہ مبذول ہوگئی ہے۔''

''سورج توانائی کا انتہائی طاقتور ذریعہ ہے۔ وہ توانائی جو فی الواقع زمین پر پہنچتی ہے، وہ تقریباً ۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۴ کلوواٹ رگھنٹے یومیہ ہے۔ یہ عظیم تعداد ریاستہائے متحدہ امریکہ کی برقی توانائی پیدا کرنے کی استعداد سے پچاس لاکھ گنا (زیادہ) ہے۔''

''وہ طریقے جن کے ذریعے شمسی توانائی کو برقی توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے یہ ہیں: اِشعاعی توانائی خلیے، شمسی بیٹری، پن چکیاں اور شمسی کولیکٹرز۔'' ("The New Book of Popular Science" Vol. 2, pp. 346-347)

''<u>خوش آہنگ جوہری توانائی سورج کا جوہری ردِّعمل ہلکا کر دیتی ہے</u>: اگر سورج دھماکے سے اُڑ جائے تو تمام دنیا اور مافیہا بھڑکتے شعلوں کی نذر ہو جائے اور چند ہی سیکنڈوں میں ہمارا یہ نیلگوں سیّارہ (زمین) بھسم ہو کر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ چونکہ اِس طاقتور جوہری توانائی کو خوش آہنگ بنایا گیا ہے کہ نہ تو یہ بہت زیادہ طاقتور ہے اور نہ ہی کمزور، سورج کا جوہری ردِّعمل بہت سست پڑ جاتا ہے اور یہ روشن سیّارہ (یعنی سورج) کروڑہا سال سے روشنی اور توانائی کی تابکاری کر رہا ہے۔ اس کی یہی خوش آہنگی انسانوں کو زمین پر رہنے کے قابل بناتی ہے۔ اگر اس کے انتظام میں ذرّہ بھر بھی خرابی ہوتی تو سیّارے (بہ شمول ہمارے سورج کے) اپنے وجود کو برقرار نہ رکھ سکتے اور اگر ایسا ہو بھی جاتا تو وہ تھوڑے ہی وقت میں پھٹ جاتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ سورج کا ڈھانچہ نہ تو حادثاتی یا اتفاقی ہے اور نہ ہی غیر ارادی۔ بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے سورج کو انسانی زندگی کی موزونیت کے لئے بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍo (الرحمٰن: ۵) [''سورج اور چاند (حساب کے) پابند ہیں۔'']

''فضا جو زمین کا تحفظ کرتی ہے : سورج کی کچھ کرنیں زمین پر زندگی کے لئے مضر ہیں۔ اِس مضر اثر سے بچانے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فضا کی شکل میں ایک خوش آئند اور کثیر المقاصد فلٹر (کشید کار) کا انتظام کیا ہے تا کہ وہ دنیا کو سورج کے تابکاری اثرات سے بچائے' وہ فلٹر زمین کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ زمین کی فضا مضر کرنوں کو چھاننے میں سو فیصد کامیاب ہے۔''

''فضا کی خاص تہوں کے ذریعے سورج کی کرنیں زمین پر صرف مطلوبہ مقدار میں پہنچتی ہیں کیونکہ فضا کے عوامل سے وہ کرنیں لہروں کی طوالت کے مطابق پہنچتی ہیں۔ ہماری فضا آلائش سے پاک ایک بڑے پلانٹ کی طرح ہے جسے اِن کرنوں کے کشید کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اپنی مخصوص ڈیزائننگ کی وجہ سے کشید کرنے کا یہ بے مثل عظیم نظام اِن عوامل کو بخوبی انجام دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کی تخلیق کی طرف سورۃ المؤمن کی آیت ۵۷ میں یوں توجہ دلائی ہے:۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَکْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَایَعْلَمُوْنَ o

''آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے سے یقیناً بڑھ کر (کام) ہے' لیکن اکثر آدمی (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے۔''

''سورج سے آنے والی شعاعیں مخصوص قسم کی ہوتی ہیں۔ اُن کے لئے کچھ خصوصیات کا حامل ہونا ضروری ہے تا کہ وہ فضائی ماحول سے نکل کر زمین تک پہنچ جائیں۔ بالکل اسی طرح فضا کی ایک خاص قسم کی ساخت ہے جو اِن شعاعوں کو گزرنے دیتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو نہ تو فضا کے وجود کی اور نہ ہی کرنوں کی موزونیت کی کوئی افادیت ہوتی۔ چونکہ فضا میں قدرتی طور پر ان شعاعوں کو گزارنے کی صلاحیت ہے اس لئے یہ شعاعیں بہ آسانی زمین پر پہنچ جاتی ہیں۔ ایک اور اہم نکتے کے بیان کرنے کی بھی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جہاں فضا اِن کشید شدہ حیات بخش شعاعوں کو زمین پر آنے دیتی ہے' تو وہ باقی تمام تباہ کن شعاعوں کو زمین پر آنے سے روک دیتی ہے۔ اس طرح فضا سورج سے آئی ہوئی یا خلا میں واقع دوسرے ذرائع سے آئی ہوئی تباہ کن شعاعوں کے لئے ایک نہایت اہم کشید کار کی خدمت انجام دیتی ہے۔'' (Encyclopaedia Britannica, Vol. 18, p. 203) 15th Edition, 1994.

''یہ تمام حقائق اس بات کے شاہد ہیں کہ خالقِ کائنات نے ہر چیز صحیح تناسب کے ساتھ بنائی ہے جیسا کہ سورۃ الفرقان کی آیت ۲ میں ارشاد ہوا: وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا o

''اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر سب کا الگ الگ پیمانہ مقرر کیا۔''

کیسا بے مثال نظم ونسق ہے کہ نہ کوئی بدل سکے اور نہ بگاڑ سکے! مناسبت ایسی شاندار کہ ذرّہ بھر کی بیشی سے تباہی آجائے' موافقت ایسی پیاری کہ جس کو جو بنا دیا' اُسی میں اُس کی بقاء۔ جس کو جو کھلا دیا' اُسی میں اُس کی صحت وغذا۔ مگر اِن حقائق میں تو اہلِ ایمان ہی غور کرتے ہیں۔

''روشنی مادّے سے ٹکراتی ہے: سورج سے نکلنے والی روشنی زمین پر تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے پہنچتی ہے۔ روشنی کی اِس قدر تیز رفتاری کے باعث ہمیں پوری دُنیا رنگین نظر آتی ہے۔''

''آنکھ کے نور اور دیکھنے کی کیفیت سے اللہ کی وحدانیت پر استدلال: باوجودیکہ آنکھ کا قطر ایک قیراط سے بھی کم ہے لیکن پھر بھی اُس کے شبکیہ (Retina) پر اتنی بڑی زمین کی صورت پہاڑوں' وادیوں' چٹانوں' دریاؤں' درختوں' مکانات اور حیوانات کی جملہ اقسام کے ساتھ مرتسم ہو جاتی ہے۔ گویا شبکیہ دریا کا کنارہ ہے جس کی طرف نوری موجیں چاروں طرف سے چلی آتی ہیں اور کروڑوں کے کروڑوں ہی اُس کے پاس آ کر ٹوٹتے جاتے ہیں اور اپنا اپنا نقش بناتے جاتے ہیں۔۔۔۔ جب ہم آنکھ کی تشریح کی طرف متوجہ ہوں' اُس کے عضلات واعصاب کو اپنا اپنا کام کرتا دیکھیں اور اُس کی شریانوں اور وریدوں سے واقف ہوں جن سے اس کی پرورش ہوتی ہے اور رباطات اور رطوبات وغیرہ سے آگاہی حاصل کریں تو ہماری حیرت اور تعجب اور بڑھ جاتے ہیں کہ اُس حکیمِ مطلق اور عقلِ کُل نے آنکھ کی حفاظت اور اُس کے کام کے بہ آسانی انجام پانے کے لئے جو تدبیریں کی ہیں' وہ نہایت ہی مضبوط اور اعلیٰ درجے کی صناعی پر مبنی ہیں۔''

''پپوٹوں (Eyelids) اور ابرو (Eyelashes) کے فوائد: آنکھ انتہائی لطیف اور حساس عضو ہے۔ خارجی اجسام سے اُسے صدمہ پہنچنے کا بہت اندیشہ تھا' اس لئے اُس کے بنانے والے نے سوائے اُس طرف کے کہ جس میں صورت کے مُرتسم کرنے کے لئے نور داخل ہوتا ہے' باقی تمام اطراف سے محفوظ رکھنے کے لئے اُسے اُستخوانی حلقہ کے اندر رکھ دیا ہے اور اُس کا صلبہ نامی پہلا طبقہ لوچدار بنایا ہے تاکہ صدماتِ خارجیہ کا تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ علاوہ ازیں اُسے پپوٹوں سے بھی چھپا دیا ہے تاکہ وہ تمام اوقات بالخصوص سونے کے وقت محفوظ رہ سکے اور اُس سے زینت بھی حاصل ہو۔ پھر پپوٹوں کے کنارے پر اُس نے مژگان کو اُگا دیا ہے جو سیاہ رنگ کے کسی قدر دبیز' لوچدار اور کھڑے ہوئے بال ہوتے ہیں جن میں سے اوپر والے ذرا اوپر کی طرف اور نیچے والے نیچے کی جانب کو مائل ہوتے ہیں۔ اُن کے سیاہ ہونے میں حکمت یہ ہے کہ وہ اُس نور میں سے جو باہر سے آنکھ پر آ کر پڑتا ہے' کسی قدر چوس لیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس کی بھنوں اور مژگان کے بالوں کا رنگ سفید ہوتا ہے تو اُس کی آنکھ چُندھیا جاتی ہے اور وہ اپنی آنکھوں کو ذرا بند کر کے دیکھتا ہے۔''

''پلکوں کے بالوں کے دبیز اور لوچدار بنانے میں یہ حکمت ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے اجسام کا جو آنکھ پر گریں' مقابلہ کرسکیں کیونکہ مثلاً آنکھ پر جب مٹی کا کوئی ریزہ گرتا ہے تو وہ اکثر مژگاں پر واقع ہوتا ہے اور وہ بال جو تیر کی طرح بلند رہتے ہیں' اُسے اندر جانے سے روکتے ہیں بلکہ اپنی لچک سے اُسے دُور پھینک دیتے ہیں۔ یہ امر کہ اُوپر کی پلکوں کے بال اُوپر کی طرف اور نیچے کی پلکوں کے بال نیچے کی طرف کیوں مائل رکھے گئے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تاکہ جب پلکوں کا کھولنا منظور ہو تو آسانی سے کھل سکیں۔ کیونکہ اگر مژگاں کے بال بالکل سیدھے ہوتے تو پلکوں کے بند کرنے کے وقت ایک دوسرے پر منطبق ہو جایا کرتے اور آنسو کی تری سے چپٹ کر رہ جاتے تو پھر اُن کے جدا ہونے میں بڑی دقّت ہوتی۔ اور اگر کہیں وہ اس طرح پر قائم ہوتے کہ اوپر اور نیچے کی پلکوں کے بال ایک دوسرے میں داخل ہو جایا کرتے تو آنسوؤں کی رطوبت سے چمٹ جانے کی وجہ سے اُن کے جدا کرنے میں اور بھی زیادہ دقّت پیش آتی۔''

''ان سب فوائد سے اگر قطع نظر بھی کیا جائے تو مژگاں سے زینت حاصل ہونا ایک ایسا امر ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔۔۔۔علاوہ بریں آنکھ میں غبار کے جم جانے سے اُس کا ضرر بھی متصوّر تھا' اس لئے خدائے حکیم نے اُس کے صاف کرنے کا یہ انتظام کر رکھا ہے کہ آنسو کی گلٹیوں سے جو پلکوں کے اندر آنکھ کے ڈھیلے کے چاروں طرف پائی جاتی ہیں' کسی قدر آنسو نکلا کرے اور اُس کی وجہ سے آنکھ میں تراوٹ باقی رہے اور پلکوں کو کھلنے اور بند ہونے کے اعتبار سے تو خدا نے ایسا سریع بنایا ہے کہ اُن کی سرعت ضرب المثل بن گئی ہے۔ اس میں اصل مقصود یہ ہے کہ دیکھنے میں حرج واقع نہ ہو اور پراگندگی نہ آنے پائے۔ پس آنسو تو اُس غبار کو جو پُتلی پر واقع ہوتا ہے' دھو دیتا ہے اور پلکیں اپنی حرکت سے اُسے صاف کرتی ہیں اور غبار آلود آنسو کو دفع کر دیتی ہیں۔ پھر یہ آنسو جو غبار سے مل کر مَیلا ہو گیا ہے' اُس کا آنکھ سے کسی مناسب طریقہ سے نکلنا بھی ضروری ہے۔ پس اگر وہ پلکوں کے باہر نکل کر گالوں پر بہا کرتا تو چہرہ نہایت بدنما معلوم ہوتا اور گویا چہرے پر دو گندے نالے ہر وقت بہا کرتے۔ اس لئے خدائے حکیم نے ایسے گرد آمیز آنسوؤں کے پُتلی سے دُور کرنے کے لئے یہ انتظام کیا کہ اُس نے اندر سے پلکوں کے کنارے اس ڈھب سے بنائے جن سے یہ آنسو اس گوشۂ چشم کی طرف جو ناک سے ملا ہوا ہے' بہ آسانی بہہ سکیں۔ پھر اُس نے اس مقام پر ذرا اوپر کو سوراخ بنایا ہے جو کہ ناک کے اندر آر پار واقع ہے' اُسے قناتِ دمعیہ یا آنسو کے بہنے کی نالی کہتے ہیں۔ یہ آنسو کی راہ سے ہو کر ناک کے اندر پہنچتے ہیں اور اس کی رطوبت سے مل کر وہاں جم جاتے ہیں۔ پھر حیوانات اُسے ناک چھینک کر یا کسی اور طریقے سے نکال ڈالتے ہیں۔''

''ان سب حیران کُن معجزاتی کیفیات کو دیکھ کر بے اختیار زبان کہہ اٹھتی ہے کہ وہ ذی حکمت اللہ نہایت منزّہ اور سبُحان ہے جس کی قدرت کے کارخانوں کا چار دانگِ عالم میں مینا بازار سجا ہوا ہے۔''
(الرّسالۃ الحمیدیۃ۔۔ علّامہ حسین آفندی: اردو ترجمہ بہ عنوان ''سائنس اور اسلام'' ص ص ۳۱۶ تا ۳۱۹)

''<u>سورج اور چاند کے مدار</u>: سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۳ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

وَهُوَ الَّذِىْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ " فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ o

''وہ وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا فرمائے' سب (اپنے اپنے) دائرہ میں تیر رہے ہیں۔''

اس آیت میں فَلَكٌ کے لفظ کا ترجمہ 'مدار' کیا گیا ہے۔ دسویں صدی کے نامور مفسر علامہ طبری لکھتے ہیں کہ اگر ہمیں قرآن کی کسی بات کا علم نہ ہو تو ہمیں خاموش رہنا چاہئے۔ اس بیان کا صاف مطلب یہی ہے کہ سورج اور چاند کے مدار کا تصور جدید ہے اور حال ہی میں اسے دریافت کیا گیا ہے۔''

("The Bible, the Qur'an and Science"... Maurice Bucaille, p. 159)

آیتِ بالا (اور اسی طرح سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰) میں وارد ہونے والا لفظ يَّسْبَحُوْنَ سَبَحَ سے لیا گیا ہے' جو اپنے اندر کسی متحرک جسم سے اخذ کردہ حرکت کا تصور رکھتا ہے۔ تو اس لفظ کے بنیادی معنیٰ لینے سے نتیجہ یہ نکلا کہ سورج اور چاند (اور اسی طرح دیگر سیارے) ساکن نہیں بلکہ اپنے اپنے مدار میں گردش میں ہیں۔

ایک جدید ماہرِ فلکیات کا کہنا ہے: ''اگر آپ آسمان کو ایک یا دو گھنٹوں تک دیکھتے رہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ستارے آسمان کے آر پار مشرق سے مغرب میں سفر کرتے ہیں' بالکل ایسے ہی جیسے فوجیوں کا ایک گروہ نپے تلے قدموں سے چل رہا ہو جن کی پوزیشن ایک دوسرے کی نسبت سے تبدیل نہیں ہوتی۔ تقریباً اسی قسم کی صورت ہر رات کو ہوتی ہے۔ چاند بھی ستاروں کے ساتھ مشرق سے مغرب میں سفر کرتا ہے اور دن کے اوقات میں سورج بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ دن کے وقت ہم ستاروں کو دیکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ہمارے اِردگرد کا فضائی ماحول سورج کی روشنی کو منتشر کر دیتا ہے اور یوں ہم ستاروں کو سورج کی موجودگی میں دیکھ نہیں سکتے۔''

''<u>اجرامِ فلکی کی گردش گھڑی کی سُوئیوں کی دَوری حرکت کے مطابق (دائیں جانب) اور اس کے برعکس</u>: امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فضا میں تمام اجرامِ فلکی کی دَوری گردش دو طرح کی ہے: ایک گھڑی کی سُوئیوں کی طرح دائیں جانب اور دوسری گھڑی کی سُوئیوں کے مخالف (بائیں جانب)۔ پہلی قسم کی گردش کا ذکر سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۳ اور سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰ میں کیا گیا ہے جبکہ دوسری گردش خود آیت کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ اگر كُلٌّ " فِىْ فَلَكٍ کو معکوس (الٹ) طرح پڑھا جائے تو نتیجہ وہی كُلٌّ " فِىْ فَلَكٍ ہی ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اجرامِ فلکی کی گردش سیدھی (دائیں جانب) بھی ہے اور معکوس یعنی الٹی بھی۔

سب سے بڑھ کر اللہ کی روشنی ہے جو بے بہا حُسن کا حامل ہے۔ پھر چونکہ اللہ خود واجب الوجود ہے لہٰذا اُس کا حُسن بھی واجب الوجود ہے کیونکہ اُصولاً صفت کو موصوف سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔
خالقِ کائنات کے سراپا حُسن کی تعریف میں سعدؔی شیرازی یوں رطب اللسان ہیں:۔
''تیرے حُسن کی کوئی حد نہیں ہے۔ سعدؔی تعریف کرنا بند نہیں کرسکتا۔ وہ تو ایک ایسے پیاسے کی مانند ہے جو پیاس سے مر رہا ہے اور دریا بھی ساتھ ہی بہہ رہا ہے۔''

(۲) کائنات میں حُسن: اللہ ربّ العزّت بے مثل و بے مثال حُسن کا مظہر ہے اور اُس نے کائنات کی ہر ہر شے کو حیران کُن طور پر حسین پیدا کیا ہے جیسا کہ درجِ ذیل آیت میں فرمایا:

اَلَّذِیٓ اَحۡسَنَ کُلَّ شَیۡءٍ خَلَقَہٗ (اَلسَّجدۃ: ۷)

''وہ وہی تو ہے جس نے جو بھی چیز بنائی، خوب ہی بنائی۔''

اللہ کی تخلیق بذاتِ خود ہر طرح مکمل اور شاندار ہے جس میں کوئی بھدا پن اور بے ترتیبی نہیں ہے۔ اگر انسان میں کسی قسم کا بھدا پن یا بے ترتیبی راہ پا گئے ہیں تو یہ انسان کے اپنے اختیار و عمل کے غلط استعمال سے آئے ہیں نہ کہ رضائے الٰہی سے۔ اور یہ شاندار وصف جو کائنات میں ہمیں نظر آتا ہے، درجِ ذیل ذیلی عنوانات کی طرف ہمیں لے آتا ہے:۔

(الف) ترتیب اور تکمیل: الٰہی تخلیق کے کسی بھی مرحلے یا عمل میں کہیں بھی کوئی بے ترتیبی، خامی یا غلطی یا جھول پن نظر نہیں آتے۔ قرآن حکیم نے کئی مقامات پر اِس حقیقت کو آشکار کیا ہے:۔

(۱) شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَالۡمَلٰٓئِکَۃُ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًا بِالۡقِسۡطِ (آلِ عمران: ۱۸)
(۲) فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ٥ (المؤمنون: ۱۴)
(۳) صُنۡعَ اللّٰہِ الَّذِیٓ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ (اَلنَّمل: ۸۸)
(۴) لَا الشَّمۡسُ یَنۡۢبَغِیۡ لَہَاۤ اَنۡ تُدۡرِکَ الۡقَمَرَ وَلَا الَّیۡلُ سَابِقُ النَّہَارِ (یٰسٓ: ۴۰)
(۵) مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ (المُلک: ۳)
(۱) ''اللہ کی گواہی ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، اور فرشتوں اور اہلِ علم کی بھی گواہی یہی ہے اور وہ عدل سے انتظام رکھنے والا معبود ہے۔''
(۲) ''اللہ تمام صنّاعوں سے بڑھ کر کیسی شان والا ہے!''
(۳) ''یہ کاریگری اللہ ہی کی ہے جس نے (اپنی حکمت سے) ہر چیز کو مضبوط بنا رکھا ہے۔''
(۴) ''نہ آفتاب کی مجال ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔''
(۵) ''تو (خدائے) رحمٰن کی صنعت میں کوئی فتور نہیں دیکھے گا۔''

نوٹ: ایسا لفظ جسے سیدھا یا اُلٹا کر کے پڑھا جائے اور اُس کے حروف کی ترتیب بھی وہی رہے تو اس کے معانی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ادب کی اصطلاح میں اسے مقلوب مستوی (Palindrome) کہتے ہیں۔ ہر زبان میں ایسے الفاظ کی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے اُردو میں داماد، درد۔ انگریزی میں Civic, Madam, Radar اور عربی میں تَبَّتْ ؛ رَبَّكَ فَكَبِّرْ۔

''دن اور رات کی معیّن ترتیب: ارشادِ باری تعالیٰ ہے :۔

(i) يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ' حَثِيْثًا (الاعراف : ۵۴)

''وہ ڈھانپ لیتا ہے رات سے دن کو' وہ جلدی سے اُسے آلیتی ہے۔''

يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَار یعنی جس فضا کو دن نے روشن کیا تھا' اُسے رات تاریک کر دیتی ہے اور جس فضا کو رات نے تاریک کیا تھا' اُسے دن روشن کر دیتا ہے۔ حَثّ کے عام معنیٰ جلدی و تیزی کے ہیں۔ يَطْلُبُه' حَثِيْثًا یعنی دن آناً فاناً گزرتا معلوم ہوتا ہے حتّٰی کہ دفعتہً رات آجاتی ہے۔ یا یہ کہ ایک گیا اور دوسرا فوراً آگیا' بیچ میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔

نوٹ: سورج ڈوبتے ہی تاریخ بدل جاتی ہے۔ یہ نکتہ لَیل (رات) کو نَہار (دن) سے پہلے لانے سے حاصل ہوا۔

(ii) أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ (لقمٰن : ۲۹)

''(اے مخاطب!) کیا تو نے اس پر نظر نہیں کی کہ اللہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا رہتا ہے؟''

رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرنے سے مراد یا تو رات دن کا گھٹنا بڑھنا ہے کہ گرمیوں میں دن بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں اور سردیوں میں اس کے برعکس' یا اس سے مراد دن رات کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا جانا ہے۔

(iii) وَآيَةٌ" لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَإِذَاهُمْ مُّظْلِمُوْنَ ۝ (یٰسٓ:۳۷)

''اور اُن لوگوں کے لئے ایک نشانی رات بھی ہے' ہم اُس پر سے دن کو اتار لیتے ہیں تو وہ یکایک اندھیرے میں رہ جاتے ہیں۔''

بھیڑ بکری کو ذبح کرنے کے بعد اُس کی کھال اتارنے کو سَلخ کہتے ہیں۔ دن کے وقت روشنی کا جو لبادہ دنیا کو پہنایا جاتا ہے' رات کے آنے پر اُس لبادے کو اتار لیا جاتا ہے یہاں تک کہ ہر طرف سیاہی پھیل جاتی ہے۔

(iv) يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ (الزُّمَر : ۵)
''وہ رات کو دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے۔''

كَوَّرَ (يُكَوِّرُ) کا معنیٰ لپیٹنے اور بَل دینے کا ہے جس کا مفہوم کسی کروی (گول) شکل کی چیز پر کسی چیز کو لپیٹنے کا ہے جیسے روئی کے ریشے کو تکلی پر لپیٹنا یا پگڑی کو بل دے کر سر کے گرد لپیٹنا۔ قرآن مجید کے بیان کا یہ انداز صاف بتا رہا ہے کہ زمین اپنی شکل اور ہیئت میں گول ہے۔

دن اور رات کی ترتیب کے تصور کے علاوہ جن کا اوپر ذکر ہوا' قرآنِ حکیم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ مشرق اور مغرب دو ہیں جیسا کہ سورۃ الزُّخرُف: ۳۸ اور سورہ الرّحمٰن: ۱۷ میں بیان ہوا۔ اوّل الذکر آیت میں مشرق و مغرب کے درمیان حد درجہ فاصلہ کا بیان کرنا مقصود ہے:۔

(۱) حَتّٰى إِذَا جَآءَنَا قَالَ يٰلَيْتَ بَيْنِي وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ٥
''یہاں تک کہ جب وہ (اندھا کافر) ہمارے پاس آئے گا تو وہ (شیطان) کہے گا اے کاش! میرے اور تیرے درمیان دو مشرقوں (یعنی مشرق و مغرب) کی دُوری ہوتی' سو وہ کیسا ہی بُرا ساتھی ہے!''

انکشافِ حقیقت کے وقت انسان بہ صد حسرت و ندامت کہے گا کہ کیوں شیطان کا ساتھی بنا لیکن اُس وقت سب بے کار ہوگا۔ ایک حدیث میں فرمایا کہ کافر کا شیطان خواب و خُور میں اُس کا شریک رہتا ہے اور مؤمن کا شیطان منتظر رہتا ہے کہ کب اُسے غفلت ہو اور اُسے دبوچ لے۔ حَتّٰى إِذَا جَآءَنَا میں یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ تغافل اور یہ مغالطہ بس دُنیوی زندگی تک ہی رہتا ہے' اس زندگی کے ختم ہوتے ہی کشفِ حقائق ہونے لگتا ہے۔

(۲) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ٥ (اَلرَّحمٰن : ۱۷)
''دونوں مشرقوں کا پروردگار ہے اور دونوں مغربوں کا پروردگار ہے۔''

مَشْرِقَيْن اور مَغْرِبَيْن کے صیغہ تثنیہ سے مراد چاند اور سورج کے طلوع ہونے والے دو اُفق اور انہی دونوں کے غروب ہونے والے دو اُفق ہیں۔ محض سورج ہی کے دو مشرق اور دو مغرب (سردی اور گرمی کی فصلوں کی مناسبت سے) بھی مراد ہو سکتے ہیں (تفسیر کبیر)

انسانوں اور جنّات کے لئے دو مشرقوں اور دو مغربوں میں یہ خصوصی نعمت ہے کہ اگر ہر روز ایک ہی مشرق اور مغرب ہوتا اور سردیوں اور گرمیوں کا ایک ہی مشرق اور مغرب ہوتا اور دن اور رات ہمیشہ برابر ہوتے تو لوگ اس مسلسل یکسانیت کی وجہ سے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتے' نیز سارا سال ایک ہی موسم رہتا اور اس میں تنوع نہ ہوتا اور جب موسمی تغیرات نہ ہوتے تو کاشتکاری صحیح نہ ہوتی' فصلیں نہ پکتیں' سارا سال ایک ہی قسم کے پھل ہوتے اور سردیوں اور گرمیوں کے الگ الگ پھل اور الگ الگ اناج نہ ہوتے اور انسان کی نشوونما کے لئے اور اس کی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے مختلف موسموں کی مختلف غذائیں حاصل نہ ہوتیں۔

سورۃ المعارج کی آیت ۴۰ سے معلوم ہوا کہ مشرق اور مغرب ایک نہیں بلکہ کئی ہیں :
فَلَآ أُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ٥ عَلٰىٓ اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ
''سو میں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی قسم کھاتا ہوں کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ ہم اُن (مشرکین) کی جگہ اُن سے بہتر لوگ لے آئیں۔''

سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں اور سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے بھی اتنے ہی مقام ہیں۔ آج ۱۶ مئی کو سورج مشرق کے جس زاویے سے طلوع ہوا' کل ۱۷ مئی کو اس زاویے سے طلوع نہیں ہوگا۔ اسی طرح آج ۱۶ مئی کو سورج مغرب کے جس زاویے میں غروب ہوا' کل ۱۷ مئی کو اُس زاویے میں غروب نہ ہوگا۔ معلوم ہوا کہ ہر روز کا ایک الگ مشرق اور ایک الگ مغرب ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جمع کے صیغہ کے ساتھ مَشارق اور مَغارِب فرمایا۔ سورۃ البقرۃ کی آیات ۱۱۵' ۱۴۲ میں مشرق اور مغرب کا واحد کے صیغہ کے ساتھ بھی ذکر ہے۔

<u>کہکشائیں</u> : ہر کہکشاں ہزاروں بلکہ لاکھوں ستاروں پر مشتمل ہوتی ہے اور ان میں بین النجوم سیّاروں کا رابطہ ہوتا ہے۔ یہ خیال بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری کہکشاں بھی ایک خاص قسم کی ہے اور ہمارا سورج ایک عام سیّارہ ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ کہکشائیں گروہوں کی شکل میں جمع ہوتی ہیں اور ہر گروہ دوسرے گروہ سے پیچھے ہٹتا ہے تاکہ پوری کائنات پھیلتی جائے۔ ان کہکشاؤں میں فاصلے بہت زیادہ ہیں اور جدید تکنیک کی رُو سے معلوم ہوا ہے کہ یہ تقریباً پانچ اَرب نوری سال ہیں۔'' (Hutchinson 20th Century Encyclopaedia, pp. 1255-1256)

نوٹ : نوری سال وہ فاصلہ ہے جو ایک سال میں روشنی کرتی ہے۔ یہ فاصلہ ۵٬۸۸۰٬۰۰۰٬۰۰۰٬۰۰۰ میل ہے۔

آسمانوں کی کہکشاؤں کی قسم کھاتے ہوئے قرآن مجید فرماتا ہے:
وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ٥ اِنَّكُمْ لَفِىْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ٥ (اَلذّٰرِيٰت : ۷' ۸)

"کہکشاؤں والے آسمان کی قسم! تم مختلف گفتگوؤں میں (پڑے) ہو"

خطاب کفارِ مکّہ سے ہے جو سیّدنا محمد ﷺ اور قرآن مجید کے متعلق مختلف باتیں کرتے تھے اور عقیدہِ حشر کا کوئی تو انکار کر رہا ہے اور کوئی اس کے متعلق گومگو اور تذبذب میں پڑا ہوا ہے اور کسی نے اس سے دنیا میں نیا جنم مراد لے کر اسے مسخ ہی کر ڈالا ہے۔

Fred Hoyle کو مجبوراً تسلیم کرتے ہوئے یہ کہنا پڑا:۔

"حقائق کی ایک عام فہم تشریح یہ ہے کہ ایک اعلیٰ و ارفع ذہن نے طبعیات (Physics)، کیمیا (Chemistry) اور حیاتیات (Biology) کے ساتھ کھیل کھیلا ہے اور یہ بھی کہ فطرت میں کوئی ایسی اندھی قوّتیں نہیں ہیں جن کے بارے میں کوئی بات کی جائے۔ اِن حقائق سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اعداد و شمار اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کے نتیجے پر کوئی سوال نہیں کیا جا سکتا۔" ("The Universe : Past and Present Reflections" Quoted in "Engineering and Science" Nov., 1981, pp. 8-12)

ہارون یحییٰ لکھتے ہیں: "دو مختلف اور متضاد قوّتیں یہاں برسرِ عمل ہیں: قوّتِ انفجار (Explosion) جو مادّے کو باہر اور دُور دھکیلتی ہے اور قوتِ جاذبیّت (Attraction) جس کا کام مزاحمت اور مدافعت کرنا ہے اور جو ہر چیز کو اندر کی طرف کھینچتی ہے۔ کائنات معرضِ وجود میں یوں آئی کہ دونوں قوّتیں متوازن تھیں۔ اگر قوّتِ جاذبیت، قوّتِ انفجار سے زیادہ ہوتی، تو کائنات شکستگی اور تعطّل کا شکار ہو جاتی اور اگر اس کے برعکس ہوتا تو مادّہ تمام اطراف میں یوں پھیلتا کہ اس کا یک جا ہونا کبھی بھی نہ ہو سکتا۔" ("The Creation of the Universe", p. 33)

فلکی طبعیات (ASTROPHYSICS): ہم علمِ فلکیات کو عمومی طور پر (Astrometry) اور (Astrophysics) میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّل الذکر کا تعلق اجرامِ فلکی کی ہیئتوں اور حرکات سے ہے اور مؤخر الذکر کا تعلق اجرامِ فلکی کی طبعی ہیئت اور تشکیل سے ہے لیکن ان دونوں کے درمیان کوئی حدِّ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ فلکی طبعیات کے اعداد و شمار اکثر نجوم پیائی کے طریقے سے اور نجوم پیائی کے اعداد و شمار فلکی طبعیات کے طریقے سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ فلکی طبعیات کو "جدید علمِ فلکیات" بھی کہا جاتا ہے۔ یہ محض اجرامِ فلکی سے متعلق علم کی فطری ترقی کی نمائندگی کرتا ہے جو مشاہدوں کے نئے طریقوں کے

استعمال کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ اِن مشاہدوں میں سپیکٹروسکوپ' فوٹوالیکٹرک سیل' تھرموکپل' فوٹوگرافک پلیٹ وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے اور اسے ایٹمی طبعیات میں واقع ہونے والی جدید پیش ہائے رفت سے تحریک ملتی ہے۔" (Encyclopaedia Britannica, Vol. 2, p. 590)

علمِ فلکیات سے متعلق ہمیں سورۃ الْوَاقِعَۃ کی آیات ۷۵'۷۶'۷۷ میں اشارہ ملتا ہے جن میں فرمایا:۔
فَلاَ أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ٥ وإنَّه' لَقَسَم ''لَّوتَعلَمُونَ عَظِيمٌ''٥ اِنَّه' لَقُرآن'' كَرِيمٌ'٥
''سو میں ستاروں کے ڈوبنے کی قسم کھاتا ہوں اور اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے کہ یہ ایک معزز قرآن ہے۔''

لاَ یہاں نفی کا نہیں' تاکید کا ہے (بیضاوی' کشاف)۔

کائنات میں دو قسم کے کونی مقامات پائے جاتے ہیں جن میں ستاروں کی خصوصیات نہیں ہوتیں:۔
''(۱) روزنِ سفید (White Holes ... Quasars): یہ ستاروں کی مقام بندی کا ایک ناقابلِ یقین توانائی کا ذخیرہ ہے۔ ایک روزن میں اتنی توانائی ہوتی ہے کہ ایک کہکشاں بنتی ہے (اور کہکشاں اربوں ستاروں کے مجموعے کا نام ہے) روزن کہکشاں کے لئے تخم ریزی کی زمین ہے جس سے اربوں ستاروں پر مشتمل کہکشاں جنم لیتی ہے۔''

''(۲) روزنِ سیاہ (Black Holes): یہ روزن اس مقام بندی کی اہمیت کو اُجاگر کرتے ہیں جو کسی ستارے کے ختم ہونے سے خالی ہوگئی ہو۔ لیکن جب ایک ستارہ ختم ہوتا ہے تو ہوتا کیا ہے؟ اس سوال کا جواب جانے بغیر اِن روزنوں کو سمجھنا ناممکن ہے یعنی ستاروں کی وہ مقام بندی جس کا آیتِ بالا ۷۵ میں ذکر ہوا ہے۔''

''یہ بات معلوم ہے کہ ستارے بے شمار ایٹموں سے بنائے گئے ہیں۔ الیکٹران اِن ایٹموں کے مرکزی نقطے کے گرد گھومتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں ہر ستارہ ایک خاص جسامت والا ہو جاتا ہے۔ کسی ستارے کی موت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ توانائی جو اُس جسامت میں موجود تھی' ختم ہوگئی ہے۔ جب ایک ستارہ مرجاتا ہے تو وہ اپنی ہی کششِ تجاذب کے دباؤ تلے دَب جاتا ہے یہاں تک کہ صرف نیوکلیائی کے ایٹم بچ جاتے ہیں اور جیسے جیسے نیوکلیائی ایک کے اوپر ایک کر کے انبار لگاتے چلے جاتے ہیں' ستارہ سکڑتا چلا جاتا ہے۔ ستارہ جب سکڑتا ہے تو وہ اپنی اصل جسامت سے لاکھوں گنا کم ہو کر سکڑتا ہے اور مادے میں کوئی اہم تبدیلی بھی رُونما نہیں ہوتی۔ اگر کوئی مرتا ہوا ستارہ سورج کی جسامت جتنا چھوٹا ہو' تو یہ نابض بن جاتا ہے۔ نابض ایک ایسا وجود ہے

جس سے ہر ۰ء۳ سیکنڈ میں ایکس ریز خارج ہوتی ہیں۔ اس کے اخراج کی حرکت نبض کی طرح ہوتی ہے۔ اور اسی لئے اسے نابض (Pulsar) کہا جاتا ہے۔ ایک ستارہ اپنے ہی مدار کے گرد کروڑوں کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کرتا ہے لیکن یہ اس قدر سکڑ جاتا ہے کہ نظر نہیں آ سکتا۔''

''اگر مرتا ہوا ستارہ بڑا ہو تو کششِ تجاذب اتنی شدید ہوتی ہے کہ یہ اپنی نیوکلیائی سطح پر رک نہیں سکتی اور جاری رہتی ہے یہاں تک کہ تمام مادّہ اور توانائی سکڑ کر اُس مقام تک آ جاتے ہیں جسے انفرادیت Singularity کہا جاتا ہے۔ یہ انفرادیت ایک کائناتی سیاہ روزن تشکیل دیتی ہے۔ اس روزن کو کسی بھی طریقے سے نہیں دیکھا جا سکتا لیکن اسے اس کی مندرجہ ذیل خصوصیات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے:۔

(۱) یہ قریب سے گزرنے والے سب ستاروں اور ریڈیائی لہروں کو نگل جاتا ہے۔

(۲) اس سے بالواسطہ طور پر گاما ریز اور ایکس ریز ابھرتی ہیں۔

(۳) اس کے قرب میں وقت اچانک پھیل جاتا ہے۔''

بہ الفاظِ دیگر یہ روزنِ سیاہ ایک ستارے کا پُر اَسرار مرقد ہے۔ یہ تمام مادّی چیزوں کو بشمول وقت' اپنے اندر کھینچتا ہے اور چھپا لیتا ہے۔ John A. Wheeler نے اِنہی مقام بندیوں کے باعث ''روزنِ سیاہ'' (Black Holes) کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔''

''طبعی نقطہ نگاہ سے یہ مقامات وہ علاقے ہیں جہاں کششِ تجاذب ختم ہو جاتی ہے۔ ہر وہ چیز جو اُن کے پاس سے گزرے' تباہ ہو جاتی ہے۔ کچھ سائنسدانوں نے اِن مقامات کی سائنسی توجیہ کی ہے اور اُنہیں کائنات میں توازن کے علاقے تصوّر کیا ہے۔''

''ایک ستارے کا توازن اس طرح برقرار رہتا ہے کہ ایک طرف تو جوہری ردِّ عمل میں پھیلاؤ ہو تو دوسری طرف شدید کششِ تجاذب ہو۔ کائنات میں کروڑوں بلکہ اَربوں ستاروں میں توازن ناقابلِ یقین حد تک کمپیوٹرائی نظام کی طرح باہم متوازن ہے۔ ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ جوہری ردِّ عمل کہکشاؤں کے لئے روزنِ سیاہ (Quasars) کی شکل میں بیج کا کام دیتا ہے۔''

ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ نے سورۃ الواقعۃ کے بارے میں فرمایا کہ

''سورۃ الواقعۃ اپنے بچوں کو سکھاؤ اور پھر وہ اپنے بچوں کو سکھائیں۔'' (الحدیث)

''کیا خدائی معجزہ اب زیادہ واضح نہیں ہے؟ اِس سورۃ کو یاد کریں اور بالخصوص آیات ۷۵ تا ۷۹ کو نسل در نسل یاد رکھیں اور بالآخر آپ کو معلوم ہوگا کہ کائنات کا راز آپ پر منکشف ہو گیا ہے۔'' ("The Holy Koran and the Facts of Science" ... Dr. Haluk Nurbaki, pp. 30-32)

اِن سیاہ روزنوں کے بارے میں ہمیں قرآن مجید کی اِن دو آیات سے پتہ چلتا ہے:۔

(۱) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ---- (المؤمنون : ۱۷)

''اور ہم نے یقیناً تمہارے اوپر سات راستے بنائے۔''

آسمانوں کو یہاں طَرَآئِقَ سے اِس لئے تعبیر کیا گیا کہ ان میں فرشتوں کی آمدورفت اور ستاروں کی گردش کے لئے راہیں ہیں۔ (تفسیر کشاف لزمخشری)

(۲) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ٥ (اَلذّٰرِیٰت :۷)

''قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں۔''

علمِ کائنات اور فلکی طبعیات کی روشنی میں ہمیں قرآن مجید میں دیئے گئے علامتی الفاظ ''راستے'' اور ''راستوں سے بھرا آسمان'' کا مطلب تلاش کرنا ہے۔ مذکورہ دونوں قسم کی سائنسیں اِس نظریے کی حامی ہیں کہ ہماری کائنات سیاہ روزنوں سے بھری ہوئی ہے اور یہی سیاہ روزن کائنات میں ایک ''راستے'' کی طرح ہے۔ روزِ محشر سے متعلق مندرجہ ذیل قرآنی آیات اس بات کو مزید واضح کر دیتی ہیں:۔

(۱) وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَآئِكَةُ تَنْزِيْلًا ٥ (الفرقان : ۲۵)

''جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا اور فرشتوں کو لگا تار اُتارا جائے گا۔''

(۲) وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ٥ (اَلنّبا : ۱۹)

''اور (اُس دن) آسمان کھل جائے گا' سو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے۔''

سورۃ الاعراف کی آیت ۴۰ میں اور شبِ معراج کی ایک حدیث میں بھی آسمانی دروازوں کا ذکر ہے۔

یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ (روزِ محشر) موجودہ نظام اپنے اختتام کو پہنچ جائے گا اور اس کی جگہ ایک نیا نظام لایا جائے گا۔ یہ راز کہ آسمانوں کے اُس پار کیا ہے' غائب ہو جائے گا اور دروازے کھل جائیں گے۔

تمام کائنات کی سیاہ روزن میں تبدیلی ۔۔ ایک ایسی قرآنی حقیقت جس سے آج کی سائنسی تحقیق بالکل ہم آہنگ ہے: جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ روزنِ سیاہ ایک پُراسرار، دکھائی نہ دینے والا آسمانی جریمہ ہے جو تمام تر ضَوریزی اور قریب سے گزرنے والے ستاروں کو نگل جاتا ہے اور اس کے قرب میں وقت بہت زیادہ پھیل جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم یہ کہتا ہے کہ روزِ قیامت تمام کائناتی نظام (توانائی، مادّہ، وقت اور خلاء) کو لپیٹ لیا جائے گا اور یہ سب کچھ نقطۂ صفر (Zero Volume) پر آ جائے گا یعنی سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ اس ضمن میں فرموداتِ الٰہیہ ملاحظہ ہوں:۔

(۱) یَوۡمَ نَطۡوِی السَّمَآءَ کَطَیِّ السِّجِلِّ لِلۡکُتُبِ ؕ کَمَا بَدَاۡنَاۤ اَوَّلَ خَلۡقٍ نُّعِیۡدُہٗ ؕ وَعۡدًا عَلَیۡنَا ؕ اِنَّا کُنَّا فٰعِلِیۡنَ ○ (الانبیاء : ۱۰۴)

"وہ دن (یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح وثیقہ کے کاغذوں کو لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے ابتداءً پیدا کیا تھا، ہم اُسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے۔ یہ ہمارا وعدہ ہے جسے ہم ضرور پورا کرنے والے ہیں۔"

(۲) وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدۡرِہٖ ٭ۖ وَالۡاَرۡضُ جَمِیۡعًا قَبۡضَتُہٗ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطۡوِیّٰتٌۢ بِیَمِیۡنِہٖ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ○ (الزُّمَر : ۶۷)

"اور ان لوگوں نے اللہ کی عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنی چاہئے تھی اور حال یہ ہے کہ ساری زمین قیامت کے دن اُس کی مٹھی میں ہوگی اور آسمان اُس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔ وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک و برتر ہے۔"

حق تعالٰی کی ذاتِ کاملہ کے حق اُس کے مرتبۂ کمال کے لحاظ سے تو کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا لیکن بندے اپنی وسعت و ظرف کے لحاظ سے جس حد تک اس کے مکلّف ہیں، ان ظالموں بدبختوں نے اتنا بھی تو نہ کیا اور اس مرتبۂ حق کا اقل قلیل حصّہ عقیدۂ توحید ہے۔ اللہ کے قبضۂ اختیار اور دستِ قدرت میں تو ساری کائنات آج بھی ہے۔ قیامت کا ذکر تخصیص سے اس لئے کیا کہ اُس روز کسی اور کو شرکت کا دعوٰی بھی نہ رہے گا اور حقیقت سب کے مشاہدہ میں آ کر رہے گی۔

(۳) فَاِذَا انۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَکَانَتۡ وَرۡدَۃً کَالدِّہَانِ ○ (الرّحمٰن : ۳۷)

"جب آسمان پھٹ جائے گا تو وہ سرخ چمڑے کی طرح سرخ ہو جائے گا۔"

وَرۡدَۃً کے معنٰی گلاب کی طرح سرخ اور دِھان کے معنٰی تیل کے ہیں۔ یعنی آسمان پھٹ کر آگ کی تپش سے پگھل جائے گا اور دوزخ کی آگ کی حرارت سے سرخ ہو جائے گا اور تیل کی طرح بہہ رہا ہوگا۔

(۴) فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ○ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ○ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ○ (اَلْقِيٰمَة : ۷ تا ۹)
''سو جس روز آنکھیں چندھیا جائیں گی اور سورج بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے۔''

چاند کے بے نور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے گہن (خَسَف) لگ جائے گا۔ اس پر ملحدین نے یہ اعتراض کیا کہ چاند کو گہن تو اُس وقت لگتا ہے جب چاند اور سورج کے درمیان زمین حائل ہو جاتی ہے۔ اور جب چاند اور سورج جمع ہوں گے' اُس وقت تو یہ حالت پیدا نہ ہوگی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چاند کو گہن لگنے کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اور وہ کسی نظام کا پابند نہیں۔ عام قانونِ فطرت سے ہٹ کر اُس نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں باپ کے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا فرمایا۔ اسی طرح اُس نے چاند اور سورج کے درمیان زمین کے حائل ہونے کو چاند کے گہن کا سبب ضرور بنایا ہے لیکن قربِ قیامت میں اللہ تعالیٰ براہِ راست زمین کے حائل ہونے کے بغیر چاند کو گہنا دے گا اور اُسے بے نور کر دے گا۔

پھر فرمایا کہ سورج اور چاند جمع کر دیئے جائیں گے حالانکہ سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰ کے مطابق ''سورج میں یہ طاقت نہیں کہ وہ چاند کو پا سکے۔'' تو جب سورج چاند کو پکڑ نہیں سکتا تو وہ دونوں جمع کس طرح ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اُس وقت کی بات ہے جب قیامت کے وقوع سے پہلے وہ معمول کی گردش کرتے رہیں گے لیکن قیامت آنے پر یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سورج اور چاند کے جمع ہونے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ دونوں بے نور ہونے میں جمع ہو جائیں گے۔

(۵) فَإِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ○ وَإِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ○ وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ○ (اَلْمُرْسَلٰت : ۸ تا ۱۰)
''اور جس وقت ستارے بے نور کر دیئے جائیں گے اور جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور جس وقت پہاڑ اُڑتے پھریں گے۔''

(۶) يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ○ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ○ (اَلنّٰزِعٰت : ۶، ۷)
''جس دن ہلا ڈالنے والی چیز ہلا ڈالے گی جس کے بعد پیچھے آنے والی چیز آ جائے گی۔''

اَلرَّاجِفَة سے مراد پہلی بار صُور کا پھونکا جانا ہے اور اسے اَلرَّاجِفَة اس لئے کہا کہ پہلے صور کے پھونکنے سے دنیا لرزنے لگے گی اور اس میں زلزلہ آ جائے گا۔ پھر اس کے بعد جب دوسری بار صُور پھونکا جائے گا تو زمین مُردوں کو زندہ کرنے کے لئے دوبارہ لرزے گی۔

(۷) إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ○ وَإِذَا النُّجُومُ انْكَدَرَتْ ○ وَإِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ○ وَإِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ○ وَإِذَا الْوُحُوشُ حُشِرَتْ ○ وَإِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ○ وَإِذَا النُّفُوسُ زُوِّجَتْ ○

''جب آفتاب لپیٹ لیا جائے' جب ستارے بے نور رہ جائیں' جب پہاڑ چلا دیئے جائیں' جب اونٹنیاں چھٹی پھرنے لگیں' جب وحشی جانور اکٹھے کر دیئے جائیں اور جب سمندر بھڑکا دیئے جائیں اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی۔'' (اَلتَّكْوِير: ۱ تا ۷)

نظامِ شمسی میں آفتاب کی اہمیت کسی سے مخفی نہیں۔ جب ابھرتا ہے تو اُس کی کرنیں اندھیروں میں ڈوبی ہوئی دنیا کو آناً فاناً منوّر کر دیتی ہیں اور اُس کی حرارت سے زمین تانبے کی طرح تپ جاتی ہے۔ لیکن روزِ قیامت اُس کی نور افشانی کرنے والی کرنیں اُس کے ارد گرد لپیٹ دی جائیں گی اور اُس کی تیز رفتار شعاعوں کو زنجیر بپا کر دیا جائے گا اور جب یہ منبعِ نور بے نور ہو جائے گا تو اُس وقت جو اندھیرا پھیلے گا' وہ کس قدر گہرا اور کتنا بھیانک ہوگا! اس کا صرف تصوّر ہی ہوش رُبا ہے۔

سورج کے بعد ستاروں کی حالتِ زار بیان ہوئی کہ وہ تیزی سے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جائیں گے اور وہ قانونِ کشش جو ہر ستارے کو اپنے مقام پر اور ہر سیارے کو اپنے مدار میں روکے ہوئے ہے' وہ قانون منسوخ کر دیا جائے گا اور وہ اپنی اپنی جگہ سے ٹوٹ کر بکھر جائیں گے۔ بعض نے 'انکدرت' کا معنی بے نور ہونا کیا ہے۔

اِسی طرح کششِ ثقل بھی فنا ہو جائے گی' پہاڑوں کا وزن باقی نہیں رہے گا۔ ہوا کے جھونکے روئی کے گالوں کی طرح اُنہیں فضا میں اُڑانے لگیں گے اور انجام کار اُن کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا۔

اَلْعِشَار اُس گابھن اونٹنی کو کہتے ہیں جسے دسواں مہینہ ہوا اور وہ جلد ہی ایک بچے کو جنم دینے کے ساتھ شیر دار ہونے والی ہو۔ اہلِ عرب کو ویسے ہی اونٹ بڑے عزیز ہوتے ہیں خصوصاً وہ اونٹنی جس کے حمل کو دس ماہ گزر چکے ہوں۔ اُن کے نزدیک وہ متاعِ گراں بہا شمار ہوتی ہے اور وہ اس کی رکھوالی اور حفاظت پوری توجہ سے کرتے ہیں لیکن قیامت کے روز لوگوں کی بدحواسی کا یہ عالم ہوگا کہ ایسی قیمتی چیز کا بھی کوئی پُرسانِ حال نہ ہوگا اور ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی ہوگی۔

صرف انسان ہی بدحواس نہ ہوں گے بلکہ جنگلی جانور جو انسان کی آواز سے بدکتے اور اُس کے سائے سے دُور بھاگتے ہیں' وہ بھی جنگل بیابان چھوڑ کر شہروں میں آگھسیں گے۔ نہ کوئی گدھا کسی کو دولتیاں مارے گا' نہ کوئی

مشہور ماہرِ طبعیات ڈاکٹر پال ڈیوس کائنات میں پہلے ہی سے طے شدہ مکمل ترتیب کی تعریف میں یہ کہتے ہیں کہ یہ طبعیات کے اُصولوں کے بالکل عین مطابق ہے:

"کائنات کا مطالعہ کرتے ہوئے (از راہِ تعجب) بے یقینی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ کائنات کے قبل از تاریخ کے بارے میں حالیہ دریافتیں ہمیں یہ تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہیں کہ کائنات کے پھیلاؤ کو ایک حیران کُن نفاست کے ساتھ متحرک رکھا گیا ہے۔" ("The Accidental Universe")

(ب) <u>توازن</u>: سورہ الرّحمٰن میں ارشاد ہوا :۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ o أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ o

"اور آسمان کو اُسی نے بلند کیا اور اُسی نے ترازو وضع کردی کہ تم تولنے میں گڑبڑ نہ کرو۔" (آیات ۷، ۸)

یعنی آسمانوں کو ایک حیرت انگیز ریاضیاتی توازن کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے انسان کو بھی باہمی معاملات میں منصفانہ طور پر کام کرنا چاہئے اور اپنے تمام امور میں توازن قائم کرنا چاہئے کیونکہ انصاف ایک خدائی وصف ہے۔ ہارون یحییٰ لکھتا ہے:۔

"سائنسدانوں نے سالہا سال تک کوشش کی کہ اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ توازن کی گتھی کو سلجھائیں لیکن اُنھوں نے مظاہرِ قدرت کو چند نام دے کر بات ختم کردی جیسے برقناطیسی قوّت' مضبوط مرکزائی قوّت' کمزور مرکزائی قوّت اور قوّتِ کمیت۔ لیکن کسی نے اِس سوال کی طرف توجہ نہیں دی کہ کیوں یہ قوّتیں کچھ اصولوں کے تحت کچھ شدّتوں پر اثر پذیر ہوتی ہیں اور کچھ پر نہیں۔ اور یہ کہ ان قوّتوں کی شدت میں اتنی ہم آہنگی کیوں ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ ایک قوّتِ واحدہ ہے جو اِن تمام کو ہم آہنگ رکھتی ہے یعنی اللہ جو تمام طاقت و حاکمیت کا مالکِ کُل ہے۔" ("The Miracle in the Atom" pp. 50-51)

مِیزَان کا ایک معنیٰ 'عدل' کا بھی کیا گیا ہے (تفسیر کبیر)۔ چنانچہ تجارت اور تجارتی معاملات میں تقویٰ' دیانت و احتیاط کی اہمیّت اِسی ایک حکم سے ظاہر ہے جو جمالیات کا ایک پہلو بھی ہے۔

اقوامِ عالَم کی طاقت کے توازن کے بارے میں قرآنِ حکیم اِس طرح اشارہ کرتا ہے:۔

(۱) وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْفَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرة : ۲۵۱)

(۲) وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج : ۴۰)

(۱) "اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے (انہیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر) بچاؤ نہ کرتا تو زمین برباد ہو جاتی لیکن اللہ تعالیٰ سارے جہانوں پر فضل و کرم فرمانے والا ہے۔"

(۲) "اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کا بعض کے ذریعے بچاؤ نہ کرتا تو (طاقتور کی غارت گری سے) منہدم ہو جاتیں خانقاہیں' گرجے' عبادت خانے اور مسجدیں جن میں اللہ کے نام کا ذکر بکثرت کیا جاتا ہے۔"

سانپ کسی کو ڈسے گا اور نہ کسی شیر کو شکار کے پھاڑنے کی ہوش ہوگی۔ سب دُم دبائے اوپر نیچے ایک جگہ جمع ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ اِن وحشی جانوروں کو قیامت کے دن ہر طرف سے جمع فرمائے گا اور جن جانوروں نے دوسرے جانوروں کو ایذاء پہنچائی ہوگی اُن سے قصاص لیا جائے گا۔ پھر ان سے کہا جائے گا کہ مرجاؤ تو وہ تمام وحشی جانور مر جائیں گے۔ اس ساری روئیداد کے ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام وحشی جانوروں کو عدل کرنے کے لئے جمع فرمائے گا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ انسانوں اور جنات کو عدل کرنے کے لئے جمع نہ کرے!

اُس دن سمندروں میں پانی کی لہریں نہیں' آگ کے شعلے اُٹھ رہے ہوں گے۔ پانی سے شعلوں کا اُٹھنا تعجب انگیز معلوم ہوتا ہے لیکن اگر پانی کے اجزائے ترکیبی پر نظر ڈالی جائے تو تعجب اس پر نہیں ہونا چاہئے کہ اس سے آگ بھڑکے گی بلکہ حیرت اس پر ہوگی کہ پانی ڈالنے سے آگ بجھ کیوں جاتی ہے۔ پانی دو گیسوں آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکّب ہے۔ ان میں سے ایک بھڑکانے والی ہے اور دوسری بھڑک اُٹھنے والی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جب اُنہیں اکٹھا کیا جائے تو یہ آگ کی صورت اختیار کرلیں لیکن قادرِ مُطلق نے ان کے مرکب کو پانی کی شکل دے دی اور اس میں آگ بجھانے کی تاثیر رکھ دی۔ قیامت کے دن جب دوسرے تکوینی ضابطے بالائے طاق رکھ دئے جائیں گے۔ سورج' ستارے اور پہاڑ کیا سے کیا بن جائیں گے' پانی کے اِس ضابطے پر بھی قلمِ تنسیخ کھینچ دیا جائے گا۔ آکسیجن اور ہائیڈروجن اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئیں گی اور ان کے بے پایاں ذخائر جو سمندروں میں پانی کی صورت میں آج ٹھاٹھیں مار رہے ہیں' وہ بھڑکتے شعلے بن جائیں گے۔

آیت ۷ کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال واخلاق کے مطابق انسانوں کی گروہ بندی کردی جائے گی۔ مقرّبین کا ایک گروہ ہوگا۔ اصحابِ یمین ایک پرچم تلے اکٹھے ہوں گے اور اصحابِ شمال کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ص ۴۹۹' ۵۰۰) جیسا کہ سورۃ الواقعۃ کی آیات ۷ تا ۱۰ میں بیان ہوا۔

(۸) اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ٥ وَاِذَا الْکَوَاکِبُ انْتَثَرَتْ ٥ (الانفطار : ۱' ۲)
''جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب ستارے جھڑ جائیں گے۔''

آسمان' زمین' پہاڑ اور دوسرے مظاہرِ قدرت اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کرتے ہیں اور سرِ مُو نافرمانی نہیں کرتے۔ وہ قیامت کے دن ریزہ ریزہ ہوجائیں گے تو انسان جو اُن کے مقابل کمزور جسامت کا ہے' اُس کے اعمال بھی صحیح نہیں ہیں' تو اُس کا کیا حال ہوگا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے یہ احوال اور آثار بیان فرمائے

تا کہ انسان اِن ہولناکیوں پر مطلع ہو کر اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اُس کی نافرمانی کرنے اور گناہوں سے باز آجائے۔

ستاروں کا جھڑنا یا تو اس وجہ سے ہوگا کہ اُن کی تخلیق مخلوق کو نفع پہنچانے کے لئے کی گئی تھی، سو جب قیامت کے بعد مخلوق ہی نہیں رہے گی تو ستاروں کی بھی ضرورت نہیں ہوگی کیونکہ اب اندھیری راتوں میں ستاروں سے رہنمائی حاصل کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ستاروں کو آسمان کی زینت کے لئے بنایا گیا ہے تو جب آسمان ہی پھٹ جائیں گے تو اُن کی زینت کے لئے ستاروں کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔

تو اِس حقیقت کے باوجود کہ سورج کی روشنی، چاند کی چمک اور حیرت انگیز سیاروں کی غیر معمولی افزونی اور کہکشائیں ہمارے نچلے ترین آسمان کو بھی زینت دیتے ہیں اور اُسے چمک فراہم کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ عارضی ہے اور اس نے بالآخر ختم ہونا ہے۔ کائنات کی دوسری چیزوں کی طرح یہ شاندار نظامِ شمسی بھی آخر کار اپنے انجام سے دوچار ہوگا جس کے عارضی ہونے کے بارے میں قرآنِ حکیم نے یوں اشارہ کیا ہے:۔

کُلٌّ "یَّجْرِیْ لِأَجَلٍ مُّسَمًّى (الرّعد : ۲ ؛ فاطر : ۱۳)

''ہر ایک وقتِ معیّن تک چلتا رہے گا۔''

اسی طرح سورہ یٰسٓ کی آیت ۳۸ میں سورج کے لئے مُستَقَر کا لفظ آیا ہے جس کا معنیٰ ہے ایک مقررہ وقت یا وقت۔ جس کا معنیٰ یہ ہوا کہ سورج ایک مقررہ سمت میں رواں دواں ہے اور مقررہ وقت تک وہ رواں دواں رہے گا۔ بہ الفاظِ دیگر یوں کہیے کہ وقتِ مقررہ کے بعد اُسے بالآخر ختم ہونا ہے۔

جان ایل ولہیلم کے مضمون کو جو نومبر ۱۹۷۷ کے ریڈرز ڈائجسٹ میں چھپا تھا، اور جس میں وہ کائنات کے انجام کو زیرِ بحث لائے ہیں، مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں پڑھا جائے تو بہت مفید رہے گا۔

آسمان کا نوبت بہ نوبت ہونا: سورہ الطّارق کی آیت ۱۱ میں فرمایا :

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ (نوبت بہ نوبت والے آسمان کی قسم)

یہ آیت اس بات پر زور دیتی ہے کہ آسمان میں ایک عمل کو بار بار کرنے کی صلاحیت ہے۔ خلا کی گہرائیوں میں کئی ستارے روزن ہائے سیاہ سے ختم ہو جاتے ہیں جبکہ روزن ہائے سفید نئی کہکشاؤں کو پیدا کرتے ہیں۔ نئی نئی تخلیقات، مختلف تغیرات اور تباہ کاریاں آسمان میں مسلسل واقع ہوتی رہتی ہیں۔

ذَاتِ الرَّجْع کا معنیٰ ہے بار بار لوٹنے والا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْع کا معنیٰ ہے بار بار بارش برسانے والا آسمان' کیونکہ آسمان سے بار بار بارش نازل ہوتی ہے یا جو خیر آسمان سے آتی ہے' وہ بار بار لوٹ کر آتی ہے۔

''ستاروں اور سیاروں میں فرق: ستاروں اور سیاروں میں بہت فرق ہے۔ ستارے نہایت ہی گرم اجسام یا کُرّے ہیں اور اُن سے ہر وقت مسلسل روشنی اور حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ اس کے برعکس سیارہ ایک ثانوی جسم ہے جو کسی ستارے یا آفتاب کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ سیارے کی ساخت اور بناوٹ میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے مثلاً سورج گیسی جسم ہے اور بعض سیارے ہماری زمین کی طرح جامد اور ٹھوس ہوتے ہیں۔ سیارہ سورج سے روشنی حاصل کر کے اُسے منعکس کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ روشن نظر آتا ہے۔ سیارے مختلف بیضوی مداروں میں سفر کرتے ہیں جبکہ ستارہ ایک جگہ جامد اور ساکن نظر آتا ہے' مگر وہ مدار کی بجائے اپنے ہی محور کے گرد چکر کاٹتا ہے یعنی ستارے کی گردش محوری جبکہ سیارے کی مداری گردش ہوتی ہے۔ اِن ستاروں اور سیاروں کے درمیان عظیم فاصلے ہیں لہٰذا اُن میں تصادم کا کوئی خطرہ نہیں۔ سورہ یٰسٓ کی آیت ۴۰ میں یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔'' (''قرآن کے جدید سائنسی انکشافات''۔۔۔ ڈاکٹر فضل کریم' ص ص ۵۶' ۵۷)

شہابِ ثاقب (ٹوٹا ہوا تارہ) اور شہابیے: اُن کی بابت قرآنی فرمودات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ o وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ o اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ o (اَلْحِجر: ۱۶ تا ۱۸)

''اور بالیقین ہم نے آسمان میں بڑے ستارے بنائے اور اُسے دیکھنے والوں کے لئے اُن سے آراستہ کر دیا اور ہم نے اُسے ہر شیطان مردود سے محفوظ کر دیا' ہاں مگر کوئی بات چوری چھپے سن بھاگے تو اُس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہو لیتا ہے۔''

(۲) لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ كُلِّ جَانِبٍ o دُحُوْرًا وَّلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ o اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ o (اَلصّٰفّٰت: ۸ تا ۱۰)

''وہ (شیاطین) عالمِ بالا کی (باتوں کی) طرف کان بھی نہیں لگا سکتے اور ہر طرف سے مار کر دھکے دئے جاتے ہیں اور اُن کے لئے عذابِ دائمی ہوگا مگر ہاں جو (شیطان) کچھ خبر لے ہی بھاگا تو ایک دہکتا ہوا شعلہ اُس کے پیچھے ہو لیتا ہے۔''

(۳) وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِیْدًا وَّشُهُبًا o وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا o (الجنّ: ۸' ۹)

''(شیطانوں نے کہا کہ) ہم نے آسمان کی تلاشی لینا چاہی تو ہم نے اُسے شدید پہرے اور شعلوں سے بھرا ہوا پایا۔ اور ہم آسمان کے موقعوں پر جا بیٹھا کرتے تھے (خبریں) سننے کے لئے' سو جو کوئی اب سننا چاہتا ہے' تو اپنے لئے ایک تیار شعلہ پاتا ہے۔''

نبیِ مکرّم ﷺ کی بعثتِ مبارکہ سے پہلے بھی شیاطین چوری چھپے آسمانوں پر جاتے تھے اور کبھی کبھی وہ فرشتوں کی باتیں اُچک لینے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن بعثتِ نبوی کے بعد ان شیاطین و جنّات پر بہت سختی کی گئی اور اُنہیں آسمانوں پر جانے سے روک دیا گیا۔ سورۃ الجن کی مذکورہ آیت ۹ کے لفظ اَلْآنَ سے مراد نزولِ قرآن اور ظہورِ محمدی کے بعد کا زمانہ ہے۔ اور سورۃ الشعراء کی آیت ۲۱۲ میں بھی یہی حقیقت بیان ہوئی:
اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ o ''وہ تو (عالمِ بالا کی باتیں) سننے سے محروم کئے جا چکے ہیں۔''

سائنسدانوں کا یہ قول کہ فضا میں بڑے وزنی پتھر چکر کھایا کرتے ہیں اور وہ ہوا سے رگڑ کھا کر روشن ہو جاتے ہیں اور کہیں زمین پر ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں' قرآن کے بیان کے ذرا بھی منافی نہیں۔ قرآن کو اُن کی ترکیب' ساخت وغیرہ سے مُطلق بحث نہیں۔ وہ تو اپنے موضوع کے اندر رہ کر صرف اتنا بیان کرتا ہے کہ اُن سے کام شیطان کے بھگانے کا بھی لیا جاتا ہے۔ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ ستارے جس مادّے سے بنے ہیں' اس میں کوئی خاص صلاحیت و قوّت آگ سے بنے ہوئے شیطانوں کے مارنے اور بھگانے کی ہے۔

(۳) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ (المُلک : ۵)
''اور بے شک ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر رکھا ہے اور ہم نے اُنہیں شیطانوں کے مار بھگانے کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔''

رُجُوْم جو میزائل کے معنیٰ میں بھی ہو سکتے ہیں' وہی شہابِ ثاقب ہیں جو اُن جنات و شیاطین پر مارے جاتے ہیں جو فرشتوں کی باتیں چوری چھپے سننے کے لئے آسمانِ دنیا پر جایا کرتے تھے۔

سُبحان ہے وہ ذات جس کی روشن نشانیاں چار دانگ عالم میں بکھری ہوئی ہیں جو اِس ناشکرے اور بے قدرے انسان کو اُس کی عظمتِ شان کے آگے جھکا دینے کے لئے کافی ہیں۔ قرآن فرماتا ہے:۔
وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ o (یوسف:۱۰۵)
''اور آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں کہ اُن پر سے (یہ لوگ) گزرتے ہیں لیکن اُن کی طرف سے منہ پھیرے رہتے ہیں۔''

آسمان کیسے ایک محفوظ چھت ہے: سورۃ الانبیاء کی آیت ۳۲ میں قرآنِ حکیم ہماری توجہ آسمان کے ایک دلچسپ وصف کی طرف مبذول کراتا ہے:۔

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

"اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنا دیا اور یہ لوگ اُس کی نشانیوں سے منہ پھیرے ہوئے ہیں۔"

عدیم المثال بلندی اور عدیم المثال اِحاطت دونوں کے لحاظ سے آسمان کو جو بہترین صفاتی نام دیا جا سکتا ہے' ہیئت وفلکیات کی ہر علمی اصطلاح سے کہیں بہتر اور کہیں واضح تر' وہ چھت ہی کا ہو سکتا ہے۔

آسمان کو محفوظ چھت بنانے کے دو محمل ہیں: ایک یہ ہے کہ جس طرح دوسری چھتیں گر جاتی ہیں اور شکست وریخت کا شکار ہو جاتی ہیں' اس طرح آسمان کو گرنے اور ہر قسم کی شکست وریخت اور نقصان سے محفوظ بنا دیا۔ جیسا کہ اِن آیات سے ظاہر ہے:

(۱) وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ (الحجّ: ۶۵)

"وہی آسمان کو روکے ہوئے ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر زمین گر نہ پڑے۔"

(۲) وَمِنْ اٰيٰتِهِ أَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ (الرّوم: ۲۵)

"اُس کی ایک نشانی یہ ہے کہ آسمان اور زمین اُس کے حکم سے قائم ہیں۔"

(۳) إِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ (فاطر: ۴۱)

"بے شک اللہ آسمانوں اور زمینوں کو برقرار رکھے ہوئے ہے کہ وہ (اپنی جگہ سے) ہٹ نہ جائیں اور اگر وہ (اپنی جگہ سے) ہٹ جائیں تو اللہ کے سوا کوئی اُنہیں روک نہیں سکتا۔"

آیت کا دوسرا محمل یہ ہے کہ آسمان کو فرشتوں یا شہاب ثاقب کے ذریعے شیاطین اور جنّات سے محفوظ رکھا گیا۔ سائنسی طریق سے زیرِ نظر آیت کی تشریح اس طرح ہو سکتی ہے:۔

"بیسویں صدی میں سائنس نے یہ بہت اہم دریافت کی کہ زمین کے اوپر تہہ در تہہ حفاظتی حِصار (Protective Layer) ہے جو ہمارے لئے ایک چھت کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ فضائی چھت آسمانوں کی طرف سے گرنے والے میٹرائٹ (Meteriots) اور خطرناک شعاعوں کو زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی روک لیتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین پر کسی طرح کی زندگی بھی ناممکن ہوتی بلکہ یہ بھی سورج کے خاندان کے دیگر سیاروں کی مانند ایک

مردہ چٹیل میدان ہوتی ۔ یہ چھت سات کُرّوں پر مشتمل ہے جن میں اہم ترین ہوائی کرّہ، مقناطیسی کرّہ، اوزون کرّہ شامل ہیں ۔ اُن کے بغیر بیرونی دنیا سے آنے والی خطرناک شعاعیں اور ذرّات ہمیں بھون کر رکھ دیتے ۔ سُبحانَ اللہ! قرآنِ حکیم نے صدیوں پہلے بتا دیا تھا کہ ہم نے آسمان ایک محفوظ چھت کی مانند بنایا اور پھر سورۃ النّبَا کی آیت ۱۲ میں وضاحت فرمائی کہ یہ چھت سات مضبوط طبقات پر مشتمل ہے: وَبَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ سَبۡعًا شِدَادًا ''اور ہم نے تمہارے اوپر نہایت مضبوط رکاوٹیں (Barriers) بنائی ہیں''۔ سائنس کا یہ کمال ہے کہ بیسویں صدی کی تحقیقات کے نتیجے میں اِن سات مضبوط رکاوٹوں کی حقیقت کو تفصیل سے سمجھا گیا ہے۔ افسوس اُن لوگوں پر جو پھر بھی کہتے ہیں کہ قرآن وحیِ الٰہی نہیں۔'' (قرآنِ پاک: ایک چیلنج، ایک سائنسی معجزہ۔ میجر (ر) امیر افضل خان، ص ص ۱۴۵، ۱۴۶!)

''فلکیاتی شعاعوں (Cosmic Rays) کے خلاف تحفظ: یہ مادّے اور توانائی کے زیرایٹمی اجزاء ہیں۔۔ جدید طبعیات نے توانائی کی اِن ناقابلِ فہم ضوریزیوں اور شعاعوں کے مُضر اثرات کا جائزہ لیا ہے جو کائنات کے لئے تباہ کن ہو سکتے ہیں۔ سورۃ الشُّعراء کی آیتِ مبارکہ (۲۸) رَبُّ الۡمَشَارِقِ وَالۡمَغَارِبِ وَمَا بَیۡنَهُمَا (مشرقوں اور مغربوں اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے، اُن سب کا رب) یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کے برعکس یہ ضوریزیاں اور شعاعیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی زیرِ نگرانی ایک عظیم الشان طبعی توازن تشکیل دیتی ہیں۔'' ("The Holy Koran and the Facts of Science" ... Dr. Haluk Nurbaki, p. 72)

''مزید برآں یہ کہ خلا سے آنے والی روشنی کی اُن شعاعوں کو جو جانداروں کے لئے مُضر ہیں، فضا کشید کرتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فضا صرف بے ضرر اور مفید شعاعوں کو ہی زمین پر پہنچنے دیتی ہے۔ زندگی کی بقاء کے لئے یہ ریڈیائی نظامِ حیات آفریں ہے۔ بنفشی شعاعیں جو فضا سے جزوی طور پر زمین پر پہنچتی ہیں، پودوں کی ضیائی تالیف (Photosynthesis) اور تمام جانداروں کی بقاء کے لئے بہت اہم ہیں۔ سورج سے آنے والی بالا بنفشی شعاعوں (Ultraviolet Rays) کی تابکاری کو اُوزونی کرہ (Ozone Layer) جذب کر لیتا ہے اور بنفشی طیف (Ultraviolet Spectrum) کا صرف محدود لیکن اہم حصّہ زمین پر پہنچتا ہے۔''

''فضا کا یہ حفاظتی کردار صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ فضا زمین کو خلا کی انجمادی سردی سے بھی بچاتی ہے جو منفی ۲۷۰ ڈگری ہوتا ہے۔''

''یہ صرف فضا ہی نہیں جو زمین کو مُضر اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ فضا کے علاوہ وان ایلن منطقہ

(Van Allen Belt) (شدید اشعاع زدہ خطّہ جو کئی ہزار کلومیٹر کی بلندی پر زمین کو جزوی طور پر گھیرے ہوئے ہے) بھی مُضر تابکاری کے خلاف حفاظت کا کام دیتا ہے۔ یہ تابکاری جو سورج اور دوسرے ستاروں سے مسلسل خارج ہوتی رہتی ہے' تمام جانداروں کے لئے مہلک ہے۔ اگر وان ایلن منطقہ کا وجود نہ ہوتا تو سورج کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی شکل میں جو سورج میں کثیر الوقوع ہوتے ہیں' توانائی کے جسیم وشدید ابھار زمین پر تمام کی تمام زندگی کو ختم کر کے رکھ دیتے۔ ہماری زندگی میں وان ایلن منطقہ (Van Allen Belt) کی جو اہمیت ہے' ڈاکٹر ہف راس (Dr. Hugh Ross) اس کی بابت یوں کہتے ہیں:۔

''ہمارے شمسی نظام میں دراصل زمین کو ایسی زبردست کثافت حاصل ہے جو کسی اور سیارے کو حاصل نہیں۔ یہ بڑا نِکل فولادی مرکزی حصّہ ہمارے وسیع مقناطیسی میدان کا ذمّہ دار ہے۔ یہ مقناطیسی میدان وان ایلن تابکاری کی ڈھال کو پیدا کرتا ہے جو زمین کو تابکاری بمبارڈمنٹ سے بچاتی ہے۔ اگر یہ ڈھال موجود نہ ہوتی تو زمین پر زندگی ممکن نہ ہوتی۔ صرف عطارد سیارہ مقناطیسی میدان کا حامل ہے لیکن اس کی قوت زمین کی قوت سے سَو گنا کم ہے۔ زہرہ سیارے کا بھی مقناطیسی میدان نہیں ہے۔ وان ایلن تابکاری کی ڈھال زمینی زندگی کی موافقت میں وضع کی گئی ہے۔'' (http://www.ips.net/bygrace/index.html.

''جیسا کہ حالیہ سالوں میں دریافت ہوا ہے اُس توانائی کا اندازہ جو اِس ایک پھٹنے کے عمل سے خارج ہوتی ہے' ایک سو اَرب اُن ایٹم بموں کے برابر لگایا گیا ہے جو ہیروشیما پر برسائے گئے تھے۔ پھٹنے کے اڑتالیس گھنٹے بعد یہ مشاہدہ کیا گیا کہ قطب نماؤں کی مقناطیسی سوئیوں نے غیر معمولی حرکت کا مظاہرہ کیا اور زمین کی فضا سے ۲۵۰ کلومیٹر بلند' درجہ حرارت اچانک ۲٬۵۰۰ ڈگری تک بڑھ گیا۔''

''قصّہ مختصر زمین کے اوپر ایک مکمل نظام مائل بہ عمل ہے۔ یہ ہماری زمینی دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور اسے خارجی خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ سائنسدانوں کو حال میں اس کا علم ہوا ہے لیکن صدیوں پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کے ذریعے ہمیں بتا دیا تھا کہ دنیا کی فضا ایک حفاظتی ڈھال کا کام دے رہی ہے۔'' ("Islam and Karma" .... Harun Yahya, pp. 102-104)

<u>علمِ فلکیات کی اہمیت</u>: اسلام آنے کے بعد مسلمانوں کو نماز کے اوقات کا اور کعبے کی سمت کا تعین کرنا تھا تا کہ وہ اوقاتِ نماز میں اس کی طرف رُخ کریں۔ اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ سورج کے رُخ کو دیکھا جائے اور جہاں جہاں مسلمان رہتے ہیں' اُن علاقوں کے طول بلد اور عرض بلد معلوم کئے جائیں

کی ضرورت مسجد سے واقفیت حاصل کرنے کے عمل میں بھی پیش آئی۔اس چیز نے علمِ ہیئت اور دوسرے متعلقہ مضامین (جیسے فلکیاتی جغرافیہ اور ریاضی) کے مطالعہ کی طرف مذہبی تحرک دیا۔اس کے علاوہ مسلمانوں کو اپنی عظیم الشان تجارت اور کبھی کبھار جہاد کے سلسلے میں برّی اور بحری سفر کرنا ہوتا تھا۔سفر میں مدد کے لئے جہاز رانی اور موسمیات کا علم' جو جہاز رانی کی ضمنی پیداوار ہے' ضروری تھے اور اس کے لئے اُنہیں ستاروں کے نقشوں کی ضرورت تھی۔ایسے نقشوں کی ضرورت علمِ فلکیات میں اُن کی دلچسپی کی ایک وجہ بنی۔''

اسلام کی آمد سے پہلے ''اہلِ عرب ستاروں اور سیاروں میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔اُنہوں نے یہ دلچسپی اس لئے بھی پیدا کی تھی کہ ایک زمانے میں وہ اجرامِ فلکی کی پرستش کرتے رہے تھے۔'' ("The Making of Humanity" ... Robert Briffault, p. 187 : Lahore 1980 Edition)
اور اس دلچسپی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ صحرا نشین عرب تجارت' جنگوں اور خانہ بدوشی کے سلسلے میں عموماً رات کو سفر کرتے تھے اور اپنے سفر کی سمت کو ستاروں کے ذریعے معلوم کرتے تھے۔اس طرح اُنہیں اپنے طور پر غیر متحرک ستاروں کا اور سیاروں کی حرکات کا علم حاصل تھا اور یہ بھی کہ موسموں میں تغیر وتبدل کیسے ہوتا ہے۔''

''ماہرینِ علمِ فلکیات کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اِس بات پر یقین رکھتا تھا کہ اجرامِ فلکی کا اثر زمینی معاملات پر بھی اور لوگوں کی قسمت اور مستقبل پر بھی پڑتا ہے۔ایسے اثرات سے تعلق رکھنے والے علم کو علم النجوم (''علم احکام النجوم'') کہا جاتا ہے جو علمِ فلکیات (ہیئت) کی ایک شاخ ہے' اُسے بابل کے قدیم باشندوں نے پروان چڑھایا اور اس میں خوب مطالعہ کیا۔قدامت پسند مسلمان اجرامِ فلکی کا انسان کی قسمت یا اُس کے مستقبل پر اثر کو نہیں مانتے تھے۔اُنہوں نے علم النجوم کو علمِ فلکیات سے علیحدہ کر دیا تھا کیونکہ اسلام میں اس بات پر اعتقاد کہ ستارے انسان کی قسمت یا مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں' کفر ہے۔اس طرح علمِ فلکیات (ہیئت) کو خالصتاً سائنس کے طور پر اُس وقت پروان چڑھایا گیا جب اُسے توہم پرستی کے اعتقادات سے پاک کر دیا گیا۔'' ("Islam and Evolution of Science" ... Muhammad Saud, pp. 39-40)

''علمِ فلکیات (ہیئت) میں مسلمان سائنس دانوں کا حصّہ: علمِ ہیئت (فلکیات) اور ریاضی میں باقاعدہ مطالعہ دوسرے عباسی خلیفہ المنصور کے دَورِ حکومت میں آٹھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف میں بغداد میں شروع کیا گیا۔اُس کے بعد دوسرے مسلمان حکمرانوں بالخصوص بنوعباس کے ساتویں خلیفہ المامون کی فیاضانہ سرپرستی نے ہر قسم کی فلکیاتی اور ریاضیاتی تحقیقات کو تحریک دی۔ ہندی' فارسی اور یونانی فلکیاتی کاموں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور مسلم دنیا کے مختلف مقامات پر خلفاء اور دیگر لوگوں نے فلکیاتی مشاہدات کے

لئے رصد گاہیں بنائیں۔ علم ہیئت کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں حیران کن طور پر مسلمان ہیئت دانوں کی تعداد بڑھ گئی اور دسویں صدی کے اختتام تک بغداد میں نامور مسلمان ہیئت دانوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں ہسپانیہ (سپین) میں علم ہیئت خوب پھلا پھولا جہاں اچھے خاصے تخلیقی اور خلقی کام کئے گئے۔''

''مشاہدات اور اعداد و شمار کے صحیح ہونے پر مسلمان ہیئت دان بہت زور دیتے تھے قطع نظر اس کے کہ وقت کتنا صَرف ہو رہا ہے۔ بعض اوقات اُن کی فلکیاتی تحقیقات چالیس سال سے بھی بڑھ جاتی تھیں۔ صداقت و صحت کے اسی جذبے کی وجہ سے مسلمان ہیئت دان بطلیموس کے ہیئتی اعداد و شمار یا پیمائش کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ (بطلیموس Ptolemy ایک یونانی ہیئت دان اور ریاضی دان تھا۔) وہ ہیئت کی تحقیق کو بنیاد فراہم کرنے کے لئے صرف اُس کے سیارگان کے نظریے کو تسلیم کرتے تھے۔ اُنہوں نے خود بغداد' سمرقند' نیشاپور' قرطبہ' دمشق اور رَے میں فلکیاتی تحقیقات کیں اور اجرامِ فلکی کا محتاط مطالعہ کرنے کے بعد اُنہوں نے بطلیموس کے ہیئتی اعداد و شمار کو نہ صرف درست کیا بلکہ اُن میں اضافہ بھی کیا اور کئی دوسری انجمی (ستاروں سے متعلق) فہارس بھی مدوّن کیں۔ اِن نئے مشاہدات کی بنیاد پر بطلیموسی نظام پر بار بار مسلم ماہرینِ ہیئت بالخصوص سپینی ماہرین کی جانب سے تنقید کی جاتی رہی۔''

''علمِ ہیئت پر تحقیقات جاری رہیں اور گیارہویں صدی کے اختتام تک تقریباً تمام تخلیقی کام مسلمان ہیئت دانوں نے کرلیا تھا' یہاں تک کہ غیر مسلم ہیئت دانوں نے بھی عربی زبان میں لکھا۔ علمِ ہیئت تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی میں اپنے نقطۂ کمال تک جا پہنچا۔ بارہویں صدی میں یہودیوں اور عیسائیوں نے عربی سے لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ترجمے کا کام شروع کیا اور اِس میدان میں تحقیقی کام کی بناء ڈالی۔ لیکن تیرہویں صدی کے آخر تک ریاضی اور علمِ ہیئت کا کوئی بھی کام عیسائیوں یا یہودیوں نے ایسا نہیں کیا جس کا موزانہ مسلمانوں کے کاموں سے کیا جاسکے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ بارہویں صدی میں جب بطلیموس کی کتاب Algamest کو مسلمانوں اور بالخصوص ہسپانیہ کے مسلم ماہرینِ ہیئت کی جانب سے کامل مطالعہ اور تحقیق کے بعد سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا' تو اس کتاب کا مطالعہ لاطینی دنیا میں شروع کیا گیا۔''

''علمِ ہیئت کے اعداد و شمار کی تدوین کے علاوہ مسلمانوں نے آسمانی دائروں کے جدول بھی تیار کئے جن میں ستاروں کی پوزیشن اور طوالت دی گئی تھی۔ مسلمان سائنسدانوں نے علمِ ہیئت اور ریاضی پر جامع کتب لکھیں اور اس علم کی مختلف شاخوں پر مسودے بھی تحریر کئے۔''

"قدیم علمِ فلکیات کو محفوظ کرنے کے لئے مسلم ہیئت دانوں نے ستاروں کے نقشے تیار کئے اور اُنہیں سفر، جہازرانی اور موسمیات کے لئے استعمال کیا جا سکے۔"

"علم ہیئت کے مطالعہ کا بڑا محرک ایک ہندوستانی ماہرِ فلکیات "سدھانتا" کی کتاب سے ملا جسے بغداد میں بادشاہ کے دربار میں کنکا نامی ایک ہندو لے کر آیا۔ کنکا ۷۶۷ء میں وقت کے بہت بڑے ماہرِ فلکیات، یعقوب بن طارق سے ملا جس نے کنکا کا تعارف خلیفہ المنصور سے کرایا۔" .. ("Introduction to the History of Science"
George Sarton, Vol. 1, p. 530 : Washington, 1927)
کنکا نے کتاب خلیفہ منصور کو دکھائی جس نے محمد بن ابراہیم الفزاری کو اسے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا (ایضاً) اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ "سدھانتا" کی بنیاد پر ایسا کام ترتیب دیا جائے جو اہلِ عرب کے لئے حوالے کا کام دے۔ محمد بن ابراہیم نے اس ذمہ داری کو قبول کیا اور ایک کتاب تیار کی جو ماہرینِ فلکیات کے ہاں "سند ہند الکبیر" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب خلیفہ مامون کے زمانۂ خلافت تک استعمال میں رہی۔ پھر ایک عظیم سائنسدان الخوارزمی نے اِس کا خلاصہ تیار کیا۔ اُس نے ہندوستانیوں، ایرانیوں اور یونانیوں کے طریقوں کے مطابق علمِ ہیئت اور ٹرگنومیٹری کے جدول بھی تیار کئے۔ دسویں صدی کے آخری نصف میں اِن جداول پر مسلمہ المجریطی نے نظرِ ثانی کی اور اُنہیں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اُنہیں چین میں بھی استعمال کیا گیا۔"

"علمِ نجوم کا ماہر ابراہیم بن حبیب الفزاری پہلا مسلمان تھا جس نے ستاروں کے جدول تیار کئے۔ اُس نے علمِ نجوم پر ایک نظم بھی منظوم کی اور عربوں کے طریقے کے مطابق کیلنڈر مدوّن کیا۔ اُس نے اصطرلاب کے استعمال اور کنگنی گولے کے متعلق بھی لکھا۔" ("تاریخ الحکماء" -- ابوالحسن علی القفطی ص ۲۶۵)

"خلیفہ مامون الرشید کے دَورِ خلافت میں بطلیموس کی کتاب Almagest کا یونانی زبان سے عربی زبان میں ترجمے کا اہم کام مکمل ہو گیا تھا۔ خلیفہ اس کے صحیح ترجمہ ہونے کے بارے میں بہت فکرمند تھا۔ اس کا متعدد بار ترجمہ کیا گیا اور اس پر بہت سے تبصرے لکھے گئے۔ اس کے خلاصے بھی تیار کئے گئے۔ وزیر یحییٰ بن خالد برمکی پہلا شخص تھا جس نے اس کا ترجمہ کیا۔ علماء کے ایک گروہ نے وزیر کے لئے اس کتاب پر تبصرہ لکھا لیکن یہ اُسے پسند نہیں آیا۔ اُنہوں نے ابوحسن اور سلمان کو جو "بیت الحکمۃ" نامی ایک سائنسی اکادمی سے وابستہ تھے، اس کا تبصرہ لکھنے پر مامور کیا ("کشف الظنون" -- حاجی خلیفہ، ج ۲، ص ۱۵۹۴، استنبول ۱۹۴۳ء)
Almagest علمِ ہیئت پر یونانی کلاسیکل ورکس کی بہترین مثال ہے۔ یہ بعد کی علم ہیئت کی کتابوں کے لئے بنیاد بنی۔ حجاج بن یوسف پہلا شخص تھا جس نے Almagest کا ترجمہ لکھا۔ اُس نے یہ ترجمہ ایک شامی نسخے کی بنیاد پر کیا تھا۔"
("Introduction to the History of Science" .. G.Sarton, Vol.1, p.562)

خوب خیال رہے کہ پرانی عبادت گاہوں کے سلسلہ میں بھی مندروں' شوالوں اور ٹھاکر دواروں کا ذکر نہیں بلکہ صرف اُنہی مذاہب کا ہے جو بعد میں عملاً جیسے کچھ بھی ہو گئے ہوں لیکن اصلاً بہرحال توحیدی ہی مذاہب تھے۔ رہا یہ سوال کہ کبھی کبھی اہلِ حق بھی تو مغلوب ہوتے ہیں تو اصل یہ ہے کہ اتنا غلبہ جس میں حق محو نہ ہو مقصود بالحکمت ہے اور یہ حاصل رہا ہے۔

(ج) **جمالیات**: اللہ جَلَّ جَلالُہٗ نے اپنی تمام تخلیقات میں جمالیات کے پہلو کو نمایاں رکھا ہے:

(۱) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ٥ (الحِجر : ۱۶)

(۲) فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ٥ (المؤمنون : ۱۴)

(۳) اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (اَلسَّجدة : ۷)

(۴) وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (اَلْمُلْك : ۵)

(۵) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ٥ (اَلتِّين : ۴)

(i) ''اور بالیقین ہم نے آسمان میں بڑے ستارے بنائے اور اُسے دیکھنے والوں کے لئے اُن سے آراستہ کر دیا۔''

(ii) ''اللہ تمام صناعوں سے بڑھ کر کیسی شان والا ہے!''

(iii) ''وہ وہی تو ہے جس نے جو بھی چیز بنائی' خوب ہی بنائی۔''

(iv) ''بے شک ہم نے قریب کے آسمان کو چراغوں سے آراستہ کر رکھا ہے۔''

(v) ''ہم نے انسان کو (بہ اعتبارِ شکل و عقل) بہترین اعتدال پر پیدا کیا ہے۔''

ڈاکٹر پال ڈیوِس جو خود ایک مادیّت پرست انسان ہے' نے تسلیم کیا ہے کہ طبعیات کے قوانین لوگوں کو زمین پر رہنے کے لئے کیسے سازگار ماحول مہیا کرتے ہیں:۔

''اگر قدرت (فضا میں آکسیجن' کاربن ڈائی آکسائڈ' نائٹروجن وغیرہ کو) موجودہ مقدار سے تھوڑا سا بھی کم و بیش رکھتی تو دنیا ایک مختلف جگہ ہوتی اور ہمارا یہاں وجود نہ ہوتا۔ قبل از تاریخ کی کائنات کے بارے میں جو حالیہ دریافتیں سامنے آئی ہیں' وہ ہمیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ پھیلتی ہوئی اِس کائنات کو ایک حیران کن نفاست و جمال کے ساتھ متحرک رکھا گیا ہے۔''

سالماتی ماہرِ نباتیات ۔۔ مائیکل ڈینٹن نے کچھ یوں لکھا ہے:۔

''اگر یہ مختلف قوّتیں اُن اَقدار کی حامل نہ ہوتیں جیسا کہ وہ ہیں تو نہ کوئی ستارے ہوتے' نہ انفجاری ستارے (جن کے پھٹنے کی روشنی ہمارے سورج کی روشنی سے کروڑوں گنا زیادہ ہے)' نہ سیارے ہوتے' نہ ایٹم ہوتے اور نہ ہی زندگی۔''

("Nature's Destiny : How the Laws of Biology Reveal Purpose in the Universe", p. 13)

(د) **تناسب اور مقداریت**: ذیل کی آیات میں جمالیات کے اِس پہلو کی جھلک نظر آتی ہے:

''مامون الرشید نے اُس زمانے کے ممتاز سائنسدانوں اور اپنے درباریوں محمد' احمد اور حسن کو حکم دیا کہ وہ دوسرے درباری سائنسدانوں کے ساتھ مل کر زمینی درجہ' اُس کی لمبائی اور محیط کی پیمائش کریں۔ اِس مقصد کے لئے سنجر اور تید مور کے میدان منتخب کئے گئے۔ سائنسدان ایک جگہ پر رک گئے اور آلات کے ذریعے اُنہوں نے قطب شمالی کے عمود کو جانچا اور وہاں ایک کیل ٹھونک دیا۔ پھر کیل کے ساتھ ایک لمبی رسی کو باندھتے ہوئے وہ رسی کو شمال کی طرف لے گئے۔ جب رسی ختم ہوگئی تو اُنہوں نے ایک اور کیل وہاں ٹھونک دیا اور اُس کے ساتھ ایک اور رسی باندھ دی اور اُسی طرح اُسی سمت میں چلے گئے۔ اُنہوں نے اِس عمل کو اور قطب شمالی کے عمود پر اپنے مشاہدات کو جاری رکھا یہاں تک کہ ایک خاص جگہ پر پہنچنے پر اُنہوں نے معلوم کیا کہ اِس قطب کا ایک درجہ بڑھ گیا ہے۔ جو فاصلہ اُنہوں نے طے کیا تھا' اُس کی بھی پیمائش کی گئی جو ۶۶ء۵۶ میل تھی۔ اِن مشاہدات سے اُنہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ زمینی درجہ پر جو سفر کیا جاتا ہے وہ ۶۶ء۵۶ میل ہوتا ہے۔ اِسی کام کو جنوب کی طرف دُہرایا گیا تو پتہ چلا کہ عمود ایک درجہ کم ہوگیا ہے۔ اب اس فاصلے کو اُنہوں نے ۳۶۰ سے ضرب دے کر دیکھا جو زمینی درجے کا کُل ہے تو معلوم یہ ہوُا کہ زمین کا محیط ۲۰۴۰۰ میل اور اُس کا قطر ۶۵۰۰ میل کے برابر ہے۔'' (''المامون'' -- شبلی نعمانی' ص ص ۴۹' ۵۰ : آگرہ ۱۸۹۴ء)

''سب سے بڑا ماہرِ فلکیات جس نے مامون الرشید کے دَور میں مشاہدات کئے' صناد بن علی تھا جو یہودیت سے اسلام کی طرف آیا۔ اُس نے بغداد میں مُعز الدولہ کے محل میں شمسیہ دروازے کے عقب میں ایک رصدگاہ تعمیر کی۔ علمِ ہیئت کا ایک جدول' علمِ ہیئت اور ریاضی پر چند کتابیں اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں۔''
(''الفہرست'' -- ابن ندیم' ص ۳۸۳: مطبع رحمانیہ قاہرہ)

''۱۲۷۹ یا ۱۲۸۹ میں محمد بن اُردی نے ایک فلکیاتی گلوب تیار کیا جس کا قطر ۱۴۰ ملی میٹر تھا۔ یہ ڈریسڈن کے رئیسانہ محل میں محفوظ ہے۔'' (''ہدایت العارفین'' اسماعیل باشا البغدادی، ج ۲' ص ۱۳۱) استنبول ۱۹۵۱ء۔

''مسلم ماہرینِ علمِ فلکیات کی کتب کا بعد میں لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ عیسائی اور یہودی علماء نے کیا جن میں کچھ فنی اصطلاحات استعمال کی گئیں۔ بہت سے سیّاروں کے نام اِن زبانوں میں داخل کئے گئے جیسے عقرب' جدی' فرقد جن کی اصل عربی ہے۔ چونکہ ستارے لاتعداد اور شمار سے باہر ہیں اس لئے اُن کا فرداً فرداً مطالعہ ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اُنہیں مختلف گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور اِن گروہوں کو اُن چیزوں اور جانوروں کا نام دیا گیا جن سے اُن کی مشابہت تھی۔''

(۱۳) جوہری توانائی (ATOMIC ENERGY)

''ایٹم (جوہر) ایک انفرادی ساخت کی چیز ہے جو کسی بھی کیمیائی عنصر کی بنیادی اکائی کا جزوی رکن ہوتا ہے۔'' (McGraw Hill Encyclopedia of Science, p. 73)

کسی نے سیّدنا عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے ذرّۃ کے معنیٰ پوچھے تو آپ نے اپنا ہاتھ مٹی پر لگایا پھر اُس میں پھونک ماری اور فرمایا کہ اِن میں سے ہر ایک چیز ذرّہ ہے۔(تفسیر کبیر و رُوح المعانی)

قرآنِ حکیم میں ایٹم کا تصور: عربی زبان کا لفظ ذرّۃ انگریزی لفظ ایٹم Atom کا ترجمہ ہے۔ ایٹم انتہائی چھوٹی چیز کو ظاہر کرتا ہے جسے قرآنِ حکیم نے چودہ صدیاں پہلے اِن آیات میں متعارف کرا دیا تھا:۔

(۱) اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ (اَلنّساء : ۴۰)
''بے شک اللہ تعالیٰ ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔''

(۲) وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ۝ (یُونُس : ۶۱ ؛ سَبا : ۳)
''اور آپ کے پروردگار سے ذرّہ برابر (بھی کوئی چیز) پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر یہ کہ سب کتابِ مبین میں ہیں۔''

فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ لا کر اس گمراہ کن عقیدے کا سدِّ باب کیا جا رہا ہے کہ حق تعالیٰ کا علم صرف حدوث کے وقت نہیں ہوتا بلکہ روزِ ازل سے چھوٹی بڑی ہر شے لوحِ محفوظ میں ثبت ہے۔ جاہلی قومیں بکثرت ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے خدا کو مانا تو ہے لیکن (معاذ اللہ) محدود العلم، ناقص العلم۔ آیت انہی گمراہیوں کی تردید میں ہے۔

نوٹ: (۱) قرآنِ مجید میں ۲۰۹ مقامات پر رب تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کو اپنے محبوب کے رب ہونے کی طرف نسبت دی ہے حالانکہ وہ کائنات کے ذرّے ذرّے کا رب ہے۔ عارفین اور عشاقِ کاملین کو وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ رب تعالیٰ کو اپنے محبوب کا رَب ہونے میں جو لطف اور کیف ملتا ہے، وہ کسی اور کے رَب ہونے میں نہیں ملتا (ﷺ)۔ اُن ۲۰۹ مقامات کا ذکر اگلی کسی اُردو جلد میں ان شاء اللہ ''مُحَمَّد'' کے عنوان کے تحت ہوگا، جبکہ اس کا ذکر اسی انسائیکلوپیڈیا کی (انگریزی کی) جلد چہارم کے صفحات 3508 تا 3514 پر ہو چکا ہے۔ (۲) لفظِ مُبِین سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کے بعض بندے لوحِ محفوظ اور اس کی ساری تحریر کو جانتے ہیں۔ اگر وہ چھپی ہوتی تو مُبِین کیسے بنتی یعنی ظاہر اور ظاہر کرنے والی۔

(۳) فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ○ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○ (الزّلزال : ۷، ۸)
"سو جو کوئی ذرّہ بھر بھی نیکی کرے گا، اُسے دیکھ لے گا اور جس کسی نے ذرّہ بھر بھی بدی کی ہوگی، اُسے بھی دیکھ لے گا۔"

حدیثِ نبوی میں اِن دو آیتوں کے لئے اَلجامِعۃُ الفاذۃ کے الفاظ آئے ہیں یعنی جو اصل اِن میں بیان کردی گئی ہے وہ جامع اور منفرد ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ آیتیں قانونِ مجازات کی تصویر کشی نہایت خوبی، خوش اُسلوبی اور جامعیت کے ساتھ کر رہی ہیں۔

"ایٹم کی تقسیم: اُنیسویں صدی تک یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ایٹم (جوہر) ہی مادّے کا چھوٹے سے چھوٹا حصّہ ہے۔ بعد میں اِس نظریے کو رد کر دیا گیا اور آج ہم جانتے ہیں کہ ایٹم کے مزید حصّے ہوسکتے ہیں جو اس سے بھی بہت ہی چھوٹے ذرّات ہیں مثلاً اس کے مزید چھوٹے ذرّات الیکٹران، پروٹان، نیوٹران اور میزان وغیرہ ہیں) اس وقت ماہرینِ طبعیات نے کل ۳۲ ذرّات معلوم کرلئے ہیں: ۱۶ مثبت اور ۱۶ منفی جو ایٹم کے مرکز میں ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم بھی یہی بیان کرتا ہے کہ ایٹم چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ نہیں ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:۔

وَمَا يَعۡزُبُ عَنۡ رَّبِّكَ مِنۡ مِّثۡقَالِ ذَرَّةٍ فِي الۡاَرۡضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصۡغَرَ مِنۡ ذٰلِكَ وَلَآ اَكۡبَرَ اِلَّا فِيۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ○ (یُونُس : ۶۱؛ سَبا : ۳)
"اور آپ کے پروردگار سے ذرّہ برابر (بھی کوئی چیز) پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ اس سے چھوٹی اور نہ بڑی مگر یہ کہ سب کتابِ مبین میں ہیں۔"

"آسمان میں ہو یا زمین میں" سے مراد ساری کائنات ہے۔ "اور نہ اس سے چھوٹی" سے مراد ایٹم کی مزید تقسیم یا تقسیم در تقسیم ہے جیسا کہ آج ہم جانتے ہیں۔ مزید یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ ایٹم اپنے بنیادی خواص کو کائنات کے کسی بھی حصّے میں (خواہ سورج میں خواہ زمین میں) برقرار رکھے گا۔ بقولِ اقبالؒ:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو ۔۔۔ لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں

("قرآنِ مجید کے سائنسی انکشافات"۔ ڈاکٹر فضل کریم ص ص ۲۴۴، ۲۴۵)

"تابکار مادّے اور ان سے خارج ہونے والی شعاعیں (Radioactivity): یہ ایٹمی مرکزوں کی ازخود ٹوٹ پھوٹ (انشقاق) ہے جس کے نتیجے میں تابکار شعاعیں یا ذرّات خارج ہوتے ہیں۔ اِس ٹوٹ پھوٹ کے دوران مرکزہ (Nucleus) توانائی کو گیما شعاعوں کے ذرّات کی شکل میں خارج کرتا ہے جو ایکس ریز کے مشابہ ہوتے ہیں۔ اِس خارج شدہ توانائی کو جسے اِشعاع (Radiation) کہا جاتا ہے، مفید

مقاصد کے لئے بروئے کار لایا جا سکتا ہے مثلاً کھانے میں بیکٹیریا کو ختم کرنے میں، سرطان کے خلیوں کو مارنے میں یا بجلی کے پیدا کرنے میں۔ اس کے برعکس تابکاری یا انعکاسی شعاعیں مُضر اور نقصان دہ بھی ہو سکتی ہیں۔ مثلاً نیوکلیائی تعامل گر (Nuclear Reactor) سے نکلنے والا ضائع شدہ مواد خاصے اشعاعی (مُضر) اثرات کا حامل ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص اُن سے خاصی مقدار میں اِشعاعی اثرات لیتا ہے تو یا تو وہ بیمار ہو جائے گا یا مر جائے گا۔'' (Encyclopedia Americana, Vol. 23, p. 181)

جنگِ عظیم دوم کے بعد ہیروشیما اور ناگاساکی پر بمباری کو اِشعاع (Radioactivity) کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے۔

مفید اِشعاع کے بارے میں نامور ماہرِ طبعیات George Wald اپنے ایک مضمون میں یوں لکھتا ہے:
''وہ اِشعاع جو با ضابطہ کیمیائی ردِّعمل کو بلا توقف تحریک دیتی ہے، اُس کی خاصی مقدار ہمارے سورج میں پائی جاتی ہے۔'' (The Article "Life and Light" appearing in "Scientific American" -- 1959, Vol. 201, p. 108)

قرآنِ حکیم دوسری قسم کی اِشعاع (Radiation) کو اللہ تعالیٰ کے اُس غیظ و غضب کی شکل میں بیان کرتا ہے جو مغرور و بد دماغ اور بدکردار اقوامِ ماضیہ پر برقِ آسمانی بن کر ٹوٹا۔

(۱) وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ (الاعراف: ۸۴)
''اور ہم نے اُن پر مینہ برسا دیا، تو (اے مخاطب!) دیکھ لے مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔''

یعنی اُن (علاقہِ سدوم) پر پتھراؤ کیا۔ یہ بارش آگ اور پتھروں کی تھی جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کے وقت ہوتی ہے۔ سدوم کے چار یا پانچ شہر ایسے تھے جو اس طرح برباد کئے گئے اور اُن کی آبادی کا مجموعہ چار لاکھ تھا۔ تباہی کا زمانہ ماہرینِ فن کے تازہ ترین تخمینہ کے مطابق ۲۰۶۱ قبل مسیح کا تھا۔

نوٹ: گزشتہ قوموں کے حالات، اُن کے عذاب کا پڑھنا، اُن میں غور کرنا اور اُن سے عبرت حاصل کرنا عین عبادت ہے تاکہ گناہوں سے نفرت ہو۔ اسی طرح مقبول و مقرب بندوں کے تاریخی حالات پڑھنا اور اُن میں غور کرنا عبادت ہے تاکہ دل میں نیکیوں کی رغبت ہو اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو۔ یہ نکتہ آیت مذکورہ کے آخری حصہ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ سے حاصل ہوا۔

(۲) فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ٥ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ٥ (هُود: ۸۲، ۸۳)

"پس جب ہمارا حکم آ پہنچا تو ہم نے اُس (زمین) کے بالائی حصے کو اس کا نچلا حصہ بنا دیا اور ہم نے اُن پر کھنگر کے تہہ بہ تہہ پتھر برسا دیئے جو آپ کے پروردگار کے پاس خاص نشان کئے ہوئے تھے اور وہ (مقام) اِن ظالموں سے کچھ دُور بھی نہیں۔"

قومِ لُوط کا مسکن دریائے یردن کی وادی میں تھا جہاں اب بحرِ مُردہ واقع ہے۔ اُن کے بڑے شہر سدوم اور عمورہ بحرِ مُردہ کے ساحل پر واقع تھے اور قریشِ مکہ اپنے سفرِ شام میں برابر اِسی راہ سے آتے جاتے تھے۔ آیت میں ظالموں سے مراد یہی کفارِ مکہ ہیں جنہوں نے جانتے بوجھتے ہوئے پیغامِ الٰہی سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

یہودیوں کے مستند علماء کے مطابق "سب سے پہلے بارش برسائی گئی تاکہ وہ اپنے اعمال پر شرمندہ ہو کر توبہ کر لیں لیکن جب اُنہوں نے توبہ نہ کی تو بارش گندھک اور آگ میں بدل دی گئی۔۔۔ چاروں شہر ایک چٹان پر تعمیر کئے گئے تھے اور عذاب کے فرشتے نے اُن سب کو اوپر سے نیچے پلٹ دیا۔" -- ("On Genesis"
Rashi, pp. 222-223, quoted in Majidi, p. 213-A, Note : 251)

Sir Charles Marston نے اِس خدائی عذاب پر اپنا مشاہدہ ریکارڈ کیا ہے جو اہلِ سدوم پر ٹوٹا:

"یہ بات اہم ہے کہ یہ انوکھی تباہی جو اہلِ سدوم اور دوسرے شہریوں پر آئی' اُردن کے علاقے میں پہنچنے والے اِس زمانے کے سیاحوں کو حقیقت و صداقت کا پیغام دیتی ہے کہ وہ اِس خوفناک بربادی کے اسباب معلوم کریں۔" ("The Bible is True" p. 130)

قومِ عاد ایک بارش کے ذریعے ہلاک کی گئی جو ایک اِشعاعی بادل سے برس رہی تھی۔ قرآنِ حکیم اِس اِشعاعی بارش کی سبق آموز تصویر یوں کھینچتا ہے:۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ "مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ "فِيْهَا عَذَابٌ" اَلِيْمٌ "o تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ o (الاحقاف: ۲۴، ۲۵)

"پھر جب اُن لوگوں نے بادل کو اپنی وادیوں کے مقابل آتے دیکھا تو بولے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسے گا۔ نہیں بلکہ یہ تو وہ ہے جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے یعنی ایک آندھی جس میں دردناک عذاب ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنے پروردگار کے حکم سے ہلاک کر دے گی۔ چنانچہ وہ ایسے ہو گئے کہ اُن کے مکانات کے سوا اور کچھ دیکھنے کو نہیں آ رہا۔ ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اکثر طور پر ریح کا لفظ ضرر پہنچانے والی آندھی کے لئے اور ریاح کا لفظ نفع پہنچانے والی اور بارش برسانے والی ہواؤں کے لئے آیا ہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! تو اِس آندھی کو ریاح بنا دے اور ریح نہ بنا۔ (مُسند شافعی ص ۱۷۵، رقم الحدیث: ۵۰۲؛ مُسند ابو یعلیٰ، رقم الحدیث: ۲۴۵۶؛ المعجم الکبیر رقم الحدیث: ۱۱۵۳۳)

''آیتِ بالا (۲۵) میں فعل فَأَصْبَحُوا صیغہ جمع غائب کا آیا ہے جس کا معنیٰ ہے ''اُنہوں نے صبح کی''۔ اس سے ہمیں امید ہوگئی تھی کہ ہمیں بتایا جائے گا کہ وہ صبح کو کیا کر رہے تھے۔ لیکن نہیں! اُنہیں تو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیا گیا تھا اور اُن کے ویران کھنڈر نما مکانات کے سوا کچھ بھی تو باقی نہیں بچا تھا۔ علمِ بلاغت کی یہ اصطلاح ''توقیف'' (Aposiopesis) کہلاتی ہے کہ ایک مقام پر بات کو آگے بڑھنے سے روک دیا گیا ہے اور خاموشی اختیار کرکے اصل بات کہنے کی طرف رخ مڑ گیا ہے۔ یہ اصطلاح خدائی عذاب کے فوری طور پر اور مکمل طور پر واقع ہونے کے اثر کو بڑھانے کے لئے استعمال کی گئی ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی، نوٹ: ۴۸۰۳)

كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ میں عام قانونِ الٰہی کا اعلان ہے کہ یہ غیبی ہلاکت عادی مجرموں اور نافرمانوں ہی کے نصیب میں آتی ہے اور اس میں کوئی تخصیص قومِ عاد کی نہ تھی۔ جو قوم بھی نافرمانی کرے گی، وہ اسی قسم کی سزا کی مستحق ہو کے رہے گی۔

مندرجہ ذیل آیات میں بھی اُن کے ہلاکت خیز انجام کی تصویر کشی کی گئی ہے:۔

(۱) إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ۝ تَنْزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ۝ (اَلقمر: ۱۹، ۲۰)

''ہم نے اُن پر ایک دائمی نحوست کے دن ایک تُند ہوا مسلّط کی، وہ لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی تھی کہ گویا وہ اُکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔''

(۲) وَأَمَّا عَادٌ فَأُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ (اَلْحَآقّة: ۶، ۷)

''اور رہے عاد، سو وہ ایک تند و تیز ہوا سے ہلاک کئے گئے، (اللہ نے) اُسے اُن پر لگاتار سات راتوں اور آٹھ دنوں تک مسلّط کر دیا تھا تو (اے مخاطب!) تو وہاں اُس قوم کو یوں گرا ہوا دیکھتا ہے کہ گویا وہ گری ہوئی کھجور کے تنے پڑے ہیں۔''

کافر اور مغرور و سرکش لوگوں کو ایسی سزائیں دینے کی تاریخ پیش کرنے میں قادرِ مطلق خالق کا مدّعا یہ ہے کہ انسان طاقت و منصب اور مادّی وسائل کے نشہ میں مدہوش ہو کے نہ رہ جائے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور مقصد کو ناکام نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے میں قرآنِ حکیم ایک بار پھر اصحابِ فیل کی بھاری بھرکم فوج کے کعبہ معظمہ پر گستاخانہ حملے کی مثال کو بیان کرتا ہے جس کی کمان یمن کا حبشی وائسرائے ابرہہ اشرم کر رہا تھا۔ ابرہہ عیسائی مذہب کا تھا اور یہ واقعہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادتِ مبارکہ کے سال ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء کا ہے۔ ابرہہ اور اُس کی طاقتور افواج چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کی ایٹمی بارش کے ذریعے اپنے المناک انجام کو پہنچے۔ یہ سنگریزے ابابیل نامی چھوٹے پرندوں کے جُھنڈ نے اپنی چونچوں میں اُٹھائے ہوئے تھے جیسا کہ سورۃ الفیل میں اس کی منظرکشی کی گئی ہے:۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِأَصْحٰبِ الْفِيْلِ o اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ o وَّأَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا أَبَابِيْلَ o تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ o فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّأْكُوْلٍ o

''(اے نبی!) کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ کیا ہم نے اُن کا داؤ بالکل اُلٹ نہیں دیا اور اُن پر جُھنڈ کے جُھنڈ پرندے بھیج دئے' وہ اُن پر کھنگر کی کنکریاں پھینکتے تھے' سو اللہ نے اُنہیں کھائے ہوئے بھوسہ کی طرح کر دیا۔'' (الفیل : ۱ تا ۵)

ڈاکٹر عبدالمالک (آف ڈیرہ غازی خاں) کہتے ہیں کہ ''اِشعاع کے اِس دَورِ جدید کے انتہائی نامور ماہرینِ طبعیات میں سے بیسویں صدی کے امام احمد رضا خاں پہلے مسلمان سائنسی عالمِ دین ہیں جنہوں نے مندرجہ ذیل آیاتِ قرآنی سے بالترتیب نیوکلیائی انشقاق اور ایٹمی نظریہ پیش کیا:۔

(۱) اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ o (سبا:۷)

''جب تم بالکل ریزہ ریزہ ہو جاؤ گے تو تم از سرِ نو پیدا کئے جاؤ گے۔''

(۲) وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا:۱۹)

''ہم نے اُنہیں (ملکِ سبا کے رہنے والوں کو) بالکل پارہ پارہ کر دیا۔''

("Scientific Work of Imam Ahmad Raza" (1856-1921) ... Dr. Abdul Maalik, p. 126)

[مؤخر الذکر آیت بالا میں اشارہ ایٹم کی تقسیم کی طرف ہے جس کا حوالہ صفحہ ۴۲۳ پر دیا جا چکا ہے۔]

(۱۴) حسابات کی جانچ پڑتال (Audit & Accounts)

پڑتال اور محاسبہ (Audit): ''حسابات کا دفتری طور پر باضابطہ معائنہ کرنا محاسبہ (Audit) کہلاتا ہے۔''
(The Shorter Oxford Dictionary, p. 122 : Great Britain, 1959)

حسابات (Accounts) : میزان (Balance) کے اظہار سمیت رقومات کی وصولی اور ادائیگی کا بیان (ایضاً ص ۱۳)

جناب یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں قرآنِ حکیم میں آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کا اشارہ ملتا ہے:۔
وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِیْ بِهٖ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِیْ فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْیَوْمَ لَدَیْنَا مَكِیْن'' أَمِیْن''o قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ'' عَلِیْم''o (یوسف: ۵۴، ۵۵)
''اور بادشاہ نے کہا اُنہیں (یوسف کو) میرے پاس لے آؤ' میں اُنہیں خاص اپنے (کام کے) لئے رکھوں گا۔ پھر جب اُن سے گفتگو کی تو اُن سے کہا کہ تم آج سے ہمارے ہاں (ہر طرح) معزّز و معتبر ہو۔ یوسف نے کہا: مجھے مُلک کے پیداواروں پر مقرر کر دیجئے۔ میں دیانت بھی رکھتا ہوں' علم بھی رکھتا ہوں۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کا عہدہ گویا آج کل کی اصطلاح میں وزیرِ محاصل و مال گزاری (ریونیو منسٹر) اور وزیرِ خزانہ (فنانس منسٹر) کا جامع تھا اور ایسے بڑے اور ذمہ دارانہ عہدہ کے لئے ضرورت دو ہی چیزوں کی ہوتی ہے: ایک دیانت و امانت' دوسرے اُس کام سے واقفیت۔ سو مجھ میں یہ دونوں وصف موجود ہیں۔ جنابِ یوسف کا مطالبہ یا معرکہ کربلا کسی خودغرضی یا ہوس پرستی کی بناء پر نہ تھا بلکہ اشاعتِ دین اور قوم کے مفاد کے لئے تھا۔ فقہاء مفسرین نے لکھا ہے کہ جب مقصود نفع رسانی ہو نہ کہ نفس پروری تو اپنے کو عہدہ و منصب کے لئے پیش کر دینا بالکل ناجائز نہیں یہاں تک کہ غیر مسلم نظامِ حکومت کے ماتحت بھی عہدہ و منصب قبول کر لینا جائز ہے اور یہ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْض (سورۃ القَصَص: ۸۳) (''وہ زمین پر بڑا بننا نہیں چاہتے'') کے منافی نہیں کیونکہ ملک کو تباہی سے بچانے کے لئے حکومت کی طلب جائز ہے' ہوس نہیں۔ اِنِّیْ حَفِیْظٌ'' عَلِیْم'' فقہاء نے لکھا ہے کسی کو واقف کرنے کے لئے اپنے فضل و کمال کو بیان کرنا بالکل جائز ہے اور یہ فَلَا تُزَكُّوْا أَنْفُسَكُمْ (سورۃ النجم: ۳۲) (''اپنی پاکیزگیاں بیان نہ کیا کرو'') کے تحت میں نہیں آتا۔ (تفسیر قرطبی و جصاص) البتہ عام حالات میں اپنی صفات اور خوبیوں کا اظہار نہ کرنا چاہئے کہ یہ فخر و مباہات اور خود پسندی کے ضمن میں آتا ہے۔

''یوسفؑ نے اب بادشاہ کی جانب سے بہت سے اعزازات پائے جس نے اُنہیں اُن کی حد درجہ

دانشمندی کی بدولت Prothorn اور Phanech کے عظیم خطابات دیئے اور یہ خطابات اُس شخص کے لئے ہوتے ہیں جو سربستہ رازوں کا انکشاف کرنے والا ہو۔" ...("Antiquities of the Jews" Josephus, Vol. II, p. 6)

"وزارت کے عہدے کے ساتھ ساتھ یوسفؑ نے غلّہ گودام کے مہتمم ہونے کا عہدہ بھی سنبھال لیا۔"
(Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica, quoted in Majidi)

"یوسفؑ کو وائسرائے کے اختیارات کے ساتھ اَناج کے شاہی گوداموں کا نگران مقرر کیا گیا۔"
(Valentine's "One Volume Jewish Encyclopaedia", p. 326)

چند متعلقہ اصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں

(۱) جواب دہی، باز پُرس (Accountability): "جواب دہی اس نظریہ پر مبنی ہے کہ اربابِ اختیار ایک طرح سے اپنے کام کے نگراں ہوتے ہیں اور اُنہیں اپنی ذمہ داری کو باحسن طریق اور خوش اُسلوبی سے نبھانے کے قابل ہونا چاہئے۔" ("The Penguin Dictionary of Politics" ... David Robertson, p. 2)

اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور انسان کی جواب دہی کے بارے میں قرآن فرماتا ہے:۔

(i) فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَا هُمْ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ (آلِ عمران : ۲۵)
"سو اُس روز جس کے وقوع میں ذرا شک نہیں جب ہم اُنہیں اکٹھا کریں گے تو کیا حال ہوگا!"

(ii) اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (الانبیاء : ۱)
"قریب آلگا لوگوں سے اُن کے حساب (کا وقت) اور وہ غفلت میں منہ موڑے پڑے ہیں۔"

وقتِ حساب ہر روز اُن کے قریب تر ہوتا آ رہا ہے اور وہ ہیں کہ اُس کے لئے تیاری تو کجا، بڑے دھوم دھام سے اپنی ولادت (Birthday) کا جشن منا رہے ہیں جبکہ ہر آنے والا دن انسان کو اُس کی قبر کے قریب کر رہا ہے۔

(iii) أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَاتُرْجَعُوْنَ ۝ (المؤمنون : ۱۱۵)
"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ ہم نے تمہیں یوں ہی بلا مقصد پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہمارے پاس لوٹا کر لوٹائے نہیں جاؤ گے۔"

قرآنِ حکیم انسان کی حیاتِ دُنیوی کا انجام پیشگاہِ الٰہی میں حاضری بتاتا ہے۔ اسی میں ردّ آ گیا اُن باطل مذہبوں کا جو انسان کا انجام فنائے محض سمجھے ہوئے ہیں۔ کاش کہ وہ اپنی تخلیق کے مقصد کو سمجھ پاتے!

(iv) وَأَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَٰكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَآ أَخَّرْتَنِيٓ إِلَىٰٓ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُن مِّنَ الصَّٰلِحِينَ ٥ (اَلْمُنافِقُون : ۱۰)

''اور ہم نے جو کچھ تمہیں دے رکھا ہے' اُس میں سے خرچ کر لو پیشتر اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ کھڑی ہو تو وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! مجھے اور کچھ دن مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا اور نیکوکاروں میں شامل ہو جاتا۔''

''جس کسی نعمت سے بھی ہم محظوظ ہوتے ہیں' سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے اور یہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اس میں سے کچھ نہ کچھ خدمتِ خلق کے لئے خرچ کریں کیونکہ اسی کا نام خیرات اور اطاعتِ الٰہی ہے۔ ہر بے غرض اور مخلص عمل خیرات ہے اور ہمیں اپنے عزمِ جمیل کو کل تک مؤخر نہیں کرنا چاہئے۔ موت ہمیں اچانک آ سکتی ہے اور اُس وقت ہمیں وقتِ مزید مانگنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وقتِ موجودہ کا ہر ہر لمحہ فوری عملِ صالح کا مطالبہ کر رہا ہے۔'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۵۴۷۷)

(v) إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ٥ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ٥ (اَلْغَاشِيَة : ۲۵' ۲۶)

''بے شک اُن کا آنا ہمارے ہی پاس ہوگا' پھر ہمارا ہی کام اُن سے حساب لینا ہوگا۔''

انجینیر فتح اللہ خان اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''انسانی جسم اور اُس کے جاں بخش اعضاء ریکارڈنگ اور نشر کرنے کے سٹیشن کا کام کرتے ہیں۔ انسان کے جاں بخش اعضاء میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ تمام ذہین پیغامات اور اعمال و افعال کو ریکارڈ کرنے کے ذریعے کیسٹوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اِن اعضاء میں جلد' قوّتِ لامسہ (چھونے کی قوّت)' اعصابی نظام' دماغ' آنکھیں اور کان شامل ہیں۔ انسان جسم رکھتا ہے لیکن رُوح جو اُس کا جزو ہے' مابعد الطبعیاتی ہے۔ لہٰذا انسانی جسم سے کئی غیر مرئی (Invisible) افعال' غیر مرئی الٰہی قوت کے تحت سرزد ہوتے ہیں جیسا کہ انسانی رُوح غیر مرئی ہے۔''

قرآنِ حکیم کئی حقائق کا انکشاف کرنے کے ساتھ ساتھ انسان کو یوں تنبیہ کرتا ہے:۔

(۱) وَ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (اَلرَّعْد : ۸)
(۲) وَالْأَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَأَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَأَنْبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ (اَلْحِجْر : ۱۹)
(۳) وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَأَسْكَنّٰهُ فِي الْأَرْضِ (اَلْمُؤْمِنُوْن : ۱۸)
(۴) وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيْرًا (اَلْفُرْقَان : ۲)
(۵) إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (اَلْقَمَر : ۴۹)
(۶) قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (اَلطَّلَاق : ۳)

(i) ''اور اُس کے نزدیک ہر شے ایک متعیّن اندازہ ہی سے ہے۔'' (یعنی قدرت کے تمام انتظامات ایک خاص نظام کے تحت انجام پاتے ہیں)
(ii) ''اور زمین کو ہم نے پھیلا دیا اور اُس میں بھاری پہاڑ ڈال دیے اور اُس میں ہر قسم کی چیز ایک معیّن مقدار سے اُگائی۔''
(iii) ''اور ہم نے آسمان سے اندازہ کے ساتھ پانی برسایا پھر ہم نے اُسے زمین میں ٹھہرایا۔''
(iv) ''اور اُس نے ہر چیز کو پیدا کیا' پھر سب کا الگ الگ اندازہ رکھا۔''
(v) ''بے شک ہم نے ہر چیز کو ایک خاص اندازے سے پیدا کیا ہے۔''
(vi) ''اللہ نے ہر شے کا ایک انداز مقرر کر رکھا ہے۔''

آیاتِ بالا کا خلاصہ یہ ہے کہ الٰہی کارخانہ میں کوئی بھی چیز اٹکل پچو نہیں ہو رہی بلکہ اِس نظامِ عالَم کا ادنٰی سے ادنٰی جزو بھی انتہائی دانشمندانہ قانون کا پابند ہے۔

اِس ضمن میں ایک مستشرق Hugh Ross نے اپنے ایک مضمون میں لکھا :۔

''لازمی طور پر ایک ذہین اور اعلیٰ ترین خالق اِس کائنات کو معرضِ وجود میں لایا ہے' لازمی طور پر ایک عقلِ کُل اور اعلیٰ ترین خالق نے ہی اِس کائنات کا نقشہ بنایا ہے' لازمی طور پر ایک ذہین اور اعلیٰ ترین خالق نے سیّارۂ زمین کا خاکہ بنایا ہے اور لازمی طور پر ایک عقلِ کُل اور اعلیٰ ترین خالق نے ہی زندگی کو ڈیزائن کیا ہے۔''

("Design and the Anthropic Principle, Reasons to Believe")

ایک اور مصنّف George Greenstein کہتا ہے :۔

''طبعیات کے قوانین حیاتِ انسانی کے مطابق ہونے کیسے ممکن ہو گئے؟ تمام شہادتوں کے مدِّ نظر جو خیال مسلسل ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ ضرور کوئی مافوق الفطرت ہستی اِس کارخانۂ کائنات کو چلا رہی ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اُس عظیم ترین ہستی کو منطقی ثبوت کے بغیر ہم تسلیم کر لیں؟ کیا یہ خدا ہی ہے جس نے ہمارے مفاد کے لئے کائنات کو پیدا کر دیا۔''

("The Symbiotic Universe", p. 27)

انسان کی متناسب اور متوازن شکل کا ذکر کرتے ہوئے قرآنِ حکیم انسان کی اپنے رحیم خالق کے پیغام سے بے پروائی اور غفلت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے سورۃ الانفطار (آیات ۶۔۸) میں کہتا ہے :

يٰۤاَيُّهَا الْإِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِيْۤ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ،

(i) وَمَا كُنتُمْ تَسْتَتِرُونَ أَن يَشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَا أَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُودُكُمْ وَلَٰكِن ظَنَنتُمْ أَنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيرًا مِّمَّا تَعْمَلُونَ ○ (حٰمٓ السَّجدة : ۲۲)

''اور تم اس وجہ سے اپنے گناہ نہیں چھپاتے تھے کہ تمہارے خلاف تمہارے کان' تمہاری آنکھیں اور تمہاری جلدیں گواہی دیں لیکن تم تو اِس گمان میں رہے کہ اللہ کو تمہاری اکثر باتوں کی خبر ہی نہیں۔''

اِس آیت کا معنٰی یہ ہے کہ جب کفار کوئی بُرا اور شرمناک کام کرنے لگتے تو وہ اُسے چُھپ کر کرتے تھے لیکن اُن کا چُھپانا اس لئے نہیں ہوتا تھا کہ اُنہیں یہ خطرہ تھا کہ اُن کے کان' اُن کی آنکھیں اور اُن کی جلدیں اللہ تعالیٰ کے سامنے اُن کے بُرے کاموں کی گواہی دیں گی کیونکہ وہ قیامت اور حشر ونشر کے تو قائل تھے ہی نہیں بلکہ اُن کا چھپ کر گناہ کرنا اس لئے تھا کہ اُن کا یہ گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کو اُن اعمال کی خبر نہیں ہوتی جو چُھپ کر کئے جائیں۔

مشرک حکماء اور فلاسفہ کی کثیر تعداد نے علمِ الٰہی کو ناقص سمجھا۔ کسی نے کہا کہ خدا کو صرف کلیات کا علم ہوتا ہے' جزئیات کا نہیں اور کسی نے کچھ اور کہا۔ بہر حال مشرکین کو صفاتِ کمالیہ الٰہیہ ہی کے سمجھنے میں شدید ٹھوکر لگی ہے بالخصوص صفتِ علم کے بارے میں۔

یہاں قرآنِ حکیم نے اس بات کو واضح کر دیا کہ انسان کی جلد میں بھی قوّتِ گویائی ہے اور وہ اُس کے خلاف اُس کے اعمال کے بارے میں گواہی دے گی۔ ہوسکتا ہے کہ پیغامات وغیرہ وصول کرتے ہوئے انسانی جلد اور دماغ اُنہیں ٹیپ کرتے رہے ہوں اور روزِ قیامت اللہ تعالیٰ اُن میں بولنے کی طاقت رکھ دے گا اور اُس کے لئے کوئی بھی بات ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ ہم نے دیکھا کہ مکہ میں ایک پتھر رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر کہتا تھا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ (صحیح مسلم: ۲۲۷۷) اور جب آپ مکہ کے راستے میں جاتے تھے تو جو پہاڑ یا درخت آپ کے سامنے آتا تھا وہ کہتا تھا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ (سنن ترمذی: ۳۶۲۶) اور صحابہ کرام نبی اکرم ﷺ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے طعام کی تسبیح سنتے تھے (سنن ترمذی: ۳۶۳۳) تو جب اللہ تعالیٰ پتھروں میں' پہاڑوں میں' درختوں میں اور طعام میں کلام پیدا کر سکتا ہے تو انسان کے اعضاء میں کلام کا پیدا کرنا کون سے تعجب کی بات ہے!

''انسان جسمانی اعضاء کا مجموعہ ہے جسے اللہ کی طرف سے ودیعت کی ہوئی روح چلا رہی ہے (سورۃ الحجر: ۲۹) جسمانی خصوصیات اور انسان کے اعضاء و جوارح ظاہر ہیں' دیکھے جاتے ہیں اور سب کو معلوم ہیں لیکن اِن اعضاء اور جسم کے کئی ایسے کام ہیں جو دیکھے نہیں جاسکتے اور غیر معلوم ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اعضاء کچھ مخفی طریقِ عمل کے ذریعے روزِ قیامت جواب دہی کے لئے مابعد الطبعیاتی دنیا سے رابطے میں ہوں۔ تاہم اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اور وہ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس سے قریب ہے۔۔۔ دراصل انسان ایک چھوٹا

سا نقش سہی لیکن بہر حال وہ ایک چلتی پھرتی کائنات ہے۔" ("God, Universe and Man, The Holy Quran and the Hereafter" ... Engr. Fatehullah Khan, pp. 136-137)

(ii) اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ" o مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ" عَتِیْدٌ" o (ق: ۱۷، ۱۸)

"(اُنہیں اُس وقت کی یاد دلایئے) جب گرفت میں لینے والے دو فرشتے دائیں اور بائیں بیٹھنے والے گرفت میں لاتے رہتے ہیں۔ وہ کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالنے پاتا مگر یہ کہ اُس کے آس پاس ہی تاک میں لگا رہنے والا تیار ہے۔"

حدیث میں آتا ہے کہ دو فرشتے ہر وقت اور ہر حال میں انسان کے ساتھ رہتے اور اُس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے عمل کو نیک ہو یا بد' دیکھتے رہتے ہیں اور کسی حال میں اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے' یہاں تک کہ انسان کی ناپاکی وغیرہ کے اوقات میں جس سے فرشتے طبعی انقباض (گھٹن) کی بنا پر اُس سے جسمًا الگ بھی ہو جاتے ہیں' اُن اوقات میں انسان جو کچھ عمل کرتا رہتا ہے' اُس کی علامتیں کچھ ایسی اُس پر نقش ہو جاتی ہیں کہ فرشتے اُنہی کو پڑھ کر اُنہیں اپنے رجسٹر میں درج کر لیتے ہیں۔ قَعِیْد'' یعنی بیٹھے رہنے والے۔ یہ انسانی محاورہ عادت کے مطابق فرشتوں کی ہمہ وقتی حاضری و موجودگی کے لئے فرمایا گیا ہے۔ بندوں کے اعمال کے احاطہ کامل کے لئے تو اللہ کی صفتِ علم محیط و کامل خود ہی بالکل کافی ہے۔ فرشتوں کے اس ہمہ وقتی معیّت اور باضابطہ اندراج سے بندوں کے دل میں اُس کی اہمیّت اور کیفیتِ استحضار کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔

''اعمال کے بعد اب آیت ۱۸ میں اقوال کا ذکر ہو رہا ہے۔ منہ سے اِدھر بات نکلی نہیں کہ اُدھر کاتب فرشتوں نے اُسے درج کر لیا۔ بات اگر اچھی ہے تو اُسے بھی اور اگر بُری ہے تو اُسے بھی! اللہ اکبر! کیا ٹھکانہ ہے انسان کی ذمّہ داریوں کا۔ وہ اللہ کا نائب بنا کر دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ وہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں کے لئے' گھنٹے کے ہر منٹ کے لئے' ہر پَل کے لئے ذمّہ دار ہے۔ غفلت کی مُہلت اُسے ایک پل کے لئے بھی نہیں۔ آیت ہر وقت نظروں کے سامنے رہے تو مسلمان سے کبھی بھی گناہ صادر نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاں کا یہ ضابطہ بتا کر مسلمان کے لئے راہِ عمل کتنی آسان کر دی ہے!'' (عبد الماجد دریا آبادی: ص ۱۰۳۷)

حسابات (Accounts) : اِس ضمن میں قرآنِ حکیم نے فرمایا:

(i) بَلْ یُرِیْدُ کُلُّ امْرِیٍٔ مِّنْهُمْ اَنْ یُّؤْتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَةً o کَلَّا بَلْ لَّا یَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ o

''اصل یہ ہے کہ اُن میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اُسے کُھلے ہوئے نوشتے دے دئے جائیں۔ ہرگز نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ آخرت کا خوف ہی نہیں رکھتے۔'' (المُدثّر :۵۲، ۵۳)

مشرکین نے نبی اکرم ﷺ سے کہا تھا کہ ہم میں سے کوئی شخص آپ پر اُس وقت تک ایمان نہیں لائے گا حتی کہ ہم میں سے ہر شخص کے پاس آسمان سے ایک کتاب نہ آجائے اور اُس میں یہ لکھا ہو کہ یہ ربُّ العالمین کی جانب سے فلاں بن فلاں کے نام ہے اور اس میں یہ تحریر ہو کہ ہم تمہیں محمد ﷺ کی اتباع کا حکم دیتے ہیں اور اس کی نظیر سورہ بنی اسرائیل کی یہ آیت (۹۳) بھی ہے: وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُه‘ (ہم اُس وقت تک ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ آپ ہم پر کوئی کتاب نازل نہ کریں جسے ہم خود پڑھیں)

آیتِ مذکورہ میں اُنہیں فرمائشی معجزات کے طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ آخرت سے نہیں ڈرتے۔ اگر کسی معجزہ کو طلب کرنے سے اُن کا مقصد یہ ہو کہ اُنہیں ہدایت حاصل ہو جائے تو اس کے لئے ایک ہی معجزہ کافی ہے۔ یہ بار بار فرمائشی معجزات کیوں طلب کرتے ہیں؟ کیا اُن کی ہدایت کے لئے قرآن مجید کی آیات کافی نہیں ہیں؟ سیدنا محمد ﷺ کا اُمّی ہونے کے باوجود ایسا فصیح و بلیغ کلام پیش کرنا کافی نہیں جس کی نظیر آج تک کوئی نہیں لا سکا؟

(ii) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَه‘ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَه‘ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۝ (بنی اسرائیل : ۱۳، ۱۴)

"اور ہر انسان کا عمل ہم نے اُس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے اور اُس کے لئے ہم قیامت کے دن اُس کا نامہ اعمال نکال کر سامنے کر دیں گے جسے وہ کُھلا ہوا دیکھ لے گا۔ (لے) اپنا نامہ اعمال پڑھ' آج تو خود ہی اپنے حق میں حساب کرنے کے لئے کافی ہے۔"

انسان کے گلے میں طائر (اعمال نامہ یا نوشتۂ تقدیر) کو لٹکانے کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اُس کے لئے مقدّر کر دیا اور اُس کے علم میں جن چیزوں کا ہونا لازمی ہے' وہ انسان کے لئے لازم ہیں اور وہ اُن سے منحرف نہیں ہو سکتا جیسا کہ حدیث میں ہے کہ قیامت تک جو کچھ ہونے والا ہے' اُسے لکھ کر قلم خشک ہو چکا ہے۔ عقل' رزق' عمر' تنگی اور فراخی' بیماری اور صحت اِن میں انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے' یہ محض اللہ کی تقدیر سے ہیں اور نیک و بد اعمال انسان کے اختیار میں ہیں اور ازل میں اللہ تعالیٰ کو علم تھا کہ انسان اپنے اختیار سے کیسے عمل

کرے گا۔ اُس نے اُن تمام امور کو لکھ کر انسان کے گلے میں لٹکا دیا یعنی یہ تمام امور اُس کے لئے لازم کر دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے گردن میں اعمال نامہ ڈالنے کا ذکر فرمایا ہے کیونکہ اگر وہ نیک اعمال ہیں تو اس طرح ہیں جیسے زیب و زینت کے لئے گلے میں ہار ڈالا جاتا ہے اور اگر وہ بد اعمال ہیں تو ایسے ہیں جیسے ذلت اور رسوائی کو ظاہر کرنے کے لئے گلے میں جوتیوں کا ہار یا طوق ڈالا جاتا ہے۔

(۳) <u>پڑتال اور محاسبہ</u> (Audit) : ارشادِ باری تعالیٰ ہوا:

(i) وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ ○ (الانبیاء : ۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن میزانِ عدل قائم کریں گے' سو کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا اور اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی (کسی کا کوئی عمل) ہوگا تو ہم اُسے بھی لا حاضر کریں گے اور حساب لینے والے ہم ہی کافی ہیں۔''

مَوَازِيْن کا واحد مِيْزَان ہے۔ اسے جمع اس لئے لائے ہیں کہ اس میں تمام مخلوق کے اعمال کا وزن کیا جائے گا۔ گویا یہ میزان واحد ہے لیکن یہ مَوَازِيْن کا کام دے گی اور اِسے قِسْط (انصاف) کے ساتھ مقید فرمایا کیونکہ دنیا میں بعض میزان عدل کے ساتھ قائم ہوتی ہیں اور بعض ظلم کے ساتھ لیکن یہ آخرت کی میزان صرف عدل اور قِسْط کے ساتھ قائم ہوگی۔

<u>مِیْزَان میں وزن کرنے کی حکمتیں</u>: اللہ تعالیٰ کو ہر انسان کے نیک اور بد عمل کا علم ہے۔ وزن اس لئے کیا جائے گا کہ اس شخص پر کوئی ظلم تو نہیں کیا جا رہا' اُس کے اعمال کے مطابق اُسے جزا یا سزا دی جا رہی ہے اور جس شخص کو اللہ معاف کر دے' اُسے یہ معلوم ہو کہ اُس پر اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے۔ اُس کے گناہ کس قدر زیادہ اور نیکیاں کس قدر کم تھیں پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اُسے معاف کر دیا۔ اسی طرح کوئی شخص لوگوں کے نزدیک بہت نیک اور بزرگ ہوتا ہے اور وہ اُسے اللہ تعالیٰ کا بہت مقرب ولی سمجھتے ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بہت بدکار اور مبغوض ہوتا ہے۔ اگر اعمال کا وزن کئے بغیر اُسے سزا دی جاتی' تو لوگ سمجھتے کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ اپنے عدل کو ظاہر کرنے کے لئے اُس کے اعمال کا وزن فرمائے گا۔ امام غزالی (م ۵۰۵ھ) احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ <u>میزان کے خطرہ سے بچنے کے لئے حقوق العباد کی ادائیگی ضروری ہے</u>۔ <u>وَكَفٰى بِنَا</u> حَاسِبِيْن کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے انتظامات تو تمہاری مزید تسکین کے لئے ہوں گے' ورنہ رتّی رتّی کے حساب کے لئے تو ہم خود ہی بلا اِن آلات و وسائط کی مدد کے کافی ہیں۔

(ii) هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ٥ (صٓ : ۵۳)
''یہی وہ (نعمت) ہے جس کا تم سے وعدہ روزِ حساب کے آنے پر کیا جاتا تھا۔''

(۴) محاسبے میں قانونِ مکافات (Law of Requital) کی مکمل ضمانت دی جائے گی:
(i) فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنَا هُمْ لِيَوْمٍ لَّارَيْبَ فِيْهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ٥ (آلِ عمران : ۲۵)
''سو اُس روز جس کے وقوع میں ذرا شک نہیں جب ہم اُنہیں اکٹھا کریں گے تو کیا حال ہوگا! اور ہر شخص کو جو کچھ اُس نے کیا ہے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''

فَكَيْفَ اِس طرزِ استفہام سے مقصود عذاب کی ہولناکی کا اظہار ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ سے ہر عاقل و بالغ انسان مراد ہے کیونکہ جانوروں اور نابالغ بچّوں کے اعمال پر جزا و سزا نہیں۔ مَا سے مراد ہر نیک و بد عمل ہے۔ كَسَبَتْ سے اختیاری اعمال مراد ہیں کیونکہ مجبوری کے اعمال پر سزا و جزا نہیں۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ سے مراد ہے کہ نہ اُن کی نیکیوں کا ثواب کم کیا جائے گا اور نہ گناہوں کا عذاب بڑھایا جائے گا۔

ایک سوال اور اُس کا جواب: آیت سے معلوم ہوا کہ معافی اور بخشش کوئی چیز نہیں۔ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ سے آریہ دھرم کی تائید ہوتی ہے۔ پھر مسلمانوں نے بخشش کا عقیدہ کہاں سے نکالا؟ اگر گناہ معاف ہو جائے تو پورا بدلہ نہ ملا اور آیت کہہ رہی ہے کہ پورا بدلہ ملے گا (ستیارتھ پرکاش)

اس کے چند جواب ہیں: اوّل تو یہ کہ آیت ظلم کی نفی کے لئے ہے کہ آخر میں فرما دیا کہ کسی پر ظلم نہ ہوگا کہ اس کی نیکی کم کر دی جائے یا گناہ بڑھا دیئے جائیں۔ گناہ کی معافی اور نیکیاں بڑھانا اس کے خلاف نہیں۔ دوم یہ کہ یہ آیت عقیدہ یہود کی تردید میں ہے۔ وہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہمیں کفر کے باوجود پوری سزا نہ ملے گی اور نیکی کے بغیر ثواب مل جائے گا۔ اُن کے اِس عقیدے کی تردید میں فرمایا جا رہا ہے کہ یہ غلط ہے۔ بغیر کئے ثواب کیسا اور کفر کا بدلہ کیوں نہ دیا جائے، ضرور دیا جائے گا لہٰذا وُفِّيَتْ نقصان کے مقابلہ میں ہے کہ کافروں کی سزا میں کمی نہیں کی جائے گی۔ (تفسیر نعیمی، حصہ ۳، ص ۲۲۰) معافی اور بخشش کا ثبوت قرآنِ مجید اور احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے

(ii) وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ غَيْرَ مَنْقُوْصٍ ٥ (ھُود : ۱۰۹)
''اور ہم یقیناً اُن کا حصہ اُنہیں بے کم و کاست پورا پورا دینے والے ہیں۔''

(iii) زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا أَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا قُلْ بَلٰى وَرَبِّىْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ "o (اَلتَّغَابُن : ۷)

''کافروں کا خیال ہے کہ وہ (دوبارہ) اُٹھائے نہ جائیں گے۔ آپ (اُن سے) کہہ دیجئے ضرور اور قسم ہے میرے پروردگار کی تم ضرور اُٹھائے جاؤ گے' پھر جو کچھ تم کر چکے ہو اُس کی تمہیں خبر دی جائے گی اور یہ اللہ پر بالکل آسان ہے۔''

لفظ زَعَمَ سے اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ منکروں کا یہ قول محض خیال اور اٹکل پچو بلا دلیل کے ہے۔ عقیدۂ آخرت کی نفی سے بدکرداروں اور ظالموں کو تو کھلی چھٹی مل گئی کہ ظالم' ظالم ہی رہا اور مظلوم بیچارہ مظلوم ہی رہا۔ ظالم مزے میں رہا اور نیک و پارسا جس نے زندگی بھر اپنے نفسِ اَمّارہ کے تقاضوں کو پامال کرتے ہوئے ہر آن اور ہر گھڑی اپنے خالق و مالک کے حکم کی بجا آوری میں گزاری' اِس طرح نقصان میں رہا۔ یہ ربُّ العالمین کے نظامِ عدل کے خلاف ہے' عدل ہو کے رہے گا' قیامت ہو کے رہے گی' ظالم کو اس کے ظلم کی سزا مل کے رہے گی اور نیکوکار و متقی کو اُس کی شب خیزیوں اور خلوصِ عبادت کی جزا و ثواب مل کے رہیں گے۔

(iv) فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَo عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَo (اَلْحِجر: ۹۳' ۹۲)

''سو آپ کے پروردگار کی قسم! ہم ضرور بالضرور اُن سب سے پوچھ کر رہیں گے اُن اعمال کی بابت جو وہ کرتے رہے ہیں۔''

فَوَرَبِّكَ میں باری تعالیٰ کا اپنی ربوبیت کو اپنے محبوب ﷺ کی طرف نسبت دینے میں جو لطیف نکتہ ہے وہ اہلِ عرفان و محبت سے مخفی نہیں (جس کا اشارہ صفحہ ۴۲۲ پر کیا جا چکا ہے)۔

مذکورہ بالا سوال روزِ قیامت بہ طور عتاب اور مؤاخذہ ہو گا نہ کہ بطور استفسار۔

<u>ایک سوال اور اُس کا جواب</u> : آیتِ بالا اور سورۃُ الصّٰفّٰت کی آیت ۲۴ سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں سے بھی سوال کیا جائے گا اور اُن سے حساب بھی لیا جائے گا' لیکن مندرجہ ذیل آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافروں سے سوال نہیں کیا جائے گا:۔

(۱) ''اور اللہ اُن سے قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا اور نہ اُنہیں پاک کرے گا۔'' (البقرۃ: ۱۷۴)

(۲) ''اور اُن کے گناہوں کے متعلق مجرمین سے سوال نہیں کیا جائے گا۔'' (القصص: ۷۸)

(۳) ''انسان ہو یا جن' سو اُس دن کسی کے گناہوں کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا۔'' (الرحمٰن: ۳۹)

اِس کا جواب یہ ہے کہ حشر کے دن کئی مواقف اور مختلف احوال ہوں گے۔ بعض مواقف اور بعض احوال میں اللہ تعالیٰ کوئی کلام نہ کرے گا' نہ کوئی سوال کرے گا اور نہ کوئی حساب لے گا۔ یہ اُس وقت ہو گا جب اللہ تعالیٰ جلال سے فرمائے گا کہ آج کس کی بادشاہی ہے؟ (سورۃ المؤمن :۱۶) پھر جب ہمارے نبی مکرم ﷺ سجدہ ریز ہو کر اللہ تعالیٰ کو راضی کریں گے' تب اللہ تعالیٰ مخلوق سے سوال کرے گا اور اُن سے حساب بھی لے گا اور اُن سے کلام بھی فرمائے گا لیکن مؤمنوں سے محبت سے کلام فرمائے گا۔ سو کفار سے سوال اور حساب کی نفی کی آیات کا تعلق پہلے موقف اور پہلے حال سے ہے اور اُن سے سوال کرنے اور حساب لینے کے ثبوت کی آیات کا تعلق بعد کے موقف اور بعد کے حال سے ہے۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن کے اعمال معلوم کرنے کے لئے سوال نہیں کرے گا کہ تم نے کیا کیا عمل کئے کیونکہ اُسے ہر چیز کا علم ہے لیکن اللہ تعالیٰ اُنہیں ڈانٹنے اور جھڑکنے کے لئے سوال کرے گا کہ تم نے فلاں فلاں عمل کیوں کئے' تم نے ہمارے رسولوں کی اور ہماری کتابوں کی نافرمانی کیوں کی اور اُس کے لئے تمہارے پاس کیا عذر ہے؟ پس تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس دن مؤمن اور کافر ہر شخص سے سوال کرے گا۔ وہ ارشاد فرماتا ہے:
ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ٥ (اَلتَّکَاثُر:۸) (تم سے اُس دن نعمتوں کے متعلق ضرور پوچھا جائے گا۔)

(۷) (۱) کُلُّ " امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْن" ٥ (اَلطُّور : ۲۱)
(۲) کُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَة" (اَلْمُدَّثِّر : ۳۸)
''ہر شخص اپنے عمل کے بدلے میں گروی ہے۔''

یعنی ہر شخص نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے عمل کے بدلہ میں رہن اور گروی رکھا ہوا ہے اور اس کے عمل کے مطابق اس سے معاملہ کیا جائے گا۔ اگر تو اُس کے اعمال نیک ہیں تو وہ اپنے آپ کو اللہ کے عذاب سے چھڑا لے گا اور اگر اُس کے اعمال بد ہیں تو اپنے آپ کو ہلاکت سے بچا نہیں سکے گا۔

(۵) محاسبین (Auditors): '' محاسب (Auditor) ایسا اہل کار ہوتا ہے جس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کے ہاتھ میں جو زر ہے' اُسے وصول کرے' اُن کے حسابات کی جانچ پڑتال کرے اور بلوں کے ساتھ اُن کی موافقت کر کے تصدیق کرے۔'' (The Shorter Oxford Dictionary, p. 122)

(i) اِنَّ رُسُلَنَا یَکْتُبُوْنَ مَا تَمْکُرُوْنَ ٥ (یونس : ۲۱)
''جو چالیں تم چل رہے ہو' ہمارے قاصد (فرشتے) یقیناً اُنہیں لکھتے جا رہے ہیں۔''

(ii) أَمْ یَحْسَبُوْنَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَکْتُبُوْنَ ٥ (الزُّخرُف:۸۰)
''تو کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے رازوں اور اُن کی سرگوشیوں کو سُن نہیں رہے (ضرور سنتے ہیں) اور ہمارے (بھیجے ہوئے) فرشتے اُن کے پاس لکھتے بھی جاتے ہیں۔''

(iii) وَاِنَّ عَلَیْکُمْ لَحٰفِظِیْنَ ٥ کِرَامًا کَاتِبِیْنَ ٥ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ٥ (الانفطار : ۱۰ تا ۱۲)
''بے شک تمہارے اوپر (ہماری طرف سے) یاد رکھنے والے معزز لکھنے والے (مقرر) ہیں' وہ اُسے جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔''

یعنی جزا و سزا نہ صرف واقع ہو کر رہے گی بلکہ اس کے لئے پورے انتظامات اور ایک مکمل نظام ابھی سے موجود ہے۔ اللہ کے فرشتے اعمال کی پوری رپورٹ لکھنے کے لئے مقرر رہیں۔ امین و متدیّن ایسے کہ حق تعالیٰ اُنہیں کِرَامًا (معزز) کے لقب سے پکارتا ہے کہ کوئی امر خلافِ دیانت یا خلافِ حکم اُن سے صادر ہونا ممکن نہیں۔ نظر اُن کی اتنی گہری کہ باریک سے باریک اور خفی سے خفی عمل و محرکِ عمل اُن سے چھوٹنے نہیں پاتے۔ حٰفِظِیْنَ میں اشارہ ہے کہ اُن سے فروگزاشت ممکن نہیں۔ یَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ میں اشارہ ہے کہ کوئی عمل' خفی سے خفی بھی ہو' اُن کی نظروں سے مخفی نہیں رہ سکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اصلاحِ عمل کے لئے اِن آیات کا نظر میں رکھنا بہت مفید ہے۔

''یہ فرشتے مستعد' چست' چاق و چوبند اور اپنے مالک کے وفادار ہیں اور اُن کی غیر جانبداری اور معتبری ہر قسم کے شک و شبہ سے بالا ہے۔ بڑے محتاط طریق سے وہ انسانوں کے اعمال و اقوال کو واضح اور شفاف انداز میں ریکارڈ کرتے ہیں۔ روزِ محشر جب انسان ربُّ العالمین کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کے لئے پیش ہوگا تو وہ علیم و خبیر' فرشتوں کو حکم دے گا کہ وہ اُس کے اعمال کے میمورنڈم کو بطور شہادت پیش کریں۔ اگر تو وہ فرشتوں کے ریکارڈ کئے ہوئے اپنے کسی عمل کا انکار کرے گا تو اُس کی گفتار و آواز اور اعمال کی وِڈیو اُسے سنا دی جائے گی جو اُس کے خلاف نا قابلِ تردید ثبوت ہوگا۔ کسی عمل کا دوبارہ دکھایا جانا سائنس اور ٹیکنالوجی کی جدید ترقی سے ثابت ہو چکا ہے اور ہماری روزمرّہ زندگی میں اُسے ٹیلیویژن پر دیکھا جا سکتا ہے۔''
(محمد علی ہادیؒ۔۔ چارٹرڈ اکاونٹنٹ' ملتان)

(۶) حسابات کا بند ہونا :اس کا ذکر مندرجہ ذیل آیت میں ہے :۔

(i) وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۚ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ٥ (الاعراف:۳۴)

"اور ہر اُمت کے لئے ایک میعاد مقرر ہے' سو جب اُن کی مقررہ میعاد آ جاتی ہے تو وہ نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔"

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ سے مراد کاروبارِ حیات یعنی حسابات کا بند ہونا ہے جس کے بعد یہ وقت ہاتھ نہ آئے گا موت آنے پر کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ بنے گا۔ لہٰذا زندگی کے ہر لحہ کو غنیمت جانو اور اُسے نیکیوں کا تخم بونے اور اطاعتِ الٰہی میں صَرف کرو۔ موت کا وقت چونکہ بتایا نہیں گیا اس لئے انسان ہر وقت موت کا منتظر رہے اور حرام کاموں سے بچتا رہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ کسی حرام کام میں مشغول ہو اور اُس کی موت کا وہی وقت مقرر ہو (اَلْعِیَاذُ باللہ)

(ii) مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ٥ (اَلْحِجر : ۵)

"کوئی قوم نہ اپنی میعادِ مقررہ سے آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔"

(iii) وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا (اَلْمُنٰفِقُوْن: ۱۱)

"اور اللہ کسی کو ہرگز مہلت نہیں دیتا جب اُس کی میعادِ مقررہ آ جاتی ہے۔"

یعنی وقتِ موعود (موت) آنے پر ساری حسرت وتمنا بے کار رہے گی۔

(iv) إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَاءَ لَا يُؤَخَّرُ (نوح : ۴)

"بے شک اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آئے گا' ٹلے گا نہیں۔"

(۷) کھاتے (LEDGER) کی جامعیت :ملاحظہ ہو مندرجہ ذیل آیت :۔

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا ۚ وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا (اَلْکہف : ۴۹)

"اور نامہ اعمال رکھ دیا جائے گا' سو (اے مخاطب!) تو مجرموں کو دیکھے گا کہ جو کچھ اُس میں (لکھا) ہے اُس سے ڈر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ہائے ہماری کم بختی! اِس نامہ اعمال کی تو عجیب حالت ہے کہ اُس نے (کوئی گناہ) نہ چھوٹا چھوڑا' نہ بڑا بغیر اُسے قلمبند کئے اور اُنہوں نے جو کچھ بھی کیا تھا' اُسے (لکھا ہوا) موجود پائیں گے۔"

نوٹ : قیامت میں ہر شخص پڑھنا جانتا ہوگا اگرچہ دنیا میں اَن پڑھ رہا ہو۔ یہ فائدہ وَيَقُوْلُوْنَ۔۔الخ سے حاصل ہوَا کہ اعمالنامہ پڑھتے ہی اُنہیں دنیا کی زندگی اور اپنے کرتوت و کردار یاد آ جائیں گے اور سب لمحات اُن کی آنکھوں کے سامنے پھر جائیں گے۔

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک چھوٹی سی نیکی کو معمولی سمجھتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے اور بعض اوقات گناہِ صغیرہ کی پروا نہیں کرتا اور اُنہیں نظر انداز کئے جانے کے قابل سمجھتے ہوئے بار بار کرتا چلا جاتا ہے۔ اِن دونوں حالتوں میں انسان کو تنبیہ کی گئی ہے۔ نیک کاموں کی خواہ وہ کتنے ہی معمولی ہوں' ترغیب دی گئی ہے کیونکہ اُن کا ثواب بہرحال ملنا ہے۔ بدعملیوں کی سزا ہے اگرچہ وہ ذرّہ (ایٹم) برابر کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا ہمیں نہ تو چھوٹی نیکیوں کو چھوڑنا چاہئے اور نہ ہی گناہِ صغیرہ کا ارتکاب کرنا چاہئے۔''

''یہ آیات تمام بنی نوع انسان کے لئے ہمہ گیر سبق دیتی ہیں۔ یہ افراد کے کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں اور اِنہی افراد سے معاشرہ بنتا ہے۔ اس طرح یہ مسلمانوں کے معاشرے کو فلاحی بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔'' (محمد علی ہادیؒ ۔۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ملتان)

(۸) حسابات کی وضاحت : سزا دینے سے پہلے عدالتوں میں عموماً جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مجرم کو پہلے چارج شیٹ (الزام کی یادداشت) دی جاتی ہے' پھر جرم کو Prosecution Witness سے ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد مجرم کو اپنے دفاع کا موقع دیا جاتا ہے۔۔۔ یومِ حساب کو اگر مجرم (گنہگار) چارج شیٹ لینے سے انکار کریں گے تو جرم کو ثابت کرنے کے لئے Prosecution Witness وہاں موجود ہوں گے یعنی اُن کے جسم کے اعضاء مثلاً زبانیں' ہاتھ اور پاؤں اُن کے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ کیا کرتے رہے تھے۔ (ایضاً)

''یہ چارج شیٹ جس کا ذکر محمد علی ہادی نے اوپر کیا' قرآن مجید کے درجِ ذیل الفاظ میں ملتی ہے:۔
يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ○ (القیمة : ۱۳)
''اُس روز انسان کو سب اگلا پچھلا کیا ہوَا جتلا دیا جائے گا۔''

بِمَا قَدَّمَ سے مراد وہ عملِ خیر ہے جو انسان دنیا میں کر گزرا ہے۔ وَأَخَّرَ سے مراد وہ عمل ہے جو انسان نہ کر پایا۔ یہ جتلانا اس معنیٰ میں نہ ہوگا کہ ایک بے خبر اور ناواقف کو باخبر اور واقف کیا جا رہا ہے بلکہ یہ جتلانا بطور اتمامِ حجت و قطع جواب

''اے انسان! تجھے (آخر) کس چیز نے اپنے کریم پروردگار سے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے! (وہ پروردگار) جس نے تجھے پیدا کیا' پھر تیرے (اعضاء کو) درست کیا' پھر تیرے (عناصر کو) معتدل بنایا (الغرض) جس شکل میں چاہا' تجھے ترکیب دے دیا۔''

(ر) رفعتِ شان: رحیم خالق بذاتِ خود عظیم ترین اور اَرفع و اعلیٰ ذات ہے۔ اُس نے اپنی رفعتِ شان کا کچھ حصہ اپنی مخلوق کو بھی عطا کیا ہے' جس کے بارے میں قرآنِ حکیم یوں فرماتا ہے:۔

(۱) مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍo (اَلْمُلْك: ۳)

(۲) اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْo وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْo وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْo وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْo (اَلْغَاشِیَة: ۱۷-۲۰)

(i) ''تمہیں (خداوند) رحمٰن کی تخلیق میں کوئی خلل نظر نہیں آئے گا۔ ذرا پھر نگاہ اُٹھا کر دیکھ' کیا تجھے کوئی رخنہ دکھائی دیتا ہے؟''

(ii) ''کیا یہ لوگ (غور سے) اونٹ کو نہیں دیکھتے کہ اُسے کیسے (عجیب طرح) پیدا کیا گیا ہے اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ اُسے کیسے بلند کیا گیا ہے اور پہاڑوں کی طرف کہ اُنہیں کیسے گاڑا گیا ہے اور زمین کی طرف کہ اُسے کیسے بچھایا گیا ہے۔''

اپنے دل کی آنکھ سے یہ سب کچھ دیکھ کر کیا انسان اِس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اُس کی زندگی کا ایک دانشمندانہ منصوبہ اور مقصد ہے یا اپنے انتہائی مہربان و مشفق خالق و مالک سے منہ موڑ سکتا ہے جس کے حضور اُس نے حاضر ہو کر اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہونا ہے؟

اِس ضمن میں John D. Barrow اور Frank J. Tipler یوں لکھتے ہیں:۔

''کائنات میں عظیم ڈیزائن کارفرما ہے جو ایک دانشمندانہ زندگی کی نشوونما کے موافق ہے۔''

("The Anthropic Comological Principle", p. 315)

اُس اَبدی سچائی (کہ قرآنِ حکیم فطرت کے مطالعے کے ذریعے فطرت کے خالق پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے جیسا کہ سُورۃُ البَقرَة کی آیت ۱۶۴ میں ارشاد ہوا اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ -- الخ) کی بابت ایک امریکی سائنسدان Guy Murchie یوں لکھتے ہیں:۔

''کائنات کی چیزوں کے پیچھے کوئی اور راہ نما ہستی کارفرما ہے اور یہ کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ خدا کے وجود کا ایک ریاضیاتی ثبوت ہے۔'' ("The Seven Mysteries of Life", p. 598)

(۳) عالَمِ بشریات (انسانیات) میں حُسن: اِس ضمن قرآنِ حکیم فرماتا ہے:۔

(۱) وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًاo (بنی اسرائیل: ۷۰)

کے ہوگا۔ تمام ارتکابی اور اجتنابی اعمال' تمام نیکیاں جو اُس نے کیں' تمام برائیاں جو اُس نے کیں' اور وہ تمام اثر و رسوخ جو اُس نے بڑی آن بان کے ساتھ پیدا کیا اور جو اثر و رسوخ اُس نے اپنے پیچھے چھوڑا' اُس دن سب اُسے بیان کر دیا جائے گا اور اُسے اپنے حق میں بولنے کا موقع فراہم کیا جائے گا شاید کہ وقت کی ہولناکی سے اُسے کچھ سکون مل جائے۔

''آدمی اپنے متعلق جو کچھ کہتا ہے'' یا ''جو کچھ لوگ اُس کے بارے میں کہتے ہیں'' یہ ایسے عوامل نہیں جن کی روشنی میں اس کے خلاف فیصلہ صادر کیا جا سکے۔ یہ اُس کی اپنی ذات ہی ہے جس کے متعلق وہ خود بخوبی جانتا ہے اگرچہ وہ کچھ ڈرامائی خام خیالیوں میں کیوں نہ چھپتا پھرے۔ قرآن فرماتا ہے''۔

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ'' o وَلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ o (القیٰمۃ : ۱۴'۱۵)

''بلکہ (اصل یہ ہے) کہ انسان خود ہی اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گو وہ اپنے حیلے پیش لائے''۔

مَعَاذِیْر جمع ہے مَعْذِرَۃ کی۔ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ انسان ہر چند اپنے کاموں کا عذر پیش کرے گا اور اپنی مدافعت میں دلائل دے گا اور ہر ممکن طریقہ سے بحث کرے گا لیکن اس سے اُسے کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس کے اعضاء و جوارح اس کے خلاف گواہی دیں گے اور پھر وہ اپنے نہاں خانۂ دل میں حقیقتِ حال کو خوب سمجھے رہتا ہے اور اُس کا ضمیر خود اس کے جرائم پر گواہ ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا' اب Prosecution Witnesses (انسان کے اعضاء و جوارح) کو بلایا جائے گا تا کہ وہ خدائی فیصلے کو اُس کے منطقی انجام تک پہنچائیں:

(i) یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَیْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَیْدِیْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ o (النور:۲۴)

''اُس دن (جس دن) اُن کے خلاف اُن کی زبانیں' اُن کے ہاتھ اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے اُن کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے''۔

(ii) اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِهِمْ وَتُکَلِّمُنَا اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ o

''آج ہم اُن کے منہ پر مُہر لگا دیں گے اور ہم سے اُن کے ہاتھ کلام کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ لوگ کیا کیا کرتے رہتے تھے''۔ (یٰسٓ:۶۵)

منہ پر مُہر لگانا یوں ہوگا کہ وہ کوئی جھوٹی داستان تصنیف کر کے پیش ہی نہ کر سکیں۔

مندرجہ ذیل احادیثِ مبارکہ بھی اِسی ضمن میں آئی ہیں جن میں رسولِ مکرّم ﷺ نے فرمایا:۔

(۱) فَيُخْتَمُ عَلٰى فِيْهِ وَيُقَالُ لِفَخِذِهٖ وَلَحْمِهٖ وَعِظَامِهٖ انْطِقِيْ فَتَنْطِقُ فَخِذُهٗ وَلَحْمُهٗ وَعِظَامُهٗ بِعَمَلِهٖ (صحيح مسلم : ۲: ۴۰۹)

"اُس کے منہ پر مُہر لگادی جائے گی' پھر اُس کی ران' اُس کے گوشت اور اُس کی ہڈیوں سے بولنے کو کہا جائے گا۔ سو اُس کی ران' اُس کا گوشت اور اُس کی ہڈیاں گواہی دیں گی کہ وہ (دنیا میں) کیا کرتا رہا تھا۔" (صحیح مسلم : ۲ : ۴۰۹)

(۲) إِنَّ أَوَّلَ عَظْمٍ مِّنَ الْإِنْسَانِ يَتَكَلَّمُ يَوْمَ يُخْتَمُ عَلَى الْأَفْوَاهِ فَخِذُهٗ مِنَ الرِّجْلِ الشِّمَالِ (اَلدُّرُّ الْمَنْثُوْر لجلال الدين السيوطي : ۵ : ۲۲)

"جس دن منہ وں پر مُہریں لگادی جائیں گی' تو انسان کی بائیں ران کی ہڈی سب سے پہلے بولے گی۔"

جب انسان بدی کے آگے بے بس ہو کر اُسے کر گزرتا ہے تو اُس کے ہاتھ پاؤں اور فطری صلاحیتیں اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور وہ روزِ قیامت اُس کے خلاف بہ طور بھانڈا پھوڑنے والے گواہ ہوں گی۔ اگر اِن فطری صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو اُس کے تمام حسّی اعضاء اور تمام ذہنی اور جذباتی اجزائے لازم اُس کی ترقی میں معاون ثابت ہوتے ہیں وگرنہ وہ اُسے پٹخ کے رکھ دیتے ہیں۔

حسّی اعضاء کا بولنا کیسا ہے؟ اسلام نے اِس نظریے سے انسان کو اُس زمانے میں متعارف کرایا جب اُس زمانے کے سرکش لوگ جہالت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور مافوق الفطرتی حقائق سے بالکل ناآشنا تھے۔ وہ اعضاء کے بولنے کے نظریے کو کیسے تسلیم کر سکتے تھے جبکہ وہ مردہ اجسام کے اُن کے گل جانے کے بعد دوبارہ جی اُٹھنے پر ایمان لانے کو تیار نہ تھے۔

علمی ترقی کے اِس دورِ جدید میں بھی کچھ لوگ غیر معقول اور بدبخت دشمنانِ اسلام کی پیروی میں جہالت کی اُسی کشتی میں سوار ہیں اور اعضاء کے بولنے کے نظریے کو خلافِ عقل مانتے ہیں اور اِسے اپنے گستاخانہ تمسخر اور زہر آلود طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ اُنہیں معلوم نہیں کہ جینیٹک انجینئرنگ میں جدید تحقیق نے انسانی خلیوں (Cells) میں اس قدر بے پایاں وسعت اور فراخی کو ثابت کر دیا ہے کہ وہ انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا کی سائز کے دس کروڑ صفحات پر مشتمل معلومات ریکارڈ کر سکتے ہیں۔ ہر ایک خلیہ جو صرف خوردبین کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے' اپنے اندر وسیع وفراخ دنیا سمیٹے ہوئے ہے' بالیقین اُس دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے بولے گا جس سے جسم کے باقی تمام اعضاء حیران ہو کر رہ جائیں گے۔

ہارون یحیٰ اپنے مخصوص انداز میں ''خلیہ -- ایک عظیم کارخانہ جو خوردبین کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:-

''ہمارے جسم کھربوں خلیوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ہر بالغ انسانی جسم میں تقریباً ایک سو کھرب خلیے ہوتے ہیں۔ یہ خلیے بہت چھوٹے ہوتے ہیں جبکہ ہمارے جسم بڑے سائز کے نہیں ہوتے۔ جب ہمارے جسم کے ایک لاکھ خلیے ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو وہ سوئی کی نوک سے زیادہ جگہ نہیں گھیرتے۔ تاہم اِن خلیوں کے چھوٹا ہونے کے باوجود اُن کی ساخت اور ہیئت کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکا۔''

''پہلا خلیہ جس سے آپ بنے' وہ خلیہ ہے جس کی ابتداء دو خلیوں کے ملاپ سے آپ کی والدہ کے شکم میں ہوئی جن میں سے ایک آپ کی والدہ کے جسم سے اور دوسرا آپ کے والد کے جسم سے نکلا۔ یہ خلیہ بعد میں تقسیم کے مراحل سے گزرتا ہوا گوشت کی ایک بوٹی بن گیا۔ پھر خلیے جیسے جیسے گوشت بناتے رہے' تقسیم کے مراحل سے گزرتے ہوئے نئے خلیوں کو پیدا کرتے رہے اور اس طرح آپ کا جسم رفتہ رفتہ بنتا چلا گیا۔''

''ہر نئے خلیے کو مختلف شکل ملتی رہی۔ کچھ خلیے خون کے خلیے اور کچھ عصبہ خلیے بن گئے۔ ہمارے جسموں میں دو سَو قسموں کے مختلف خلیے ہیں۔ دراصل یہ تمام خلیے باہم ملتے جلتے اجزاء سے تشکیل دیئے گئے ہیں' اس کے باوجود ہر ایک خلیہ مختلف کام کرتا ہے۔ مثلاً آپ کی ٹانگوں میں اعصابی خلیے بٹی ہوئی رسّی کی طرح ہیں تاکہ آپ چل سکیں اور دوڑ سکیں۔۔۔ آپ کے خون کے خلیے شکل میں بیضوی ہیں جن کا کام آکسیجن کو خون کی نالیوں کے ذریعے جسم کے مختلف حصّوں میں اُن کی ضرورت کے مطابق منتقل کرنا ہے۔ بحمدہ تعالیٰ اُن کی ساخت اس طرح کی گئی ہے کہ وہ اپنے ساتھ لائی ہوئی آکسیجن سمیت خون کی نالیوں سے بہ آسانی گزر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس جلد کے خلیے آپس میں قریبی طور پر ایک قطار میں جُڑے ہوئے ہیں۔ اسی لئے آپ کی جلد پھپھوندی اور پانی کے لئے غیر جاذب ہے۔''

''اسی طرح تمام دوسرے خلیوں کی بھی مثالی شکلیں ہیں جو اُن کے کاموں کے بالکل موافق و مطابق ہیں۔ لیکن یہ کوئی اتفاق کا نتیجہ نہیں کہ اِن خلیوں نے اپنے طور پر یہ شکل اپنا لی ہو۔ ذرا کمپیوٹر' موٹر کاروں اور ہوائی جہازوں پر غور کیجئے۔ اُن کی شکل اور اُن کے چلانے کے نظام کو بنانے والا کوئی تو ہے۔ ایک نظام کو بنانے اور ایک پیداوار کو معرضِ وجود میں لانے کے لئے ایک ذہنی منبع کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے خلیوں کے کام اور دائرہ ہائے عمل ٹیلیویژن اور کسی دوسری تکنیکی مشینری سے زیادہ وسیع اور ترقیاتی ہیں اور سائنسدان اِن چھوٹی چھوٹی اکائیوں کے معجزانہ نظام کو مکمل طور پر سمجھ نہیں پائے۔''

"آپ حیران ہو رہے ہونگے کہ ایسا ڈیزائن کہ انسان جس کا مکمل جائزہ نہیں لے سکا' ایک چھوٹی سی جگہ پر کیسے وجود میں آ گیا؟ اس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے خلیوں کی منصوبہ بندی اور تخلیق ایسی ہستی سے کی گئی ہے جو عقلِ کُل ہے۔ وہ عقلِ کُل اللہ تبارک وتعالیٰ ہے جس نے ہمیں ہر طرح مکمل طور پر پیدا کر کے بھیجا اور کائنات کی ہر چیز کو ہماری حیات اور بقا کے موافق و مطابق پیدا کیا۔" (Miracles in Our Bodies... Harun Yahya, pp. 18-21, 23)

وہ شخص کتنا احمق ہے جو اللہ تعالیٰ کو اتنا قادر بھی نہیں سمجھتا کہ وہ انسانی اعضاء سے بات کرائے' وہ اللہ کہ جس نے ہماری خدمت کے لئے کھربوں خلیے ہمارے جسموں کی غیر متصوّر چھوٹی سی جگہ پر بنا دیئے!

حِسّی اعضاء میں جلد کی اہمیت : انسان اندھا' گونگا' بہرا ہو کر اور قوتِ ذائقہ اور شامّہ (سونگھنے کی قوت) سے محروم رہ کر زندگی گزار سکتا ہے لیکن اُس کی بقا قوتِ لامسہ کے بغیر جو جلد سے ہوتی ہے' کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قوتِ لامسہ (Power of Touch) کے ختم ہونے کا مطلب موت ہوتا ہے۔ جلد انسان کی خواب کی اور بیداری کی دونوں حالتوں میں دماغ کو برقی اشارہ (Feedbacks) دیتی ہے۔ جلد کے اِسی عمل کی بدولت اِسے صحیح طور پر بجلی کا موصل کہا جاتا ہے۔ J. Lionel Taylor جلد کی اہمیت پر اُس کی حسِ لامسہ کے حوالے سے یوں بات کرتا ہے:۔

"ہمارے جسم میں عظیم حِس' لمس کی حِس ہے۔ خواب اور بیداری دونوں حالتوں میں یہ غالباً سب سے بڑی اور اہم حِس ہے۔ یہ ہمیں کسی چیز کی گہرائی' اس کے پتلے پن اور اُس کی ساخت کا پتہ دیتی ہے۔ ہم اپنی جلد کے حیوی خلیوں (Corpuscles) کے ذریعے کسی چیز کو محسوس کرتے ہیں' اِنہی کے ذریعے محبت اور نفرت کرتے ہیں' اِنہی کے ذریعے حسّاس ہو جاتے ہیں۔" ("The Stages of Human Life" p. 157)

(۹) صاف ستھرا لیکن غیر جانبدارانہ سخت محاسبہ : ہمارے دنیاوی محاسباتی نظام میں کمزوریوں' غلطیوں، بھول چُوک اور بے ربطیوں کا ہونا ایک لازمی امر ہے چاہے گوشواروں اور کھاتوں کو کتنی ہی دیانتداری' احتیاط اور حُسنِ نیت سے کیوں نہ تیار کیا جائے کیونکہ وہ انسان کے بنائے ہوئے ہوتے ہیں اور انسان خطا کا پُتلا ہے۔ لیکن وہ قادرِ مُطلق ذاتِ حق وصداقت کو چھپانے سے کوسوں دُور ہے' اُس کی ذات ہر قسم کی خامی' عیب اور غلطی سے مبرّا ہے اور اُس کا علم ہر چیز کو محیط ہے چنانچہ سورہ طٰہٰ کی آیت ۵۲ میں فرمایا: لَا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى ۝ (میرا رب نہ تو بھٹک سکتا ہے اور نہ ہی بھول سکتا ہے)۔

بدکاروں کو بھی پورا انصاف ملے گا جبکہ نیکوکاروں کو اُن کے حق سے زیادہ جائے گا جیسا کہ سورہ قٓ کی آیت ۳۵ میں ارشاد ہوا: لَهُم مَّا يَشَآءُونَ فِيهَا وَلَدَيۡنَا مَزِيدٌ "o
''اُن (اہلِ جنت) کو وہاں (جنت میں) سب کچھ ملے گا
جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اور بھی بہت کچھ ہے۔''

مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ لَدَيۡنَا مَزِيدٌ" سے مراد یہ ہے کہ اہلِ جنت کو انہی جیتی جاگتی آنکھوں سے اللہ تعالٰی کی زیارت کرائی جائے گی اور اُس لمحے وہ وجد و مسرت کے جذباتِ وفور میں اس قدر مست اور مستغرق ہوں گے کہ وہ اس بات کی شدید آرزو کریں گے کہ پلک جھپکنے کی دیر تک بھی اُنہیں اِس لذّتِ دیدار سے محروم نہ رکھا جائے، چاہے جنت اپنی تمام خوشیوں اور لذات و کیفیات سمیت اُن سے واپس لے لی جائے۔ وہ رحیم و کریم ذات اُن کے وجد و انبساط میں یہ فرماتے ہوئے مزید اضافہ فرمائے گی کہ اُس کا دیدار بھی ابدالآباد تک اُنہیں کرایا جاتا رہے گا اور جنت کی فرحت و انبساط، لذّات و نعم بھی اُن سے کبھی منقطع نہیں ہوں گی۔ (ملخص از: تفسیر مظہری، ضیاء القرآن) [اللہ تعالٰی ہمیں بھی اِس لذت سے شادکام فرمائے! آمین]

(۱۰) خدائی قانونِ مکافات (Divine Retribution)

(i) وَوُفِّيَتۡ كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُونَo (آلِ عمران: ۲۵)
''اور ہر شخص کو جو کچھ اُس نے کیا ہے، پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

(ii) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنۡ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفۡهَا وَيُؤۡتِ مِنۡ لَّدُنۡهُ اَجۡرًا عَظِيۡمًاo (النّساء: ۴۰)
''بے شک اللہ تعالٰی ذرّہ برابر بھی ظلم نہیں کرے گا اور اگر ایک نیکی ہو گی تو اُسے دوگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔''

''سو کیا اندازہ اور کیا ٹھکانہ ہے ایسے پروردگار کی رحمت و فیضانِ کرم کا! مِنۡ لَّدُنۡهُ یعنی اپنے پاس سے یعنی زائد از استحقاق بلکہ بلا استحقاق۔ اسلام کا خدا نہ کوئی خونخوار دیوتا ہے اور نہ ایسا معذور کہ کسی پر کرم کرنا چاہے بھی تو اپنی صفتِ عدل کو برقرار رکھنے کے لئے کسی اور پر اُسے ظلم کرنا پڑے۔۔۔ شرک اور مسیحی شرک دونوں کی تردید آیت سے ہوگئی۔'' (تفسیر ماجدی اردو: ص ۱۹۲)

لَدُنۡ اور عِنۡدَ میں فرق: دونوں کے معنی پاس اور نزدیک کے ہیں۔ مگر عِنۡدَ عام ہے اور لَدُنۡ خاص۔

اگر آپ کی رقم کسی دوسری جگہ میں ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں عِنْدِیْ کَذَا مگر لَدُنْ وہاں ہی کہا جائے گا جب رقم اپنے پاس اور قبضے میں ہو (تفسیر کبیر)

(iii) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (اَلنَّحل : ۹۷)
"نیک عمل جو بھی کرے گا مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اُسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا فرمائیں گے اور ہم اُنہیں اُن کے اچھے کاموں کے عوض میں ضرور اجر دیں گے۔"

"گویا ایمان وعملِ صالح یا مؤمنانہ زندگی کا ایک معاوضہ تو جس کا نام حیاتِ طیبہ ہے' نقد اِسی دنیا میں مل جائے گا اور پھر دوسرا اور اس سے کہیں بڑھ کر بڑا معاوضہ آخرت میں نصیب میں آئے گا۔ حَیٰوةً طَیِّبَةً کی بشارت سے یہ مراد نہیں کہ مؤمنِ صالح کو کبھی فقر یا مرض طاری نہ ہوگا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اطاعت کی برکت سے اُس کے دل میں ایسا نور پیدا ہوگا جس سے وہ ہر حال میں صابر وشاکر اور تسلیم ورضا رہے گا اور سکون وجمعیتِ خاطر کی اصل یہی رضا ہے۔ (مولانا اشرف علی تھانوی بحوالہ تفسیر ماجدی ص ۵۷۰)

یہاں دو نکات قابلِ توجہ ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کی نظر میں اعمال کے لحاظ سے مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں۔ (۲) نیک اعمال کے لئے ایمان شرط ہے۔ اسلام کو چھوڑ کر کوئی یہودی' عیسائی' صابئ' ہندو' سکھ وغیرہ کتنا ہی دنیا کی نظروں میں نیک بنے' سب بے کار اور برباد ہے۔ کافر اگر اچھے اور فلاح و بہبود کے کام کرے اور انسانی ہمدردی کرے تو اُسے بھی عملِ صالح تو کہا جائے گا لیکن وہ نیکی اور بِرّ وتقوٰی نہ کہلائے گا لہٰذا اجر سے محروم رہے گا۔ اُس کا صلہ صرف اِتنا ہے کہ اُسے دنیا میں نیک نامی اور شہرت مل گئی۔

<u>ایک سوال اور اُس کا جواب</u>: اِس آیت سے ثابت ہؤا کہ ایمان کے بغیر اچھے اعمال بے کار ہیں لیکن سورۃ الزلزال کے آخر میں ہے: ''جس نے ذرّہ بھر نیکی کی ہوگی' وہ اُسے بھی دیکھ لے گا (آیت: ۷) اور جس نے ذرّہ بھر بدی کی ہوگی' وہ اُسے بھی دیکھ لے گا (آیت: ۸)۔'' یعنی ذرّہ برابر بھی اچھا کام کیا تو قیامت میں اُسے ضرور دیکھے گا یعنی اجر پائے گا۔ اِن دونوں بیانات میں تضاد کیوں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الزلزال کی مذکورہ دونوں آیتوں میں بالترتیب مؤمن اور کافر کا ذکر ہے۔ مؤمن کے اعمال خیر ہیں جنہیں وہ (بروئے آیت: ۷) دیکھ لے گا جبکہ کافر کے اعمال شر ہیں جنہیں وہ (بروئے آیت: ۸) دیکھ لے گا۔ یعنی سورۃ الزلزال کی ساتویں آیت کا تعلق مؤمن سے اور آٹھویں آیت کا تعلق کافر سے ہے۔

(۱۱) متوازن اور با اُصول طریق کار (Well-balanced Polity):

(i) فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُه‘ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ o وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُه‘ فَأُولٰئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْا أَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ o (المؤمنون: ۱۰۲، ۱۰۳)

”جس کسی کا میزانِ عمل بھاری ہوگا تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہوں گے۔اور جس کسی کا میزانِ عمل ہلکا ہوگا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا اور وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔“

(ii) فَأَمَّا مَنْ طَغٰى o وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا o فَإِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَأْوٰى o وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى o فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى o (النّٰزعٰت: ۳۷ تا ۴۱)

”تو جس کسی نے سرکشی کی ہوگی اور دُنیوی زندگی کو ترجیح دی ہوگی تو ایسے کا ٹھکانہ بس دوزخ ہی ہوگا۔ اور جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو خواہش سے روکا ہوگا تو ایسے کا ٹھکانہ جنّت ہوگا۔“

ذکر گنہگار اور خطا کار کا نہیں بلکہ مجرم کافروں کا ہو رہا ہے جنہوں نے اُخروی زندگی سے منکر ہو کر اِسی ناسوتی زندگی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ دوزخ مستقل ٹھکانہ صرف اُنہی کا ہو سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

”قوّتِ نظریہ اور قوّتِ عملیہ کا فساد: انسان کو دو قوّتیں ودیعت کی گئی ہیں: قوّتِ نظریہ اور قوّتِ عملیہ۔ قوّتِ نظریہ کا کمال یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور وہ اُس کی توحید کی تصدیق کرے اور یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اُس پر غالب ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو حقیر جانے گا اور سرکشی اور تکبر کی بجائے انکسار اور تواضع اختیار کرے گا۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں کرے گا اور اُس کی توحید کی تصدیق نہیں کرے گا تو وہ سرکشی اور تکبر کرے گا۔ قوّتِ عملیہ کا کمال یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر اور رسول اللہ ﷺ کے تمام فرامین پر عمل کرے اور دنیا کے عیش و عشرت پر آخرت کو ترجیح دے۔ قوّتِ عملیہ کا فساد یہ ہے کہ انسان دنیا کے لہو و لعب اور عیش و عشرت میں مستغرق ہو کر آخرت کو فراموش کردے۔ النّٰزعٰت کی آیت: ۳۷ میں قوّتِ نظریہ کے فساد کا ذکر ہے کیونکہ جب قوّتِ نظریہ فاسد ہو جاتی ہے تو انسان سرکشی کرتا ہے اور آیت: ۳۸ میں قوّتِ عملیہ کے فساد کا ذکر ہے کیونکہ جب قوّتِ عملیہ فاسد ہو جاتی ہے تو انسان دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے۔“

”اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ گناہ کے جس حال میں کھڑا ہو

وہ اُس حال میں ڈرر ہا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کام کے کرنے سے منع فرمایا ہے اور میں اُسے کر رہا ہوں۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو گناہ کی لذت حاصل کرنے اور شہوت کے تقاضے پورا کرنے سے روکا ہو اور اُسے آخرت کے عذاب کا خوف دامن گیر ہو اور جب اُس پر یہ کیفیت طاری ہوگئی تو اُس پر اپنی شہوت کے تقاضے کو ترک کرنا اور آخرت کو سنوارنا آسان ہو جائے گا۔'' (''تبیان القرآن''۔۔غلام رسول سعیدی' ج ۱۲' ص ۵۶۲' ۵۶۳)

(iii) فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖo فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًاo وَّيَنْقَلِبُ إِلٰى أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًاo وَ أَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهْرِهٖ o فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًاo وَّ يَصْلٰى سَعِيْرًاo إِنَّهٗ كَانَ فِيْ أَهْلِهٖ مَسْرُوْرًاo (اَلْاِنْشِقَاق : ۷ تا ۱۲)

''تو جس کسی کا نامہ اعمال اُس کے دائیں ہاتھ میں ملے گا' تو اُس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ اپنے گھر والوں کے پاس خوش خوش لوٹ کر آئے گا اور جس کسی کا نامہ اعمال اُس کی پیٹھ پیچھے سے ملے گا تو وہ موت کو پکارے گا اور جہنّم میں پڑے گا۔ وہ اپنے والوں میں خوش خوش رہا کرتا تھا۔''

آسان حساب کا معنیٰ یہ ہے کہ اُس کے اوپر اُس کے اعمال پیش کئے جائیں اور وہ جان لے کہ اِن اعمال میں یہ طاعت اور یہ معصیت (گناہ) ہے۔ اُسے طاعت پر تو ثواب دیا جائے اور اُس کی معصیت سے درگزر کیا جائے تو یہ آسان حساب ہے۔ اس میں اُس شخص پر نہ کوئی سختی ہے اور نہ اُس سے کوئی مناقشہ ہے اور نہ اُس سے یہ کہا جائے گا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟ اور فلاں کام کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ اگر اُس سے عذر پوچھا جائے اور وہ عذر پیش نہ کر سکے تو وہ رسوا ہوگا۔ پھر جب اُس سے یہ آسان حساب لیا جائے گا تو وہ اپنے اہل کی طرف خوشی خوشی لوٹے گا اور ثواب حاصل کرنے والا ہوگا اور عذاب سے نجات پانے والا ہوگا۔ اُس کے اہل سے مراد اُسے ملی ہوئی بڑی' موٹی آنکھوں والی حوریں' اُس کی بیویاں اور اُس کی اولاد ہیں بشرطیکہ وہ مؤمن اور اہلِ جنّت سے ہوں۔

آنجناب ﷺ نے فرمایا کہ جس سے اُس دن حساب میں مناقشہ کیا جائے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ (المستدرک' ج ۱' ص ۲۵۵ ؛ شعب الایمان' رقم الحدیث: ۲۷۰ ؛ صحیح ابنِ خزیمہ' رقم الحدیث: ۸۴۹' ۳۷۲؛ مُسند احمد ج ۶' ص ۴۸)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آیات ۱۰ تا ۱۴ اسود بن عبدالاسد کے متعلق نازل ہوئیں اور اس کا حکم ہر مؤمن اور کافر کے متعلق عام ہے۔ وہ اپنا دایاں ہاتھ نامہ عمل کو لینے کے لئے بڑھائے گا تو فرشتہ اُس کے بائیں ہاتھ میں نامہ پکڑا کر اُس کے ہاتھ کو موڑ کر اُس کی پیٹھ کے پیچھے کر دے گا اور وہ اپنی موت کو طلب کرے گا۔

(۱۲) کوئی قائم مقامی (Proxy) اور کوئی تلبیس* (Impersonation) نہیں ہوگی: ان آیات میں ذاتی ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کیا گیا ہے:۔

(i) وَلَاتَزِرُ وَازِرَةٌ" وِّزْرَ أُخْرٰی (الانعام: ۱۶۴؛ الاسراء: ۱۵؛ فاطر: ۱۸؛ النجم: ۳۸)
"اور کوئی بوجھ اُٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔"

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایصالِ عذاب درست نہیں یعنی گناہ کر کے اُس کا عذاب کسی کو بخشا جائے۔ البتہ ایصالِ ثواب درست ہے اور اُس کا ثبوت قرآن وحدیث میں ملتا ہے۔

یہ آیت اُن مشرکین کے جواب میں اُتری جنہوں نے اس بات کی پیشکش کی تھی کہ اگر محمد (ﷺ) اُن کے مشرکانہ عقیدے پر آجائیں تو اُن کا یہ گناہ مشرکین اپنے ذمہ لے لیں گے۔ (تفسیر بیضاوی)

آیت میں عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ کی بھی تردید ہوگئی اور اسی طرح اُن کے اِس عقیدہ کی بھی تردید ہو گئی کہ آدم علیہ السلام کے گناہ کی سزا نسلاً بعد نسلٍ ساری اولادِ آدم کو ملتی رہے گی یا مشرکوں کا یہ عقیدہ کہ خدا جس کی بجائے جسے چاہے سزا دے دے۔ ("احکام القرآن-- جصاص)

ایک سوال اور اُس کا جواب : اِس آیت نے بتایا کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا لیکن سورۃ العنکبوت کی آیت ۱۳ میں سردارانِ کفر کے متعلق ارشاد ہوا کہ وہ اپنا بوجھ بھی اُٹھائیں گے اور دوسروں کا بھی۔ تو اِن دونوں آیتوں میں تعارض کا جواب ایک تو یہ ہے کہ سردارانِ کفار بخوشی سب کا بوجھ نہ اُٹھائیں گے بلکہ اُن پر جبراً بوجھ لادے جائیں گے۔ اِس آیت ۱۳ میں بخوشی اٹھانے کی نفی ہے۔ دوسرے یہ کہ سردارانِ کفر اپنے ماتحتوں کا بوجھ اِس طرح نہ اُٹھائیں گے کہ ماتحت لوگ ہلکے ہوجائیں بلکہ اِس طرح اُٹھائیں گے کہ اُن پر بھی بوجھ باقی رہیں گے۔ چونکہ سردارانِ کفر نے دو جُرم کئے: خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا' اس لئے اُن پر دوسروں کا بھی وبال پڑا۔ اُن کے ماتحتوں نے یہ جُرم کیا کہ سرداروں کی بات مان کر اور اُن کی صحبت میں رہ کر گمراہ ہوئے لہٰذا وہ بھی بوجھ تلے دبے۔

اسی طرح سورۃ النحل کی آیت ۲۵ میں ہے: "تا کہ وہ (متکبر کافر) روزِ قیامت اپنے (گناہوں کے) پورے بوجھ اُٹھائیں اور کچھ بوجھ اُن لوگوں کے بھی اُٹھائیں جنہیں وہ اپنی جہالت سے گمراہ کرتے تھے۔"

* خود کو کسی اور کے طور پر ظاہر کرنا تلبیس (Impersonation) کہلاتا ہے۔

تو اس کا بھی یہی جواب ہے کہ جن لوگوں نے کسی برائی اور گناہ کو ایجاد کیا تو قیامت تک جتنے لوگ اُس برائی پر عمل کریں گے' تو اُن کے گناہوں کی سزا میں اُس برائی کے ایجاد کرنے والے کا بھی حصّہ ہوگا کیونکہ وہ اُن سب لوگوں کے لئے اُس بُرائی کے ارتکاب کا سبب بنا تھا اور بعد کے لوگوں کی سزا میں کوئی کمی نہیں ہوگی جیسا کہ اس حدیثِ مبارکہ میں ہے جو جنابِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس شخص نے ہدایت کی دعوت دی تو اُسے ہدایت پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر اجر ملے گا اور اُن متّبعین کے اجروں میں سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور جس نے کسی گمراہی کی دعوت دی تو اُسے اُس گمراہی پر تمام عمل کرنے والوں کے برابر سزا ملے گی اور اُن متّبعین کی سزاؤں میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔'' (سُنن ترمذی' ج ۴' رقم الحدیث: ۲۶۸۳؛ صحیح مسلم' رقم الحدیث: ۲۶۷۴؛ سُنن ابو داؤد' رقم الحدیث: ۴۶۰۹؛ مؤطا امام مالک' رقم الحدیث: ۵۰۷؛ مسند احمد' ج ۳' رقم الحدیث: ۹۱۷۱ بحوالہ تبیان القرآن' ج ۳' ص ۷۰۵)

(ii) وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ (الاسراء : ۱۳)
''اور ہر انسان کا عمل ہم نے اُس کے گلے کا ہار کر رکھا ہے۔''

یہ آیت بھی ذاتی ذمہ داری کے احساس کو اجاگر کرتی ہے۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہوں صفحات ۴۳۳' ۴۳۴۔

''یہودیوں اور عیسائیوں کے نظریہ ''سفارش و کفّارہ'' سے ذاتی ذمہ داری کی مکمل طور پر نفی ہو جاتی ہے۔ پالن کی متعارف کردہ عیسائیت کے ابتدائی زمانے میں یہ عقیدہ تھا کہ عیسٰی علیہ السلام نے اپنی اذیتوں کی صورت میں شیطان کو ادائیگی کر دی تھی کہ وہ اپنا زور انسان پر نہ چلائے۔'' (Pallen and Wyne's "New Catholic Dictionary", p. 77) New York.

''یہاں کفارۂ مسیح کے نیابتی اختیار کے عقیدے کی مذمّت کی گئی ہے۔ ایک گنہگار اور فاسق کی نجات معصوم شخص کو سزا دے کر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ عذاب کسی پر اُس وقت تک نہیں اتارتا جب تک کہ اپنے کسی برگزیدہ رسول کو بھیج کر اسے تنبیہ نہ کر دے'' (عبداللہ یوسف علی' نوٹ: ۱۲۹۱) جیسا کہ سورۃ الاسراء کی آیت ۱۵ میں ارشاد ہوا کہ ''ہم اُس وقت تک عذاب دینے والے نہیں جب تک کہ ہم کسی رسول کو نہ بھیج دیں۔''

(۲) فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَةَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (الرُّوم : ۳۰)
(۳) وَ صَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (اَلتَّغَابُن : ۳)
(۴) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍo (اَلتِّيْن : ۴)

(i) ''اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور ہم نے اُنہیں خشکی اور دریا (دونوں) میں سوار کیا اور ہم نے اُنہیں نفیس چیزیں عطا کیں اور ہم نے اُنہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر بڑی فضیلت دی ہے۔''

(ii) ''پس آپ اپنا رُخ دینِ (حق) کی طرف پوری یکسوئی سے کرلیں۔ اللہ کے دین کو (مضبوطی سے پکڑلیں) جس کے مطابق اُس نے لوگوں کو پیدا فرمایا ہے۔''

(iii) ''اور اُس نے تمہاری صورت گری کی اور کیا ہی اچھی صورت گری کی!''

(iv) ''ہم نے انسان کو (بہ لحاظ عقل و شکل) بہترین اعتدال پر پیدا فرمایا ہے۔''

امام الصوفیاء ابن العربی نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز پیدا نہیں کی اور اُسے اِن عظیم صفات سے آراستہ کیا: حیّ، عالم، با اختیار، با ارادہ، متکلّم (بولنے والا)، شنوا، بینا، مدبّر اور حکیم۔

''اللہ کے تخلیقی ہاتھوں سے انسان معصوم، پاکیزہ، سچا، آزاد، نیکی کی طرف رُجحان رکھنے والا پیدا ہوا۔ اُسے سچی سوچ عطا کی گئی کہ وہ کائنات میں اپنی حیثیت اور اپنے خالق کی صفتِ اچھائی، عقل و دانش اور اُس کی بے پایاں قوّت کو پہچانے۔ یہ اُس کی صحیح فطرت ہے جیسا کہ میمنے کی فطرت میں بے ضرر ہونا اور گھوڑے کی فطرت میں تیز رفتار ہونا ہے۔ لیکن انسان رسم و رواج، توہّمات، خود غرضانہ خواہشات اور جھوٹی تعلیمات کے چنگل میں جکڑا گیا ہے اور یہ چیزیں اُسے مفسد، ناپاک، جھوٹا، گھٹیا خواہشات کی تکمیل کے لئے کمینہ صفت، اُن چیزوں کے پیچھے بھاگنے والا جن سے اُسے روکا گیا ہے، اپنے بھائی بندوں سے محبت کرنے سے دُور اور خدائے واحد کی مخلصانہ پرستش سے ہٹ جانے والا بنا دیتی ہیں۔'' (تفسیرِ قرآن بہ زبانِ انگریزی از عبداللہ یوسف علی، نوٹ ۳۵۴۱)

اِس ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ عَلىٰ فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ وَيُمَجِّسَانِهٖ وَيُنَصِّرَانِهٖ

''ہر بچہ دینِ فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اُس کے والدین ہی ہیں جو اُسے یہودی، مجوسی (آتش پرست) یا عیسائی بنا دیتے ہیں۔''

سورۃ التّین کی آیت ۴ (جو اوپر بیان ہوئی) کا حوالہ دیتے ہوئے کیپٹن واحد بخش رَبّانی لکھتے ہیں:

''انسان کے لئے اعلیٰ ترین اچھائی یہ ہے کہ وہ اپنی فطرت کی تکمیل تک پہنچے جس کی طرف اللہ پاک نے سُورۃ التّین کی آیت ۴ میں اشارہ کیا ہے۔ اُس کی صحیح فطرت یہ ہے کہ وہ اللہ کا قرب حاصل کرے اور پھر اس کے ذریعے امن، ہم آہنگی، عدل و انصاف اور سہولیات کو دنیا میں عام کرے۔ تو جب قلبِ انسانی کلامِ الٰہی سے منوّر ہو جائے اور اُس کے ساتھ ساتھ روحانیت کا ساتھ بھی ہو تو وہ اِن اعلیٰ مقاصد کو پانے کے لئے

(iii) قُلْ لَّا تُسْئَلُوْنَ عَمَّآ أَجْرَمْنَا وَلَا نُسْئَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْنَo (سَبَا : ۲۵)
''فرما دیجئے اگر (بالفرض) ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو اس کے متعلق تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔ اور نہ تمہارے اعمال کے متعلق ہم سے کوئی سوال کیا جائے گا۔''

اِس آیت میں بھی ہر شخص کی ذاتی مسئولیت اور ذمہ داری کی تعلیم ہے اور یہ منکرین کے لئے آخری جواب ہے کہ خیر' اور کسی طرح نہیں مانتے ہو نہ مانو۔ ہم اگر مجرم و خطا کار ہیں تو تم سے سوال نہ ہوگا اور تمہاری بابت ہم سے سوال نہ ہوگا۔

یہ جدل اور مناظرے سے بہت بعید اور انتہائی منصفانہ کلام ہے * کیونکہ اس میں موحدین کی جماعت کی طرف جرائم کو منسوب کیا ہے اور فریقِ مخالف کی طرف مطلق اعمال کو منسوب کیا ہے خواہ وہ کفر ہو یا گناہِ کبیرہ ہو۔ یہ آیت لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے) کی مثل ہے۔

أَجْـرَمْـنَـا (جرائم) کو اپنی طرف منسوب کرنا اور اعمال کو مخالفین کی طرف منسوب کرنا نیز اپنے جرائم کو زمانہ ماضی میں بیان کرنا اور مشرکین کے اعمال کو زمانہ حال (فعل مضارع) میں بیان کرنا اعلیٰ فصاحت و بلاغت کی عمدہ ترین مثال ہے!!

(۱۴) <u>محاسبہ بہ عُجلتِ تمام (جلدی جلدی) ہوگا:</u>

(i) اِنَّ اللّٰہَ سَرِيْعُ الْحِسَابِo (المائدۃ:۴؛ ابراھیم : ۵۱؛ المؤمن:۱۷)
''بے شک اللہ بہت جلد حساب لے ڈالنے والا ہے۔''

آیت کا مطلب یہ ہے کہ (۱) منکرینِ اسلام یہ نہ سمجھیں کہ چونکہ اللہ اپنے رحیم و رحمٰن ہونے کی وجہ سے مہلت پر مہلت دیئے چلا جاتا ہے' لہٰذا یومِ حساب آنے میں دیر ہے۔ لیکن جب وہ وقت باذنِ الٰہی آجائے گا تو محاسبہ اتنی تیزی سے ہوگا کہ مشرکین حیران رہ جائیں گے اور وہ اس بات کی آرزو کریں گے کاش کہ اُنہیں کچھ اور مہلت دی جاتی (سورہ ابراہیم:۴۴)۔ (۲) محاسبے کے عظیم دن میں یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ چونکہ وہاں اربوں' کھربوں لوگوں کا حساب ہوگا اس لئے فیصلوں کے صادر کرنے میں تاخیر ہوگی جیسا کہ دنیاوی عدالتوں میں ہوتا ہے۔ نہیں' وہ تو دنیا ہی اور ہے اور وقت کی پرواز سے ماوراء ہے۔ وقت کا جو تصوّر ہمارے ہاں اس دنیا میں ہے'

* اس سے ماقبل آیت ۲۴ بھی کلامِ منصف ہے جس میں فرمایا: ''اے مشرکو! ہم یا تم ہی ضرور راہِ راست پر ہیں۔''

اُس لحاظ سے تو محاسبہ پل جھپکنے میں ہو جائے گا۔'' (عبداللہ یوسف علی: نوٹ: ۱۹۳۰) جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

(ii) وَمَآ أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ (اَلنَّحل : ۷۷)
''اور قیامت کا معاملہ بھی ایسا ہوگا جیسے آنکھ کا جھپکنا بلکہ اُس سے بھی جلد تر۔''

أَمْرُ السَّاعَةِ سے مراد ہے قیامت کے وقوع کا وقت۔ كَلَمْحِ الْبَصَرِ بمعنیٰ پل جھپکنے کی طرح۔ یعنی آناً فاناً۔ عام محاورۂ انسانی میں کسی شے کے فی الفور واقع ہو جانے کے لئے طریقِ تعبیر یہی ہے۔ اُس کی قدرتِ کاملہ کا تو یہ حال ہے کہ قیامت کا قائم کرنا اُس کے نزدیک اِن قدر آسان اور سریع ہے جیسے انسان کے لئے پل جھپکنا بلکہ اس سے بھی زیادہ آسان اور سریع۔ نظامِ عالَم کو درہم برہم کرنے کے لئے سال یا مہینے یا صدیاں درکار نہیں ہوں گی بلکہ کم سے کم مدّت جس کا تم تصوّر کر سکتے ہو اور وہ پل جھپکنا ہے۔ اور ''پل جھپکنا'' بھی انسانی فہم اور سمجھ کے مطابق لایا گیا ہے۔

(۱۴) <u>کفّار اور منافقین کو کوئی رعایتی نمبر نہیں ملیں گے بلکہ شدید عذاب اُن کا مقدّر رہوگا:</u>

(i) إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُونَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولٰٓئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ٥ (البقرة : ۱۷۴)

''بے شک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اُس کے معاوضہ میں حقیر قیمت حاصل کرتے ہیں' تو ایسے لوگ تو اپنے سینوں میں بس آگ ہی آگ بھرتے ہیں اور اللہ روزِ قیامت نہ تو اُن سے کلام فرمائے گا اور نہ ہی اُنہیں پاک کرے گا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

رشوت لے کر اور آخرت کے عذاب کے مقابلہ میں دنیاوی حقیر رقم لے کر نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوّت و رسالت کی ابدی صداقت کو چھپانے والے ربّ تعالیٰ کے انتہائی غیظ و غضب کا شکار ہوں گے۔ اور وہ ربّ تعالیٰ کے کلام کرنے سے محروم رہیں گے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں سے گفتگو اُن کی انتہائی خوش نصیبی ہوگی اور یوں سمجھئے <u>کہ اُن کے لئے رعایتی نمبر (Grace Marks) ہوں گے اور اُس کا اُن سے کلام نہ کرنا اُن کی انتہائی بدنصیبی ہوگی۔</u>

نوٹ: لَمحِ البَصَر کا تعلق نظریہ اضافیت (Theory of Relativity) سے بھی ہے جو انشاءاللہ العزیز ''فزکس'' کے عنوان کے تحت زیرِ بحث آئے گا۔ حصّہ انگریزی میں نظریہ اضافیت اور قرآنِ حکیم کا ''تصوّرِ زمان و مکاں'' جلد چہارم کے صفحات 3953 تا 3960 پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

(ii) اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ (آل عمران:۷۷)

''بے شک جولوگ اللہ کے عہد اوراپنی قسموں کو حقیر قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں' یہ وہی لوگ ہیں جن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور اللہ روزِ قیامت اُن سے نہ بات کرے گا' نہ ہی اُن کی طرف دیکھے گا اور نہ ہی اُنہیں پاک کرے گا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔''

یہ آیت علمائے یہود اور رؤسائے یہود یعنی ابو رافع کنانہ' کعب بن اشرف اور حُیّ بن اَخطب کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے تورات کے اُس عہد کو چھپایا اور اُن آیتوں کو بدلا جو حضور علیہ السلام کے بارے میں تھیں اور قسم کھا گئے کہ یہ آیتیں رب کی نہیں ہیں محض اس لالچ سے کہ ہماری آمدنی کم نہ ہو جائے۔ (تفسیر خازن وخزائن العرفان)

ثَمَنًا قَلِیْلًا دُنیوی معاوضہ ہمیشہ اُخروی اجر کے مقابلہ میں قلیل وحقیر ہی ہوتا ہے۔ یہ مراد نہیں کہ اگر زیادہ معاوضہ مل رہا ہو تو بددیانتی اور عہد شکنی جائز ہوگی۔ آیت مذکورہ میں ایسے لوگوں کے لئے پانچ سزائیں بیان ہوئیں: (۱) آخرت کی زندگی میں اُنہیں رحمتِ الٰہی سے کوئی حصہ نہ ملے گا' نہ قبر میں آرام پائیں' نہ حشر میں راحت' نہ جنّت' نہ حور وقصور اور نہ رضائے ربِّ غفور۔ (۲) روزِ قیامت ربِّ ذوالجلال والاکرام کے (بہ طریقِ لطف) شرفِ کلام سے وہ لوگ محروم رہیں گے۔ خطاب برائے غضب ومؤاخذہ کی نفی مراد نہیں۔ (۳) وہ نگاہِ مہر و التفات سے اُن کی طرف نظر نہ فرمائے گا۔ نگاہِ قہر کی نفی مقصود نہیں۔ یہ کنایہ ہے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوّت و رسالت کی ابدی صداقت کو چھپانے والوں کے خلاف رب تعالیٰ کے انتہائی غیظ وغضب سے۔ اس لئے کہ جس سے کوئی شخص راضی اور خوش ہو' اُس کی طرف وہ بار بار دیکھتا ہے اور جس سے ناراض ہو' اُس سے منہ موڑے رکھتا ہے۔ (تفسیر بیضاوی) (۴) اُن کے گناہ معاف کرکے اُنہیں گناہوں کی گندگی سے پاک وصاف نہیں فرمائے گا۔ (۵) اِتنی محرومیوں کے باوجود اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔

(iii) اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا ۝ (اَلنِّسآء: ۱۴۵)

''یقیناً منافق جہنم کے نچلے طبقہ میں ہوں گے اور (اے مخاطَب!) تو اُن کا کوئی مددگار نہ پائے گا۔''

نوٹ: گنہگار مؤمن اور کافر اگرچہ دونوں جہنم میں جائیں گے لیکن مختلف حیثیت سے۔ وہ تو پاک وصاف ہونے کے لئے اور یہ ہمیشہ جلنے کے لئے' جیسے کوئلہ اور سونا دونوں بھٹی میں جاتے ہیں' کوئلہ وہاں رہنے کے لئے اور سونا پاک وصاف ہو کر نکلنے کے لئے۔ اسی لئے کافروں کو وہاں ہمیشگی ہوگی نہ کہ گنہگار مسلمانوں کو۔ یوں سمجھئے کہ یہ نار لقائے یار (یار سے ملنے) کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ اُنہیں پاک نہ کرے گا۔

دَرک کے لغوی معنیٰ گہرائی کے ہیں۔ سمندر کی گہرائی کو بھی دَرک کہہ دیتے ہیں۔ اِسی سے ہے اِدراک یعنی بات کی تہہ۔ اُس کی گہرائی کو پالینا یعنی گہرے اعتراض کو دُور کر دینا استدراک ہے۔ دَرک اور دَرَجة دونوں کے ایک ہی معنیٰ ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اوپر سے نیچے کی طرف ترتیب کے لحاظ سے دَرک کہا جاتا ہے اور نیچے سے اوپر کی طرف ترتیب کے لحاظ سے درَجة کہلاتا ہے۔ جنت کے درجات ہیں اور دوزخ کے درکات کہ جنت میں اونچا درجہ زیادہ اعلیٰ وافضل ہے اور دوزخ کا نچلا طبقہ زیادہ سخت وتکلیف دِہ۔ کثیف چیز نیچے گرتی ہے جیسے مٹی اور لوہا جبکہ لطیف چیز اوپر چڑھتی ہے جیسے آگ اور ہوا۔ نیکیاں اور نیک لوگ چونکہ لطیف ہیں اس لئے وہ جنت کے درجوں کے مستحق ہیں اور گناہ و گنہگار چونکہ کثیف ہیں' اس لئے وہ دوزخ کے درکات کے مستحق ہیں۔ جہنم کے سات طبقات ہیں: (۱) جہنّم (سورة الاعراف:۴۱)' (۲) لظٰی (سورة المعارج :۱۵)' (۳) حُطَمة (سورة الھُمزة:۴'۵)' (۴) سَعِیر (سورة الانشقاق:۱۲)' (۵) سَقَر (سورة المدّثر:۲۶'۲۷)' (۶) جَحِیم (سورة الدُّخان: ۵۶)' (۷) ھاوِیة (سورة القارعة : ۹) مگر ساری دوزخ کو جہنم کہہ دیتے ہیں یعنی پہلے طبقہ کے نام سے کُل کو یاد کرتے ہیں (روح المعانی' خازن' کبیر) جہنم کا سب سے نچلا طبقہ ھاویہ زیادہ المناک ہے جیسے جنت کے تمام طبقوں میں سب سے اونچا طبقہ جنت الفردوس (سورة الکھف :۱۰۷) اور اعلیٰ علّیین (سورة المطففین:۱۹) ہے۔ نبی علیہ الصلوٰة والسلام نے فرمایا کہ اللہ سے جب بھی جنت مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو۔

منافق کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ اپنے جرمِ کفر پر ایک مزید جرمِ مکروفریب کا اضافہ کئے ہوئے ہے' اس لئے اگر اُسے کھلے ہوئے کافر سے سخت تر سزا ملے تو یہ تقاضائے عقل کے عین مطابق ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا سے فقہاء مفسرین نے محض گنہگاروں کی شفاعت پر استدلال کیا ہے اور طریقِ استدلال یہ ہے کہ نصرت وامداد نہ ہونے کی یہ تنبیہ چونکہ منافقوں کے لئے مخصوص ہے' اس لئے معلوم ہوا کہ جو منافق نہ ہوں گے' اُن کی نصرت و شفاعت ہو سکے گی۔ (تفسیر ماجدی حصّہ اُردو ص۲۲۴)

(iv) وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۚ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَ مَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝ (الاعراف : ۵۰' ۵۱)

"اور دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ ہم پر کچھ پانی اُنڈیلو یا اُس میں سے جو اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے۔ جنّتی کہیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں کافروں پر حرام کر رکھی ہیں' جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا تھا اور اُنہیں دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر دیا تھا' سو آج ہم اُنہیں فراموش کر دیں گے جیسے اُنہوں نے آج کے دن کی ملاقات کو بُھلا دیا تھا اور جیسے وہ ہماری آیتوں سے انکار کرتے تھے۔"

چونکہ دوزخی کفار دنیا میں متکبر تھے اور فقراء مؤمنین سے بات کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔اب اُس کے عوض میں یہ متکبرین بھیک مانگنے کے لئے ایسی آواز سے اُن جنتیوں کو پکاریں گے جیسے بھکاری پکارتا ہے۔ یہ ہے تکبر کا انجام! أَفِيضُوا بنا ہے اِفَاضَة سے جس کا مادّہ فَيض ہے بمعنیٰ اوپر سے کوئی پتلی چیز بہانا جس سے معلوم ہوُا کہ جنت اوپر ہے اور جہنم نیچے۔ اگر چہ دوزخی بھوکے بھی ہوں گے مگر اُنہیں پیاس اور تپش کی انتہائی شدید تکلیف ہوگی اس لئے وہ پانی پہلے مانگیں گے۔ بعض فقہاء نے آیت کی اس حصّہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ پانی پلانا بہترین اعمال میں سے ہے (تفسیر قرطبی)۔ عَلَيْنَا کہنے سے مراد یہ کہ پانی ہم پر بہاؤ تا کہ جنت کے ٹھنڈے پانی سے ہم نہا بھی لیں جس سے ہمارے جھلسے ہوئے جسم کچھ ٹھنڈے ہو جائیں اور پی بھی لیں جس سے ہماری پیاس بھی بجھ جائے۔ اس لئے أَفِيضُوا بھی کہا یعنی ہم پر کثرت سے جنت کا پانی بہاؤ۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اِراقة اور اِفَاضة دونوں کے معنیٰ بہانے کے ہیں لیکن اِراقة میں بہانے سے برتن خالی ہو جاتا ہے جبکہ اِفاضة میں برتن خالی نہیں ہوتا جسے چھلکنا کہتے ہیں۔ دوزخی أَفِيضُوا کہہ کر ہی یہ بتا رہے ہیں کہ ہمیں کچھ دینے سے تمہارے ہاں کچھ کمی نہ ہوگی اس لئے کہ جنت کی نعمتیں دائمی ہیں اور خرچ کر دینے سے کم نہیں ہوتیں۔

جب یہ دوزخی بڑی لجاجت' عاجزی اور آہ وزاری سے یہ بھیک مانگیں گے تو جنتیوں کی طرف سے چالیس سال تک کوئی جواب نہ ملے گا۔ چالیس سال کے بعد اہلِ جنت کو حکم ہوگا کہ اُنہیں جواب دو (روح البیان) تب وہ جواب دیں گے کہ ہم تمہیں یہ بھیک نہیں دے سکتے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں (جنت کا کھانا' پانی ۔۔تفسیر قرطبی) کافروں پر حرام کر رکھی ہیں۔ خیال رہے کہ یہ حرمتِ شرعی نہیں کیونکہ وہاں حلال وحرام کے شرعی احکام جاری نہ ہوں گے (تفسیر مدارک)

الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا یعنی وہ کفار جنہوں نے دنیا میں کھیل تماشوں کو اپنا دین بنا لیا تھا کہ گانا بجانا' ڈھول ڈھماکے' تالیاں' سیٹیاں وغیرہ کو عبادت سمجھ بیٹھے تھے نیز اُن کا کعبہ معظمہ کی حفاظت کرنا' مسجدِ حرام کو آباد کرنا' حجاج کی خدمت کرنا اگر چہ نیکیوں کے کام ہیں لیکن اُن کے لئے کھیل کود ہیں کیونکہ وہ یہ کام نبی ﷺ کی اطاعت کے تحت نہیں کرتے' لہٰذا ان کا کوئی نتیجہ نہیں اور جس کا کوئی نتیجہ نہ ہو وہ کھیل کود ہوتا ہے۔ لَهو اور لَعَب قریب المعنیٰ ہیں۔ بعض نے کہا کہ ناجائز باتوں میں مشغول ہو کر اپنا غم غلط کرنا لَهو ہے اور بری باتوں کے ذریعے خوشی اور سرور حاصل کرنا لَعَب ہے۔ آیت میں ارشاد ہوُا کہ ہم دوزخیوں کو بھول جائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ بھول چوک سے پاک ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوُا کہ ہم اُن کی دستگیری نہیں کریں گے۔

نوٹ: اِس آیت سے معلوم ہوا کہ دوزخیوں پر جنت کا پانی وغیرہ حرام ہے مگر صحیح بخاری کتاب الرضاع کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ابولہب کو اُس کی کلمہ کی انگلی سے دوزخ میں پانی ملتا ہے اور دوشنبہ کو عذاب ہلکا ہوتا ہے تو وہ پانی کہاں کا ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر وہ پانی جنت کا ہی ہو تو اِس آیت میں قانون کا ذکر ہے اور حدیثِ مذکورہ میں خصوصی عطیہ کا ذکر ہے۔ چونکہ ابولہب نے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادتِ مبارکہ کی خوشی میں اپنی لونڈی ثُوَیبہ کو آزاد کیا تھا' اس لئے خصوصی طور پر یہ کرمِ خسروانہ ہوا (تفسیر نعیمی' ج ۸' ص ۵۵۶)

(۷) وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُه' فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَo تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَo أَلَمْ تَكُنْ آيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ قَالُوْا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَo رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظٰلِمُوْنَo قَالَ اخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِo (اَلْمُؤمنون : ۱۰۳ تا ۱۰۸)

"اور جس کسی کا نامہ عمل ہلکا ہوگا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا' وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے چہروں کو آگ جھلستی ہوگی اور اس میں اُن کے منہ بگڑے ہوں گے۔ کیوں' کیا میری آیتیں تمہیں پڑھ کر نہیں سنائی جاتی تھیں جنہیں تم جھٹلایا کرتے تھے۔ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! ہماری بدبختی نے ہمیں گھیر لیا تھا اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اِس جہنم سے نکال دے' اب اگر ہم پر ایسا کریں تو بے شک ہم (پورے) قصوروار ہوں گے۔ ارشاد ہوگا: دُھتکارے ہوئے اسی میں پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔"

یہ ناکارہِ خلائق وہ بدنصیب لوگ ہیں جن کی اچھائیوں کا پلڑا اُٹھ گیا اور بُرائیوں کا جھک گیا۔ اُنہوں نے خود کو بدترین نقصان میں رکھا۔ اُن کے شجرِ خبیث میں نہ عقیدت کے بیج' نہ ایمان کی جڑیں' نہ خلوصِ الٰہی کے پھول' نہ حُبِّ نبوی کی کلیاں' نہ توحید کا سرمایہ' نہ رسالت کا سایہ۔ اُن کے بیابانِ حیات میں تو صرف اعمال کی بلا جڑ' بلا پھول و پھل والی مرجھائی شاخیں ہی تھیں تو اُن کا وزن کیا ہوتا! لہٰذا اے دشمنانِ خدا! اور اے غافل مسلمانو! سنبھل جاؤ' جلدی جلدی ایمان و عرفان کے سدابہار پھول اپنے نامہ عمل میں سجالو ورنہ اگر دھول' غبار' راکھ' ٹوٹی شاخ' سوکھے پتوں کی مثل بے وزن ہوکر خَسِرُوْٓا أَنْفُسَهُمْ بن کر آئے تو فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ کی پکی اٹل وعید ہے۔ خیال رہے کہ جہنم کی آگ گناہوں کو جلا اور مٹاسکتی ہے کیونکہ وہ مثلِ مَیل ہیں مگر کفر وشرک کو نہیں مٹاسکتی۔ گنہگار صرف میلا ہے مگر کافر بذاتِ خود گندگی ہے تو چونکہ کفر کی گندگی دائمی قائم ہے اس لئے کافر کو جہنم میں دائمی قیام اور ایسا عذاب ہوگا کہ نارِ جہنم ان کفار کے چہروں جیسی خوبصورت چیز کو بھی جو شناختِ انسانی

ہے' جلا ڈالے گی۔ چہرہ تمام جسم میں تین وجہ سے اشرف و اعلیٰ ہے: (۱) یہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہے چنانچہ سورۃ التّغَابُن کی آیت ۳ میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم انسانوں کی شکل وصورت سب مخلوق سے اچھی بنائی۔ (۲) بالشت بھر کے چہرے پر اعضاء ایک جیسے مگر نقشے کروڑوں بنا دئے کہ کوئی بھی ایک دوسرے کے مشابہ نہیں یہاں تک کہ باپ' بیٹا' ماں' بیٹی' جڑواں اولادوں کی بھی مختلف شکلوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوتا ہے۔ (۳) چہرۂ انسانی میں قدرت کے آٹھ خزانے ہیں: (۱) عقل وحفظ کا خزانہ دماغ میں (۲) نظر وعلم کا خزانہ آنکھوں میں (۳) سننے کا خزانہ کانوں میں (۴) سونگھنے کا خزانہ ناک میں (۵) بندگی وعبادت کا خزانہ ماتھے میں (۶) بولنے کا خزانہ زبان میں (۷) کھانے پینے کا خزانہ منہ میں اور (۸) حُسن کا خزانہ رخسار میں۔ فاسق مؤمن کا چہرہ جہنم میں نہ جائے گا کیونکہ اس میں سجدۂ الٰہی کا ماتھا ہے لیکن کفار کا چہرہ جل کر بگڑ جائے گا۔ بحوالہ ترمذی شریف فرمانِ رسول ہے کہ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ کی صورت یہ ہوگی کہ بوٹیاں ٹوٹ کر پگھل کر ایڑیوں کی طرف بہتی ہوں گی اور حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ نبی مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کَالِحُوْن کا نقشہ گائے یا بکری کی بھنی ہوئی سری جیسا ہوگا کہ ہونٹ بھن کر پھیل جائیں گے' دانت نکل آئیں گے' اوپر کا ہونٹ پھیل کر آدھے سر تک چلا جائے گا اور نیچے کا ہونٹ پھیل کر ناف تک لٹک آئے گا۔ شدّتِ تکلیف سے ایک دوسرے کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھیں گے تو ایک غیبی آواز آئے گی کہ کیا دنیا میں ایسا نہ ہوتا تھا کہ جب میری آیات تمہارے سامنے تلاوت کی جاتی تھیں اور آج کے دن کا ڈر سناتی تھیں تو تم سن کر اِسی منہ سے اُن آیات کو جھٹلاتے تھے اور منہ چڑھا چڑھا کر ہنسی اُڑایا کرتے تھے۔ وہ جواباً کہیں گے کہ اے ہمارے رب! دنیا میں ہم پر ہماری بدبختی' خرمستی اور نفسانی خباثت غلبہ پا گئی تھی' ہم اپنی سرکشیوں اور غداریوں کی وجہ سے بہت دُور کی ظلمتوں میں گھر کر گمراہ قوم ہو گئے تھے۔ ہم اپنی کفریہ حرکتوں کا اقرار کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں اب ہوش آیا اور اب ہماری آنکھیں کھلی ہیں' اب ہم سچی توبہ کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں یہاں سے نکال کر دنیا میں لوٹا دے۔ پھر اگر ہم تیری نافرمانی کریں تو یقیناً ہم ظالم اور ہر قسم کی سزا کے مستحق ہوں گے۔ احادیث میں ہے کہ کفار جہنم میں پہنچ کر تین لاکھ ساٹھ برس تک سات بار باہر نکلنے کی التجا کریں گے اور یہ التجا آخری بار ہو گی۔ پھر اتنے سال گزر جانے کے بعد وہ جواب آئے گا جو اگلی آیت ۱۰۸ میں مذکور ہے۔ اس میں کفار کو ہمیشہ کے لئے التجائیں کرنے سے روک دیا جائے گا۔ اس روک کے بعد پھر کبھی کفار کوئی التجا نہ کرسکیں گے۔ (تفسیر نعیمی' جزء ۱۸' ص ص ۳۷۵' ۳۷۶)

چند مفید نکات: (۱) کفار کے سب اعمال کا وزن کیا جائے گا لیکن چونکہ اُن کے اچھے اعمال میں ایمان کا رس' تروتازگی' پھل پھول' پتے نہ ہوں گے بلکہ خشک شاخوں کی طرح ہلکے پھلکے ہوں گے اس لئے ان کی کفریات سے بہت ہلکے پڑ جائیں گے۔ (۲) تمام جسم میں مؤمن کا چہرہ سب سے اعلیٰ ہے کہ یہ اشرف بھی ہے' افضل بھی ہے اور اکرم بھی۔ اشرفیت انسانیت کی وجہ سے' افضلیت ایمان کی وجہ سے اور اکرمیت بوجہ اعمال ہے۔

(۱۵) اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے اپنے حسابات کے کھاتوں کو پاک وصاف اور درست رکھا ہوگا' خدائی رحمتوں اور بے حساب نعمتوں کا غیر منقطع سلسلہ عنایت جاری رہے گا:

(i) جَنّٰتُ عَدۡنٍ یَّدۡخُلُوۡنَهَا وَمَنۡ صَلَحَ مِنۡ آبَآئِهِمۡ وَأَزۡوَاجِهِمۡ وَذُرِّيّٰتِهِمۡ وَالۡمَلاۤئِكَةُ يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ٥ سَلَامٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ٥ (اَلرَّعد : ۲۴،۲۳)

''ہمیشگی کے باغ جن میں وہ (خود بھی) داخل ہوں گے اور (وہ بھی) جو جنّت کے لائق ہوں گے' اُن کے ماں باپوں میں سے' اُن کے میاں بیویوں میں سے اور اُن کی اولاد میں سے اور فرشتے اُن کے پاس ہر دروازہ سے داخل ہوتے ہوں گے (یہ کہتے ہوئے کہ) سلامتی ہو تم پر اُس کے صلہ میں کہ تم صبر کرتے رہے (سو تمہارا) اِس جہان میں بہت ہی اچھا انجام ہے۔''

روایات میں آیا کہ جنّتِ عدن جنّت میں ایک مقام ہے جس میں دیدارِ الٰہی کا بازار لگا کرے گا' اُس میں پچیس ہزار ملائکہ ہیں' اُس کے دروازوں پر پہرے مقرر ہیں۔ تو جنّتِ عدن کا مفہوم یہ ہوا کہ ہمیشہ قائم اور دیدارِ الٰہی کی لذتوں والے باغ (تفسیر نعیمی' جزء ۱۳' ص ۳۴۸) چونکہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت گزار کی جزا میں اُس کی اِس خوشی کو بھی شامل کیا ہے کہ اُس کے اہل اُس کے ساتھ جنت میں داخل ہوں اور یہ اُس اطاعت گزار کا اِکرام ہوگا۔ اس ملاپ اور اجتماع جیسی نعمتِ عظمیٰ سے اُس اطاعت گزار کو انتہائی خوشی حاصل ہوگی۔

مَنۡ صَلَحَ کی قید نے صاف کر دیا کہ اہلِ جنت سے قرابت کا تعلق بخشش کے لئے کافی نہیں۔ بخشش تو ایمان ہی پر مترتب ہوگی البتہ ترقیِ درجات و مراتب کی گنجائش اعزہ و اقرباء کی شفاعت کی بناء پر ہے۔ (تفسیر کبیر) اور اِس میں اِس بات کی بھی دلیل ہے کہ اطاعت گزاروں کی شفاعت سے درجات بڑھ جائیں گے اور یہ بھی کہ نیک اعمال کے بغیر حسب ونسب غیر مفید ہوں گے (بیضاوی) آبَآئِهِمۡ اس کے تحت میں عجب نہیں کہ ماں' باپ دونوں کی طرف سے کُل بزرگانِ خاندان آ جائیں۔ أَزۡوَاجِهِمۡ میں میاں بیوی دونوں آ گئے۔ ذُرِّيّٰت کے تحت میں عجب نہیں کہ لڑکے' لڑکیاں' پوتے' نواسے اور پھر شاگرد وغیرہ سب آ جائیں (ماجدی حصّہ اردو' ص ۵۱۷)

صبر کی کئی تفسیریں ہیں: (۱) اللہ تعالیٰ کے احکامات پر عمل کرنے کی مشقت پر صبر (۲) دنیا کی فضول چیزوں پر صبر (۳) فقر پر صبر (۴) دین کی مشکلات پر صبر (۵) اپنی محبوب چیز کے گم ہونے اور اپنے کسی عزیز کی وفات پر صبر (۶) شہوات اور گناہوں سے پرہیز کرنے پر صبر (۷) انتقام کی طاقت رکھنے کے باوجود لوگوں کی

اپنی ذات کو نظم و ضبط کا پابند بنا دیتا ہے۔ الٰہی تعلیم اُسے عالمی لطف و کرم کی طرف لے جاتی ہے جو دراصل اُس کی روح کے اندر موجود ہے۔ اِس طرح وہ دوسروں کے فائدہ کی خاطر اپنی خواہش کو قربان کر دیتا ہے۔ اِسی انسان دوستی کو قرآن مجید نے دو مقامات پر (سورۃ الحشر: ۹ اور سورۃ الدھر: ۸، ۹) بیان فرمایا:

(۱) وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰىٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞

(۲) وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۞ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۞ (اَلدّھر: ۸، ۹)

(i) ''اور وہ (دوسروں کو) اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اُنہیں اُس چیز کی شدید حاجت ہو اور جسے اپنے نفس کی حرص سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ بامراد اور کامیاب ہیں۔''

(ii) ''اور وہ اللہ کی محبت میں مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور کہتے ہیں) ہم تمہیں اللہ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے کوئی اجر چاہتے ہیں اور نہ شکریہ۔''

کیپٹن موصوف مزید فرماتے ہیں:

''وہ اپنے آپ کو آرام، راحت و سکون (بہ شکل تفریح و کھیل) بھی دیتا ہے لیکن اُس راحت و آرام کو وہ اِس حد تک محدود کر دیتا ہے کہ وہ اُس کے سنجیدہ فرائض کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ وہ اس بات کو پسند ہی نہیں کرتا کہ وہ آرام و سکون اُسے کاہلی، فضولیات اور تمسخر بازی کی طرف لے جائے۔ وہ سوتا ضرور ہے لیکن نماز کے اوقات کا بھی خیال رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن نے ایسے ہی خوش بختوں کے متعلق فرمایا:۔

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اَلسَّجدۃ: ۱۶)

''اُن کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں اِس حال میں کہ وہ اپنے پالنہار کو خوف اور اُمید سے پکارتے رہتے ہیں۔'' (بروئے حدیث ایمان نام ہی خوف و امید کی درمیانی کیفیت کا ہے)

''اُسے اپنی ذات کے جنسی تقاضوں کا بھی پاس ہے لیکن صرف اُن حدود کے اندر جو اللہ نے مقرر کی ہیں۔ (دُنیوی) دولت و اَملاک کے لئے بھی اُس کی خواہش کو اللہ کی اِس وعید نے لگام دے رکھی ہے:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (الحدید: ۲۰)

''خوب جان لو کہ دُنیوی زندگی محض ایک کھیل کود اور (ظاہری) خوشنمائی اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اَولاد میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتلانا ہے۔''*

''زندگی کی اُس سادگی نے جسے رسول اللہ ﷺ نے اپنایا اور ریشم اور سونے کی ممانعت نے اُس کے عیش و آرام کے رُجحان کو لگام دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے تمام خیالات و اعمال کا مرکز و محور اللہ کی رضا اور خوشنودی کو بنایا۔ اِس سچے جذبے نے اُس کی توجہ جسمانی آسائشات کی طرف سے ہٹا دی۔

* دُنیاوی زندگی کے جن تین پہلوؤں کا یہاں ذکر ہوا، وہ انسانی زندگی کے تین مختلف اَدوار کے عین مطابق ہیں: یعنی لڑکپن میں وہ لہو و لعب کا دلدادہ، عالمِ شباب میں وہ خودنمائی کے احساس میں گرفتار اور بڑھاپے میں اُس پر مال و اَولاد پر فخر کرنے کے جذبات غالب ہوتے ہیں۔

طرف سے اذیتیں ملنے اور دل آزاری پر صبر (''تبیان القرآن''--علامہ غلام رسول سعیدی' ج ٦' ص ٨٩)

سَلاَم" عَلَیْکُم حالتِ سرور' فرحت و نشاط میں انسان گفتگو بھی اسی قسم کی سننا چاہتا ہے جو اُس کے لئے زیادہ کیف آور اور نشاط انگیز ہو۔ چنانچہ فرشتے بھی ہر طرف سے آ آ کر ایسے ہی پیام پہنچائیں گے۔مِّنْ کُلِّ بَـاب ''ہر ہر دروازے سے'' کے ایک معنیٰ تو ظاہر ہی ہیں۔جنّت کے ہر محل میں دروازے متعدد ہوں گے اور یہ پیامِ مسرّت لانے والے ہر ہر طرف سے داخل ہوں گے۔ایک اور معنیٰ یہ بھی لئے گئے ہیں کہ مؤمن نے جتنی قسم کی طاعتیں کی ہوں گی مثلاً نماز' روزہ' حج' زکٰوۃ' حُسنِ معاملت' سچائی وغیرہ' اُن میں سے ہر ہر قسم کے لئے ایک ایک دروازہ قائم ہو جائے گا اور فرشتے اُس میں سے داخل ہو کر نویدِ جانفزا سنائیں گے۔

(ii) اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰی لَھُمْ وَحُسْنُ مَآبٍo (اَلرَّعد:٢٩)
''جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے' اُن کے لئے خوشحالی اور اچھا ٹھکانہ ہے۔''

طُوبٰی مصدر ہے طَیِّب کا اور اس کا معنیٰ مؤمنین کے لئے پاکیزہ زندگی' نعمت' خیر اور سرور ہے۔
حضرت ابو سعید خُدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! اُس شخص کے لئے طوبیٰ (خوشی) ہو جس نے آپ کو دیکھا اور آپ پر ایمان لایا۔آپ نے فرمایا: اُس کے لئے طوبیٰ ہو جس نے مجھے دیکھا اور مجھ پر ایمان لایا۔پھر طوبیٰ ہو' پھر طوبیٰ ہو' پھر طوبیٰ ہو اُس کے لئے جو مجھ پر ایمان لایا حالانکہ اُس نے مجھے نہیں دیکھا۔ایک شخص نے پوچھا کہ طوبیٰ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ طُوبٰی جنّت میں ایک درخت ہے جس کی مسافت ایک سو سال ہے اور اہلِ جنّت کا لباس اُس کے شگوفوں سے نکلتا ہے (مُسند احمد' ج ٣' ص ٧١؛ مُسند ابو یعلیٰ' رقم الحدیث: ١٣٧۴؛ صحیح ابن حبان' رقم الحدیث: ٧١٨٦ بحوالہ ''تبیان القرآن'' ج ٦' ص ٩٦)

(iii) اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍo اُدْخُلُوْھَا بِسَلٰمٍ آمِنِیْنَo وَنَزَعْنَامَافِیْ صُدُوْرِھِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَo لاَ یَمَسُّھُمْ فِیْھَا نَصَب" وَّ مَا ھُمْ مِّنْھَا بِمُخْرَجِیْنَo (اَلْحِجر: ۴۵ تا ۴٨)
''بے شک پرہیزگار باغوں اور چشموں میں (بستے) ہوں گے۔(اُن سے کہا جائے گا) تم اُن میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو۔اور جو کچھ اُن کے دلوں میں کینہ ہو گا' اُسے ہم نکال باہر کریں گے' (سب) آمنے سامنے تختوں پر بھائی بھائی کی طرح رہیں گے۔اُس کے اندر اُنہیں کوئی تکلیف چھوئے گی ہی نہیں اور نہ وہ اُس میں سے (کبھی) نکالے جائیں گے۔''

جمہور اہلسنت کے نزدیک متقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو کفر اور شرک سے ہمیشہ دُور رہے ہوں لیکن متقی ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُنہوں نے ہر ہر کبیرہ گناہ سے پرہیز کیا ہو' جس طرح قاتل ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُس نے لوگوں کے ہر ہر فرد کو قتل کیا ہو اور عالم ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اُسے ہر ہر مسئلہ کا علم ہو۔ ایک انسان کو قتل کرنے والا بھی قاتل کہلاتا ہے اور چند عام پیش آنے والے مسائل کو جاننے والا بھی عالم کہلاتا ہے۔ اسی طرح خوفِ خدا سے چند بار گناہوں کو ترک کرنے والا بھی متقی ہے۔ سو جس شخص نے زندگی میں ایک بار بھی خوفِ خدا سے اپنی خواہشوں کے منہ زور گھوڑے کو گناہ کی وادی میں دَوڑنے سے روک لیا' وہ اِس آیت کا مصداق ہے۔

آیت ۴۶ میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جنتیوں کے سینوں سے اُن رنجشوں کو نکال دے گا جو دنیا میں وہ ایک دوسرے کے خلاف رکھتے تھے۔ کیونکہ کینہ کا سبب شیطان کے وسوسے ہیں اور شیطان اُس وقت دوزخ میں جل رہا ہوگا' اس لئے اہلِ جنت کے سینے اور اُن کے دل ہر قسم کے بغض' کینہ اور کدورت سے پاک وصاف ہوں گے۔ نَزَعْنَا اگرچہ فعل ماضی ہے لیکن مستقبل کے معنیٰ میں ہے اور یقینی ہونے کی بناء پر فعل ماضی لایا گیا' گویا کہ ایسا ہو ہی گیا۔

پھر فرمایا کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی ہو کر مسند نشین ہوں گے۔ یعنی سب بھائیوں کی طرح شیر و شکر ہو کر رہیں گے' یہ بھائی ہونا صرف محبت کے اعتبار سے ہوگا ورنہ چھوٹے بڑے کا ادب واحترام اور مدارج وہاں بھی ہوں گے۔ حضرت ابنِ عباس نے فرمایا: وہ ایک دوسرے کے بالمقابل ہوں گے اور ایک دوسرے کی طرف پیٹھ نہیں کریں گے کیونکہ پیٹھ کرنا بے ادبی اور بے مروّتی کی علامت ہے۔ امام رازیؒ نے فرمایا: جس طرح دو شیشے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں تو ایک کا عکس دوسرے میں نظر آتا ہے' اسی طرح جب جنتی باہم متقابل ہوں گے' تو ایک کے انوار دوسرے میں منعکس ہوں گے۔ (''تبیان القرآن'' ج ۶' ص ص ۲۹۴' ۲۹۶)

(iv) فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّآ أُخۡفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعۡيُنٖ جَزَآءَۢ بِمَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ○ (السّجدة:۱۷)

''سو کسی کو علم نہیں آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو (سامان) اُن کے لئے (خزانہ غیب میں) مخفی ہے' یہ صلہ ہے اُن کے (نیک) اعمال کا۔''

سچی بات ہے کہ جنّت کی نعمتوں کا پورا اور صحیح اندازہ انسان کو اپنے اِن ناسوتی حواس کے ساتھ ہو ہی نہیں سکتا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطہ سے یہ حدیثِ قُدسی مختلف طریقوں سے مروی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے صالح بندوں کے لئے وہ وہ نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جنہیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا' نہ کسی

کان نے سنا ہے اور جو نہ کسی انسان کے دل میں گزری ہیں' بلکہ یہ اُن نعمتوں کے علاوہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مطلع فرمایا ہے' پھر آپ نے اِس آیت کی تلاوت فرمائی فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ" مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ (صحیح بخاری: رقم الحدیث ۴۷۸۰؛ صحیح مسلم: رقم الحدیث ۲۸۲۴، ۲۸۲۵ ؛ سنن ابن ماجہ: رقم الحدیث ۳۳۲۸) جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ میں حُسنِ اعمال کی ترغیب اور اُن پر شوق دلانا (تشویق) ہے۔

(۷) مُتَّكِئِيْنَ عَلٰى فُرُشٍ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ وَ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ○ فَبِاَيِّ آلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ○ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ" قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ" ○ (الرحمٰن: ۵۴ تا ۵۶)
''وہ لوگ تکیہ لگائے فرشوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر دبیز ریشم کے ہوں گے اور دونوں باغوں کے پھل بہت ہی قریب ہوں گے۔ سو تم دونوں (اے جن و اِنس!) اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! اُن (باغات) میں نیچی نگاہ والیاں ہوں گی کہ ان لوگوں سے پہلے اُن پر نہ کسی انسان نے تصرّف کیا ہوگا اور نہ جن نے۔''

''جن کے اَستر دبیز ریشم کے ہوں گے'' جب اَستر یعنی اندر کا حصّہ ایسا نفیس ہوگا تو باہر کے حصّے یعنی اَبری کا کیا کہنا! مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے بادشاہوں کے تختوں کی طرح تمہارے لئے نفیس اور آرام دہ بستر بنا دئے ہیں اور جنت کے درختوں کے پھل اِس قدر قریب اور جُھکے ہوئے ہوں گے کہ اُنہیں اہلِ جنت کھڑے' بیٹھے' لیٹے ہوئے ہر حال میں اور ہر وضع میں بلا ادنیٰ مشقت وتعب حاصل کرلیا کریں گے۔ قٰصِرٰتُ الطَّرْف میں اُن کی اعلیٰ ترین شرم وحیا کی طرف اشارہ ہے کہ اُن بیویوں کی نظریں اپنے شوہروں کے سوا کسی اور کی طرف نہ اُٹھیں گی اور اُن کے شوہروں سے پہلے اُن سے نہ تو کسی انسان نے جماع کیا ہوگا اور نہ جن نے۔ طمث کا معنیٰ ہے جماع کرنا۔ اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ حُورانِ جنت کے ساتھ جب بھی جماع کیا جائے گا' وہ کنواری ہوں گی۔ اُن کی خوبصورتی کا یہ عالم ہے کہ اگر اُن میں سے کوئی آسمان پر آجائے تو تمام آسمان روشن ہو جائے اور سورج' چاند کی روشنی ماند پڑ جائے (''تبیان القرآن'' ج ۱۱' ص ۶۳۸)۔ سبحان اللہ! اُس کے حسن کا اندازہ کون کرسکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حسین فرمایا ہو۔ اس میں ایک بار پھر بشارت ہے کہ روحانی نعمتوں کے ساتھ ساتھ مادّی لذّتیں بھی اپنی تفصیلات وجُزئیات کے ساتھ اہلِ جنت کو اِس دنیا سے کم نہیں بلکہ زائد پوری طرح حاصل رہیں گی۔

آیت ۵۶ میں یہ دلیل ہے کہ (۱) جن بھی جنت میں داخل ہوں گے اور (۲) وہ بھی جنیات سے جماع کریں گے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر جن جنت میں جماع نہ کریں تو پھر جنات پر کوئی احسان نہ ہوگا حالانکہ اس آیت کے بعد فرمایا ہے'' تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟''

(vi) عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍo مُّتَّكِئِيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَo يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَo بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ o وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍo لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَo وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَo وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَo وَحُوْرٌ عِيْنٌ o كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ o جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ o لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًاo اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًاo وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِo فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍo وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍo وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍo وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍo وَّفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍo لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍo وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍo اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءًo فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًاo عُرُبًا اَتْرَابًاo لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِo

(اَلْواقِعَة: ۱۵ تا ۳۸)

''یہ (مقرّبین) سونے کے تاروں سے بنے ہوئے پلنگوں پر تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اُن کے پاس نوخیز لڑکے جو ہمیشہ نوخیز ہی رہیں گے' (ہاتھوں میں) پیالے' آفتابے اور شرابِ طہور سے چھلکتے جام لئے ہوئے اُن کے ہاں گردش کرتے ہوں گے۔ وہ اُس سے نہ تو سر درد محسوس کریں گے اور نہ مدہوش ہوں گے۔ اور وہ میوے بھی پیش ہوں گے جو جنتی پسند کریں گے اور پرندوں کا گوشت بھی جو اُنہیں مرغوب ہوگا۔ اور حوریں خوبصورت' موٹی آنکھوں والیاں (بچّے) موتیوں کی مانند جو چھپا کر رکھے گئے ہوں۔ یہ اُن نیکیوں کا اجر ہوگا جو وہ کرتے رہے تھے۔ وہ وہاں نہ تو لغو باتیں سنیں گے اور نہ ہی گناہ والی باتیں' بس ہر طرف سے سلام ہی سلام کی آواز آئے گی۔ اور دائیں ہاتھ والے' کیا شان ہوگی دائیں ہاتھ والوں کی! بے خار بیریوں میں اور کیلے کے گچھوں میں اور لمبے سایوں میں اور پانی کے آبشاروں میں اور پھلوں کی بہتات میں' نہ وہ ختم ہوں گے اور نہ اُن کی روک ٹوک ہوگی۔ اور اونچے اونچے پلنگوں پر بستر بچھے ہوں گے۔ ہم نے اُن کی بیویوں کو خاص طور پر بنایا ہے۔ پس ہم نے اُنہیں کنواریاں' (دل وجان سے) پیار کرنے والیاں' ہم عمر بنا دیا۔ (یہ سب نعمتیں) اصحابِ یمین (دائیں ہاتھ والوں) کے لئے مخصوص ہوں گی۔''

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ'' ایک ہی کیفیت پر ہمیشہ رہنے والے لڑکے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن میں بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوں گے۔ یہ وہ بچے ہوں گے جن کے والدین اسلام نہ لائے اور یہ بچپن ہی میں فوت ہو گئے۔ اُنہیں اہلِ جنت کا خادم بنا دیا جائے گا۔ رہے اہلِ ایمان کے کمسن بچے' تو اُنہیں اُن کے والدین کے ساتھ بلند واعلیٰ مقامات پر رکھا جائے گا۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۹۰)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خمر (انگور کی شراب) میں چار وصف ہوتے ہیں: اس سے نشہ

آتا ہے' سر میں درد ہوتا ہے' قے ہوتی ہے اور پیشاب آتا ہے لیکن جنت کی شراب ان تمام خرابیوں سے پاک ہوگی بلکہ اُس میں سرور ہی سرور اور لذّت ہی لذت ہوگی۔ یہ قرآن مجید کا کمالِ بلاغت ہے کہ دو مختصر فقروں میں اُس نے شراب کی ساری ہی خرابیوں کی نفی کر دی (ابنِ قُتَیبہ)

حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میرے سوال کرنے پر رسول اللہ ﷺ نے "حُـــوْر' عِیْـــن" کے متعلق فرمایا کہ وہ سفید رنگ کی حوریں ہوں گی' جن کی آنکھیں موٹی موٹی اور کشادہ ہوں گی اور اُنہیں زعفران سے پیدا کیا گیا ہے۔(المعجم الاوسط' ج ۳' ص ۲۷۸ و ج ۱' ص ۹۵ ؛ جامع البیان: ۲۵۸۰۹)

کَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَکْنُوْنِ. اِس تشبیہ میں مقصود غایتِ حُسن و غایتِ عصمت دونوں کا اظہار ہے۔ اہلِ جنت کو یہ شرف بھی بخشا جائے گا کہ وہاں کوئی ایسی گفتگو اُن کے لئے بارِ گوش نہ ہوگی جو لغو اور بیہودہ ہو اور نہ ہی وہاں جھوٹ' غیبت' گلہ' سب وشتم' مکر و فریب پر مشتمل کوئی گفتگو ہوگی جو سراسر گناہ ہے بلکہ اُن کی گفتگو خیر ہی خیر ہوگی۔ وہ اس طرح بات چیت کریں گے جس سے باہمی محبت و پیار میں اضافہ ہو' فضا کیف و سرور سے معمور ہو جائے' دلوں کے غنچے کھِل اُٹھیں' بیگانگی اور وحشت کا نام تک نہ رہے یعنی باہم ملاقات کے وقت وہ اپنے کلام کی ابتداء سلام سے کریں گے اور ایک دوسرے کو خوش آمدید اور مرحبا کا تحفہ پیش کریں گے۔

فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ (کانٹوں کے بغیر بیریاں) کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اُن بیریوں کے کانٹوں کو کاٹ دے گا اور ہر کانٹے کی جگہ ایک پھل پیدا کر دے گا اور ہر پھل سے بہتّر (۷۲) ذائقے نکلیں گے اور اُن میں سے کسی کا رنگ دوسرے سے نہیں ملے گا۔(المستدرک للحاکم' ج ۲' ص ۷۶ طبع قدیم ؛ المستدرک' رقم الحدیث: ۳۷۷۸ طبع جدید؛ حِلیۃ الاولیاء' ج ۶' ص ۱۰۳؛ الترغیب والترہیب للمنذری: رقم الحدیث: ۵۵۱۱)

اللہ تعالیٰ نے آیات ۲۸' ۲۹ میں بیری (سِدْر) اور کیلے (طَلْح) دونوں درختوں کا ذکر اس لئے فرمایا کہ اہلِ عرب اُن درختوں کو بہت پسند کرتے تھے جن کا سایہ بہت لمبا اور گھنا ہو۔ جنت کے درختوں کے سائے ہمیشہ قائم رہیں گے اور کبھی ختم نہ ہوں گے' تمام جنت سائے والی ہے' وہاں دھوپ نہیں ہوگی اور وہاں اس طرح کا وقت ہوگا جیسے طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے صبح کا وقت ہوتا ہے۔

نوٹ: قرآن حکیم نے یہاں ایک مفید طبی نکتہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ آیات ۲۰' ۲۱ میں ترتیب ملاحظہ ہو کہ اہلِ جنت کو سب سے پہلے پھل اور میوے پیش کئے جائیں گے اور بعدہٗ طعام اور گوشت وغیرہ۔ اور طعام سے پہلے پھل' میوے کا استعمال صحت کے لئے بہر حال مفید ہی ہوتا ہے۔

جنت کے پھل اس طرح کم مقدار اور کم تعداد میں نہیں ہوں گے جس طرح دنیا میں ہوتے تھے اور کسی وقت میں بھی وہ پھل منقطع نہیں ہوں گے بلکہ وہ درخت ہر وقت اور ہمیشہ پھلوں سے لدے رہیں گے۔ جس طرح دنیا میں گرمیوں کے پھل سردیوں میں نہیں ہوتے اور سردیوں کے پھل گرمیوں میں نہیں ہوتے۔ دنیا میں بعض اوقات پھلوں کے حصول سے درختوں کے کانٹے مانع ہوتے ہیں' بعض اوقات باغ کی چاردیواری مانع ہوتی ہے' بعض اوقات حفاظت کے چوکیدار مانع ہوتے ہیں' بعض اوقات وہ پھل اس قدر مہنگے ہوتے ہیں کہ انسان کی قوتِ خرید سے باہر ہوتے ہیں' بعض اوقات انسان کی بیماریاں بعض پھلوں کے کھانے سے مانع ہوتی ہیں۔ لیکن جنت میں کسی بھی وقت' کسی بھی پھل کو کھانے سے کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

فُرُش مَّرۡفُوۡعَة (اونچے اونچے پلنگ) کے ضمن میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان بستروں کی اونچائی اتنی ہوگی جتنی زمین سے آسمان تک کی اونچائی ہے اور وہ پانچ سو سال کی مسافت ہے (تبیان القرآن' ج ۱۱' ص ۶۶۲)

آیات ۳۵ تا ۳۸ میں اہلِ جنت کی نیک بیویوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو اُن کی خِلقت بالکل بدلی ہوئی ہوگی۔ اگرچہ وہ دنیا میں خوش شکل نہ تھیں' وقت آخر میں وہ بالکل بوڑھی ہوگئی تھیں لیکن جب جنت میں داخل ہوں گی تو بھرپور جوانی ہوگی' مجسّم حُسن و رعنائی ہوگی اور کنواری بنا کر اُنہیں جنت میں داخل کیا جائے گا۔ حدیث پاک میں اس آیت کی یہی تفسیر مذکور ہے۔ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے عرض کرنے پر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے اُمِّ سلمہ! ان سے مراد وہی بیویاں ہیں۔ اگرچہ وفات کے وقت وہ بالکل بوڑھی تھیں' اُن کے بال سفید تھے' اُن کی بینائی کمزور تھی' آنکھیں میلی کچیلی رہتی تھیں لیکن جب وہ جنت میں داخل ہوں گی تو ساری ہم عمر ہوں گی۔ (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۹۲)

اُن کی دو صفتیں اور بیان فرمائیں: ایک تو وہ عُرُب'' ہوں گی اور دوم یہ کہ وہ چھوٹی عمر کی ہم عمر ہوں گی۔ جیسے أَتۡرَابًا مٹی سے کھیلتی بچیوں کی عمر والی (تُراب بمعنی مٹی)

عُرُب'' کا واحد عروب ہے اور اس کا معنی وہ عورت ہے جو (۱) حسین و جمیل بھی ہو۔ (۲) ناز و ادا والی بھی ہو۔ (۳) خوش گفتار بھی ہو (۴) ہنس مکھ بھی ہو (۵) اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور (۶) اپنی چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اُس کا اظہار کرنے والی ہو۔ (تفسیر قرطبی) علامہ ابن منظور افریقی نے بھی ''لسان العرب'' میں اس لفظ کو تقریباً ایسے ہی Define کیا ہے۔ یہ سب نعمتیں اَصۡحٰبُ الۡیَمِیۡن جیسے خوش نصیبوں کے حصے میں آئیں گی جنہوں نے اپنے نفسِ امارہ کے تقاضوں کو پامال کیا اور رب کے حکم پر عمل پیرا رہے۔

''جنت میں جسمانی لذات وانبساط کے انہی بیانات نے کچھ لوگوں اور غالباً راہبوں کی ناراضی کو ابھارا ہے۔ وہ محمد (ﷺ) کے (معاذ اللہ) غیر خالص مذہب کے خلاف پُر زور احتجاج کرتے ہیں جبکہ آپ ﷺ کے بھولے بھالے معذرت خواہوں نے کنایوں اور تشبیہات کا کمزور سہارا لے کر دفاع کیا ہے۔ لیکن ایمان میں پختہ اور مستحکم گروہ نے بغیر کسی شرم یا جھجک کے قرآن کے لفظی ترجمہ سے تمسک کیا ہے کیونکہ جسموں کا زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا جانا بے کار ہوگا اگر اُن میں عظیم ترین صلاحیتیں بحال نہ کی جائیں اور اُنہیں پنپنے کا موقع نہ دیا جائے۔ انسانِ کامل کی خوشی اور شادمانی کی تکمیل کے لئے جنسی اور ذہنی حظِ وافر انتہائی ضروری ہیں'' ("The Decline and Fall of the Roman Empire" --- Gibbon, Vol. 5, p. 351)

(vii) فَوَقٰهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَ لَقّٰهُمْ نَضْرَةً وَّ سُرُوْرًا o وَ جَزٰهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّ حَرِيْرًا o مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا o وَ دَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا o وَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّ اَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا o قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا o وَ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا o عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا o وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا o وَ اِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّ مُلْكًا كَبِيْرًا o عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَ سَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا o اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا o (الدّھر:۱۱-۲۲)

''سو اللہ اُنہیں اُس دن کی سختی سے محفوظ رکھے گا اور اُنہیں تازگی اور خوشی عطا کرے گا۔ اور اُن کے صبر (و ثبات) کے صلہ میں اُنہیں جنت اور ریشمی لباس دے گا اِس حال میں کہ وہ پلنگوں پر تکیہ لگائے ہوں گے اور نہ وہاں وہ تپش پائیں گے اور نہ سردی۔ اور درختوں کے سائے اُن پر جُھکے ہوئے ہوں گے اور پھلوں کے خوشے اُن کے قریب کر دیے جائیں گے۔ اور اُن کے لئے چاندی کے برتن اور ایسے گلاس گردش میں لائے جائیں گے جو شیشہ کی طرح صاف ہوں گے اور وہ شیشے چاندی کے ہوں گے جنہیں بھرنے والوں نے مناسب انداز سے بھرا ہوگا۔ وہاں اُنہیں ایسے جام بھی پلائے جائیں گے جن میں سونٹھ کے چشمہ کی آمیزش ہوگی۔ اِس چشمہ کو جنت میں سلسبیل کہا جاتا ہے۔ اور اُن کے پاس نوخیز لڑکے جو ہمیشہ نوخیز ہی رہیں گے، گردش کریں گے، تم اُنہیں دیکھ کر یہ گمان کرو گے کہ وہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ تم وہاں جہاں بھی دیکھو گے تو سراسر نعمتیں اور عظیم سلطنت ہی دیکھو گے۔ اہلِ جنت کے اوپر باریک ریشم کے سبز کپڑے ہوں گے، دبیز ریشم کے بھی اور اُنہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور اُن کا رب اُنہیں پاکیزہ شراب پینے کو دے گا۔ (کہا جائے گا:) یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں۔''

مؤمن کی ساری زندگی صبر سے عبارت ہے۔ احکامِ الٰہی کی ادائیگی پر صبر' نواہی سے اجتناب پر صبر' محرومیوں اور نقصانات پر صبر' دشمنانِ اسلام کے سامنے معرکہِ حق و باطل میں صبر اور جنگ جیتنے کے بعد اپنے اقتدار و اختیار کے صحیح استعمال کرنے پر صبر۔ الغرض مؤمن کی زندگی کا کوئی گوشہ بھی تو ایسا نہیں جہاں صبر کا نور نہ دمک رہا ہو۔ آیت ۱۲ میں ارشاد ہے کہ اہلِ ایمان نے زندگی کا سفر جس صبر و استقامت سے طے کیا' نفس کے سرکش گھوڑے کو جس عزم سے اُنہوں نے قابو میں رکھا' آج اُن تمام کاموں کا اُنہیں معاوضہ ملے گا۔ أرائِك جمع ہے اَرِیکۃ کی اور اَرِیکۃ اُس مخصوص پلنگ کو کہا جاتا ہے جو نو بیاہتا دُلہن کے لئے بچھایا جاتا ہے۔

''آیت ۱۳ میں فرمایا کہ جنتی لوگ جنت میں نہ تو دھوپ کی تپش پائیں گے اور نہ سردی اور درختوں کے سائے اُن کے قریب کر دیئے جائیں گے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سایہ وہاں ہوتا ہے جہاں سورج ہو' تو جب جنت میں سورج نہیں ہوگا تو وہاں سایہ بھی نہیں ہونا چاہئے اور پھر درختوں کے سائے کیسے ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جنت میں دوسرے اجسامِ نورانیہ کی روشنی ہو جس کی وجہ سے درختوں کا سایہ ہو کیونکہ جنت میں بہرحال اندھیرا تو نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سورج اور چاند کے بغیر وہاں سایہ پیدا کر دے کیونکہ انسان سائے میں بھی فرحت محسوس کرتا ہے جیسے جنت میں سونے' چاندی کے کنگھے ہوں گے حالانکہ جنت میں بالوں کے اندر نہ میل کچیل ہوگا اور نہ بال اُلجھے ہوں گے جنہیں سنوارنے کے لئے کنگھا کرنے کی ضرورت ہو اور جیسے پیاس کے بغیر جنت میں لذّت و فرحت کے لئے مشروب پلائے جائیں گے۔''

''پھر فرمایا کہ پھلوں کے خوشے اُن کے قریب کر دیئے جائیں گے یعنی اگر وہ کھڑے ہوں تب بھی خوشوں سے پھل توڑ سکیں گے اور اگر اپنی مسندوں پر بیٹھے ہوں یا مسہریوں پر لیٹے ہوں' تب بھی خوشوں سے پھل توڑ سکیں گے۔''

''قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ کا مفہوم حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے یوں بیان فرمایا کہ یہ سارے برتن چاندی کے بنے ہوں گے لیکن اُن میں چمک اتنی زیادہ ہوگی کہ خیال گزرے گا کہ شیشہ اور بلّور ڈھال کر اُنہیں بنایا گیا ہے۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شفاف چاندی کے برتنوں اور گلاسوں کا ذکر فرمایا ہے جبکہ سورۃُ الزخرف کی آیت ۷۱ میں فرمایا: ''اُن پر سونے کے پیالوں اور سونے کے گلاسوں کا دَور چلایا جائے گا۔'' بظاہر ادونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جنت میں سونے اور چاندی دونوں کے برتن ہوں گے اور اہلِ جنت کے تنعّم اور عیش کے لئے کبھی اُنہیں سونے کے برتنوں میں کھلایا پلایا جائے گا اور کبھی چاندی کے برتنوں میں۔''

''اِس آیت میں فرمایا گیا کہ اُن کے لئے شفاف چاندی کے برتن ہوں گے۔ شفاف وہ چیز ہوتی ہے

جس کے آر پار دیکھا جا سکے لیکن چاندی تو کثیف ہوتی ہے جس کے آر پار دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی چاندی ایسی ہی ہوتی ہے لیکن جنت کی چاندی اور جنس کی ہوگی اور اُس کے آر پار دیکھا جا سکے گا' نیز شیشہ بھی پتھر کی جنس سے ہے اور وہ بذاتِ خود کثیف ہوتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ کثیف پتھر کو شفاف اور لطیف بنا سکتا ہے تو وہ کثیف چاندی کو بھی لطیف اور شفاف بنا سکتا ہے۔ نیز حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جنت کی کسی چیز کا دنیا کی کسی چیز کے ساتھ کوئی مماثلت نہیں ہے' اُن میں صرف نام کا اشتراک ہے ورنہ جس نام کی چیز دنیا میں ہے' جنت میں اُس نام کی چیز اس سے بہت مختلف ہوگی۔'' (تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ص ۴۴۸' ۴۴۹)

آیت ۱۶ میں فرمایا کہ پلانے والے اُن برتنوں کو مناسب انداز سے بھریں گے یعنی ساقی گری کی خدمت پر جو خدّام مقرر ہوں گے وہ بڑے سلیقہ شعار اور اَدا شناس ہوں گے۔ صراحی سے جام میں اِتنی مقدار میں شراب اُنڈیلیں گے جتنی پینے والا چاہے گا اور جتنی اُس کی خواہش ہوگی۔ وہ اناڑی نہ ہوں گے کہ جسے چند گھونٹ کی خواہش ہو اُسے چھلکتا گلاس دے دیں اور جو زیادہ پینا چاہتا ہو اُسے چند قطروں پر ٹرخا دیں۔

'' آیت ۱۷ میں ایک دوسری قِسم کی شراب کا ذکر ہو رہا ہے کہ اُنہیں ایسی شراب دی جائے گی جس میں زنجبیل (سونٹھ) کی ملاوٹ ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بتا دیا کہ یہ بھی جنت کے ایک چشمہ کا نام ہے جسے سلسبیل * کہا جاتا ہے۔ اہلِ عرب شراب میں سونٹھ ملا کر پیتے تھے اور آیت میں اُنہی کا پسندِ خاطر نام ذکر فرمایا اور بتا دیا کہ جنت میں ایک چشمہ اسی نام کا جاری ہے جس میں سونٹھ کی آمیزش ہوگی' اُس میں سونٹھ کی بُو تو ہوگی لیکن اُس کے ذائقہ میں تلخی نہ ہوگی نیز یہ کہ جنت میں کھانے پینے کے بعد الگ سے سونٹھ کا پانی پینے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ جنت کے مشروبات میں از خود سونٹھ کا پانی ملا ہوگا۔'' (ضیاء القرآن' ج ۵' ص ۴۴۷ ؛ تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ۴۴۹)

وِلْدَان ''مُخَلَّدُوْن کی تشریح صفحہ ۴۶۲ پر گزر چکی ہے۔ یہاں آیت ۱۹ میں اتنا اضافہ فرمایا گیا کہ جب وہ لڑکے جنت کے مرغزاروں میں جنتیوں کی خدمت میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہوں گے تو یوں معلوم ہوگا کہ موتیوں کی کوئی لڑی ٹوٹ گئی ہے اور اُس کے تابندہ اور رنگ رنگیلے موتی اِدھر اُدھر لڑھکتے چلے جا رہے ہیں۔ رنگ کی صفائی کے لحاظ سے تو وہ موتی ہوں گے لیکن بکھرے ہوئے یوں کہ ہر وقت جنتیوں کی خدمت کے لئے اُن کی آمد و رفت جاری رہے گی اور رُکنے میں نہیں آئے گی۔

* ابن الاعرابی نے کہا کہ سَلسَبِیل کا لفظ صرف قرآن میں آیا ہے' عربی زبان میں یہ لفظ نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مادّہ کیا ہے اور یہ کس لفظ سے ماخوذ ہے اور اکثر علماء نے کہا ہے کہ جو مشروب میٹھا ہو اور بہ آسانی حلق سے اتر جائے' اُسے سَلسَبِیل یا سَلسَال کہا جاتا ہے۔'' (تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ۴۴۹)

آیت ۲۰ میں فرمایا کہ ''جنت میں تم جہاں بھی دیکھو گے تو سراسر نعمتیں اور عظیم سلطنت ہی دیکھو گے۔'' حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اِس آیت کی تشریح میں فرمایا کہ کوئی بیان کرنے والا جنت کی نعمتوں کے حُسن اور اُن کی پاکیزگی کو کما حقہٗ بیان نہیں کر سکتا۔ اہلِ جنت میں سے جو شخص ادنیٰ درجہ کا ہوگا' وہ دیکھے گا کہ اُس کا مُلک ایک ہزار سال کی مسافت کو محیط ہے اور وہ دُور والے کو اسی طرح دیکھے گا جیسے وہ قریب والے کو دیکھ رہا ہے اور وہ جب کسی چیز کی خواہش کریں گے تو وہ اُنہیں فوراً مل جائے گی۔ کلبی نے اہلِ جنت کی عظیم سلطنت کی تفسیر میں کہا کہ اللہ کا ولی اپنے گھر میں آرام کر رہا ہوگا تو اللہ کا فرستادہ اُس کے پاس عمدہ پوشاک' لذیذ کھانے اور مرغوب مشروبات لے کر آئے گا اور اُس کی اجازت سے اُس کے گھ میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے مقرب و مکرّم فرشتے بھی اُس کے گھر میں اُس کی اجازت کے بغیر نہیں آسکیں گے۔ اس سے بڑھ کر اُن کی نعمتیں اور اُن کی عظیم سلطنت اور کیا ہوگی!''

آیت ۲۱ میں سُندُس کا لفظ ہے جس کا معنیٰ باریک ریشم کا ہے۔ علامہ سیوطی نے ''الاتقان'' میں لکھا کہ جوالیقی نے کہا ہے کہ فارسی میں اس کا معنیٰ ہے باریک دیبا۔ دراصل یہ لفظ فارسی الاصل ہے اور اسے عربی بنا دیا گیا ہے۔ اسی طرح اِستَبرَق کا لفظ ہے بمعنیٰ ریشم کا زرّیں کپڑا (لغات القرآن' ج ا' ص ۷۷)

آیت ۲۱ میں فرمایا کہ اہلِ جنت کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے جبکہ سورۃُ الکہف :۳۱ میں فرمایا کہ اُنہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔ اِس تعارض میں تطبیق یوں ہے کہ اُن کے پاس سونے اور چاندی دونوں قِسم کے کنگن ہوں گے۔ جب اُن کا جی چاہے گا سونے کے اور جب جی چاہے گا' چاندی کے کنگن پہن لیں گے۔ اِس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اِس آیت میں جنت کے نوخیز بے ریش لڑکوں کا ذکر ہے کہ وہ چاندی کے کنگن پہنے ہوں گے جبکہ سورۃُ الکہف :۳۱ میں جنت کے مَردوں کا ذکر ہے کہ وہ سونے کے کنگن پہنے ہوں گے۔ ریشم اور زیور بعض مفاسد کی بناء پر اِس دنیا میں مَردوں کے لئے ممنوع و معیوب ہیں لیکن جنت کی فضا میں وہ سارے مفاسد غیر موجود ہوں گے۔

دو قِسم کی شرابوں کا ذکر پہلے ہو چکا: ایک وہ جس میں کافور کے چشمے کا پانی ملا ہوگا (آیت:۵)' دوسری وہ جس میں زنجبیل کے چشموں کا پانی ملا ہوگا (آیت:۱۷)۔ اب آیت ۲۱ میں تیسری قسم کی شراب کا ذکر ہو رہا ہے اور وہ شرابِ طہور ہے جسے پلانے والا خود رب العالمین ہے۔ ''طہور طاہر کا مبالغہ ہے یعنی جنت کی شراب بہت زیادہ پاکیزہ ہوگی اور وہ دنیا کی خمر (انگور کی شراب) کی طرح نجس نہیں ہوگی اور اُسے بنانے میں ناپاک اور نجس ہاتھوں کا استعمال نہ ہوا ہوگا اور جسم کے مسامات سے جو پسینہ نکلے گا' اُس میں نجس شراب کی بُو نہیں ہوگی بلکہ مُشک کے پسینہ کی خوشبو آ رہی ہوگی۔'' (تبیان القرآن' ج ۱۲' ص ۴۵۱)

اِن سب میلانات اور رُجحانات کو اُس نے اپنے تابع کر لیا اور اُنہیں خدا کی بندگی اور اطاعت کے لئے استعمال کیا۔ اب بجائے اِس کے کہ وہ رُجحانات شیطنت کے طور پر اُس پر حملہ آور ہوتے' وہ زندگی کی راہ میں اُس کے مضبوط مددگار بن گئے۔ اُن بنیادی خصوصیات نے جو نفسِ امّارہ میں موجود ہیں' اُسے پاکیزہ کیا اور اُسے عظیم کامیابی کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ اُن اسباب کے حصول کی کوشش کرتا ہے جو اُن لوگوں کی خدمت کرنے میں اُس کے مددگار ہوتے ہیں جن کے حقوق کی ادائی اللہ نے اُس پر فرض کی ہے مثلاً اُس کے ضرورتمند رشتہ دار' یتامیٰ اور مصیبت زدگان۔ اُس کی اُن تھک تگ و دَو حق کے عام کرنے اور بدی کو دبانے کی طرف مڑ جاتی ہے اور، بقولِ قرآن اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (کافروں پر برقِ آسمانی بن کر گرتے ہیں لیکن آپس میں شیر و شکر ہوتے ہیں) وہ اُنہی میں سے ایک بن جاتا ہے۔''

''جائز حقوق کا دفاع قابلِ ستائش ضرور ہے لیکن ڈر ہے کہ یہ چیز انسان کو بخل اور خود غرضی کی طرف نہ لے جائے۔ اِن برائیوں کی مذمت شاندار الفاظ میں یوں کی گئی ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًاo اَلَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَیَکْتُمُوْنَ مَا آتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ (اَلنِّساء : ۳۶۔۳۷)

''قطعاً اللہ ایسوں کو پسند نہیں کرتا جو خود بیں اور شیخی خورے ہیں جو بخل کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور جو کچھ اُنہیں اللہ نے اپنے فضل سے دے رکھا ہے' اُسے چھپاتے ہیں۔''

''وہ اوّلاً اگر اپنے اور اپنے گھر والوں اور برادری کی فلاح و بہبود کا ذمّہ دار ہے تو آج قبائلی نفرت کی دیواریں گرادی گئی ہیں اور اب اُس کی وفاداریاں تمام مسلم بھائی چارے بلکہ دراصل تمام انسانیت کا احاطہ کر رہی ہیں' ہاں مگر اُن کے لئے نہیں جو کھلم کھلا اللہ اور اُس کے فرامین کی عظمت اور بالادستی کو للکارتے ہیں۔ اُس کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کلمہِ حق کو غلبہ مل جائے اور یہ کہ صرف وہ لوگ اُس کی تعریف کریں جن کی تعریف کی کوئی قدر و حیثیت بھی ہے۔ اُن اچھی خصوصیات پر جن کا وہ حامل ہے' وہ کوئی انعام بھی نہیں چاہتا:

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (یوسف : ۵۳)

''اور میں اپنے نفس کی براءت (کا دعویٰ) نہیں کرتا' بے شک نفس تو برائی کا حکم دیتا ہے مگر (وہی بچتا ہے) جس پر میرا پالنہار رحم فرمادے۔''

''جہاں تک شہرت کی بات ہے تو وہ اُسے صرف اللہ کی خاطر چاہتا ہے یا اگر اپنے لئے چاہے تو صرف اس لئے کہ وہ دوسروں کو صراطِ مستقیم کی طرف لانے کے لئے اُنہیں متاثر کرے۔ اُس کی خود ستائشی خود نمائی کی بنا پر نہیں بلکہ یہ پاکیزگیِ خیال و عمل اور ہم آہنگی کا ایک پہلو ہے۔ وہ اُس ذاتِ بے مثل کی تعریف کرتا ہے جو خود لازوال اور ابدی حُسن ہے اور حُسن و خوبی کو پسند کرتا ہے۔ اگر اُسے کوئی مسندِ اختیار ملتی ہے تو وہ اُسے

وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ اہلِ جنت کے اعزاز و اکرام کی ترتیب اس سورۃ میں دیکھتے جایئے۔ پہلے ارشاد ہوا یَشْرَبُوْنَ یعنی وہ خود وہاں پئیں گے۔ پھر بیان ہوا یُسْقَوْنَ (بہ صیغہ مجہول) یعنی اُنہیں پلایا جائے گا۔ پلانے والے مجہول رہے' چاہے فرشتے ہوں یا جنت کے کوئی دوسرے خدّام ہوں۔ اب آیت ۲۱ میں ارشاد ہو رہا ہے وَسَقَاھُمْ رَبُّھُمْ * ساقی براہِ راست ذاتِ باری تعالیٰ ہوگی۔ کیا ٹھکانہ ہے اس اِعزاز و اِکرام کا!

آیت ۲۲ میں فرمایا کہ (کہا جائے گا) کہ یہ ہے تمہاری جزا اور تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں۔ اہلِ جنت سے فرشتوں کے اس کلام کا مقصود یہ ہے کہ اہلِ جنت کو مزید خوش کیا جائے تاکہ ان کی مسرت اور شادمانی میں مزید اضافہ ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو یعنی یہ نوازشیں اور یہ عنایتیں تمہارے ان مخلصانہ اعمال کی جزا ہیں اور تمہیں مبارک ہو کہ ہم نے محض اپنے رحم و کرم سے تمہارے ناقص اعمال کو قبول فرما لیا ہے۔ بندہ کے لئے اس سے بڑھ کر خوشی کا اور کیا مقام ہوگا جب اُسے یہ نویدِ جانفزا سنائی جائے گی!

<u>اللہ تعالیٰ کے شاکر ہونے کی توجیہ</u>: آیت ۲۲ میں ''تمہاری سعی (نیک اعمال) مشکور ہیں'' کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے نیک اعمال پر اُن کا شکر ادا کیا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ کے لئے لائق یہ ہے کہ بندے اُس کا شکر ادا کریں' نہ کہ اللہ تعالیٰ بندوں کا شکر ادا کرے۔ اس سوال کے حسبِ ذیل جوابات ہیں:

(۱) شکر کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ مشکور کی تعریف و تحسین کی جائے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ بندوں کے نیک اعمال کی تحسین فرمائے گا اور بتائے گا کہ ان نیک اعمال کی وجہ سے اُنہیں جنت میں ان بلند مقامات پر رکھا گیا ہے اور اُنہیں یہ انعامات دیئے گئے اور یہی اُن کے نیک اعمال کا مشکور ہونا ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے شکر کرنے کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ بندوں کے نیک اعمال کو قبول فرماتا ہے' اُن کی اچھی جزا عطا فرماتا ہے اور اُن نیک اعمال کی قدر دانی اور قدر افزائی فرماتا ہے۔

(۳) جو شخص تھوڑی سی چیز سے راضی ہو جائے اُسے شکور (بہت زیادہ شکر ادا کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی تھوڑی سی عبادت و طاعت سے راضی ہو جاتا ہے اور اُن کی کم عبادت پر بھی اُنہیں بہت زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔ اسی لئے سورۃ البقرۃ: ۱۵۸ میں فرمایا کہ ''جس نے خوشی سے کوئی نیکی کی تو بے شک اللہ تعالیٰ (اس کا) قدر دان اور بہت جاننے والا ہے۔''

(۴) بندے کے اللہ سے قرب کا آخری درجہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہو اور اللہ اُس سے راضی ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرمان ''یہ انعامات تمہاری جزاء ہیں'' میں بندے کے راضی ہونے کی طرف اشارہ ہے <u>اور اِس کے فرمان ''تمہاری سعی مشکور ہے'' میں اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی طرف اشارہ ہے۔</u>

* شراب عربی میں ہر مشروب (پینے والی چیز) کو کہتے ہیں (امام راغب اصفہانی)۔ اس سے ذہن اُردو کے لفظ شراب اور اُس کے گندے' نشیلے مفہوم کی طرف کہیں منتقل نہ ہو جائے۔

(۱۵) ہوابازی (Aviation)

''ایوی ایشن نام ہے' طیارہ کے ارتقائی مراحل کا' اُس کے دائرۂ کار اور استعمال کا جس میں ''ہوا سے بھاری'' طیاروں کی پرواز اور ''ہوا سے ہلکے'' طیاروں کی پرواز دونوں شامل ہیں۔'' (Academic American Encyclopedia, Vol. II, p. 370) 1981 Edn.

''فضائی دباؤ میں تبدیلی: ٹمپریچر کی طرح فضا کی ہوا کا دباؤ بلندی کے ساتھ ساتھ کم ہوتا جاتا ہے۔ اِس طرح سطحِ سمندر پر ہوا کا دباؤ ۱۴.۷ پونڈ فی مربع انچ ہوتا ہے جو اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر کم ہو کر آدھا رہ جاتا ہے۔ چونتیس ہزار فٹ کی بلندی پر اُس کا چوتھائی حصّہ اور اڑتالیس ہزار فٹ کی بلندی پر اُس کا آٹھواں حصّہ رہ جاتا ہے۔'' (Encyclopedia Britannica, Vol. 2, p. 812)

ارتفاعی (اونچائی کا) مرض (Altitude Sickness): کچھ مسافر کافی بلندی پر جا کر آکسیجن نہ ملنے کی وجہ سے سانس کی دشواری کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں لیکن اُن کی اس بیماری کو آکسیجن کی فراہمی کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ یہ طریقِ کار جنگِ عظیم اوّل (۱۸-۱۹۱۴) سے فوجی طیاروں میں شروع ہوا اور ۱۹۳۸ء سے شہری طیاروں نے مسافروں کے لئے اپنے ساتھ آکسیجن رکھنا شروع کر دی ہے۔ (ایضاً' ص ۸۱۲)

اِطلاقی برقیریات (Avionics): یہ وہ انتہائی ضروری برقی آلات ہیں جو طیاروں میں نصب کئے جاتے ہیں اور جو پرواز میں مدد دیتے ہیں۔ اِن آلات میں ہوائی لہروں کو معلوم کرنے کے آلات' راڈار' کمپیوٹر وغیرہ شامل ہیں۔

حضرتِ انسان قدرتی طور پر متجسس واقع ہوا ہے اور اُس کے اِس تجسس نے اُسے ہمیشہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے پر اُبھارا ہے جس سے اُس نے کئی دریافتیں معلوم کیں اور انجام کار ترقی کی شاہراہ تک پہنچا۔ زمین کے اِس باسی (انسان) نے پرندوں کو دُور آسمان کی فضاؤں میں اُڑتے دیکھا تو اُس کے ذہن میں اُڑنے کی خواہش نے انگڑائی لی۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پرندوں کے برعکس انسان کی ہڈیاں اور اعصاب ایسے بنائے گئے ہیں جو پرواز کی موافقت نہیں کرتے۔ تاہم مختلف زمانوں میں انسان نے اپنے بازوؤں کے ساتھ پَر باندھ کر اُڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش ہمیشہ ہی مہلک ثابت ہوئی۔ ہوابازی کے میدان میں اُس کی بالآخر کامیابی اور جدید ترقی یافتہ تکنیکی مہارت اُس کی ایک طویل' تاریخی اور غیر منقطع (مسلسل) جدّ وجُہد کا نتیجہ ہے۔ یہ معلوم کرنے میں اُسے خاصا وقت لگا کہ پرندے اپنی دُموں کے ذریعے زمین پر اترتے ہیں۔ اِس چیز نے اُسے زمین پر بہ حفاظت اترنے میں دُم (بہ شمول فِن (Fin) اور رَڈر (Rudder) کا تصوّر دیا۔ [فِن اور رَڈر پر نوٹ اگلے صفحے کے ذیل میں ملاحظہ کیجئے]

پرندوں کی پرواز کے بارے میں قرآنِ مجید نے فرمایا:۔

(۱) اَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ مُسَخَّرٰتٍ فِىۡ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ‌ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ۝ (اَلنَّحل : ۷۹)

"کیا اِن لوگوں نے پرندوں کونہیں دیکھا کہ آسمان کی فضا میں (قدرت کے) وہ تابع ہیں' اُنہیں اللہ کے سوا کسی (اور) نے نہیں تھام رکھا' بے شک اس میں ایمان والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

(۲) اَوَلَمۡ يَرَوۡا اِلَى الطَّيۡرِ فَوۡقَهُمۡ صٰٓفّٰتٍ وَّيَقۡبِضۡنَ‌ مَا يُمۡسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحۡمٰنُ (اَلۡمُلك : ۱۹)

"کیا اِن لوگوں نے اپنے اوپر پرندوں پر نظر نہیں کی کہ پَر پھیلائے ہوئے ہیں اور سمیٹ بھی لیتے ہیں' اُنہیں سوائے خدائے رحمٰن کے کوئی اور نہیں تھامے رہتا۔"

یعنی جب پرندے آسمان اور زمین کے درمیان فضاء میں پرواز کررہے ہوتے ہیں تو وہ کس طرح اپنے بازو پھیلا کر ہوائی کرّے کو چیرتے ہوئے اور توازن قائم رکھتے ہوئے اُڑ رہے ہوتے ہیں۔ ان پرندوں میں کس نے ایسی طاقت رکھی ہے جو اُنہیں ہوا میں اڑا کر لے جاتی ہے جبکہ ثقیل جسم کا فطری تقاضا ہے کہ وہ زمین کی کشش سے فوراً بلندی سے نیچے گر جاتا ہے* تو دورانِ پرواز کون اُنہیں فضاء میں قائم رکھتا ہے اور نیچے گرنے سے کون روکتا ہے؟ کیا پتھر کے بنائے ہوئے یہ بُت ان پرندوں کو اُڑاتے ہیں اور اُنہیں دورانِ پرواز نیچے گرنے سے روکے رکھتے ہیں؟ جب یہ بُت نہیں تراشے گئے تھے جب بھی پرندوں کے اُڑنے اور فضاء میں قائم رہنے کا یہی نظام تھا' اس لئے بت اُن کے خالق نہیں ہوسکتے۔ جب اِس نظام کی وحدت اور یکسانیت بھی یہی بتاتی ہے کہ اِس نظام کا خالق واحد ہے اور جب پرندوں کے اِس نظام کا وہی واحد لاشریک خالق ہے تو کائنات کے باقی تمام نظاموں کا بھی وہی خالق ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

قرآنِ حکیم حضرت سلیمان علیہ السلام کے تخت کی بھی نقشہ کشی کرتا ہے جو ہوا میں طیارے کی طرح تیرتا تھا۔ وہ طیارہ جسے صدیوں بعد انسان نے ایجاد کیا:۔

(i) وَلِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِىۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَى الۡاَرۡضِ الَّتِىۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا (الانبیاء : ۸۱)

"اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کے لئے تیز اور تند ہوا کو تابع کر دیا تھا جو اُن کے حکم کے مطابق اُس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھ دی تھی۔"

نوٹ: فِن (Fin) مچھلیوں اور دوسرے سمندری جانوروں کا ایک عضو جو جسم کے مختلف حصّوں پر ہوتا ہے اور اُنہیں تیرنے' آگے بڑھنے اور توازن قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔

رَڈر (Rudder) یہ ہوائی جہاز کی پشت سے جُڑا ہوا عمودی پٹ ہے جس سے اُس کی اُفقی سمت متعین کی جاتی ہے۔

*انہی آیات نے جہاں انسان میں اڑنے کی خواہش کو ابھارا' وہیں ان سے کششِ ثقل کا قانون (Law of Gravitation) بھی ثابت ہوتا ہے جسے انگریزی حصّہ کے "فزکس" کے عنوان کے تحت صفحات 3946 ,3945 ,3943 پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ اس قانون کا دریافت کرنے والا نیوٹن نہیں ہے بلکہ نیوٹن کے آنے سے صدیوں پہلے قرآن مجید نے اس قانون کو اشارۃً پیش کر دیا تھا۔

(ii) فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ ۝ (ص : ۳۶)
"پھر ہم نے ہوا کو اُن کے تابع کر دیا کہ وہ اُن کے حکم سے جہاں وہ چاہتے' نرمی سے چلتی۔"

اِن دونوں آیتوں میں بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے کہ سورۃ الانبیاء:۸۱ میں ہوا کو تند و تیز بتایا گیا جبکہ سورہ صٓ: ۳۶ میں اُسے نرم و لطیف بتایا گیا۔ اس کا ایک جواب تو مفسرینِ کرام نے یہ دیا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کے تخت کو اٹھاتے وقت ہوا تیز ہوتی تھی اور اُسے نیچے لاتے وقت وہ نرم و لطیف ہوتی تھی۔ بعض مفسرین نے فرمایا کہ عَاصِفَةً اور رُخَاءً کہہ کر رب تعالیٰ نے ہوا کی فرمانبرداری اور عاجزی کو ظاہر فرمایا ہے کہ جیسے سلیمان چاہتے تھے' ہوا ویسے ہی چلتی تھی۔ بعض نے فرمایا کہ عَاصِفَةً فرما کر ہوا کی ذاتی اور جنسی کیفیت کا ذکر کیا گیا کہ ہوا ذاتی طور پر بوجہ لطیف ہونے کے تیز ہی ہوتی ہے اور رُخَاءً فرما کر اُس کی عملی کیفیت کا ذکر کیا گیا کہ جب حکمِ سلیمانی ہوتا تو اپنی مرضی سے نہ چلتی بلکہ تابع فرمان ہو کر چلتی۔ اِس قول میں عَاصِفَةً اور رُخَاءً کا معنیٰ تیز اور نرم نہیں بلکہ آزاد ہو کر اور تابع ہو کر چلنا مراد ہے۔ (تفسیر نعیمی ۔۔۔ مفتی اقتدار احمد خان نعیمی' جزء ۱۷' ص ۳۷۶)

کچھ متعلقہ اصطلاحات اور نام قرآنِ حکیم کی روشنی میں: یہ حقیقت خوب خوب ذہن نشین رہے کہ قرآنِ حکیم نہ تو ہوابازی کے قواعد و ضوابط کی کتاب ہے اور نہ ہی فلسفہ اور ریاضی کی گتھیوں کو سلجھانے کی بلکہ بنیادی طور پر یہ رُشد و ہدایت کی کتاب ہے جس کا مقصد وحید جبینِ انسانیت کو اغیار سے ہٹا کر ایک خدائے واحد و لاشریک کے حضور جھکا دینا ہے۔ لیکن رُشد و ہدایت کے اِس منصبی فریضہ کے پسِ پردہ وہ کچھ ایسے نِکات بھی بیان کر جاتا ہے جن کا تعلق اگرچہ براہِ راست نہ سہی' بالواسطہ کسی نہ کسی سائنسی حقیقت سے ضرور ہوتا ہے اور اس انداز کو ہم Implied یعنی ضمنی کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل تمام بیانات میں مطلب ضمنی Implied لیا گیا ہے نہ کہ حقیقی۔

(۱) __ہوائی اڈّہ:__ اس کا ذکر (براہِ راست نہیں بلکہ) ضمنی طور پر سورۃ الانبیاء:۸۱ میں آیا ہے جس کا حوالہ گزشتہ صفحہ میں دیا جا چکا ہے۔ وہ اَرض (سرزمین) جہاں سلیمان علیہ السلام کو ہوا اتارتی تھی' گویا کہ ہوائی اڈّہ تھی۔

(۲) __طیارہ:__ اس کا ذکر بھی براہِ راست تو نہیں بلکہ بالواسطہ اور ضمناً اِن آیات میں کیا گیا ہے:۔

(i) وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (اَلنَّحل : ۸)
"اور اللہ وہ چیزیں پیدا کرتا ہے جن کی تمہیں خبر نہیں" (چنانچہ ریل گاڑی' ہوائی جہاز سب اس میں آگئے)

(ii) يَعْلَمُ ۔۔۔۔ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا (الحدید : ۴)
"جو چیز بھی آسمان کی طرف چڑھتی ہے' وہ اُسے جانتا ہوتا ہے۔"

(۳) فضائی حادثہ : ذیل کی آیت بندے کو ہر چاہتِ دنیا اور ہر خواہشِ نفسانی سے ہٹ کر ایک خدائے واحد لاشریک کا بندہ بننے کا سبق دے رہی ہے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ اگر اس میں سے حادثۂ فضائی کا سبق ضمناً اخذ کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ معاف کرے اِس سے قرآنِ پاک کی مقصدیت اور غایتِ اولیٰ میں کوئی فرق نہیں آئے گا:۔

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْتَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ o (الحج : ۳۱)

''اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شریک کرتا ہے تو جیسے وہ آسمان سے گر پڑا' پھر (مُردار خور) پرندوں نے اُسے اُچک لیا (اور نوچ ڈالا) یا اُسے آندھی نے کسی دُور دراز جگہ جا پھینکا۔''

غرض کہ یہ شخص بُری طرح ہلاک ہوا جس طرح کہ ہوائی حادثے میں انسان کا کچھ بھی تو نہیں بچتا۔

(۴) خاصی بلندی' آکسیجن نقاب اور ارتفاع پیما: جوں جوں ہم سطح سمندر سے اوپر پہنچتے جاتے ہیں تو ہوائی دباؤ کم ہوتا جاتا ہے اور ہم بے قراری محسوس کرتے ہیں۔ جوں جوں ہم بلندی پر چلے جائیں تو بیرونی ہوا ہمارے جسموں پر کم دباؤ ڈالتی ہے اور اندرونی اور بیرونی دباؤ کے درمیان توازن درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انتہائی بلندی پر ہوا کے چند چھوٹے سے ذرّات (Molecules) ہوتے ہیں اور یہ اکٹھے ہو کر بھی کم دباؤ ڈالتے ہیں۔ اِسی وجہ سے کمرشل ایئر لائنز کے پائلٹ جہاز کو آہستہ آہستہ اوپر کو لے جاتے ہیں تاکہ وہ اپنے مسافروں کو خاصا وقت دیں کہ وہ بغیر کسی تکلیف کے ہوا کے کم دباؤ کے ساتھ موافقت اور ربط پیدا کر سکیں۔ مزید برآں اِس تکلیف دہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے مسافروں کو آکسیجن نقاب (Oxygen Mask) مہیا کئے جاتے ہیں۔

زیریں فضا میں آکسیجن (O_2) پائی جاتی ہے جو عملِ تنفس (سانس لینے) کے ذریعے تمام حیوانی زندگی کے لئے منبعِ حیات ہے۔ اوزون (O_3) جو ایک زہریلی اور انتہائی بدبودار گیس ہے' فضا کے انتہائی بلند طبقے میں پائی جاتی ہے۔ اگر انسان کو آکسیجن کی بجائے اوزون بطور سانس لینا ہوتی' تو کوئی بھی انسان باقی نہ بچتا۔

صدیوں پہلے اُس اُجڈ غیر سائنسی دَور میں قرآنِ حکیم نے انتہائی بلندی پر آکسیجن کی کمی کو بیان کر دیا تھا:۔

وَمَنْ يُّرِدْ أَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ (الانعام:۱۲۵)

''اور جسے گمراہ کرنے کا وہ ارادہ کر لیتا ہے تو اُس کے سینے کو وہ تنگ اور بہت تنگ کر دیتا ہے جیسے اُسے آسمان میں چڑھنا پڑ رہا ہو۔''

ارتفاع پیما (Altimeter) ایسا آلہ ہے جسے بالخصوص ہوائی جہاز میں لگایا جاتا ہے جو سطح سمندر سے بلندی ظاہر کرتا

ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ارتفاع پیما (Altimeter) کی ایجاد سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت ۱۲۵ میں بیان کردہ سائنسی حقیقت کی رہینِ منت ہے۔

(۵) ارتقائی (اونچائی کا) مرض (Aeroembolism .. Altitude Sickness) بیس ہزار سے تیس ہزار فٹ کی بلندی چڑھنے سے ہوائی دباؤ میں نمایاں کمی واقع ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال انسانی جسم میں وہی کیفیت پیدا کرتی ہے جو اُس شخص کے ساتھ ہوتی ہے جو گہرے سمندر میں غوطے کھا رہا ہو اور جس صورت کو اصطلاح میں (Bends) کہا جاتا ہے۔ ہوابازی کی اصطلاح میں اس صورت کو Aeroembolism کہا جاتا ہے۔

ایک سائنسی ذہن میں لازمی طور پر سورۃ الانعام کی آیت ۱۲۵ کے آخری حصے سے Aeroembolism کا خیال آئے گا جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہوا: كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ o
''اِس طرح اللہ تعالیٰ اُن لوگوں پر گندگی (محرومی اور بے توفیقی) ڈالے رکھتا ہے جو ایمان نہیں لاتے۔''

دل کی تنگی اور سختی کفار کی علامت ہے۔ مؤمن رحم دل بھی ہوتا ہے اور وسیع القلب بھی۔ یہ نکتہ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ سے حاصل ہوا۔ جس قدر ایمان قوی' اُسی قدر دل وسیع۔ وسعتِ قلب کی زندہ جاوید تفسیر جناب یوسف علیہ السلام کا دشمن بھائیوں کو معاف فرما دینا اور ختمی مرتبت نبیِ اکرم ﷺ کا جنابِ ابوسفیان' ہندہ' وحشی اور عکرمہ بن ابوجہل کو بخش دینا ہے۔ یونہی کفر جس قدر سخت ہو' اُسی قدر دل تنگ اور سخت ہوتا ہے اور اس کی مثالیں فرعون اور ابوجہل کی زندگیاں ہیں۔ (تفسیر نعیمی' جزء ۸)

(۶) جہاز کا نیچے اترنا اور اوپر کو چڑھنا: اسے بھی اشارۃً ذیل کی آیت سے سمجھا جاسکتا ہے:۔
يَعْلَمُ ـــــ مَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا (ألحديد: ۴)
''وہ جانتا ہے۔۔۔اُس چیز کو بھی جو آسمان سے اترتی ہے اور اُسے بھی جو اُس میں چڑھتی ہے۔''

''جو چیز آسمان سے اترتی ہے'' اگرچہ معروف معنیٰ میں اِس سے مراد فرشتے' وحی' احکامِ الٰہی' رزق' بارش وغیرہ ہیں لیکن جدید دَور میں اس اُترنے میں ہوائی جہاز کا لینڈ کرنا بھی شامل ہے کیونکہ وہ بھی تو بلندی (آسمان) سے نیچے کو اُترتا ہے۔ اسی طرح ''جو چیز آسمان کو چڑھتی ہے'' اگرچہ معروف معنیٰ میں اِس سے فرشتے' اعمالِ حسنۂ اہلِ ایمان' ارواح وغیرہ مراد ہیں لیکن دَورِ جدید میں اس اوپر چڑھنے میں طیارے کا (Take off) کرنا اور اوپر کو بلند ہونا بھی شامل ہے۔

(BIBLIOGRAPHY)مراجع ومصادر

1. Abdul Maalik — Scientific Work of Imam Ahmad Raza
2. Ager, A. Derck — The Nature of the Fossil Record.
3. Ameer Ali, Sayyid — Muhammadan Law.
4. Arnold, Matthew — Culture and Anarchy.
5. Arnold, T. W. — The Preaching of Islam.
6. Barrow, John D. — The Anthropic Cosmological Principle.
7. Bergil, Mehmet Suat — The Golden Ratio in Nature/Science/ Art... 1993 edn.
8. Bosworth, Smith — Muhammad and Muhammadanism
9. Branely, Franklin — Colours from Rainbows to Lasers.
10. Briffault, Robert — The Making of Humanity.
11. Bucaille, Maurice — The Bible, Qur'an and Science.
12. Cobbald, Lady — Pilgrimage to Mecca.
13. Corey, A. Michael — God and the New Cosmology : The Anthropic Design Argument : Maryland, 1993.
14. Darwin, Charles — Descent of Man ;
15. Darwin, Charles — Life and Letters ;
16. Darwin, Charles — The Origin of Species by Means of Natural Selection.
17. Denton, Michael — Nature's Destiny.
18. Fatehullah Khan (Engr.) — God, Universe and Man – the Holy Qur'an and the Hereafter. Lahore, 1982.
19. Foster — Text-book of Physiology.
20. France, W. A. — The Mosque – Mirror of Islam.
21. Futuyma, Douglas — Science on Trial.
22. Fyfe — The Illusion of National Character.
23. Gibbon — Decline and Fall of the Roman Empire.
24. Greenstein, George — The Symbiotic Universe
25. Greenwood — Biology and Christian Belief.
26. Haroon Yahya — Allah's Artistry in Colour : Istanbul 2000.
27. Haroon Yahya — Islam and Karma : Istanbul 2002.
28. Haroon Yahya — Miracles in Our Bodies : India, 2004.
29. Haroon Yahya — The Miracle in the Atom : Istanbul 2001.
30. Haroon Yahya — The Miracle of Creation in the Ant : New Delhi, 2004.
31. Haroon Yahya — The Miracle of Creation in DNA : New Delhi, 2003.
32. Haroon Yahya — The Miracle of Creation in Plants : New Delhi, 2002.
33. Hammerton — Universal History of the World.
34. Haux, J. — Nine Tenalizing Mysteries of Nature.
35. Hitti, Philip, K. — History of the Arabs.
36. Ftoyle, Fred — Religion and the Scientists.
37. Ftoyle, Fred — The Universe : Past and Present Reflections.
38 Hugh, Ross — Design and the Anthropic Principle : Reasons to Believe.
39. Hugh, Ross — Revolt against Reason.
40. Huxley — Collected Essays.

41. Iqbal, Muhammad, Dr.	Reconstruction of Religious Thought in Islam.
42. Jill, M. Phillips	Birthday Secrets.
43. Josephus	Antiquities of the Jews.
44. Langdon, Dr.	Semitic Mythology.
45. Lecky	History of European Morals.
46. Lipson, H.S.	Evolution Trends in Plants.
47. Lovelock, James, J.	Gia : Oxford, 1987.
48. Mannan, M. A.	Islamic Economics : Theory and Practice : A Comparative Study : Lahore, 1991.
49. Marston, Charles, Sir	The Bible is True.
50. Mercier	Conduct and Its Disorders.
51. Moore	A Scientist's Interpretation of Reference to Embryology in the Qur'an.
52. Muir, William, Sir	Mahomet and Islam
53. Murchie, Guy	The Seven Mysteries of Life.
54. Mustafa,Saba	Some Glittering Aspects of the Islamic Civilization.
55. Nemilov	Biological Tragedy of Woman.
56. Nurbaki, Haluk, Dr.	Verses from the Holy Koran and the Facts of Science : Karachi, 1997.
57. Patterson, Collin	Cladistics : 1982 Edn.
58. Paul, Devis, Dr.	Nature's Destiny : How the laws of Biology Reveal Purpose in the Universe.
59. Paul, Devis, Dr.	The Accidental Universe.
60. Ranganathen, B. G.	Origins.
61. Rashid A. Seyal, Dr.	Divine Philosophy and Modern Day Science.
62. Rushi	On Genesis.
63. Sarich	Cladistics
64. Sarton, George	Introduction to the History of Science.
65. Saud, Muhammad	Islam and Evolution of Science.
66. Shakespeare, William	Hamlet (A Play)
67. Shakespeare, William	Macbeth (A Play)
68. Siever, R., F. Press	Earth.
69. Tahir-ul Qadri, Prof. Dr.	Creation of Man.
70. Taqi Usmani, Mufti	Our Socio-Economic Order.
71. Taylor, Lionel, J.	The Stages of Human Life.
72. Wahid Bakhsh Rabbani, Captain	Islamic Sufism : Lahore, January 2005.
73. Watt, Montgomery	A History of Islamic Spain.
74. Weibel, E. R.	Morphometry of the Human Lung : 1963 Edn.
75. Wethbrill, George, W.	How Special is Jupiter!
76. Wickramasingh, C.	Evolution from Space : New York : 1984.
77. Yaldrim, Cemal	The Theory of Evolution and Bigotry (Eng. Trans.)
78. Yusuf, Muhammad, Mirza	A-One Comprehensive General Knowledge.
79. Zaki Ali, Dr.	Islam in the World.
80. Zakir Naik, Dr.	The Qur'an and Modern Science : LHR, 2006.

Encyclopaedias

1. Academic American Encyclopedia : USA, 1981.
2. Cheyne and Black's Encyclopaedia Biblica.
3. Encyclopedia Americana : USA, 1982.
4. Encyclopaedia Britannica : New York, 15th edn., 1994.
5. Encyclopaedia of Seerah.
6. Encyclopaedia of Spirituality – Charles Gai Eaton.
7. Encyclopedia of the Qur'an : Leiden, 2003, 2004, 2005.
8. Everyman Encyclopaedia
9. Funk & Wagnalls New Encyclopedia of Science.
10. Grolier Academic Encyclopedia : USA 1987.
11. Hastings' Encyclopaedia of Religion and Ethics.
12. Hutchinson 20th Century Encyclopedia, 7th edn.
13. The Concise Encyclopaedia of Islam.
14. McGraw-Hill Encyclopedia of Science and Technology : Phillipines, 1978.
15. The Encyclopaedia of Religion – Mircea Eliade.
16. The Jewish Encyclopaedia.
17. The New Encyclopaedia Britannica.
18. Valentine's One-Volume Jewish Encyclopaedia.

۱۹۔ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ (انسائیکلوپیڈیا) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

Dictionaries

Dictionary of Literary Terms and Literary Theory --- J. A. Cuddon : Penguin Books, 1999.

2. New Catholic Dictionary : Pallen and Wynne, New York.
3. Oxford Advanced Learner's Dictionary : New International Students' 5th Edn., 1996.
4. Hamlyn Encyclopaedic World Dictionary : UK. 1979.
5. Hastings' Dictionary of the Bible.
6. Dictionary and Glossary of the Koran --- John Penrice : NY, 1971.
7. The Penguin Dictionary of Politics.:.. David Robertson
8. Edward Lane's Arabic-English Lexicon (8 parts).
9. Longman Dictionary of Contemporary Thought.
10. The Shorter Oxford Dictionary.

(۱۱) الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیۃ: ابونصر اسمٰعیل بن حماد الجوہری (م ۱۰۰۵ھ)، دار العلم للملایین بیروت ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۶ء

(۱۲) القاموس المحیط: مجد الدین فیروز آبادی، مطبعۃ دار المامون مصر ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء

(۱۳) القاموس العصری (عربی انگریزی۔۔انگریزی عربی): الیاس انطون

(۱۴) لسان العرب: ابن منظور محمد بن مکرم الافریقی (۶۳۰۔۷۱۱ھ/۱۲۳۲۔۱۳۱۱ء) نشر ادب الحوزۃ قم ایران، ۱۴۰۵ء

(۱۵) مفردات القرآن: امام راغب اصفہانی (م ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء) دارالقلم طبع اوّل ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء)
(۱۶) تاج العروس من شرح جواھر القاموس: (شرح القاموس المحیط للفیروزآبادی): محمد مرتضی الزّبیدی، مطبعۃ الخیریۃ ۱۸۸۸ء
(۱۷) المنجد فی الادب والعلوم: لویس معلوف الیسوعی، المطبعۃ الکاثولیکیۃ بیروت، طبع پنجم ۱۹۲۷ء
(۱۸) معجم مقاییس اللغۃ: ابن فارس
(۱۹) تاج العروس: الزجاج
(۲۰) کتاب العین: خلیل احمد نحوی بصری

Journals, The Dailies, Weeklies & Monthlies

1. Engineering and Science : November, 1981
2. Journal of Molecular Evolution.
3. Scientific American : 1989.
4. Islamic Culture : October, 1940.
5. Journal of Scientific and Technology.
6. Reader's Digest, October, 1960.
7. The Daily "Dawn" Karachi, 3rd March, 1972.

INTERNETS

1. http://www.answers.com/topic/aesthetics?method.
2. http://www.ips.net/by grace/index. intml.

Translations (of the Holy Qur'an)

1. Marmaduke Pickthall : Taj Company Limited.
2. N. J. Dawood : Warlingham, April, 1955.

Tafsir Literature

1. Abdul Majid Daryabadi, Maulana (Eng.) Vols. 1, 2 : Taj Company Ltd., Lahore, 197
2. Abdullah Yusuf Ali : Translation and Commentary on the Qur'an : Maryland, 1983.
(۳) جامع البیان: امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۱ھ، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۴) تفسیر القرآن العزیز: امام عبدالرحمن بن محمد ادریس بن ابی حاتم رازی، متوفی ۳۲۷ھ، مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ
(۵) احکام القرآن: امام ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی، متوفی ۳۷۰ھ، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ
(۶) الجامع لاحکام القرآن: علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی، متوفی ۶۶۸ھ، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۷) معالم التنزیل: امام ابومحمد الحسین بن مسعود الفرّاء البغوی، متوفی ۵۱۶ھ، مطبوعہ بیروت ۱۴۲۰ھ۔

لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے تو یہ اسلام کی عظمت و شان وشوکت کے لئے ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نفیس لباس پہنے ہوئے لوگوں کے جلوس میں عید نماز کو تشریف لے جاتے تھے۔ خوشامدیوں کی بجائے وہ اپنے گرد اُن لوگوں کو اکٹھا کرتا ہے جو کلمۃ اللہ کی بالا دستی کے لئے ویسی ہی لگن رکھتے ہوں اور جو خلوصِ دل سے اچھائی اور نیکی کی تعریف کریں اور برائی کے خلاف احتجاج میں پس وپیش نہ کریں۔ غیبت کی تباہ کن خوشی حاصل کرنے کی بجائے وہ اپنے آپ کو اُن لوگوں کو تنبیہ کرنے کی حد تک محدود رکھتا ہے جو کسی بُرے شخص کے ہاتھوں خطرے سے دوچار ہونے والے ہوں۔ اگر یہ خطرہ موجود نہ بھی ہو تو وہ کسی ایسے آدمی کی خوبیاں بیان کرے گا جس کے بارے میں بُری بات کہی جا رہی ہو یا اُس کے عیوب کی پردہ پوشی کے لئے کم از کم خاموش رہے گا۔ نفس کو اچھائی اور نیکی کی طرف پلٹنے کا یہ عمل (تقلیب) ایک ایسی اخلاقی عظمت وشان والا ہے جس کی مثال نبی مکرم ﷺ نے پیش کی ہے۔ یہ ایک ایسا مشکل کام ہے جس کے کئی درجات اور مراحل ہیں اور اُس وقت تک اِس کا حصول ممکن نہیں جب تک اندرونی جہدِ مسلسل نہ ہو۔ یہ روح کی خدا تک بہ تدریج رفعت (پہنچ) کے لئے ابتدائیہ ہے۔ تو انسان کو جو اپنی ننھی سی سلطنت کا مالک ہے' دو دُنیاؤں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے: ایک وہ جو روحانی ہے اور خدا کی طرف لے جاتی ہے اور دوسری وہ جو مادّی ہے اور نفسِ امّارہ کی طرف لے جاتی ہے۔ اُسے منصفی کے ساتھ ایسی راہ تلاش کرنی ہے جس میں دونوں کے حقوق برقرار رہیں۔'' ("Islamic Sufism" pp. 180-184)

انسانی جسم کی ساخت میں نعمتِ الٰہیہ کی بے پایاں عظمت کا حوالہ دیتے ہوئے جسٹس کرم شاہ الازہری نے اپنے احساسات کا یوں اظہار کیا ہے:۔

''انسان کو مٹی سے بنایا۔ وہ مٹی محض بے جان ہے۔ دیکھنے' سننے کی صلاحیت سے محروم' عقل وفہم سے یکسر عاری۔ ایسی مٹی سے انسان کو بنایا اور اُسے احسن تقویم کے شرف سے نوازا۔ چاند کی چاندنی اُس کے نورِ جمال کے سامنے شرمندہ' سروِ چمن اُس کی قامتِ زیبا کے آگے دم بخود مُہر بلب' غنچوں کا تبسم اُس کی مسکراہٹ پر قربان' پھولوں کی تازگی اور لطافت اُس کی رعنائی و دلربائی پر نثار' غرضیکہ حُسن و جمال کے سارے مظہر اِس آئینہ انوارِ الٰہی کے سامنے سرافگندہ ہیں۔ اُس کی عقل و فہم کی جولانیوں کے سامنے اَفلاک کی بلندیاں سرنگوں اور فضا کی وسعتیں سمٹ کر رہ گئی ہیں۔ تم ہی بتاؤ جس ربِّ قدیر نے اُس بے جان مٹی سے ایسا شاہکار تخلیق فرمایا' اُس کی عظمتوں کا کیا کہنا!''

(ضیاء القرآن' ج ۳' ص ۵۶۷)

اللہ تعالیٰ کی بے پناہ نعمتوں میں حُسنِ صورت کے علاوہ جو چیز انسان کو دوسری مخلوقات پر برتری دلاتی ہے' وہ اُس کا فہم' دماغی صلاحیت اور وہ عظیم الشان خوبیاں ہیں جو اُسے اِس کرّۂ خاکی پر اللہ کا نائب بناتی ہیں۔ قرآن مجید اِس صلاحیت کو کئی مقامات پر اَفئِدَۃ (واحد فُؤَاد) کا نام دیتا ہے (ملاحظہ ہو آیت ۷۸ سورۃ

(۸) الکشاف : علامہ محمود بن عمر زمخشری' متوفّٰی ۵۳۸ھ' مطبوعہ دار احیاء التراث العربی بیروت ۱۴۱۷ھ۔
(۹) زاد المسیر فی علم التفسیر : علامہ ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی بن محمد جوزی' متوفّٰی ۵۹۷ھ' بیروت۔
(۱۰) تفسیر کبیر : امام فخر الدین محمد بن ضیاء الدین رازی' متوفّٰی ۶۰۶ھ' مطبوعہ بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۱۱) انوار التنزیل : قاضی ابوالخیر عبداللہ بن عمر بیضاوی شیرازی شافعی' متوفّٰی ۶۸۵ھ' مطبوعہ مصر۔
(۱۲) مدارک التنزیل : علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد نسفی' متوفّٰی ۷۱۰ھ' مطبوعہ دار الکتب العربیہ' پشاور۔
(۱۳) تفسیر القرآن العظیم : حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی' متوفّٰی ۷۷۴ھ۔
(۱۴) الدُّرُّ المنثور : حافظ جلال الدین السیوطی' متوفّٰی ۹۱۱ھ' مطبوعہ مکتبہ آیت اللہ العظمٰی ایران' ۱۴۲۱ھ۔
(۱۵) جلالین : حافظ جلال الدین السیوطی' متوفّٰی ۹۱۱ھ' مطبوعہ دار الکتب العلمیہ' بیروت۔
(۱۶) رُوح البیان : علامہ اسماعیل حقی حنفی' متوفّٰی ۱۱۳۷ھ' مطبوعہ مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ' ۱۴۲۱ھ۔
(۱۷) تفسیر مظہری : قاضی ثناء اللہ پانی پتی' متوفّٰی ۱۲۲۵ھ' مطبوعہ بلوچستان بک ڈپو' کوئٹہ۔
(۱۸) تفسیر عزیزی : شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی' متوفّٰی ۱۲۳۹ھ' مطبوعہ مطبع فاروقی دہلی۔
(۱۹) فتح القدیر : شیخ محمد بن علی شوکانی' متوفّٰی ۱۲۵۰ھ' مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۴۱۸ھ۔
(۲۰) رُوح المعانی : علامہ ابوالفضل سید محمود آلوسی' متوفّٰی ۱۲۷۰ھ' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۷ھ۔
(۲۱) خزائن العرفان : سید محمد نعیم الدین مراد آبادی' متوفّٰی ۱۳۶۷ھ' مطبوعہ تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور۔
(۲۲) نور العرفان : مفتی احمد یار خان نعیمی متوفّٰی ۱۳۹۱ھ' مطبوعہ دار الکتب الاسلامیہ گجرات۔
(۲۳) معارف القرآن : مفتی محمد شفیع' متوفّٰی ۱۳۹۶ھ' مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی' ۱۳۹۷ھ۔
(۲۴) تفہیم القرآن : سید ابوالاعلیٰ مودودی' متوفّٰی ۱۳۹۹ھ' مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور۔
(۲۵) التّبیان : علامہ سید احمد سعید کاظمی' متوفّٰی ۱۴۰۶ھ' مطبوعہ کاظمی پبلی کیشنز' ملتان۔
(۲۶) ضیاء القرآن : جسٹس پیر محمد کرم شاہ الازہری' مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور۔
(۲۷) تدبّرِ قرآن : امین احسن اصلاحی' مطبوعہ فاران فاؤنڈیشن' لاہور۔
(۲۸) تفسیر منیر : ڈاکٹر وھبہ زحیلی' مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۱۲ھ۔
(۲۹) تبیان القرآن : علامہ غلام رسول سعیدی' رومی پبلی کیشنز اینڈ پرنٹرز' لاہور ۱۴۳۰ھ۔
(۳۰) معانی القرآن واعرابہ : الزجاج

کتب علومِ قرآن

(۱) الاتقان فی علوم القرآن : علامہ جلال الدین السیوطی، متوفّی ۹۱۱ھ، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور۔
(۲) البرهان فی علوم القرآن : علامہ بدرالدین محمد بن عبداللہ زرکشی، متوفّی ۷۹۴ھ، مطبوعہ بیروت۔

کتب احادیث

(۱) مؤطا امام مالک : امام مالک بن اَنس اصبحی، متوفّی ۱۷۹ھ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۰۹ھ۔
(۲) المسند شافعی : امام محمد بن ادریس شافعی، متوفّی ۲۰۴ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۰ھ۔
(۳) المصنف عبدالرزاق : امام عبدالرزاق بن ہمام صنعانی، متوفّی ۲۱۱ھ، مکتبہ اسلامی بیروت ۱۳۹۰ھ۔
(۴) مسند امام احمد بن حنبل : متوفّی ۲۴۱ھ، مطبوعہ مکتب اسلامی بیروت ۱۳۹۸ھ۔
(۵) صحیح بخاری : امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری، متوفّی ۲۵۶ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۲ھ۔
(۶) صحیح مسلم : امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیری، متوفّی ۲۶۱ھ، مکتبہ نزار مصطفی الباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۷ھ۔
(۷) سنن ابن ماجہ : امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہ، متوفّی ۲۷۳ھ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۸) سنن ابوداؤد : امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی، متوفّی ۲۷۵ھ، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۹) سنن ترمذی : امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفّی ۲۷۹ھ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۱۰) شمائل محمدیہ : امام ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، متوفّی ۲۷۹ھ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۴۱۴ھ۔
(۱۱) سنن نسائی : امام ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب نسائی، متوفّی ۳۰۳ھ، مطبوعہ دارالمعرفہ بیروت، ۱۴۱۲ھ۔
(۱۲) مسند ابویعلی : امام احمد بن علی المثنی التمیمی، متوفّی ۳۰۷ھ، مطبوعہ دارالمامون التراث بیروت ۱۴۰۴ھ۔
(۱۳) المعجم الصغیر : امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، متوفّی ۳۶۰ھ، مطبوعہ مکتبہ سلفیہ مدینہ منورہ ۱۳۸۸ھ
(۱۴) المعجم الکبیر : امام ابوالقاسم سلیمان بن احمد الطبرانی، متوفّی ۳۶۰ھ، مطبوعہ داراحیاء التراث العربی بیروت
(۱۵) المستدرک : امام ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، متوفّی ۴۰۵ھ، مطبوعہ دارالباز مکہ مکرمہ ۱۴۱۸ھ
(۱۶) حلیۃ الاولیاء : امام ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، متوفّی ۴۳۰ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۸ھ
(۱۷) سنن کبریٰ : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، متوفّی ۴۵۸ھ، مطبوعہ نشر السنۃ، ملتان۔
(۱۸) شعب الایمان : امام ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، متوفّی ۴۵۸ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۰۱ھ۔
(۱۹) الترغیب والترہیب : امام زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذری، متوفّی ۶۵۶ھ، قاہرہ ۱۴۰۷ھ۔
(۲۰) مشکوٰۃ : امام ولی الدین تبریزی، متوفّی ۷۴۲ھ، مطبوعہ اصح المطابع دہلی۔
(۲۱) کنز العمال : علامہ علی متقی بن حسام الدین ہندی برہان پوری، متوفّی ۹۷۵ھ، بیروت۔

کتب شروح حدیث

(۱) فتح الباری : حافظ شہاب الدین احمد بن علی بن حجر عسقلانی، متوفی ۸۵۲ھ، مطبوعہ لاہور۔
(۲) عمدۃ القاری : حافظ بدر الدین محمود بن احمد عینی، متوفی ۸۵۵ھ، مطبوعہ مصر ۱۴۲۱ھ۔
(۳) ارشاد الساری : علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، مطبوعہ مطبعہ میمنہ مصر، ۱۳۰۶ھ۔
(۴) مرقات : علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان۔
(۵) التعلیق الصبیح : شیخ محمد ادریس کاندھلوی، متوفی ۱۳۹۴ھ، مطبوعہ مکتبہ عثمانیہ لاہور۔
(۶) نزہۃ القاری (شرح صحیح بخاری) : مولانا محمد شریف الحق امجدی متوفی ۱۴۲۱ھ، مطبوعہ فرید بک سٹال لاہور، ۱۴۲۱ھ۔

کتب فقہ

(۱) المبسوط: شمس الائمہ محمد بن احمد سرخسی، متوفی ۴۸۳ھ، مطبوعہ دار المعرفہ بیروت ۱۳۹۸ھ۔
(۲) فتاویٰ قاضی خاں : علامہ حسین بن منصور اوزجندی، متوفی ۵۹۲ھ، مطبوعہ مطبعہ کبریٰ بولاق مصر ۱۳۱۰ھ۔
(۳) ھدایہ اولین وآخرین: علامہ ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی، متوفی ۵۹۳ھ، مطبوعہ شرکت علمیہ ملتان۔
(۴) الحاوی للفتاویٰ : علامہ جلال الدین سیوطی، متوفی ۹۱۱ھ، مطبوعہ مکتبہ نوریہ رضویہ، فیصل آباد۔
(۵) المغنی: علامہ موفق الدین عبداللہ بن احمد بن قدامہ، متوفی ۶۲۰ھ، مطبوعہ دار الفکر بیروت ۱۴۰۵ھ۔
(۶) الدرّ المختار: علامہ علاء الدین محمد بن علی بن محمد حصکفی، متوفی ۱۰۸۸ھ، مطبوعہ بیروت۔
(۷) فتاویٰ عالمگیری : ملا نظام الدین، متوفی ۱۱۶۱ھ، مطبوعہ مطبع کبریٰ امیریہ بولاق مصر، ۱۳۱۰ھ۔
(۸) ردّ المختار: علامہ سید محمد امین ابن عابدین شامی، متوفی ۱۲۵۲ھ، مطبوعہ بیروت ۱۴۱۹ھ۔
(۹) بہارِ شریعت : علامہ امجد علی، متوفی ۱۳۷۶ھ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی۔
(۱۰) فتاویٰ نوریہ: علامہ نور اللہ نعیمی، متوفی ۱۴۰۳ھ، مطبوعہ کمبائن پرنٹرز لاہور، ۱۹۸۳ء۔

کتب متفرقہ

(۱) احیاء علوم الدین : امام محمد بن محمد غزالی، متوفی ۵۰۵ھ، مطبوعہ دار الخیر بیروت ۱۴۱۳ھ۔
(۲) لوائح : عبدالرحمن جامی
(۳) زاد المعاد: شیخ شمس الدین محمد بن ابی بکر ابن القیم الجوزی، متوفی ۷۵۱ھ، مطبوعہ بیروت۔
(۴) کشف الظنون: علامہ مصطفی بن عبداللہ الشہیر بحاجی خلیفہ، مطبوعہ تہران، ۱۳۷۸ھ۔

(۵) الحِسبۃ فی الاسلام : ابنِ تیمیہ
(۶) معجم البلدان : یاقوت حموی
(۷) اخبارِ مکہ : الازرقی
(۸) الاحکام السلطانیہ : الماوردی
(۹) الفہرست : ابن ندیم
(۱۰) الحلال والحرام فی الاسلام : یوسف القرضاوی (انگریزی ترجمہ)
(۱۱) حجۃ اللہ البالغۃ : شاہ ولی اللہ محدث دہلوی۔
(۱۲) حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ : ابومحمد زہرہ
(۱۳) ہدایۃ العارفین : اسماعیل باشا البغدادی۔
(۱۴) قواعد التدبر الامثل : عبدالرحمن حسن
(۱۵) الشہاب الثاقب : شبیر احمد عثمانی
(۱۶) الفاروق : شبلی نعمانی
(۱۷) المامون : شبلی نعمانی
(۱۸) الملفوظ : امام احمد رضا خاں
(۱۹) بحثِ نجوم : عبدالرحمن صوفی
(۲۰) مقالاتِ سعیدی : علامہ غلام رسول سعیدی
(۲۱) قرآن اور جدید سائنس : ڈاکٹر محمد عبدالکریم ذاکر نائیک
(۲۲) قرآن اور علمِ جدید : ڈاکٹر محمد رفیع الدین
(۲۳) قرآن کے جدید سائنسی انکشافات : ڈاکٹر فضل کریم

کتب تاریخ، سیرت وفضائل

(۱) السیرۃ النبویۃ : امام عبدالملک بن ہشام، متوفی ۲۱۳ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۵ھ۔
(۲) تاریخ الامم والملوک : امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری، متوفی ۳۱۰ھ، مطبوعہ دارالقلم بیروت۔
(۳) الرّوض الانف : علامہ ابوالقاسم عبدالرحمن بن عبداللہ سہیلی، متوفی ۵۷۱ھ، مکتبہ فاروقیہ ملتان۔
(۴) اسد الغابہ : علامہ ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی المعروف بابن الاثیر، متوفی ۶۳۰ھ، طبع بیروت۔
(۵) البدایہ والنہایۃ : حافظ عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر شافعی، متوفی ۷۷۴ھ۔
(۶) المواہب اللدنیہ : علامہ احمد قسطلانی، متوفی ۹۱۱ھ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۴۱۶ھ۔
(۷) شرح الشفاء : علامہ علی بن سلطان محمد القاری، متوفی ۱۰۱۴ھ، مطبوعہ بیروت۔
(۸) شرح المواہب اللدنیہ : علامہ محمد عبدالباقی زُرقانی، متوفی ۱۱۲۲ھ، مطبوعہ دارالفکر بیروت ۱۳۹۳ھ۔

INDEX (General) اشاریہ (عمومی)

(قوسین کے اندر کے اعداد صفحہ نمبر کو ظاہر کرتے ہیں)

INDEX (QUR'ANIC) اشاریہ (قرآنی)

(قوسین کے اندر کے اعداد سورۃ نمبر/صفحہ نمبر کو ظاہر کرتے ہیں)

طبع اوّل : اپریل 2012ء

ملنے کے پتے :

اندرونِ ملک :

(۱) پروفیسر اشفاق احمد خان۔۵ شالیمار کالونی' عقب ٹویوٹا شوروم۔ بوسن روڈ ملتان
فون :061-6523251 موبائل : 0331-2220692
0301-7422684

(۲) ملتان کتاب گھر۔ بالمقابل گورنمنٹ کالج' بوسن روڈ ملتان
فون: 061- 6750226

(۳) مکتبہ قاسمیہ۔ کچہری روڈ' نزد چوک گھنٹہ گھر۔ ملتان
موبائل : 0300-7300097

بیرونِ ملک : پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد سلیم
drhafizsaleem@yahoo.com.uk.
Landline Tel: 0044-1628-823632

قیمت : ایک ہزار روپے (Rs. 1000/-)

النحل' آیت ۷۸ سورۃ المؤمنون' آیت ۲۳ سورۃ الملک) جس کے بدلے میں وہ ہم سے یہ توقع کرتا ہے کہ ہم اُس کے شکر گزار بنیں بہ ایں معنی کہ جتنی دماغی اور فہمی صلاحیتیں ہمیں عطا کی گئی ہیں' ہم اُنہیں اُس کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کریں۔

(۴) عالمِ نباتات (پودوں اور سبزیوں) میں حُسن : قرآن حکیم فرماتا ہے:

(۱) وَ هُوَالَّذِیٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِیَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ وَّ الزَّیۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَیۡرَ مُتَشَابِهٍ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَیَنۡعِهٖ اِنَّ فِیۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ○ (الانعام:۹۹)

(۲) وَ هُوَالَّذِیۡۤ اَنۡشَاَ جَنّٰتٍ مَّعۡرُوۡشٰتٍ وَّغَیۡرَ مَعۡرُوۡشٰتٍ وَّالنَّخۡلَ وَالزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّیۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَیۡرَ مُتَشَابِهٍ (الانعام : ۱۴۱)

(۳) وَتَرَى الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۢ بَهِیۡجٍ (الحج:۵)

(۴) وَاَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ مَا كَانَ لَكُمۡ اَنۡ تُنۡۢبِتُوۡا شَجَرَهَا (النمل:۶۰)

(i) ''اور وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر قسم کی روئیدگی کو نکالتے ہیں' پھر ہم اُس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں' پھر اس سے (خوشہ جس میں دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اُس کے گابھے سے نیچے جھکے ہوئے گچھے اور (ہم نے پیدا کئے) باغات انگور اور زیتون اور انار کے' بعض (شکل وذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ۔ پھل کے درخت کی طرف دیکھو جب وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اُس کے پکنے کو۔ بے شک اِن میں (اُس کی قدرتِ کاملہ کی) اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایماندار ہیں۔''

(ii) ''اور وہ وہی تو ہے جس نے پیدا کئے باغات' کچھ چھپروں پر چڑھائے ہوئے اور کچھ بغیر اس کے اور کھجور اور کھیتی کہ اُن کے کھانے کی چیزیں مختلف ہوتی ہیں اور زیتون اور انار باہم مشابہ بھی اور غیر مشابہ بھی۔''

(iii) ''اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک ہے' پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوش نما نباتات اُگاتی ہے۔''

(iv) ''اور اُس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا پھر اُس کے ذریعہ سے ہم نے بارونق باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ اُن کے درختوں کو اُگاؤ۔''

ترکی کے ایک ممتاز سکالر ہارون یحیٰی نے نباتاتی حُسن کے بارے میں یوں لکھا ہے:۔

''ایک لمحہ کے لئے سوچئے۔ ہم کسی ایسی دنیا میں رہ سکتے تھے جہاں نہ خوشبو ہوتی نہ ذائقہ۔ چونکہ ہمیں ذائقے اور خوشبو کا کوئی خیال ہی نہ ہوتا کہ وہ کیا ہوتے ہیں' تو ہم اس کی خواہش ہی نہ کرتے کہ

(۲۸۰) ۳۶ : ۴۰
(۲۱۷) ۵۶ : ۴۰

حٰمٓ السّجدہ (۴۱)

(۵۲) ۳ : ۴۱
(۱۲۵) ۱۰ : ۴۱
(۳۳۹) ۱۲ : ۴۱
(۴۳۱) ۲۲ : ۴۱
(۷۶) ۳۴ : ۴۱

الشّوریٰ (۴۲)

(۲۱۶) ۱۳ : ۴۲
(۲۱۵) ۱۴ : ۴۲
(۸۸) ۴۳ : ۴۲

الدُّخان (۴۴)

(۲۵۸) ۲۹ : ۴۴

الجاثیۃ (۴۵)

(۱۷۴) ۳-۵ : ۴۵
(۳۳۴) ۱۲ : ۴۵
(۳۷۲) ۱۳ : ۴۵

الاَحقاف (۴۶)

(۲۰۲) ۱۵ : ۴۶
(۴۲۵) ۲۴، ۲۵ : ۴۶

مُحمّد (۴۷)

(۲۹۶) ۱۵ : ۴۷

الحُجرات (۴۹)

(۷۶) ۱۱ : ۴۹
(۲۱۱) ۱۳ : ۴۹

قٓ (۵۰)

(۳۷۲) ۶ : ۵۰
(۵۶) ۹، ۱۰ : ۵۰
(۴۳۲) ۱۷، ۱۸ : ۵۰
(۴۳۵) ۳۵ : ۵۰

الذّاریٰت (۵۱)

(۴۰۷) ۷ : ۵۱
(۴۰۳) ۷، ۸ : ۵۱

الطُّور (۵۲)

(۳۰۵) ۳۸ : ۵۲

الرّحمٰن (۵۵)

(۳۷) ۷، ۸ : ۵۵
(۱۴۴) ۱۰ : ۵۵
(۱۱۱) ۱۰-۱۲ : ۵۵
(۱۹۱) ۱۴ : ۵۵
(۴۰۲) ۱۷ : ۵۵
(۳۷۹) ۳۳ : ۵۵
(۴۰۸) ۳۷ : ۵۵
(۴۶۱) ۵۴-۵۶ : ۵۵

الواقعۃ (۵۶)

(۴۶۲) ۱۵-۳۸ : ۵۶
(۱۳۸) ۲۰ : ۵۶
(۹۰) ۳۷ : ۵۶
(۳۲۰) ۶۳-۶۷ : ۵۶
(۳۲۸) ۶۸-۷۰ : ۵۶

الحدید (۵۷)

(۴۷۲) ۴ : ۵۷
(۹۱) ۱۱ : ۵۷
(۴۲) ۲۰ : ۵۷

الحشر (۵۹)

(۱۳۹) ۵ : ۵۹
(۸۷) ۹ : ۵۹

المُنافقون (۶۳)

(۴۳۰) ۱۰ : ۶۳

التّغابن (۶۴)

(۴۱) ۳ : ۶۴
(۴۳۶) ۷ : ۶۴

المُلک (۶۷)

(۹۳) ۳ : ۶۷
(۳۷۲) ۳، ۴ : ۶۷
(۳۵۶، ۳۶۴، ۳۸۱) ۵ : ۶۷
(۴۷۱) ۱۹ : ۶۷
(۳۲۹) ۳۰ : ۶۷

القلم (۶۸)

(۱۵۱) ۱۷-۳۳ : ۶۸

الحاقّۃ (۶۹)

(۴۲۶) ۶، ۷ : ۶۹

ہمیں ایسے محسوسات محسوس ہونے چاہئیں ۔تاہم ایسا نہیں ہے۔بھورے رنگ کی مٹی سے جس کی ایک خاص قسم کی خوشبو ہوتی ہے' سینکڑوں قسم کے خوشبودار اور لذیذ پھل' ہزاروں قسم کی سبزیاں اور مختلف رنگوں والے پھول نکلتے ہیں جن کی اپنی شکلیں ہوتی ہیں اور اپنی خوشبو۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ ایک طرف تو یہ ایٹم غیر معمولی طور پر اکٹھے ہو کر ایک مادّہ بناتے ہیں تو دوسری طرف ساتھ مل کر ذائقہ اور خوشبو بناتے ہیں۔اگرچہ ہم اکثر اِن باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے اور اِس طرف ہمارا خیال نہیں جاتا کہ اِن کی خوشبو اور ذائقہ آخر کیوں ہے؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہماری دنیا میں خوشگوار طور پر عظیم الشان کاریگری کے اثرات بہم پہنچاتے ہیں۔''

("The Miracle in the Atom", p. 87)

''ہر پودا اپنی ہی جنس کے کسی دوسرے پودے کی تخم ریزی کرتا ہے۔اگر پودے کا کوئی زیرہ* کسی اور قسم کے پودے کے تخم دان** پر گر جائے تو پودے کو پتہ چل جاتا ہے اور وہ اپنی ٹیوب کے ذریعے زیرہ کو بچہ دانی تک جانے نہیں دیتا۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تخم ریزی ممکن نہیں ہوتی۔''

("The Miracle of Creation in Plants" --- Harun Yahya, p. 60)

<u>پودوں میں مختلف رنگوں کا ہونا</u> : زیادہ تر پتے کلوروفل # کی وجہ سے سبز رنگ کے ہوتے ہیں۔ ہر شے جو اپنے رنگوں کو منعکس کرتی ہے' اُس کا دارومدار اُس کے صبغہ ## کے اُن چھوٹے چھوٹے ذرّات پر ہوتا ہے جو اُس میں موجود ہوتے ہیں۔ سبز پودوں میں رنگ کرنے والا بنیادی مواد کلوروفل ہوتا ہے۔اِس کے علاوہ کچھ اور مختلف قسم کے صبغے بھی ہوتے ہیں جو پودوں میں دوسرے رنگ پیدا کرتے ہیں۔

کلوروفل کے علاوہ نارنجی رنگ کے کچھ اور مواد بھی پودوں میں ہوتے ہیں۔اِن میں سے کچھ صبغے زرد رنگ کے ہوتے ہیں جو مکئی کی بالیوں' لیموں' عصائے زرّیں اور سورج مکھی کو رنگ دیتے ہیں۔ کچھ اور رنگ ہوتے ہیں جو پیلے کی بجائے سرخ زیادہ ہوتے ہیں۔یہ ہمیں چقندر' ٹماٹر' گلاب کے پھولوں اور گاجر میں نظر آتے ہیں۔<u>نارنجی رنگ ہرے پتوں میں بھی موجود ہوتا ہے۔یہ حیرت کی بات ہے کہ پتے پھر ہمیں سرخ</u>

*زیرہ (زرگل Pollen) جو پھولوں کے زرحصے سے جھڑتا ہے۔ہر اک میں ایک زواجہ ہوتا ہے جس سے مادہ بیضہ بارور ہو سکتا ہے۔

** تخم دان (Stigma) اِس میں زیرہ داخل ہو کر باروری کرتا ہے۔

یہ سبز رنگ کا مادہ ہوتا ہے جو پودے کے سبز پتوں اور نرم تنوں میں پایا جاتا ہے۔یہ مادہ شمسی توانائی کو استعمال کر کے کیمیائی توانائی میں تبدیل کرتا ہے جو خوراک کی صورت میں استعمال ہوتی ہے۔پودے کے جن حصّوں میں کلوروفل نہیں ہوتا' وہاں فوٹو سنتھسز کا عمل نہیں ہو سکتا۔
پودے اپنی خوراک جس عمل سے بناتے ہیں اُسے Photosynthesis کہتے ہیں۔(فوٹو بمعنی روشنی اور سنتھسز بمعنی بنانا)۔اِس عمل میں سبز پودے شمسی توانائی (روشنی) کی مدد سے کلوروفل کی موجودگی میں غیر نامیاتی اجزاء پانی اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو کیمیائی طور پر ملاتے ہیں جس سے نامیاتی مادہ گلوکوز بنتا ہے اور آکسیجن گیس خارج ہوتی ہے۔اِس سارے عمل میں درجہ حرارت بھی اہم کردار ادا کرتا ہے اور فوٹو سنتھسز کی رفتار پر اثر انداز ہوتا ہے۔یہ عمل صرف دن کے وقت سورج کی روشنی میں ہوتا ہے۔

##صبغہ (Pigment) حیوانی یا نباتی اصل سے حاصل کردہ رنگ ہوتا ہے مثلاً کلوروفل یا سبز مایہ۔
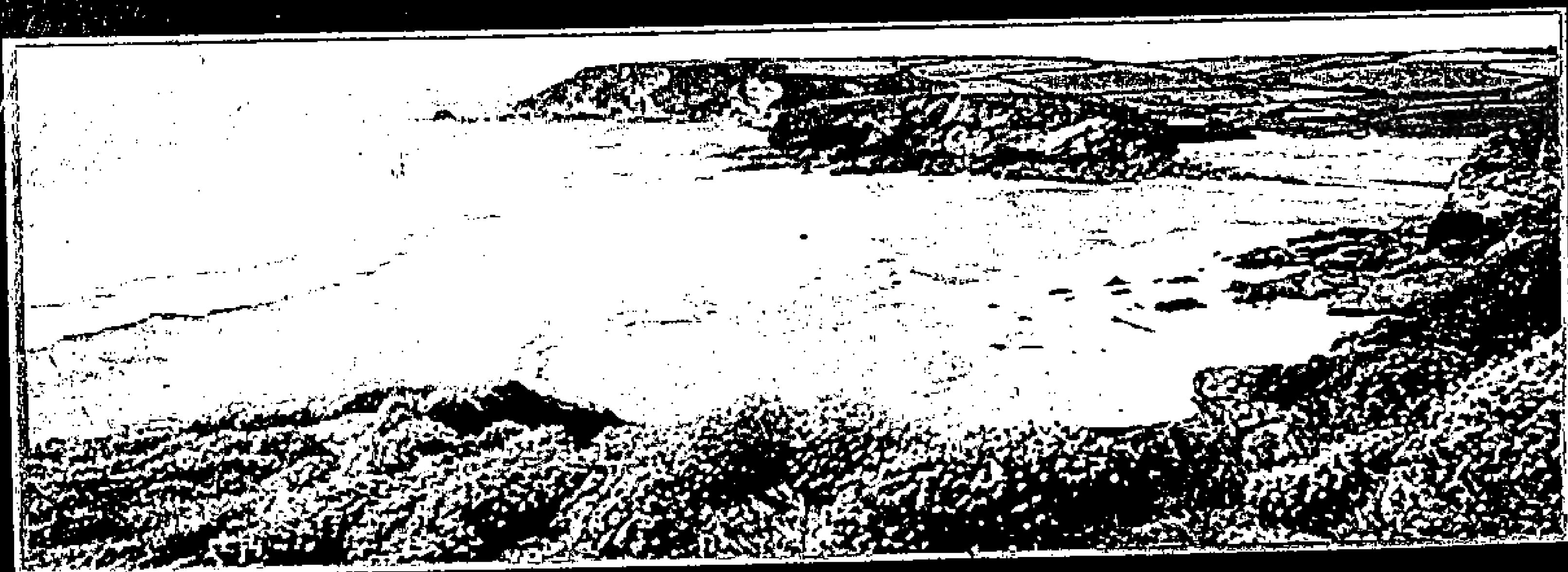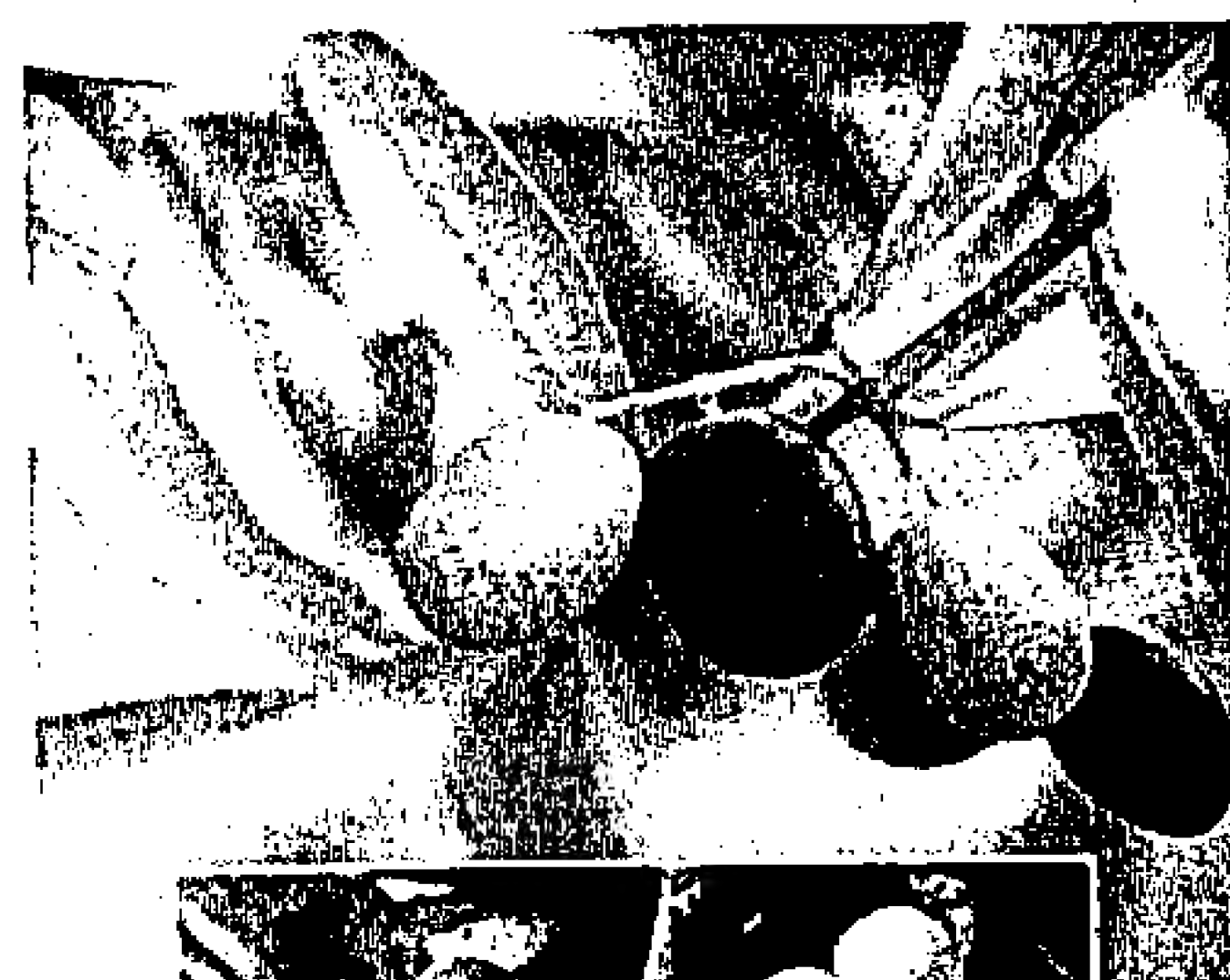
"ALLAH'S ARTISTRY IN COLOUR"............Harun Yahya
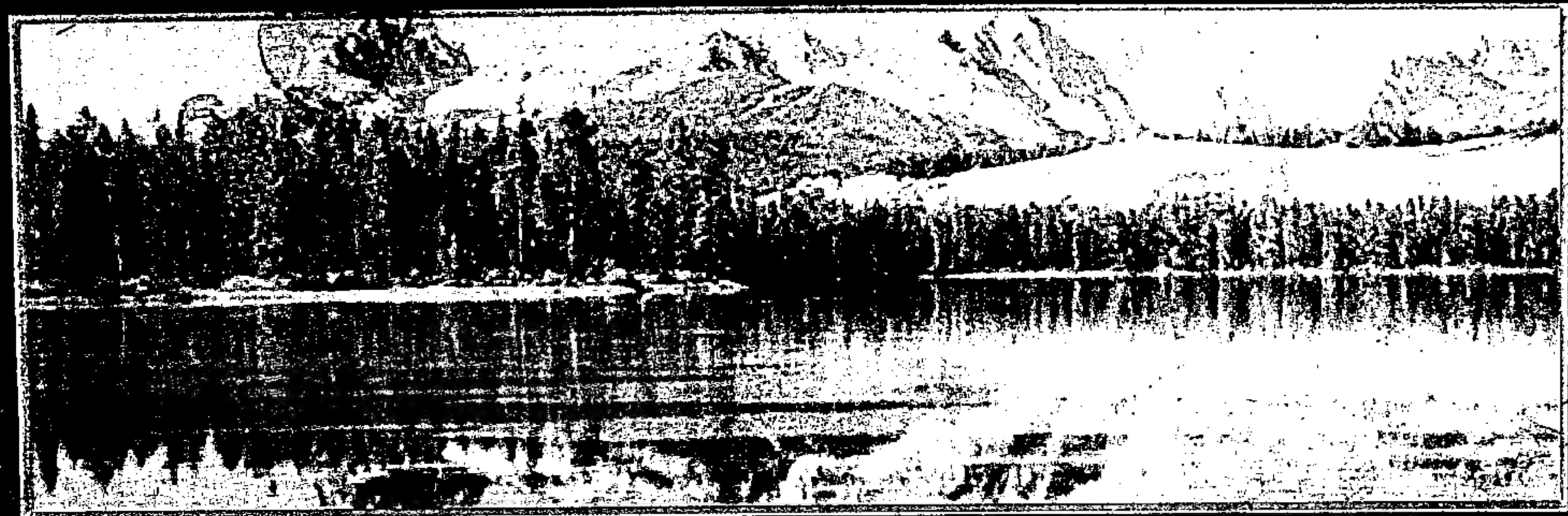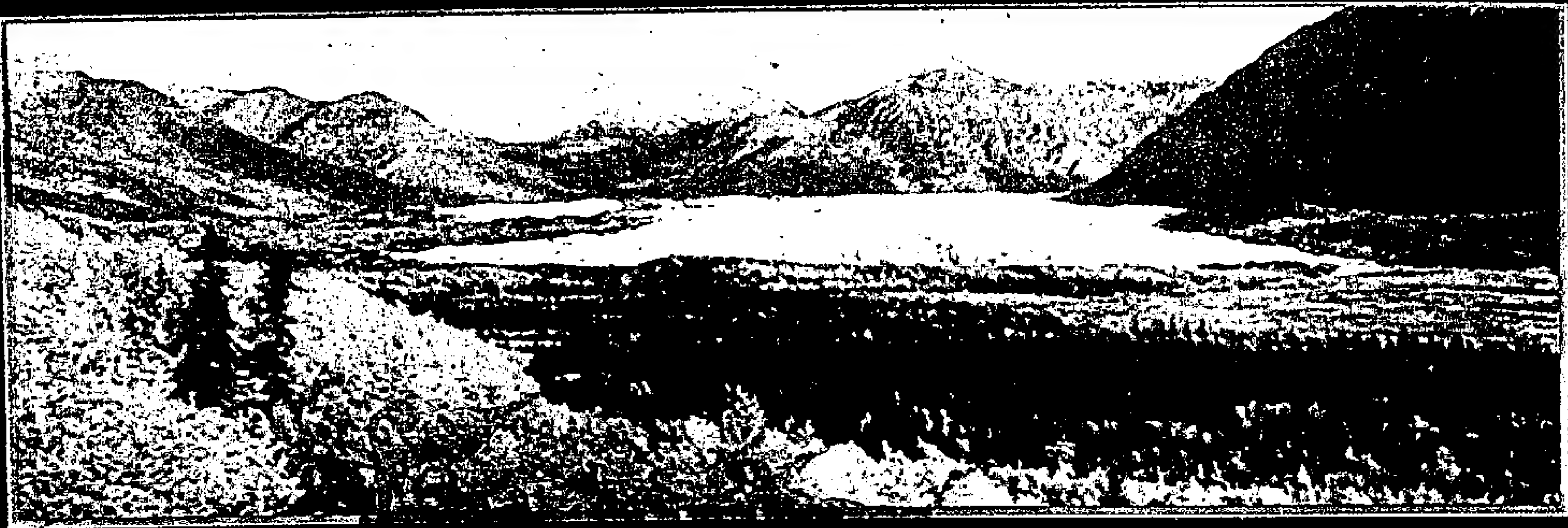
"ALLAH'S ARTISTRY IN COLOUR"............Harun Yahya

یا زرد یا نارنجی نظر کیوں نہیں آتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلوروفل کا سبز رنگ اتنا غالب ہوتا ہے کہ باقی رنگ دکھائی نہیں دیتے۔'' ("Color, From Rainbows to Lasers: --- Franklyn Branely, p. 37)

"تاہم موسمِ خزاں کے دوران تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ جیسے جیسے دن چھوٹے ہونے لگتے ہیں' پودوں میں کلوروفل بننے کا عمل کم ہونے لگتا ہے اور صبغوں کی سبز رنگ بنانے کی قوت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پتوں کے سبز رنگ دُھندلانے لگتے ہیں۔ نارنجی رنگ اب نظر آنے لگتے ہیں اور اُن سے رنگ بھورے' پیلے اور سرخ ہو جاتے ہیں۔''

''موسمِ خزاں میں ہی کچھ صبغے جنہیں Anthocyanins کہا جاتا ہے' کچھ پتوں کی بیرونی سطح پر نمودار ہوتے ہیں۔ رنگ میں یہ چمکدار سرخ اور نیلے ہوتے ہیں۔ اور اکٹھے ہو کر پتوں کو قرمزی اور ارغوانی رنگ کے کر دیتے ہیں جو ہم کبھی کبھار دیکھتے ہیں۔'' (ایضاً ص ۳۸)

''تمام رنگ بنانے کے عمل کے بارے میں معلومات اُس پودے کے DNA* میں ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے ہر پودے کی خصوصیات ایک جیسی ہی رہتی ہیں اس سے قطع نظر کہ اس کی زمین کیسی ہے۔ مثال کے طور پر دنیا میں ہر جگہ سنگترے کا رنگ' شکل اور ساخت ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ کیلے ہر جگہ پیلے ہوتے ہیں۔ ٹماٹر سرخ اور گلاب اور بنفشے کے پھول کہیں بھی ہوں' گلنار اور ایک ہی رنگ کے ہوں گے۔ دُنیا میں جہاں کہیں آپ چلے جائیں آپ کو اسٹرابری کسی اور رنگ کی نہیں ملے گی' دنیا میں ہر جگہ اسٹرابری کے ڈی۔ این۔ اے کی خصوصیات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اُن کا رنگ' خوشبو اور ذائقہ ہر جگہ ایک جیسا ملے گا۔ یہ ایک بے مثل و بے نظیر ترتیب ہے اور قطعاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سارا نظام اتفاقاً وجود میں آ گیا۔''

''دنیا بھر میں پھیلی ہوئی اِس بے مثل و بے مثال کاریگری کا مالک اللہ سبحانہٗ وتعالٰی ہے جو عقلِ کُل اور بے انتہا فراست والا ہے اور کوئی بھی چیز اُس کے دائرۂ قدرت سے باہر نہیں۔''

''کیا آپ نے کبھی سوچا کہ پودے رنگا رنگ کے کیوں ہوتے ہیں اس کے باوجود کہ وہ ایک ہی زمین میں اُگتے ہیں اور ایک ہی جیسے پانی سے اُنہیں سیراب کیا جاتا ہے۔ سورۃ الرَّعد میں اللہ تعالٰی اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ اگرچہ یہ سب ایک ہی جیسے پانی سے سیراب ہوتے ہیں لیکن اُن سے مختلف فصلیں نکل آتی ہیں:

وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ٥ (الرَّعد: ۴)

''اور زمین میں پاس پاس ٹکڑے ہیں اور انگوروں کے باغ اور کھیتیاں ہیں اور کھجوریں کچھ ایک تنے سے پھوٹتی ہیں اور کچھ الگ الگ تنوں سے۔ ایک ہی پانی سے سیراب کیا جاتا ہے (اس کے باوجود) ہم کچھ

---

* DNA=Deoxyribo-Nucleic Acid ایک وراثتی مادہ ہے جو تیزابی خاصیت رکھتا ہے۔ یہ ایک لمبا مالیکیول ہے جس کی موٹائی 2mm ہے

کو کچھ پر فضیلت دیتے ہیں ذائقہ اور بُو میں۔ بے شک ان میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں''

''جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ہماری توجہ مبذول کرائی ہے' تو آیئے اپنے اردگرد پھلوں اور سبزیوں کو دیکھ کر غور کریں کہ ایک ہی مٹی سے مختلف قسم کی فصلیں کیسے اُگتی ہیں۔ مثلاً خربوزے' تربوز' چینی کروندے' کیلے' چیری' بینگن کے پودوں' ٹماٹروں' انگوروں' آڑوؤں اور سبز پھلیوں کو دیکھئے۔ جب آپ کیلے کا گہرا پیلا چھلکا اتاریں تو اس میں سے بے مثال خوشبو والا ہلکے پیلے رنگ کا کیلا نکل آتا ہے۔ سیب کا سرخ' سبز یا زرد چمکتا ہوا چھلکا ہوتا ہے۔ انسان ان میں سے کسی کے ذائقے یا خوشبو یا اس کے میٹھے رس کی نقالی نہیں کر سکتا۔''

''پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سب پھلوں' پھولوں' درختوں اور سبزیوں کے رنگ مختلف کیوں ہوتے ہیں جبکہ یہ سب ایک ہی قسم کی خشک مٹی سے نکلتے ہیں؟ یہ اللہ کی مسلسل تخلیقی قوّت کی گواہی ہے۔ انسان کے لئے کسی نئے رنگ کا بنانا ناممکن ہے۔ جتنے بھی رنگ انسانوں نے بنائے' وہ سب اُن رنگوں کی نقالی ہیں جو پہلے ہی سے فطرت میں موجود تھے۔ بہر حال اللہ ہی خالقِ حقیقی ہے اور تمام رنگوں کا خالق بھی وہی ہے۔ اللہ جلّ جلالہٗ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ایک نام (بمطابق سورۃُ الحَشر : ۲۴) اَلْمُصَوِّر بھی ہے۔ یعنی وہ جو اپنی مخلوقات کو مختلف شکلوں میں بناتا ہے اور وہ ہر شے کو عظمتِ کمال تک پہنچاتا ہے۔''

''زمین پر تمام پودوں کی رنگتیں اور اُن کی آن بان روحِ انسانی کو متاثر کرتی ہیں۔ پھلوں اور سبزیوں کے قسم ہا قسم کے رنگ بے مثال ہیں تو دوسری جانب پھولوں اور درختوں میں بھی ہمیں ایسی ہی رنگت' آن بان اور جمالیات کی ایسی ہی جھلک نظر آتی ہے۔''

''پھولوں کے ڈیزائن اور رنگوں میں بے مثل انوکھا پن (ندرت) پایا جاتا ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں قسم کے پھولوں میں ہزاروں خصوصیات پائی جاتی ہیں اور ہر خصوصیت دوسری سے بالکل مختلف ہے۔ آج کل عطریات وخوشبویات اور اصل فطری رنگوں سے ملتے جلتے رنگ بنانے میں انسان نے ملکہ حاصل کر لیا ہے لیکن یہ سب اصل فطرتی رنگوں کی نقالی ہیں۔ مثلاً بنفشے کے پتوں کا ارغوانی رنگ' مخمل کی طرح ملائم اور اُس کے پتوں کی سطح کی ہمواری بے مثال ہوتی ہے۔ مخمل کو بنفشے کے پتوں کی ساخت کی نقالی میں بنایا جاتا ہے لیکن اُس جیسا وصف پیدا کرنا انسان کے بس میں نہیں۔''

''اِس بحث کے بعد ہم زمین کے کسی بھی پودے کا مشاہدہ کریں تو اِس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ ایک مکمل تخلیق ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ جس کا کوئی شریک نہیں' انسان کی خاطر مختلف ذائقوں' خوشبوؤں' رنگوں اور شکلوں کے پودے پیدا فرماتا ہے۔ ہم پر جو ذمّہ داری عائد ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کی پیدا کردہ نشانیوں پر غور وفکر کریں اور اُس کے شکر گزار بندے بنے رہیں۔'' ("Allah's Artisty in Colour"-- Harun Yahya, pp.93,102-03)

(۵) حیوانات کی دنیا میں حُسن: سورۃ النّحل میں ارشاد فرمایا:

(۱) وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَo وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَ حِينَ تَسْرَحُونَo وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُوا بَالِغِيهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌo وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَo (النّحل: ۵-۸)

(۲) وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ وَالْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ أَلْوَانُهُ كَذَٰلِكَ (فاطر: ۲۸)

(i) "اور چوپائے بھی اُسی نے بنائے۔ اُن میں تمہارے لئے گرم لباس بھی ہے اور دیگر فائدے بھی۔ اور اُن میں سے تم کھاتے بھی ہو۔ اور اُن کی وجہ سے تمہاری رونق بھی ہے جبکہ (اُنہیں) شام کے وقت (گھر) لاتے ہو اور جبکہ (اُنہیں) صبح کے وقت (چرنے) چھوڑ دیتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ بھی ایسے شہر کو لے جاتے ہیں جہاں تم جان کی سخت مشقت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔ بے شک تمہارا پالنہار بڑی ہی شفقت والا بڑا ہی مہربان ہے۔ اور اُسی نے پیدا کئے گھوڑے اور خچر اور گدھے تاکہ تم اُن پر سوار ہو* اور زینت کے لئے بھی۔ اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے جن کی تم کو خبر نہیں**۔"

(ii) "اور انسانوں، چارپایوں اور جانوروں کے رنگ بھی اِسی طرح جدا جدا ہیں۔"

قدرت کی ندرت آفرینیاں کہاں ختم ہوتی ہیں! مصوّرِ فطرت کا موئے قلم انسانوں، چوپایوں اور جانوروں کو مختلف رنگ آمیزیوں سے یوں آراستہ و پیراستہ کر رہا ہے کہ دل کھچے چلے جاتے ہیں۔ آنکھیں ہزار بار دیکھنے کے باوجود سیر نہیں ہوتیں اور "یکبارِ دیگر بینم" کی آرزو کبھی ختم نہیں ہوتی!

(۶) ارضیات کی دنیا میں خوبصورتی: محسنِ حقیقی نے ارشاد فرمایا:-

(۱) إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًاo (الکھف: ۷)

(۲) وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًاo لِّتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًاo (نوح: ۱۹، ۲۰)

(i) "ہم نے زمین پر جو کچھ بھی ہے، اُس کے لئے باعثِ رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ اُن میں بہ لحاظِ عمل کون بہتر ہے۔"

زِینَۃ اور 'اَحْسَنُ' کے الفاظ جمالیات کے مظہر ہیں۔ اللہ کی منصوبہ بندی میں زمین کی زینت انسان

* گھوڑے، خچر اور گدھے کے گوشت کا ناجائز ہونا اسی آیت سے ثابت ہے کہ جہاں مویشیوں کا ذکر آیا، وہاں حق تعالیٰ نے وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ (اور اُن میں سے تم کھاتے بھی ہو) اور یہاں صرف لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہ جانور صرف سواری اور آرائش کے کام کے ہیں، کھانے کے لئے نہیں۔

** اس آیت میں نقل و حرکت کے وہ ذرائع بھی آگئے جو نزولِ قرآن کے وقت موجود نہ تھے لیکن بعد میں ایجاد ہوئے یا قیامت تک ایجاد ہوتے رہیں گے۔ یعنی موٹریں، ریل، دخانی بحری جہاز، طیارے، راکٹ اور اللہ معلوم کیا کیا بننے والا ہے۔ یہ سب اُسی کی صفتِ رحمت کے مظاہر ہیں۔

سے تقاضا کرتی ہے کہ وہ اُس پر رہتے ہوئے نیک کام کرے۔

(ii) ''اور اللہ نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا تا کہ تم اِس کے کھلے راستوں میں چلو پھرو۔''

''یہ واقعی حیران کن بات ہے کہ ہماری زمین سورج سے بالکل صحیح فاصلے پر رکھی گئی ہے۔ وہ نہ تو عظیم الجثہ اور منبعِ توانائی سورج کی جھلسا دینے والی تباہ کن قوّت کے ہدف پر رکھی گئی اور نہ ہی اُس کی قوّت کی افادیت سے اُسے محروم کیا گیا۔'' ("The Miracle in the Atom" -- Harun Yahya, p. 109)

''اور زمین کی جسامت بالکل صحیح ہے' نہ اتنی چھوٹی اور نہ اتنی بڑی۔ زمین کا اندرونی حصہ بہت ہی بڑا ہے لیکن بڑی نفاست سے اسے متوازن بنایا گیا ہے۔ اگر یہ بہت زیادہ سست روی سے چل رہی ہوتی تو ارضی سرگرمیاں بہت آہستگی سے آگے بڑھ رہی ہوتیں۔ لوہا شاید کبھی نہ پگھلتا اور مائع کی شکل اختیار نہ کرتا۔ مقناطیسی میدان کبھی ترقی نہ کرتے۔ اگر تابکاری ایندھن موجودہ مقدار سے زیادہ ہوتا تو آتش فشاں گیسیں اور گرد سورج کو چھپا دیتے' کرۂ ہوائی شدید طور پر کثیف (گاڑھا) ہو جاتا' سطحِ زمین روزانہ زلزلوں کی زد میں ہوتی اور آتش فشاں پھٹ رہے ہوتے۔'' ("Earth"-- F.Press, R. Siever, p. 4)

(۷) پہاڑوں میں حُسن: ارشادِ ربانی ہے:

وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا وَغَرَابِيبُ سُودٌ ٥ (فاطر: ۲۷)

''اور پہاڑوں میں بھی گھاٹیاں ہیں کوئی سفید اور کوئی سرخ' اُن کے رنگ مختلف ہیں اور کوئی بہت گہرے سیاہ۔''

''مختلف پہاڑوں کی بناوٹ' اُن کی بلندی و پستی میں قدرتِ ربانی کے صدہا جلوے نظر آرہے ہیں۔ ذرا اُن کے رنگوں کو دیکھئے۔ کہیں تو بالکل سفید دھاری چلی گئی ہے' کہیں رنگت سرخ ہے اور سرخی بھی ایک جیسی نہیں۔ اِس رنگ میں بھی کئی رنگ ہیں۔ کوئی ہلکا سرخ' کہیں گوڑھا عنابی' کہیں گلابی مائل اور کہیں سیاہ ہے تو ایسا سیاہ کہ بس حد ہی ہوگئی۔''

''پہاڑوں کے مختلف رنگوں کی طرف خصوصی طور پر متوجّہ کرکے اُن معدنیات کا کھوج لگانے کی ترغیب دی گئی ہے جو اُن کے شکموں میں موجود ہیں اور مدت سے کسی جوانمرد اور باہمت انسان کی ضربِ خارا شگاف کے لئے منتظر ہیں۔ پہاڑوں کی یہ مختلف رنگتیں اُن مدفون خزانوں کا پتہ بتا رہی ہیں۔ افسوس وہ قوم جسے قرآنِ مبین جیسی کتابِ منیر عطا کی گئی تھی' وہ اسے ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر سوگئی اور یورپ کی وحشی قومیں اِس چشمۂ صافی سے اپنی کشتِ حیات کو سیراب کرنے میں سبقت لے گئیں۔'' (ضیاء القرآن' ج ۴' ص ۱۵۴)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَدَدَ مَا فِیْ عِلْمِ اللّٰہِ صَلٰوۃً دَائِمَۃً بِدَوَامِ مُلْکِ اللّٰہِ

DEDICATED TO

The Almighty's marvellous creature whose "towering and radiant personality may be likened to a beacon-light illuminating a pitch-dark night or to a diamond shining in a heap of dead stones" and without whose advent," a most important chapter in the history of mankind would have remained unwritten." ﷺ

انتساب

قادرِ مطلق کی اُس یگانہ روزگار مخلوق کے نام جس کی رفعتوں کی حامل منوّر شخصیت اُس روشن مینار کی طرح ہے جو گمبھیر رات کی گھٹا ٹوپ ظلمتوں کو ضیا پاش کیے ہوئے ہے یا اُس ہیرے کی طرح جو خشک اور مُردہ پتھروں کے درمیان پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا ہے اور جس کے ظہور کے بغیر تاریخِ انسانیت کا ایک انتہائی اہم باب غیر منضبط رہ جاتا ﷺ

(۸) کرّہ ہوائی میں حُسن: قرآنِ حکیم نے سُورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ اور سورۃُ الْجَاثِیَہ کی آیت ۵ میں تَصْرِیفِ الرِّیٰحِ (ہواؤں کا اُدل بدل) کی اصطلاح استعمال کی ہے کہ یہ بتایا جائے کہ کرّہِ ہوائی کس حد تک انسانی زندگی کے لئے موافق اور سازگار ہے۔ جسٹس کرم شاہ اَلاَزہری نسیم برّی میں جمالیات کے پہلو کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

''اِس کرّہِ ہوائی پر نظر ڈالو۔ اِس کی یکسانیت میں حیران کُن تنوّع ہے اور اِس تنوّع میں جو اَنگنت اثرات مُضمر ہیں' اُن کا اندازہ لگانا اَربابِ فہم کے لئے مشکل نہیں۔ کہیں بادِ نسیم کے جھونکے خواب آلود غنچوں کو جگا رہے ہیں' کہیں سبز غنچوں پر شبنم کے موتی سجا رہے ہیں' کہیں طوفان بن کر اُمڈ رہے ہیں' کہیں بادل کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو یکجا کرنے کی خدمت انجام دی جا رہی ہے' کہیں گھنگھور گھٹاؤں کو آنِ واحد میں ناپید کر رہے ہیں' کبھی بہار کا پیغام لا رہے ہیں' کہیں خزاں کی چیرہ دستیوں میں اِضافہ کر رہے ہیں' کہیں انسان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کو تمام کرہ میں آناً فاناً پھیلا رہے ہیں۔ کرّہِ ہوا کی بوقلمونیوں کو دیکھتے ہی انسان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اِس کے پیدا کرنے والے کی قُدرت' حکمت اور علم بے نظیر اور لاجواب ہے اور اِن حقائق کے مشاہدہ کے بعد ہر وہ شخص جس کے دل میں ایمان اور یقین کا نور موجود ہے اور عقل و فہم کا چراغ روشن ہے' اُسے آسانی سے عرفانِ الٰہی نصیب ہو سکتا ہے۔'' (ضیاء القرآن' جلد ۴' ص ۴۵۰)

کرّہِ ہوائی میں جمالیات کے اِسی رُوح پرور پہلو کے تعارف میں ہارون یحیٰی' مائیکل ڈینٹن کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''اگر آپ کی فضا میں آکسیجن کی مقدار (موجودہ مقدار سے) زیادہ ہوتی تو کیا زندگی ممکن ہوتی؟ ہرگز نہیں۔ آکسیجن بہت زیادہ ردِّعمل کرنے والا عنصر ہے۔ فضا میں اس کا موجودہ تناسب ۲۱% ہے جو زندگی کے تحفظ کی بالائی حد ہے۔ اگر فضا میں ایک فیصد آکسیجن کا اضافہ ہو جائے تو جنگل کی آگ پھیلنے کے امکانات ۷۰% تک بڑھ جائیں ــــــ۔ فضا اپنی عام ہیئت ترکیبی بہ شمول کثافت اور دباؤ وغیرہ میں ایسی ہونی چاہئے جو تمام سانس لینے والی مخلوقات کے مناسب و موافق ہو۔'' ("Nature's Destiny"--Michael Denton, pp.121, 127)

اِسی قسم کی بات ایک اور مصنف جیمز لَوْ لاک نے لکھی ہے:۔

''آکسیجن کے تناسب کے ۲۵ فیصد ہونے پر ہماری زمین کا سبزہ آتش زدگی کو برداشت نہ کر سکتا جو قطبین کے برساتی جنگلوں اور ٹنڈرا جیسے برفانی علاقے کو تباہ کر کے رکھ دیتی۔ چنانچہ آکسیجن کا موجودہ تناسب ایسا ہے جہاں خطرہ اور فائدہ دونوں (باہم) متوازن اور زندگی کے لئے موافق ہیں۔''

("Gia" -- James J. Lovelock, p. 71) Oxford University Press, Oxford 1987.

غرض کہ اللہ ربُّ العزت کی نشانیوں سے زمین و آسمان کا کونہ کونہ آباد ہے۔ نظامِ کائنات کا مشاہدہ کرنے والوں پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ سراسر ایک حکیمانہ نظام ہے مگر بہت سے لوگ اُن نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں جس حقیقت کے متعلق قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا:۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ٥ (یُوسُف: ۱۰۵)

"اور زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے یہ لوگ منہ موڑ کر گزر جاتے ہیں (اُن کی حقیقت وصفت اور اُن کے بنانے والے کی طرف توجّہ نہیں دیتے۔)"

(۹) فلکیات کی دنیا میں حُسن: کو یوں بیان فرمایا گیا:۔

(۱) وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ٥ (اَلْحِجر: ۱۶)

(۲) اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ۨالْكَوَاكِبِ (اَلصّٰفّٰت: ۶)

(۳) وَ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ حِفْظًا (حٰمٓ السَّجْدَة: ۳)

(i) "اور بالیقین ہم نے آسمان میں بُرج (بڑے ستارے) بنائے اور اُسے دیکھنے والوں کے لئے اُن سے آراستہ کر دیا۔"

"علمائے ہیئت نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ سورج تین ماہ تک شمال کی طرف مائل ہوتا ہے، پھر تین ماہ تک ہٹتا رہتا ہے۔ اس کے بعد وہ تین ماہ تک جنوب کی طرف مائل ہوتا ہے اور پھر تین ماہ تک ہٹتا رہتا ہے تو اُنہوں نے سورج کے مدارِ حرکت کو بارہ حصّوں میں بانٹا اور ہر حصّہ کو بُرج کا نام دیا اور مدار کے ہر حصّہ میں جو بڑے بڑے ستارے پائے جاتے ہیں، اُن کی ایک خیالی شکل اپنے ذہن میں قائم کر لی اور اُس شکل سے اُس بُرج کا نام رکھ دیا۔ اُن بُرجوں کے نام یہ ہیں: حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سُنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حُوت۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آیت میں بروج سے کیا مراد ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ مدارِ آفتاب کی یہ تقسیم یونانی علمائے ہیئت نے کی تھی۔ اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ نزولِ قرآن سے پہلے عرب اِس تقسیم کو جانتے تھے اور اُسے اپنی زبان میں استعمال کرتے تھے تو پھر ان بُرجوں سے وہی بارہ بُرج مراد ہوں گے جن کے نام اوپر لکھے گئے ہیں اور اگر اس کا قابلِ اعتماد ثبوت بہم نہ پہنچے تو بھی آیت کا مفہوم سمجھنے میں کوئی دقت نہیں کیونکہ اِس صورت میں بُرج سے مراد وہ سات سیارے یا دیگر بڑے بڑے چمکدار ستارے ہوں گے جو کروڑوں چمکتے ہوئے ستاروں میں بھی خوب نمایاں نظر آتے ہیں" (ضیاء القرآن، ج ۲، ص ۵۳۴)

(ii) "بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو ستاروں کی آرائش کے ساتھ زینت بخشی ہے۔"

(iii) "اور ہم نے اِس قریب والے آسمان کو ستاروں کے ذریعے رونق بھی دی اور حفاظت بھی کی۔"

''یعنی یہ نہیں کہ چمکدار ستارے بنا دئے اور اُنہیں غیر منظم طور پر بکھیر دیا کہ اُن سے روشنی حاصل ہوتی رہے اور اُن کی کرنیں اپنی اپنی تاثیرات سے متعلقہ اشیاء کو متاثر کرتی رہیں اور بس۔ بلکہ اُن کو ایسے موزوں طور پر سجایا ہے کہ دیکھنے والی آنکھ اُن کے حُسنِ ترتیب کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہے۔ الغرض یہ کوئی حُسنِ مستور نہیں جس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہو۔ تاروں بھری اندھیری رات ہو یا چودھویں کا چاند اِس خاکدانِ ارضی پر اپنے انوار کی بارش کر رہا ہو۔ حجلۂ عروسی سے نکلنے والی دُلہن کی طرح حیاء کی سرخی گالوں پر لئے صبح کے وقت سورج جلوہ نمائی کر رہا ہو یا شام کے وقت مغربی اُفق کو اپنی حسرتوں کے خون سے سرخ کرکے وہ رات کی تاریکی میں گم ہونے کی تیاری کر رہا ہو۔ کون سا ایسا منظر ہے جس سے ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اندوز نہیں ہوتا۔ خالقِ کائنات نے ہر چیز کو جس طرح مفید اور مستحکم بنایا ہے' اُتنا ہی اُسے حُسن و جمال بھی بخشا ہے۔'' (ایضاً' ص ۵۳۴)

''آسمان کی حفاظت کرنے سے مراد ہر طرح کی بیرونی دخل اندازیوں اور تاثیراتِ شیطانی سے حفاظت ہے۔ اور یہ بھی کہ اس میں کوئی دراڑ نظر نہیں آتی اور کوئی شگاف دکھائی نہیں دیتا جیسا کہ سورۃ الملک کی آیت ۳ میں فرمایا گیا۔

ہارون یحییٰ اِس ضمن میں اپنی کتاب "Miracle in the Atom" میں لکھتے ہیں:۔

''ایسے بے پناہ توانائی والے سورج کو (زمین سے) اتنے فاصلے پر رکھا گیا ہے جو (فاصلہ) تمام زمینی مخلوقات اور بالخصوص انسانی زندگی کے لئے بالکل موزوں اور مناسب ہے۔'' (ص ۱۰۹)

آئزک نیوٹن نے جسے ہر زمانہ کا عظیم ترین سائنسی ذہن مانا جاتا ہے' لکھا:۔

''آفتابوں' سیاروں اور دُمدار ستاروں کا لطیف و خوش آئند نظام ایک عقلِ کُل اور قادرِ مُطلق ہستی کی منشا اور شاہانہ شان و شوکت کے شایانِ شان بنا۔۔۔ ۔ وہ اپنی مخلوقات پر ایک روح کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقتدر فرمانروا کے طور پر حکمرانی کرتا ہے۔ اپنی مقتدرانہ شہنشاہیت کی وجہ سے اُسے ربّ عزّ وجلّ کہا جاتا ہے۔''
("God and the New Cosmology : The Anthropic Design Argument" -- Michael A, Corey, p. 259), Maryland, 1993.

آسمان کی ترتیب اور تزیین کے بارے میں قرآن حکیم نے فرمایا:

ءَ أَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَاo رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَاo (اَلنّٰزِعٰت: ۲۷' ۲۸)

"بھلا تمہارا (دوبارہ) پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ اُسی نے اُس کو بنایا۔ اُس کی چھت کو بلند کیا اور اُسے درست بنایا۔" (منکرین سے خود اُن کے اپنے معیار سے جواب مانگا جا رہا ہے)

اِس آیت میں حضرتِ انسان کو یہ یاددہانی کرائی جا رہی ہے کہ اللہ کے وسیع نظامِ تخلیق میں انسان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر وہ مغرور ہو جائے یا اپنے خالق کے آگے اپنی جوابدہی کو بھول جائے تو اُسے جان

لینا چاہئے کہ اللہ کی اِس وسیع کائنات میں اُس کی حیثیت ایک معمولی دھبّے کی سی ہے۔''

(۱۰) کام و دہن (طعام) میں جمالیات: مطعومات (کھانے کی چیزوں) کے پُرلذّت ہونے میں اُن کا جمالیاتی پہلو نکلتا ہے جس کے بغیر کھانے کا لطف جاتا رہتا ہے۔قرآنِ حکیم نے فرمایا:۔

(۱) وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَ صِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ٥ (اَلْمُؤْمِنُوْن : ۲۰)

(i) ''اور اُس نے ایک درخت بھی پیدا کیا جو طورِ سَیْناء میں پیدا ہوتا ہے۔وہ اُگتا ہے تیل لئے ہوئے اور سالن لئے ہوئے کھانے والوں کے لئے۔''

یہاں کسی درخت کے نام کی وضاحت نہیں لیکن سب کا اتفاق ہے کہ اِس سے مراد زیتون ہے۔چونکہ وہ طُور کے علاقہ میں بکثرت ہوتا ہے اور اُس خطہ کی اہم پیداوار شمار کیا جاتا ہے' اس لئے اُس کی نسبت وادیِ طُور کی طرف کرتے ہیں۔صِبْغ اُس چیز کو کہتے ہیں جو سالن کے طور پر استعمال کی جائے۔چونکہ کھانے کا مزہ سالن کے ساتھ دوبالا ہو جاتا ہے' اِس لئے طعام میں یہ جمالیاتی پہلو لئے ہوئے ہے۔صِبْغ کا ایک معنٰی سلاد (Salad) بھی ہوسکتا ہے جو کچی سبزیوں سے تیار ہوتا ہے اور جو روٹی اور سالن کے ساتھ مل کر کچھ اور ہی مزہ دیتا ہے۔

(۲) فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ٥ اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا٥ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا٥ فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا٥ وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا٥ وَّزَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا٥ وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا٥ وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا٥ مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ٥

(ii) ''پھر انسان ذرا غور سے اپنی غذا کو دیکھے کہ ہم نے خوب پانی برسایا' پھر اچھی طرح زمین کو پھاڑا' پھر ہم نے اُس میں غلّہ' انگور' ترکاریاں' زیتون' کھجوریں' گھنے باغات' طرح طرح کے پھل اور چارہ اُگایا' تمہارے اور تمہارے مویشیوں کے فائدہ کے لئے۔'' (عَبَس:۲۴۔۳۲)

یعنی تم اپنے دستر خوان پر بچھے ہوئے رنگا رنگ کھانوں کو ہڑپ کر جاتے ہو اور یہ نہیں سوچتے کہ اللہ نے کس طرح اُنہیں پیدا کیا ہے۔بارش برستی ہے' بیج زمین کا سینہ چیرتے ہوئے نازک نازک بالیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' پھر وہ بالیاں اُگتی ہیں' نشوونما پاتی ہیں۔کہیں کھیت میں تمہارے لئے اناج کے ذخیرے تیار کئے جا رہے ہیں تو کہیں انگوروں کی بیلیں زمین پر بَل کھاتی نشوونما پا رہی ہیں' کہیں تمہارے جانوروں کے لئے چارہ اُگ رہا ہے۔زیتون اور کھجور کے درخت کہیں بہار دکھا رہے ہیں' کہیں شاداب اور گھنے باغات ہیں جن کے درختوں کی ٹہنیاں رنگا رنگ پھولوں اور پھلوں سے لدی ہیں۔کہیں گھاس اُگ رہی ہے جو تمہارے جانوروں کے کام آتی ہے۔ذرا دیکھو تو سہی ہم نے اپنی قدرتِ کاملہ کو کس طرح تمہارے فائدے کے لئے استعمال کیا ہے اور کس طرح ہم نے اپنی رحمت و قدرت سے تمہارے اور تمہارے حیوانوں کے لئے سامانِ حیات فراہم کر دیا ہے۔ ربوبیت اور رزاقیت کی اتنی زبردست مشینری کے دیکھنے کے بعد بھی رُوگردانی اور ادائے شکر سے تمہارا انکار کیسی شدید احسان فراموشی ہے!!

(۱۱) مشروبات میں حُسن (ذائقہ اور مزہ):

(۱) وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ○ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا (النحل:۶۶، ۶۷)

(۲) وَجَعَلْنَا فِيْهَا جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ وَّفَجَّرْنَا فِيْهَا مِنَ الْعُيُوْنِ○ لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ○ (یٰسٓ: ۳۴، ۳۵)

(i) ''اور بے شک تمہارے لئے مویشیوں میں بھی بڑا سبق ہے۔ جو اُن کے پیٹوں میں گوبر اور خون ہے' اُن کے درمیان سے نکال کر ہم تمہیں خالص دُودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے بہت خوش ذائقہ ہے۔ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے (ہم تمہیں پلاتے ہیں)۔ تم اس سے میٹھا رَس اور عمدہ چیزیں بناتے ہو۔''

لغت میں سَکَر شراب کو کہتے ہیں (بحر المحیط) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ آیت شراب کے حرام ہونے سے پہلے نازل ہوئی تھی جبکہ مسلمان اُسے ابھی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے اُس کا یہاں ذکر کیا گیا۔ بعد میں حرمتِ شراب کا حکم نازل ہونے سے یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ لیکن دوسرے علماء نے کہا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ اپنے احسانات کا ذکر فرما رہا ہے۔ ایسے مقام پر کسی پلید اور نجس چیز کا ذکر کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ اُن کی رائے میں سَکَر سے مراد کھجور اور انگور کا میٹھا رس ہے جو حلال ہوتا ہے (بحر المحیط' قرطبی) اس طرح نسخ کرنے کی ضرورت بھی نہ رہے گی اور وہ شبہ بھی دُور ہو جائے گا۔ (ترجمہ اِسی آخری قول کے مطابق کیا گیا ہے۔)'' (ضیاء القرآن' ج ۲' ص ۵۸۱)

(ii) ''اور ہم نے اُس (زمین) میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ لگائے اور اُس (زمین) میں چشمے جاری کردئے تاکہ لوگ اُس (باغ) کے پھلوں سے کھائیں اور وہ (وہ بھی کھائیں) جو اُن کے ہاتھ بناتے ہیں۔ تو کیا یہ لوگ شکر نہیں کرتے؟''

علامہ اسمٰعیل حقّی نے تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ مَا عَمِلَتْهُ میں مَا موصولہ ہو سکتا ہے (چنانچہ ترجمہ اِسی قول کے مطابق کیا گیا ہے) اور اِس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ اپنے پکے پکائے اور تیار کردہ کھانے اور مطعومات کو دیکھو تو اُس میں اپنے خالق و مالک ہی کی ربوبیّت کی جھلک پاؤ گے۔

روح البیان میں یہ بھی بیان ہوا کہ یہاں مَا نافیہ (یعنی نفی کے معنوں میں) بھی ہو سکتا ہے اور اِس لحاظ سے ٹکڑا بہت قابلِ غور ہے کہ ساری دُنیا' خدائی قدرت و انتظام سے الگ ہو کر' اگر مل کر بھی کوشش کر ڈالے کہ تخم ریزی و آبپاشی کے نتائج غلّہ' پھل وغیرہ ہی کی شکل میں ظاہر ہوتے رہیں تو کامیابی ناممکن ہے۔ یقینی طور پر اِن مسبّبات کو اِنہی نتائج کی صورت میں ظاہر کرنا خاص الخاص کرشمہِ قدرتِ خداوندی ہے۔

مَا عَمِلَتۡهُ أَيۡدِيۡهِمۡ (جو اُن کے ہاتھ بناتے ہیں) میں آج کے دَور کی پُر ذائقہ، مزیدار اشیائے خوردنی (اچار، مربے، چٹنیاں، بسکٹ، آملیٹ، پنیر، پڈنگ، مارملیڈ، جیم، یخنی) اور نئے نئے مشروبات، مِلک شیک سب شامل ہیں۔
انسانی حِسّ ذائقہ اور سونگھنے (قوتِ شامّہ) کی بابت ہارون یحیٰی لکھتے ہیں :۔

''کیا آپ نے کبھی یہ سوچا ہے کہ آپ کی زندگی کتنی بے کیف اور بے مزہ ہوتی اگر آپ کو تمام زندگی ایک ہی قسم کی خوراک کھانا پڑتی اور پینے کے لئے صرف پانی ہوتا؟ لہٰذا دوسری نعمتوں کی طرح ذائقہ اور سونگھنا اِلٰہی حُسن کا پرتَو ہیں۔ وہ جو لامحدود عظمت اور شان و شوکت والا ہے اُس نے انسان کو یہ نعمتیں فیاضانہ طور پر بخشی ہیں اور (لطف یہ کہ) اُن کے بدلے میں اُس نے انسان سے کچھ بھی نہیں لیا۔ صرف اِنہی دو حواس (ذائقہ اور سونگھنا) کے نہ ہونے سے انسانی زندگی بالکل بے کیف ہو جاتی۔ اِن تمام نعمتوں کے عوض جو انسان کو عطا کی گئی ہیں، انسان کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ وہ ایک ایسا انسان بننے کی کوشش کرے جس سے اللہ راضی ہو جائے۔'' ("The Miracle in the Atom" pp. 87-88)

(۱۲) آبی (+ نباتاتی) دُنیا میں حُسن: نباتاتی دُنیا کا حُسن بارش کے پانی کا رہینِ منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم جہاں کہیں بھی نباتاتی دُنیا کی بات کرتا ہے، وہاں وہ بارش کے ذریعے آب رسانی کی بات کرتا ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کی آیات :۔

(۱) وَ هُوَالَّذِىۡ أَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَىۡءٍ فَأَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا وَ مِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّ جَنّٰتٍ مِّنۡ أَعۡنَابٍ وَّ الزَّيۡتُوۡنَ وَ الرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ أُنۡظُرُوۡا اِلٰى ثَمَرِهٖ اِذَآ أَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ۝ (الانعام:۹۹)

(۲) وَتَرَى الۡأَرۡضَ هَامِدَةً فَإِذَآ أَنۡزَلۡنَا عَلَيۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَأَنۡبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍ بَهِيۡجٍ (الحج:۵)

(۳) وَأَنۡزَلَ لَكُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَنۡبَتۡنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهۡجَةٍ مَا كَانَ لَكُمۡ أَنۡ تُنۡبِتُوۡا شَجَرَهَا (النمل:۶۰)

(۴) وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَأَنۡبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الۡحَصِيۡدِ ۝ وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ ۝ رِّزۡقًا لِّلۡعِبَادِ وَ أَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا (قٓ: ۹-۱۰)

(i) ''اور وہ وہی تو ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا۔ پھر ہم اُس کے ذریعہ سے ہر قسم کی روئیدگی کو نکالتے ہیں، پھر ہم اُس سے ہری ہری بالیں نکالتے ہیں، پھر اُس سے (خوشہ جس میں) دانے ایک دوسرے پر چڑھے ہوتے ہیں اور (نکالتے ہیں) کھجور سے یعنی اُس کے گابھے سے نیچے جھکے ہوئے گچھے اور (ہم نے پیدا کئے) انگور اور زیتون اور انار کے باغات، بعض (شکل و ذائقہ میں) ایک جیسے ہیں اور بعض الگ الگ۔ پھل کے درخت کی طرف دیکھو جب

وہ پھل دار ہو اور (دیکھو) اُس کے پکنے کو۔ بے شک اِن میں (اُس کی قدرتِ کاملہ کی) اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایماندار ہیں۔''

(ii) ''اور تو زمین کو دیکھتا ہے کہ خشک ہے' پھر جب ہم اُس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور پھولتی ہے اور ہر قسم کی خوش نما نباتات اُگاتی ہے۔''

(iii) ''اور اُس نے آسمان سے تمہارے لئے پانی اتارا پھر اُس کے ذریعہ سے ہم نے بارونق باغ اُگائے (ورنہ) تم سے تو ممکن نہ تھا کہ اُن کے درختوں کو اُگاؤ۔''

(iv) ''اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا' پھر ہم نے اُس سے باغ اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گندھے ہوئے رہتے ہیں بندوں کو روزی دینے کے لئے اُگائے اور ہم نے اُس کے ذریعے مردہ زمین کو زندہ کیا۔''

پانی کی خصوصیات پر بحث کرتے ہوئے ہارون یحیٰ لکھتے ہیں :۔

''تحقیق سے ثابت ہے کہ طبعیات' کیمیا اور حیاتیات کے تمام مروّجہ قوانین خواہ وہ زمینی کائنات سے متعلق ہوں یا کرّہِ ہوائی' سورج یا ذرّہِ بے مقدار (Atom) وغیرہ سے متعلق ہوں' یوں ترتیب دیئے گئے ہیں کہ وہ انسانی زندگی کے معاون اور اُس کی ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ دوسرے عناصر کی طرح پانی زندگی کے لئے اِس درجہ تک مناسب و موافق ہے کہ کسی اور مائع سے اِس موافقت کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ زمین کا ایک خاصا حصّہ اُتنی ہی مقدار میں پانی سے پُر ہے جتنی کہ زندگی کو ضرورت ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ اتفاقی حادثات کا نتیجہ نہیں ہوسکتا اور یہ کہ کائنات میں مکمل نظم و ضبط اور (بے مثال) ڈیزائن ہے۔'' ("The Miracle in the Atom" p. 81)

(۱۳) قرآن مجید میں حُسن : قرآن مجید کے الفاظ کی خوبصورتی کے ساتھ اِس کا اندازِ بیان' اُسلوب اور موضوع بھی انتہائی خوبصورت ہیں۔ قرآن کی انہی خصوصیات نے عربوں جیسے شاہسوارانِ خطابت کو قرآن کی نظیر لانے سے عاجز کر دیا تھا۔ یہ چیلنج آج بھی موجود ہے جبکہ انسان علم و دانش اور سائنسی کمالات کی حیران کن بلندیوں کو چھو چکا ہے۔ (تفصیلات آنے والی جلدوں میں LITERATURE اور RHETORIC کے عنوانات کے تحت ملاحظہ فرمائیں)

(۱۴) جنّت میں حُسن : قرآن مجید نے باغِ عدن کے حُسن و جمال کے انتہائی روح پرور نظارے کھینچے ہیں' جو اللہ کے فرمانبردار بندوں کو عطا کئے جائیں گے۔ چند ایک نمونے ملاحظہ ہوں :۔

(۱) فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ o (الم السجدۃ : ۱۷)

(۲) أُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ o فَوَاكِهُ وَهُمْ مُّكْرَمُونَ o فِي جَنّٰتِ النَّعِيمِ o عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِينَ o يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ o بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِينَ o لَا فِيهَا غَوْلٌ وَّلَا هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُونَ o وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِينٌ o كَأَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُونٌ o (الصافات : ۴۱ ـ ۴۹)

(۳) إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّنَعِيمٍ o فٰكِهِينَ بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ o كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ o مُتَّكِـِٔينَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوفَةٍ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُورٍ عِينٍ o وَالَّذِينَ اٰمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ أَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِينٌ o وَأَمْدَدْنٰهُمْ بِفٰكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ o يَتَنٰزَعُونَ فِيهَا كَأْسًا لَّا لَغْوٌ فِيهَا وَلَا تَأْثِيمٌ o وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ o (الطور : ۱۷ ـ ۲۴)

(۴) وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ o فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o ذَوَاتَآ أَفْنَانٍ o ـــ o فِيهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ o ـــ o فِيهِمَا مِنْ كُلِّ فٰكِهَةٍ زَوْجٰنِ o ــــ o مُتَّكِـِٔينَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ إِسْتَبْرَقٍ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ o ـــ o فِيهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ o ــــ o كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ o ــــ o هَلْ جَزَآءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ o ــــ o وَمِنْ دُونِهِمَا جَنَّتٰنِ o ــــ o مُدْهَآمَّتٰنِ o ـــ o فِيهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ o ـــ o فِيهِمَا فٰكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ o ــــ o فِيهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ o ـــ o حُورٌ مَّقْصُورٰتٌ فِي الْخِيَامِ o ـــ o لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ o ــــ o مُتَّكِـِٔينَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ o فَبِأَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ o (الرحمٰن : ۴۶، ۴۷، ۴۸ ـ ۷۷)

(۵) عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُونَةٍ o مُّتَّكِـِٔينَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِينَ o يَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ o بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيقَ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِينٍ o لَّا يُصَدَّعُونَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُونَ o وَفٰكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ o وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ o وَحُورٌ عِينٌ o كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ o جَزَآءًۭ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ o لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيمًا o إِلَّا قِيلًا سَلٰمًا سَلٰمًا o وَأَصْحٰبُ الْيَمِينِ مَآ أَصْحٰبُ الْيَمِينِ o فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ o وَّطَلْحٍ مَّنْضُودٍ o وَّظِلٍّ مَّمْدُودٍ o وَّمَآءٍ مَّسْكُوبٍ o وَّفٰكِهَةٍ كَثِيرَةٍ o لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ o وَّفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ o إِنَّآ أَنْشَأْنٰهُنَّ إِنْشَآءً o فَجَعَلْنٰهُنَّ أَبْكَارًا o عُرُبًا أَتْرَابًا o لِّأَصْحٰبِ الْيَمِينِ o (الواقعۃ : ۱۵ ـ ۳۸)

(۶) وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَّحَرِيرًا o مُّتَّكِـِٔينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَآئِكِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيرًا o وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا o وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا o قَوَارِيرَا۟ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا o وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا o عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا o وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُورًا o وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا o عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ وَّحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا o إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُورًا o (الدھر : ۱۲ ـ ۲۲)

(۷) وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ o لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ o فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ o لَّا تَسْمَعُ فِيهَا لٰغِيَةً o فِيهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ o فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ o وَّأَكْوَابٌ مَّوْضُوعَةٌ o وَّنَمَارِقُ مَصْفُوفَةٌ o وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوثَةٌ o (الغاشیۃ : ۸ ـ ۱۶)

(۱) ''پس کوئی شخص نہیں جانتا جو جو (نعمتیں) آنکھوں کی ٹھنڈک کے طور پر اُن کے لئے چھپا کر رکھی گئی ہیں۔ یہ صلہ ہے اُن کے (اُن نیک) اعمال کا جو وہ کرتے تھے۔'' (الٓمٓ السجدۃ : ۱۷)

(۲) ''یہی وہ لوگ ہیں جنہیں وہ رزق دیا جائے گا جس کی کیفیت معلوم ہے یعنی میوے اور اُن کا بڑا احترام کیا جائے گا۔ وہ راحت کے باغوں میں ہوں گے' (زرنگار) پلنگوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اُن پر (شرابِ طہور کے) چھلکتے جام پھرائے جائیں گے' (دودھ سے زیادہ) سفید' پینے والوں کے لئے بڑے لذیذ۔ نہ اُس میں کوئی مضرِ صحت کوئی چیز ہے اور نہ وہ (اُس کے پینے سے) مدہوش ہوں گے۔ اور اُن کے پاس نیچی نگاہ آہو چشم (موٹی آنکھوں والی) عورتیں ہوں گی *ایسے جیسے (شترمرغ کے) انڈے' گرد و غبار سے محفوظ۔'' (الصّافات: ۴۱۔۴۹)

(۳) ''بے شک پرہیزگار (اُس دن) باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے' اُن نعمتوں پر خوش ہو رہے ہوں گے جو اُن کے پالنہار نے اُنہیں دی ہوں گی' اور اُن کا پروردگار اُنہیں عذابِ دوزخ سے محفوظ رکھے گا۔ (کہا جائے گا) خوب مزے سے کھاؤ پیو اُن (نیکیوں) کے بدلے جو تم کرتے رہے ہو۔ بچھے ہوئے پلنگوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم اُنہیں گوری گوری آہو چشموں سے بیاہ دیں گے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور اُن کی اولاد نے بھی ایمان میں اُن کا ساتھ دیا' ہم اُن کے ساتھ اُن کی اولاد کو ملا دیں گے اور ہم اُن کے عملوں (کی جزاء) میں سے ذرّہ بھر کمی نہیں کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں اَسیر ہوگا۔ اور ہم اُنہیں (ایسے) میوے اور گوشت مسلسل دیتے رہیں گے جو وہ پسند کریں گے۔ وہاں وہ جامِ شراب پر آپس میں چھینا جھپٹی کریں گے بغیر کسی لغویت اور گناہ کے۔ (اُن کی خدمت بجا لانے کے لئے) اُن کے غلام آئیں جائیں گے' (اپنے حُسن کے باعث) یوں معلوم ہوں گے گویا وہ محفوظ (چھپے) موتی ہیں۔'' (الطُّور: ۱۷۔۲۴)

(۴) ''اور جو کوئی اپنے پروردگار کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے' اُس کے لئے دو باغ ہوں گے۔ سو (اے جنّ و اِنس!) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے! دونوں باغ پھل دار ٹہنیوں والے ہوں گے۔۔۔ دونوں باغوں میں دو چشمے جاری ہوں گے۔۔۔ اُن دونوں باغوں میں ہر طرح کے میووں کی دو دو قسمیں ہوں گی۔۔۔ وہ بستروں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے اَستر دبیز ریشم کے ہوں گے اور دونوں باغوں کا پھل نیچے جھکا ہوگا۔۔۔ اُن میں نیچی نگاہ والی (حُوریں)

* ''عیسائی مصنفین اِن جیسی قرآنی آیات کو قدرتی طور پر ناپسندی بلکہ خوف زدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ عیسائی اخلاقیات میں جنسی زندگی موروثی طور پر ایک ضروری برائی (Necessary Evil) سمجھی جاتی ہے۔ زندگی کے متعلق یہ مریضانہ رویّہ صرف عیسائیت کے 'تاریک دَور' کے آغاز سے شروع ہوا۔ اسلام نے اِس غیر صحتمندانہ نظریئے کے خلاف تعلیم دی ہے اور اس کی تعلیمات جدید سائنسی تحقیقات کے مطابق ہیں کہ جنسی زندگی ایسی اعلیٰ ترین مسرّتوں کا منبع ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ یہ عظیم ترین اور بے مثل عضویاتی مسرّت و شادمانی ہے جسے بہ نظرِ تحسین دیکھنا چاہئے نہ کہ کم نگاہی سے۔ جنسی زندگی کوئی برائی کی زندگی نہیں کہ کہا جائے کہ ہم اسے برداشت کر رہے ہیں' بلکہ ایک نعمتِ عظمیٰ ہے جس کے بغیر زندگی بے کیف ہے۔ انسانی وجود میں جنسی زندگی کی قدر ہونی چاہئے اور اِس نظریئے کی آبیاری کی جانی چاہئے۔'' ("Biological Tragedy of Woman" -- Nemilov, pp. 200-201)

ہوں گی جنہیں اُن سے پہلے نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا نہ جن نے ۔۔۔۔گویا وہ یاقوت اور مرجان ہیں ۔۔۔۔بھلا کمال اطاعت کا بدلہ کمال عنایت کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟۔۔۔۔۔۔اور اُن باغوں سے کم درجہ میں دو اور باغ بھی ہیں ۔۔۔۔دونوں نہایت سرسبز وشاداب ۔۔۔اُن دونوں میں جوش مارتے ہوئے دو چشمے ہوں گے ۔۔۔اُن دونوں میں میوے' کھجوریں اور انار ہوں گے ۔ ۔۔۔۔اُن میں اچھی سیرت والیاں' اچھی صورت والیاں ہوں گی ۔۔۔۔ موٹی موٹی آنکھوں والی (گورے رنگ والیاں) پردہ دار خیموں میں (محفوظ) ہوں گی ۔۔۔اُنہیں بھی (اُس وقت تک) نہ کسی انسان نے چھوا ہوگا اور نہ کسی جن نے ۔۔۔ وہ سبز مسند پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے جو اَز حد نفیس' بہت خوبصورت ہوگی ۔۔۔۔پس (اے جن وانس!) تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے!!'' (الرحمٰن : ۴۶' ۴۷' ۴۸۔۔۔۵۰' ۔۔۔۵۲' ۔۔۔۵۴' ۔۔۔۷۷)

(۵) ''(مقربین) اُن پلنگوں پر جو سونے کی تاروں سے بُنے ہوں گے' تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے ۔اُن کے پاس نوخیز لڑکے جو ہمیشہ نوخیز ہی رہیں گے' آبخورے' آفتابے اور شرابِ طہور سے چھلکتے جام لئے ہوئے آتے جاتے رہیں گے' نہ اُنہیں دردِ سر ہوگا اور نہ اُس سے عقل میں فتور آئے آئے گا۔اور وہ میوے بھی (پیش کئے جائیں گے) جو وہ (جنتی) پسند کریں گے اور پرندوں کا گوشت بھی جس کی وہ رغبت کریں گے' اور گوری بڑی آنکھوں والیاں (ہیں گی) موتیوں کی طرح جو چھپا رکھے ہوں ۔یہ اجر ہوگا اُن نیکیوں کا جو وہ کرتے رہے تھے ۔وہ وہاں لغو اور گناہ والی باتیں نہیں سنیں گے' بس (ہر طرف) سلام ہی سلام کی آواز آئے گی ۔ اور دائیں ہاتھ والے' کیا شان ہوگی دائیں ہاتھ والوں کی ! بے خار بیریوں میں' تہ بہ تہ کیلوں میں' لمبے لمبے سایوں میں' پانی کے آبشاروں میں' اور پھلوں کی بہتات میں جو نہ ختم ہوں گے اور نہ اُن سے روکا جائے گا اور اونچے اونچے بستر بچھے ہوں گے ۔ہم نے اُن کی بیویوں کو خاص طور پر بنایا ہے' یعنی ہم نے اُنہیں ایسا بنایا ہے کہ وہ کنواری ہی رہیں گی' دل وجان سے پیار کرنے والیاں اور ہم عمر (یہ سب نعمتیں) دائیں ہاتھ والوں کے لئے ہوں گی ۔'' (الواقعہ: ۱۵۔۳۸)

عُرُب'' کا واحد عَرُوب'' ہے ۔علامہ قرطبی کہتے ہیں فَالْعَرُوْبُ تبینُ مَحَبَّتَهَا لِزَوْجِهَا بِشَكْلٍ وَعنجٍ وَحُسْنِ الْكَلَامِ یعنی وہ عورت جو ناز وادا اور خوش گفتاری سے اپنی محبت کا اظہار اپنے خاوند سے کرے ۔یہ عورت کی ایسی صفت ہے جس میں اُس کی نسوانیت کی ساری خوبیاں سمٹ آتی ہیں ۔(۱) حسین وجمیل بھی ہو' (۲) ناز وادا والی بھی' (۳) خوش گفتار بھی ہو' (۴) ہنس مکھ بھی ہو (۵) اپنے خاوند کو دل سے چاہنے والی بھی ہو اور (۶) اپنی چاہت کو چھپانے والی نہ ہو بلکہ اُس کا اظہار کرنے والی ہو۔ تو جنتی زندگی میں

عورت کے حوالے سے جمالیات کے تمام ممکنہ پہلو اس میں آ گئے۔

(۶) ''اور اُن کے صبر و ثبات کے صلہ میں جنت اور ریشمی لباس مرحمت فرمائے گا' وہاں وہ پلنگوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے' نہ وہاں تپش پائیں گے اور نہ ہی سردی۔ اور درختوں کے سائے اُن پر جھکے ہوں گے اور میووں کے گچھے اُن کے بالکل اختیار میں ہوں گے۔ اور اُن کے سامنے چاندی کے برتن اور شیشہ کے گلاس گردش میں ہوں گے (اور) شیشے بھی وہ جو چاندی کی قسم کے ہوں گے' ساقیوں نے اُنہیں مناسب انداز سے بھرا ہوگا۔ اور اُنہیں وہاں (ایسی شراب کے) جام پلائے جائیں گے جن میں زنجبیل کی آمیزش ہوگی۔ یہ زنجبیل جنت میں ایک چشمہ ہے جسے سلسبیل کہا جاتا ہے۔ اور اُن کی خدمت میں ہمیشہ نوخیز رہنے والے لڑکے آمد و رفت رکھیں گے' جب تو اُنہیں دیکھے تو سمجھے کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں۔ اور وہاں جدھر بھی تم دیکھو گے تمہیں نعمتیں ہی نعمتیں اور وسیع مملکت نظر آئے گی۔ اُن کے اوپر باریک ریشم کا اور دبیز ریشم کا سبز لباس ہوگا اور اُنہیں چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے اور اُن کا پروردگار اُنہیں نہایت پاکیزہ شراب پلائے گا۔ (اُنہیں کہا جائے گا) یہ تمہارا صلہ ہے اور (مبارک ہو) تمہاری کوششیں مقبول ہوئیں۔'' (الدھر: ۱۲۔۲۲)

(۷) ''اُس دن کتنے ہی چہرے بارونق ہوں گے' اپنی کاوشوں پر خوش ہوں گے' بہشتِ بریں میں ہوں گے' وہاں وہ کوئی لچر بات نہیں سنیں گے۔ اس میں بہتے ہوئے چشمے ہوں گے۔ اس میں اونچے اونچے تخت (بچھے) ہوں گے اور آبخورے (قرینے سے) رکھے ہوں گے' اور گاؤ تکیے قطار در قطار لگے ہوں گے' اور قیمتی قالین بچھے ہوں گے۔'' (الغاشیۃ : ۸۔۱۶)

مزید برآں قرآنِ حکیم کے تصوّرِ جمالیات کا تعلق براہِ راست روحانیت اور اخلاقی اقدار سے ہے جسے ہم ''پاکیزگی'' کا نام دیتے ہیں یا قرآنی اصطلاح میں اسے ''تقوٰی'' کہتے ہیں۔ اسلام کی اخلاقی اَقدار کو مضبوطی سے تھامنا مؤمن کی اِس زندگی میں بھی اور آخرت کی زندگی میں بھی حُسن اور نکھار لاتا ہے۔

تقوٰی کا مطلب ہے اللہ کی ناراضی سے ڈر کر گناہوں سے بچ جانا اِس یقین و ایمان کے ساتھ کہ اُس کے حضور جوابدہی ہونی ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے تمام شعبہ ہائے حیات میں ذمّہ داری اور ایمانداری کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ یہ انسان کی نجات کے لئے اور عذابِ الٰہی سے بچنے کی ناگزیر شرط ہے۔

پھر تقوٰی میں کچھ اور بھی قابلِ ستائش اوصاف شامل ہیں جیسے بندگانِ خدا سے محبت و ہمدردی' رحم

دلی' بے غرضی' ایثار و قربانی، خلوص اور سخاوت وغیرہ۔ رُوحانیت الٰہی روح کا دوسرا نام ہے جو حیوانی روح سے بلند تر اور عظیم تر ہے اور جو حیوانی روح کو مغلوب کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ''فِیہِ مَا فِیہِ'' میں جلال الدین رومی کہتے ہیں:

''افسوس تو یہ ہے کہ انسان اُس خوراک پر مطمئن ہو جاتا ہے جو اُس کا گدھا بھی کھاتا ہے۔''

یعنی اگر انسانی زندگی کا مقصد صرف کھانا پینا ہی ہے تو انسان اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ انسان اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ' اشرف المخلوقات اور الٰہی تخلیق کا شاہکار جیسے عظیم القابات کا مصداق صرف اُسی وقت ثابت کر سکتا ہے جب وہ حیوانی جبلّت کو لگام دے اور اپنی ملکوتی (فرشتوں جیسی) صفت کو تقویت دے۔ اُس کے جسم کا تعلق مادّی دنیا سے ہے اور اپنی بقا کے لئے (مادّی) خوراک چاہتا ہے لیکن چونکہ روح کا تعلق روحانی دنیا سے ہے' لہٰذا اُسے اپنی بقا کے لئے روحانی غذا چاہئے جس کے بغیر وہ بے چین ہو جاتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے جسم مادّی خوراک کے بغیر بے چین ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی بے چینی' مایوسی' بیزاری اور باہمی آویزش محض روح انسانی کی بے چینی کا نتیجہ ہیں کیونکہ اُسے روحانی غذا نہیں دی جا رہی۔ اگر اُسے یہ غذا مل جائے تو زندگی میں جمالیات کا پہلو نکھر کر سامنے آ جائے۔

سورۃ التّین کی آیات ۴' ۵ کے حوالے سے عبدالرحمٰن جامی نے اپنے ''لوائح'' میں بیان کیا ہے کہ ''جسمانی لحاظ سے انسان ذلت کی انتہائی گھٹیا سطح پر ہے لیکن روحانی طور پر وہ شرافت و نجابت کے نقطۂ عروج پر ہے۔''

سورۃ الحِجر کی آیت ۲۹ فَاِذَا سَوَّیتُہٗ وَنَفَخْتُ فِیہِ مِنْ رُّوحِی (جب میں آدم کو بنا لوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں ۔۔۔۔) کے ضمن میں کیپٹن واحد بخش ربّانی لکھتے ہیں:۔

''روح چونکہ اللہ کے قریب ہے' اس لئے وہ ہمیشہ اُس کا قُرب اور اُس سے گہرا تعلق قائم کرنے کے لئے بے قرار رہتی ہے۔ روح کی اللہ کے ساتھ اِس قربت کے تین پہلو ہیں: اوّل یہ احساس کہ وہ اُس کی محتاج ہے اور اِس وجہ سے وہ اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتے ہوئے (قول و فعل میں) اپنا سراپا اُس کے سپرد کر دیتی ہے اور اُس کی حمد و ثنا اور عبادت میں مگن رہتے ہوئے اُس کی رحمت وعنایت کی خواستگار رہتی ہے۔ دوم یہ کہ اُس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اُسے راضی رکھے' اُس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے اور اُس

کی خوشنودی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہے۔ سوم یہ (اور یہ روح کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے) کہ وہ اللہ کا وصل (ملاپ) پائے تاکہ وہ اُس کا آئینہ نور بن جائے اور اپنی نا تمام تکمیل کو اُس کی تکمیل کا عکس بنا دے۔ کیونکہ روح میں قدرتی طور پر اللہ کی محبت موجود ہے' اِس لئے وہ تمام اوصاف الٰہی سے محبت کرتی ہے۔ روح انسان میں پاکیزگی' نفاست' شائستگی' حُسن' نور اور ہم آہنگی پیدا کرتی ہے اور اِن اوصاف کی مخالف باتوں یعنی گندگی' بیہودگی اور آلودگی سے نفرت کرتی ہے۔ تاہم روح مکمل طور پر اللہ کی جانب مائل نہیں ہوتی بلکہ دوسری ارواح کی طرف بھی مائل ہوتی ہے۔ چونکہ روح قدرتی طور پر الٰہی اوصاف کا پرتو عکس) ہے اور حدیث تَخَلَّقُوْا بِأَخْلَاقِ اللهِ (اپنے اندر رحم وعفو جیسے خدائی اوصاف پیدا کرو) اور فرمودہِ خداوندی وَسِعَتْ رَحْمَتِيْ كُلَّ شَيْءٍ [میری رحمت ہر شے کا احاطہ کئے ہوئے ہے (سُورَةُ الاعـــراف: ۱۵۶)] کی رُو سے اُس کا رویّہ دوسری ارواح کی طرف ہمدردی اور نرم دلی کا ہوتا ہے۔ جب روح کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے تو اُس سے بے غرضی' خلوص اور فیاضی کے چشمے پھوٹتے ہیں جو محبت لنڈھاتے ہیں۔ اور جب روح بذاتِ خود رُوحانی فیض سے متور رہوتی ہے تو یہ نہ صرف دوسری ارواح کی طرف دستِ سخا بڑھاتی ہے بلکہ اُن سے قوّت اور دل کی روشنی بھی اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ اس طرح اتنے اچھے طریقے سے یہ دونوں ایک دوسرے کی ترقی اور نشوونما میں حصّہ دار بنتے ہیں۔ اِس کے برعکس انسانی روح اُن لوگوں سے نفرت کرتی ہے جو اپنے آپ کو (جہالت کی) تاریکی اور بُرائی کے پردے میں ڈھانپے رکھتے ہیں اور اِس طرح اللہ سے دشمنی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یہ نفرت شدید غصّے میں بھی بدل سکتی ہے لیکن اُس غصّے اور بیزاری میں بھی رحم کا پہلو چھپا ہوتا ہے جو اُن کی بدی کو نیکی میں بدلنے کا خواہاں ہوتا ہے اور بالآخر اُن کی نجات کی اُمّید رکھتا ہے کیونکہ روح کی فطرت اُس عظیم ترین روح کی طرز پر ہے جو رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْن (تمام جہانوں کے لئے رحمت) ہے۔" ("Islamic Sufism" -- Capt. Wahid Bakhsh Rabbani, pp. 173-174)

چند ایک قرآنی آیات جن میں تقوٰی کی افادیت بیان کی گئی ہے' درج ذیل ہیں:۔

(۱) وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰى آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَأَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ٥ (الاعراف: ۹۶)

(۲) يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِنْ تَتَّقُوا اللهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (الانفال: ۲۹)

(i) "اور اگر بستیوں والے ایمان لے آئے ہوتے اور پرہیزگاری اختیار کی ہوتی تو ہم اُن پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے لیکن اُنہوں نے تو جھٹلایا' سو ہم نے اُن کے کرتوتوں کی پاداش میں اُنہیں پکڑ لیا۔"

(ii) ''اے اہلِ ایمان! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تم میں حق و باطل میں تمیز کی قوت پیدا کر دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دُور کر دے گا اور تمہیں بخش دے گا۔''

اوپر سورۃ الاعراف کی آیت ۹۶ میں خدائی قانون بیان کیا جا رہا ہے کہ اگر لوگ ایمان اور تقوٰی کی زندگی اختیار کریں تو آسمانی اور زمینی برکتیں اور فیضانِ رحمت ہر آن اُن کے شاملِ حال رہیں گے۔

اور سورۃ الانفال کی آیت ۲۹ میں متقی مؤمنین سے وعدہ کیا جا رہا ہے کہ تقوٰی اختیار کرنے سے اُنہیں جبلّی طور پر صحیح اور غلط کا احساس ہوگا اور وہ جائز اور ناجائز، حلال اور حرام میں حدِّ فاصل قائم کر سکیں گے، اُنہیں غیر معمولی عزّت و وقار ملے گا جو اللہ کے نیک بندوں کا امتیازی وصف ہے، اُن کے لئے دوسروں کے دلوں میں عزت و محبت پیدا ہوگی اور اُن پر اللہ کی خاص عنایت ہوگی جس کے ذریعے وہ حیرت انگیز طور پر اپنی کوششوں میں کامیاب و کامران ہوں گے۔ لفظِ فُرقان اِن تمام خوبیوں کو شامل ہے۔ ربّ کریم نے اِن قابلِ رشک نعمتوں کا وعدہ مؤمنین اور اپنے پارسا بندوں سے کیا ہے۔ اِس زندگی میں اور آخرت کی زندگی میں اُن کی بخشش کی نوید اِس کے سوا ہے۔

قرآنِ حکیم تقوٰی کی طرف بلانے میں ترغیبی اور ترہیبی (ڈرانے والے) دونوں طریقے اختیار کرتا ہے۔ درجِ بالا دونوں آیات میں ترغیبی طریقہ ہے جبکہ ذیل کی دو آیات میں ترہیبی طریقہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ اِن دونوں طریقوں میں سے کسی ایک یا دونوں کو اختیار کر کے انسان جمالیات کا نمونۂ کمال بن جائے:

(۱) یٰٓاَیُّھَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ○ یَوْمَ تَرَوْنَھَا تَذْھَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَھَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ○ (الحج : ۱، ۲)

(۲) یٰٓاَیُّھَاالنَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ وَاخْشَوْا یَوْمًا لَّا یَجْزِیْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِہٖ وَلَا مَوْلُوْدٌ ھُوَ جَازٍ عَنْ وَّالِدِہٖ شَیْئًا اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَلَا یَغُرَّنَّکُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ○ (لقمٰن : ۳۳)

(i) ''لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے (کیونکہ) قیامت (کے دن) کا زلزلہ بڑی سخت چیز ہے، جس دن تم دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے (بچہ) کو بھول جائے گی اور ہر حمل والی اپنا حمل گرا دے گی اور لوگ تجھے نشہ میں دکھائی دیں گے حالانکہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے بلکہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہوگا۔'' (الحج : ۱، ۲)

(ii) ''لوگو! ڈرو اپنے پروردگار سے اور اُس دن کا خوف رکھو جب نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کی طرف سے کچھ بدلہ ہو سکے گا اور نہ ہی بیٹا اپنے باپ کی طرف سے کوئی بدلہ بن سکے گا۔ اللہ کا وعدہ بالیقین سچا ہے' سو دُنیوی زندگی تمہیں ہرگز دھوکے میں نہ ڈال دے اور نہ کہیں وہ بڑا فریبیا تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکہ میں رکھے۔'' (لقمٰن: ۳۳)

غَـــرور ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غفلت اور دھوکہ میں ڈال دے۔ مال ہو' یا جاہ و منصب' خواہشِ نفسانی ہو یا خود شیطان ہو۔ یہاں مراد شیطان ہے جیسا کہ ابن عباس' عکرمہ' قتادہ' مجاہد اور ضحاک رضی اللہ عنہم جیسے اَجل صحابہ و تابعین سے مروی ہے۔

اوپر کی آیات ایک مسلمان کی زندگی میں تقویٰ کی اہمیت اور اِس مخلصانہ کوشش کو اجاگر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وہ بغیر کسی مکر و ریا اور تصنّع کے تمام زندگی اللہ جل شانہٗ کی تابعداری اور تعمیلِ احکام میں گزار دے۔ ایمان کی تجدید اور دلوں میں خالقِ حقیقی سے محبت کی چنگاری روشن کرنے کی خاطر کچھ اور آیات ہدیہ قارئین کی جاتی ہیں جن میں فرمایا گیا:۔

(۱) وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍo جَنّٰتِ عَدْنٍ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُo مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّ شَرَابٍo وَ عِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ'' o هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِo اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَالَهٗ مِنْ نَّفَادٍo (صٓ: ۴۹۔۵۴)

(۲) اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًاo حَدَآئِقَ وَ اَعْنَابًاo وَّ كَوَاعِبَ اَتْرَابًا o وَّ كَاْسًا دِهَاقًاo لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا o جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ عَطَآءً حِسَابًاo (النّبا: ۳۱۔۳۶)

(i) ''اور پرہیزگاروں کے لئے (جنّت) اچھا ٹھکانہ ہے یعنی ہمیشہ رہنے کے باغات جن کے دروازے اُن کے لئے کُھلے ہوں گے۔ اُن (باغوں) میں وہ تکیہ لگائے ہوں گے اور وہاں وہ بہت سے میوے اور پینے کی چیزیں منگوائیں گے۔ اور اُن کے پاس نیچی نگاہ والیاں (عمر' جمال و کمال میں) ہم شکل (حُوریں) ہوں گی۔ یہی وہ (نعمت) ہے جس کا وعدہ تم سے روزِ حساب کے آنے پر کیا جاتا تھا۔ بے شک یہ ہماری عطا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگی۔'' (صٓ: ۴۹ ۔ ۵۴)

(ii) ''بلاشبہ پرہیزگاروں کے لئے کامیابی (ہی کامیابی) ہے یعنی باغات' انگور اور چھلکتے ہوئے جام۔ وہاں وہ نہ کوئی بیہودہ بات سنیں گے اور نہ ہی جھوٹ۔ یہ بدلہ ہوگا آپ کے رب کی طرف سے کافی انعام۔'' (النّبا: ۳۱۔۳۶)

حَدَائِق جمع ہے حَدِیقَة کی بمعنیٰ وہ باغ جس کے اردگرد چار دیواری تعمیر کر دی گئی ہو۔ یہ انعام و اِکرام کیونکہ صالحین کے نیک اعمال کے عوض ہے اس لئے اُسے جزاء کہا گیا اور چونکہ اس میں اُس کا احسان جلوہ نما ہے اس لئے اُسے عَطاء کہا گیا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے عَطاء کا معنیٰ کَثِیرًا بتایا ہے یُقَالُ اَحْسَبْتُ فُلَانًا أَیْ کَثُرْتُ لَهُ الْعَطَاءَ حَتّٰی قَالَ حَسْبِیْ یعنی جب کوئی چیز اِتنی وافر مقدار میں دی جائے کہ وہ خود کہہ اٹھے بس بس، مجھے اِتنا کافی ہے تو لغتِ عرب میں کہتے ہیں اَحْسَبْتُ فُلَانًا میں نے اُسے بہت عطا کیا۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ کے الفاظ اہلِ محبت کے لئے اپنے اندر خصوصی کشش رکھتے ہیں۔ جب دوزخیوں کی سزا کا ذکر ہوا تو صرف جَزَآءً وِّفَاقًا فرمایا گیا اور جب اہلِ جنت پر اپنے جُود و کرم کی بارش فرمانے کا موقع آیا تو اُس کو اپنی ذات کی طرف منسوب کیا اور اپنی شانِ ربوبیّت کی اضافت اپنے حبیب مکرّم کی طرف فرما دی۔ رب تو وہ سب کا ہے لیکن صفتِ ربوبیت کا جو خصوصی تعلّق ذاتِ پاک مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثناء سے ہے، وہ کسی اور کو نصیب نہیں، نہ عرش کو، نہ کرسی کو، نہ جبریل کو اور نہ ہی نوح و خلیل کو۔

اللہ کے سچّے، وفادار بندے کتنے اچھے نصیبے والے اور قابلِ رشک ہیں جو باغِ عدن کی تمام لازوال آسائشیں ملنے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق و مالک کی نگاہِ کرم اور اُس کے قرب میں ہوں گے۔ یہ وہ مقام ہے جو کسی اور کو نصیب نہ ہوگا۔

تقوٰی کے علاوہ کچھ اور اَخلاقی اَقدار پر عمل جن کا ذکر قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں آیا ہے، بھی مؤمن کی زندگی میں حُسن اور نکھار پیدا کرتے ہیں۔ وہ اَخلاقی اَقدار حسبِ ذیل ہیں :۔

طہارت (صفائی) : اسلام شروع ہی طہارت سے ہوتا ہے۔ طہارت کی مختلف اَقسام ہیں مثلاً لباس، جسم، خیالات، کھانے پینے میں، کمانے اور خرچ کرنے میں طہارت جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات سے ظاہر ہے:

(۱) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرۃ : ۱۶۸)

(۲) اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ ○ (اَلْبَقَرَة : ۲۲۲)

(۳) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ (اَلْبَقَرَة : ۲۶۷)

(۴) وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (اَلْمَائِدَة : ۶)

(۵) فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ○ (اَلتَّوبَة : ۱۰۸)

(۶) وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْo وَ الرُّجْزَ فَاهْجُرْo (اَلْمُدَّثِّر : ۴، ۵)

(i) "اے انسانو! زمین پر جو کچھ حلال اور پاکیزہ موجود ہے اُس میں سے کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو' کوئی شک نہیں وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔"

(ii) "بے شک اللہ توبہ کرنے والون اور پاک وصاف رہنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔"

اسلام میں طہارت کو جو اہمیت حاصل ہے' اُس کا موازنہ قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دَور کے عیسائی پادریوں اور اُن کے علماء سے کیجئے:۔

"۳۷۳ء سے عیسائی دُنیا میں بزرگوں کا ایک خاص نشان امتیاز گندگی اور بیماری بن گیا تھا۔ (گندگی اور عفونت میں لتھڑے) قابلِ نفرت فقیر اپنی گندگی اور پھوڑوں کو اہلِ ایمان کے لئے بہ طورِ احترام پیش کرتے تھے۔"

(iii) "اے ایمان والو! جو تم نے کمایا ہے' اُس میں سے عمدہ چیزیں خرچ کرو اور خراب چیز کا قصد بھی نہ کرو کہ اس میں سے خرچ کرو بجز اُس صورت کے کہ اُس میں چشم پوشی ہی کر جاؤ۔"

یعنی ایسی ناکارہ' ردّی اور ناقص چیزیں اگر خود تمہیں ملنے لگیں تو تم لینا گوارا نہ کرو سوائے اُس صورت کے کہ تم ارادۃً ان کی طرف سے چشم پوشی کر لو تو اللہ کی راہ میں تو ایسی چیزیں صَرف کرنے کا تو تمہیں خیال ہونا چاہیے۔

(iv) "اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو (سارا جسم) پاک وصاف کر لیا کرو۔"

(v) "اُس (مسجدِ قُبا) میں ایسے آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ خوب پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔"

(vi) "اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھئے اور بُتوں سے (حسبِ سابق) دُور رہیے۔"

فقہائے کرام نے سورۃ المدثر کی اِسی آیت ۴ سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ نماز کے لئے لباس کا پاک ہونا ضروری ہے اور جب لباس کا پاک ہونا ضروری ہے تو نمازی کا اپنا جسم اور وہ جگہ جہاں وہ نماز ادا کر رہا ہے' اُس کا بھی پاک ہونا بہ طریقِ اَولیٰ ضروری ہوگا۔ اس سے اگلی آیت ۵ کو دیکھئے کہ عقیدہ اور عمل کی ہر ظاہری اور باطنی نجاست سے حسبِ سابق پرہیز کرنے کی تاکید ہو رہی ہے کیونکہ ایک مبلّغ کا کام اُس وقت تک مؤثر نہیں ہوسکتا جب تک وہ خود ان برائیوں سے پاک وصاف نہ ہو۔ فرمادیا کہ وہ تمام گناہ جو اللہ کی ناراضگی اور عذاب کا باعث بنتے ہیں جن میں سب سے بڑا گناہ بُتوں کی پرستش ہے' اُن سے کنارہ کش رہیے ورنہ تبلیغ کی کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوں گی۔ رُجز (را کی پیش کے ساتھ) بمعنی بُت اور رِجز (را کی زیر کے ساتھ) بمعنی پلیدی' گناہ۔

(Hammerton's "Universal History of the World", Vol. IV, p. 2333) New York.

اِس سلسلہ میں رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔
اِنَّ اللّٰہَ طَیِّب" لَا یَقْبَلُ اِلَّا طَیِّبًا (بے شک اللہ صاف اور پاک ہے۔ وہ صرف پاکیزہ، عمدہ چیز ہی پسند فرماتا ہے۔)
اِس طرح طہارت اور پاکیزگی انسان کو اللہ کی محبت حاصل کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔

جسمانی طہارت کے حصول کے طریقے:

(۱) وضو : ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت پر پنجگانہ نماز فرض ہے۔ وضو کے بغیر نماز قابلِ قبول نہیں ہوتی اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔
لَا تُقْبَلُ صَلَاۃُ اَحَدِکُمْ اِذَا أَحْدَثَ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ (صحیح بخاری)
''جب تم میں سے کوئی بے وضو ہو جائے تو بغیر وضو کئے اُس کی نماز قبول نہیں ہوگی۔''

از روئے سورۃ المائدۃ آیت ۶، وضو کے چار فرائض ہیں: (۱) چہرے کا دھونا (۲) ہاتھوں کا کہنیوں تک دھونا (۳) سر کا مسح کرنا (۴) پاؤں کا ٹخنوں تک دھونا۔

وضو ایک ہی وقت میں کیا جائے۔ اعضاء کے دھونے میں وقفہ اور تاخیر نہ ہو۔ اس لئے کہ عبادت شروع کرنے کے بعد اُسے منقطع کرنا ممنوع ہے۔ (منہاج المسلم از ابوبکر جابر الجزائری، ص ۳۰۰)

وضو کی اہمیت وفضیلت پر زور دیتے ہوئے ختمی مرتبت پیغمبر ﷺ نے فرمایا:۔
(۱) مِفْتَاحُ الْجَنَّۃِ الصَّلَاۃُ وَ مِفْتَاحُ الصَّلَاۃِ اَلْوُضُوْءُ (مُسند امام احمد)
(۲) اَلَا أَدُلُّکُمْ عَلٰی مَا یَمْحُوا اللّٰہُ بِہِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِہِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوْا بَلٰی یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ : اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَی الْمَکَارِہِ وَالْخُطَا اِلَی الْمَسْجِدِ وَانْتِظَارُ الصَّلَاۃِ بَعْدَ الصَّلَاۃِ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ (صحیح مسلم)
(۳) اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوِالْمُؤْمِنُ فَغَسَلَ وَجْھَہٗ، خَرَجَتْ مِنْ وَجْھِہٖ کُلُّ خَطِیْئَۃٍ نَظَرَ اِلَیْھَا بِعَیْنَیْہِ مَعَ الْمَاءِ أَوْ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ وَاِذَا غَسَلَ یَدَیْہِ خَرَجَتْ کُلُّ خَطِیْئَۃٍ بَطَشَتْھَا یَدَاہُ مَعَ الْمَاءِ أَوْ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ حَتّٰی یَخْرُجَ نَقِیًّا مِّنَ الذُّنُوْبِ (مؤطا امام مالک)
(i) ''جنت کی کنجی نماز ہے اور نماز کی کنجی وضو ہے۔''

(ii) "کیا میں تمہیں گناہوں کے مٹانے اور درجات کو بلند کرنے والی چیزیں نہ بتادوں؟" صحابہ نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فرمایا: "ناپسندیدگی کے باوجود مکمل وضو کرنا اور مساجد کی طرف چلنا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا' یہ دشمن کے مقابلے میں اپنے آپ کو تیار رکھنا ہے۔"

(iii) "مؤمن جب وضو کرنے میں چہرہ دھوتا ہے تو آخری قطرۂ پانی کے ساتھ اُس کے چہرے سے وہ سارے گناہ ساقط ہوجاتے ہیں جن کی طرف اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جب ہاتھ دھوتا ہے تو آخری قطرۂ پانی کے ساتھ اُس کے ہاتھوں کے وہ گناہ گر جاتے ہیں جن کو اُس کے ہاتھوں نے پکڑا تھا حتّٰی کہ (وضو کرنے کے بعد) وہ گناہوں سے صاف ہوکر نکل جاتا ہے۔"

(۲) جمعہ کے دن غسل کرنا: حفظانِ صحت کے اصولوں کے مدّنظر روزانہ کے غسل کی اہمیت اپنی جگہ لیکن جمعہ کے دن کے غسل کی اہمیت کسی طرح کم نہیں۔ اس کی فضیلت کے بارے میں دو احادیث درج ذیل ہیں:

(i) "نمازِ جمعہ کو جانے سے پہلے نمازی کو غسل کرلینا چاہئے۔" (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

(ii) "اگر کوئی نمازِ جمعہ کے لئے وضو کرتا ہے تو ٹھیک لیکن اگر کوئی غسل کرتا ہے تو یہ اور بھی اچھا ہے۔"
(ابوداوٗد' احمد' نسائی' ترمذی' دارمی)

(۳) غسل کب واجب ہوتا ہے؟ مندرجہ ذیل حالات میں غسل بہرحال واجب ہوجاتا ہے:

(الف) جنابت یا احتلام کے بعد: مادہ منویہ کے اخراج سے خواہ وہ جنابت کے نتیجہ میں ہو یا بحالتِ نیند احتلام کی صورت میں' غسل واجب ہوجاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا (المائدة:٦) "اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہوتو (سارا جسم) پاک وصاف کرلو۔"

نکتہ سنج فقہاء نے فَاطَّهَّرُوْا کے لفظ سے سارے جسم کے دھونے کا حکم نکالا ہے اور محض کچھ اعضاء کے دھوڈالنے کو کافی نہیں سمجھا۔ غسلِ واجب میں کلی' غرغرہ اور ناک میں پانی لینے کا حکم بھی یہیں سے پیدا ہوا۔

(ب) عورتوں کے لئے حیض کے بعد: ایسی عورتوں کے لئے قرآن وحدیث میں حکم بالترتیب یوں ہے:

(i) "عورتوں کے حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہا کرو اور اُن کے نزدیک نہ جایا کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔" (البقرة:۲۲۲)

(ii) "حیض کے ایام ختم ہونے کے بعد عورتوں کو بہرصورت غسل کرلینا چاہئے۔" (بخاری' مسلم)

نوٹ: حیض والی عورت سے جماع کرنے کے خطرات "میڈیکل سائنس" اور "پیتھالوجی" کے عنوانات کے تحت بیان کئے جائیں گے۔

(ج) بچے کی پیدائش کے بعد جب خون آنا بند ہوجائے تو عورت کو پاک وصاف ہونا فرض ہوجاتا ہے۔

(۴) لباس کی صفائی: جسم کی صفائی کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث میں لباس کی صفائی پر بھی زور دیا گیا ہے چنانچہ سُورَۃُ الاعراف کی آیت ۲۶ میں ارشاد ہوا :۔

یٰبَنِیْۤ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَیْرٌ

"اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا ہے جو تمہاری شرم گاہوں کو ڈھانپتا ہے اور باعثِ زینت ہے اور پرہیزگاری کا لباس سب سے بہتر ہے۔"

اَنْزَلْنَا کا لغوی معنی تو اوپر سے نیچے اتارنا ہے۔ یہاں لباس کے لئے اس کا استعمال بطورِ مجاز ہے یعنی بارش جو کپاس وغیرہ کی روئیدگی اور حیوانات (جن کی اون سے گرم کپڑے بنتے ہیں) کی زندگی کا سبب ہے' چونکہ اوپر سے نازل ہوتی ہے تو گویا لباس بھی اوپر ہی سے نازل ہوا۔ بعض علماء نے کہا کہ اَنْزَلْنَا بمعنی خَلَقْنَا (ہم نے پیدا کیا) ہے۔ اس لفظ میں لباس کی برکتوں کی طرف اشارہ ہے کہ گویا وہ آسمان سے اترا ہوا ہے۔ غور کیا جائے تو ہر لباس اپنی تیاری کے لئے آسمانی اسباب کا ہی محتاج نظر آئے گا۔

آیتِ بالا میں یُوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ اور رِیْش کے الفاظ لباس کے مقاصد کو بیان کرتے ہیں۔ لفظ سَوْأَۃ جسم کا وہ حصہ ہے جس کا ننگا کرنا بُرا اور قبیح ہو یعنی مرد کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک ڈھانپنا ضروری ہے اور عورت کے لئے نامحرم سے سارے بدن کا ڈھانپنا لازمی ہے۔ رِیْش کا معنی پرندے کے بال و پر کے ہیں جو اُس کے لئے زیب و زینت کا باعث بھی ہیں (مفردات امام راغب اصفہانی)۔ اسی طرح لباس انسان کے لئے زیب و زینت کا باعث ہے۔ ہربرٹ سپنسر اور ویسٹر مارک وغیرہ مغربی فلسفیوں نے بھی لباس کا ایک مقصد زینت و آرائش ہی بتایا ہے (ماجدی ص ۳۲۸)۔ تو گویا قرآن کے نزدیک لباس کے دو مقاصد ہیں: سترِ عورت اور زیب و زینت۔ لباس و حجاب مقاصدِ شرعی میں سے ہیں اور برہنگی و نیم برہنگی کا فلسفہ خواہ اُس کی تبلیغ یورپ اور امریکہ سے ہو رہی ہو یا اس کی ترویج وحشی اور غیر مہذب قوموں میں' بہرحال ایک شیطانی فلسفہ ہے۔

فرمایا کہ تقوٰی کا لباس سب سے بہتر ہے اور دنیا کا کوئی قیمتی سے قیمتی لباس بھی اس کی خوبصورتی اور پائیداری کا مقابلہ نہیں کر سکتا :۔

اِذَا الْمَرْءُ لَمْ یَلْبَسْ ثِیَابًا مِّنَ التُّقٰی ۔۔۔ تَقَلَّبَ عُرْیَانًا وَّاِنْ كَانَ كَاسِیَا

'جب تک انسان تقوٰی کا لباس زیبِ تن نہ کرے گا تو وہ ننگا ہے اگرچہ اُس نے کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔'

وَخَیْرُ لِبَاسِ الْمَرْءِ طَاعَةُ رَبِّهٖ ۔۔۔ وَلَا خَیْرَ فِیْمَنْ كَانَ لِلّٰهِ عَاصِیَا

'اطاعتِ الٰہی سب سے بہتر لباس ہے اور اللہ کے نافرمان میں نام کو بھلائی نہیں ہے۔'

محتویات (CONTENTS)

''لِبَاسُ التَّقْوٰی شرم وحیا' پاکدامنی اور پاکبازی' خوفِ خدا اور اپنے خالق کے لئے احساسِ عبدیت کی طرف اشارہ کررہا ہے۔ جب تقوٰی کی خلعت کسی کو عطا کی جاتی ہے تو اُس کا حسن اور عزت واحترام دیدنی ہوتے ہیں۔شکلِ انسانی میں وہ دراصل انسانوں کے درمیان فرشتہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ فرشتے اُس پر رشک کرتے ہیں۔اِسی وجہ سے فرمایا گیا کہ تقوٰی تمام لباسوں میں بہترین ہے۔'' (''تدبّرِ قرآن'' ۔۔امین احسن اصلاحی)

''لفظِ تقوٰی کا یہ بھی مطلب ہے کہ جسم کی عریانیت اور ننگے پن کو ظاہری لباس سے ڈھانپا جائے تاکہ اللہ کا خوف پیدا ہو۔ یہ اس لئے ہے کہ تقوٰی خود کو ایسے لباس میں خود بخود ظاہر کرتا ہے جو عمدہ ہونے کے ساتھ ساتھ جسم کو اچھی طرح ڈھانپے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اچھا لباس پہننے سے انسان کے اَخلاق پر بھی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔'' (''معارف القرآن'' ۔۔۔مفتی محمد شفیع' ج ۳' ص ۵۳۶)

سادہ لباس بھی ستر پوشی کرتا ہے لیکن اُس کریم خالق نے اپنے نائب حضرتِ انسان پر اپنی عنایات کی تکمیل کے لئے کمال شفقت کے ساتھ ایسے لباس کا اہتمام کیا ہے جو اُسے ڈھانپتا بھی ہے اور اُسے گرمی اور سردی سے بچاتا بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اُس کی شخصیت کا آئینہ دار بھی ہے اور اُس کے حسن و وقار میں اضافے کا موجب بھی۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ ہرگز نہ سمجھنا چاہئے کہ قیمتی اور بھڑکیلا لباس خوبصورتی اور جمالیات کا مظہر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ زندگی کی حقیقت کو پانے کا صحیح اور درست طریقہ اپنی ذاتی خواہشات اور رضائے الٰہی کے درمیان توازن برقرار رکھنا ہے کہ زندگی کی خوشیوں سے بھی لطف اندوز ہوں اور نیکی اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ بھلائی اور خیرخواہی کرنے کے کاموں میں بھی حصّہ لیں۔لہٰذا لباس اپنی حیثیت کے مطابق ہو ایسا نہ ہو کہ مالدار ہونے کے باوجود وہ مفلس وقلاش نظر آئے اور نہ ہی اس سے دولت کا غرور جھلکتا ہو یا مالداری کا غیر معقول اظہار ہوتا ہو۔ چنانچہ حدیثِ نبوی ہے:۔

''عبداللہ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کے دل میں ذرّہ بھر بھی غرور ہوگا' جنت میں داخل نہ ہوگا۔ایک شخص نے کہا کہ ہر شخص اچھا لباس اور اچھے جوتے پہننا پسند کرتا ہے (تو کیا یہ بھی غرور ہوگا؟) اس پر آپ نے فرمایا کہ اللہ خود لطیف ہے اور لطافت کو پسند فرماتا ہے۔'' (صحیح مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ عمدہ لباس غرور اور تکبر کا نام نہیں ہے بلکہ تکبر اپنے ابنائے جنس کے حقوق کو غصب کرنے اور اُنہیں حقارت اور کم نگاہی سے دیکھنے کا نام ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ :

(۱) ''اللہ اُسے عزت وشرافت کا لباس پہنائے گا جو وسائل اور قدرت رکھنے کے باوجود اللہ کے آگے عاجزی

اور اُس کی بندگی کی خاطر لباس میں سادگی کو اپناتا ہے۔'' (ابوداؤد)
(۲) ''لباس میں سادگی ایمان کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔'' (ابوداؤد)

(۵) دانتوں کی صفائی: مندرجہ ذیل احادیث دانتوں کی صفائی کی اہمیت پر زور دیتی ہیں
(۱) ''وہ نماز جس سے پہلے مسواک کر لیا جائے' اُس کا اجر اُس نماز سے ستّر گنا زیادہ ہے جس میں مسواک نہ کیا جائے۔'' (شرح الایمان۔۔بیہقی)
(۲) ''اگر مجھے اپنی اُمّت پر مشقت کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں اُنہیں حکم دیتا کہ وہ نمازِ عشاء میں تاخیر کریں اور ہر نماز سے پہلے مسواک کیا کریں۔'' (بخاری' مسلم)
(۳) ''مسواک منہ کو صاف رکھنے کا ایک طریقہ ہے اور خالق کو پسند ہے۔'' (نسائی' احمد' دارمی)
(۴) ''فرشتہ جبریل میرے پاس جب بھی آیا' مجھے مسواک کرنے کی ترغیب دی۔'' (احمد)

(٦) آرائشِ گیسو: بکھرے ہوئے' گندے بال نبی اکرم ﷺ کو پسند نہیں تھے۔ آپ ہمیشہ اِس بات کی تلقین فرماتے تھے کہ بال سنورے ہوئے ہوں اور اُن میں کنگھا کیا ہؤا ہو۔ ایک موقع پر فرمایا:
''جس کے بال ہوں' اُسے اُن کا اِعزاز و اِکرام کرنا چاہئے۔'' (یعنی کنگھی سے سنوارے ہوئے ہوں)

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ رسولِ مکرّم ﷺ کے بالوں میں کنگھا کیا کرتی تھیں۔ وہ یہ بھی فرماتی ہیں کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کو عمدہ ترین خوشبو بھی لگاتی تھیں جو اُنہیں مل سکتی یہاں تک کہ وہ خوشبو سرمبارک پر چمکنے لگتی۔

''ایک دفعہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کے پاس اِس حال میں آیا کہ اُس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آپ نے اُس سے کچھ اشارے کئے جن کا مطلب یہ تھا کہ وہ بالوں میں کنگھا کر لے۔ اُس نے ایسا ہی کیا۔ اُس کی واپسی پر آپ نے اُس سے فرمایا: کیا یہ بات اِس سے بہتر نہیں کہ انسان شیطان کی صورت میں بکھرے ہوئے بالوں سے آئے؟''

صفائی پر پیغمبرِ اسلام کی اِس قدر زبردست تاکید کا موازنہ عیسائیت کی ابتدائی صدیوں سے کیجئے:
''بدن کی صفائی کو روح کی آلودگی سمجھا جاتا تھا۔ وہ بزرگ جن کی بہت زیادہ تعریف کی جاتی تھی' وہ وہ تھے جن پر مٹی اور گندگی کی دبیز تہہ جم چکی ہوتی تھی۔ سینٹ ایتھاناسیئس نے بڑے جوش وخروش

سے بیان کیا کہ شہنشاہیت کے سربراہ سینٹ انتھونی' بڑھاپے کی عمر میں بھی اپنے پاؤں دھونے کے جرم کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔۔۔۔ سینٹ یوفریکسیا نے ایک سوتیں اُن راہبات کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ اُن میں سے کسی نے کبھی پاؤں تک نہیں دھوئے تھے اور نہانے کے ذکر پر تو وہ کانپ اٹھتی تھیں۔"
("History of European Morals" -- Lecky, Vol. 2, p. 47)

"چوتھی صدی کی ایک پاکیزہ زائرہ بڑے فخر سے کہتی تھی کہ اُس نے اٹھارہ سال سے اپنا چہرہ اس ڈر کے مارے نہیں دھویا تھا کہ کہیں بپتسمہ کا متبرک تیل صاف نہ ہو جائے۔" (انسائیکلوپیڈیا برٹینکا' ج ا' ص ۴۹)

(۷) **طرزِ زندگی میں دل آویزی:** کچھ لوگ قرآنِ حکیم کی تعلیمات میں نفاست اور شائستگی کے عنصر کا انکار کرتے ہیں حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ قرآنِ مجید انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں حُسنِ ذوق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور مصیبت اور محرومی کی زندگی گزارنے والوں سے اس طرح سوال کرتا ہے:۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (الاعراف : ۳۲)

" اے نبی مکرّم! آپ (ان سے) پوچھئے کہ اللہ کی زینت کو جو اُس نے اپنے بندوں کے لئے بنائی ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے یہ چیزیں ایمان والوں کے لئے دنیا کی زندگی میں ہیں (اور) قیامت کے دن تو خالص (اُنہی کے لئے ہوں گی)۔ ہم اسی طرح آیات کو کھول کر اُن لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔"

زِيْـنَةَ اللّٰهِ میں لباسِ فاخرہ کے علاوہ جملہ سامانِ آرائش شامل ہیں۔ فقہاء و مفسرین نے آیت سے عید اور دعوت وغیرہ کے موقعوں پر خوش لباسی کے مستحب ہونے پر دلیل پکڑی ہے۔ محققین نے اس آیت سے یہ بھی اخذ کیا ہے کہ ذائقہ دار کھانے بجائے خود ہرگز قابلِ ترک نہیں چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے محض لذّت کی بنا پر کسی بھی لذیذ غذا سے نہیں روکا البتہ شوق کی زیادتی اور لت کے باعث جو فکرِ آخرت سے روک دینے والی چیزیں ہیں' منع فرمایا ہے۔

قرآن مجید کی یہ آیت واضح طور پر ایک نفیس اور جمالیاتی زندگی کی طرف اللہ تعالیٰ کے رویّے کو ظاہر کر رہی ہے جہاں تمام جائز خوشیاں' آسائشات اور تفریحات کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ اُن سے مکمل طور پر فائدہ اٹھانے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ اَخْـرَجَ لِـعِبَـادِهٖ کے الفاظ سے ظاہر ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو یہ اختیار نہیں کہ اُن کے استعمال کو روک دے۔ ان آسائشات اور تفریحات کی اجازت انسانی تہذیب وثقافت کے مالا مال ہونے کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔

آیت کے الفاظ ھِیَ لِلَّذِیْنَ آمَنُوْا کے متعلق علامہ زمخشری نے کہا کہ لِغَیْرِھِمْ کی تصریح نہ کرنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ اُن نعمتوں کے اصلی حقدار تو مؤمنین ہی ہیں۔ اگر یہ نعمتیں دنیا میں کافروں کو بھی مل رہی ہیں تو یہ محض مؤمنین کی وجہ سے ہیں لیکن آخرت میں تو خاص الخاص بغیر کسی غیر مؤمن کی شرکت کے اُن خوش نصیبوں کے لئے ہوں گی جنہوں نے اپنے منعمِ حقیقی کو پہچانا اور اُس کی نعمتوں پر شکر ادا کیا لیکن وہ نادان جو عمر بھر اُس کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتے رہے لیکن اُس کریم کو نہ تو پہچانا اور نہ ہی اُس کا شکر ادا کیا' اُنہیں اُس روز محروم کر دیا جائے گا۔

آیت کے آخری حصے میں اُن لوگوں کے لئے تنبیہ اور سرزنش ہے جو اِن جائز آسائشات اور زندگی کی مسرتوں سے دُور رہ کر مذہب میں تنگ نظری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہا پسند ہو جاتے ہیں۔ وہ تنگ و افلاس کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اسے کارِ خیر سمجھتے ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا آف سیرۃ' ج ۸' ص ۸۰) سیرۃ فاؤنڈیشن لندن ۱۹۹۴ء

(۸) **تہذیب و ثقافت میں جمالیاتی پہلو:** اسلام نے انسان کو اتنی پاکیزہ' بلند اور عملی رہنمائی عطا کی ہے کہ اس پر عمل کرنے سے وہ نہ صرف اعلیٰ درجے کی روحانی زندگی گزار سکتا ہے (حوالہ کے لئے دیکھیے سورۃ النور کی آیتِ نور ۳۵) بلکہ وہ اُسے اللہ کی دھرتی پر اعلیٰ اور اکمل و مکمل تہذیب و ثقافت تخلیق کرنے کا ذریعہ بھی مہیا کرتی ہے۔ اسلام رہبانیت کے خلاف ہے (سورۃ الحدید: ۲۷) اور اِن آیات میں خانگی زندگی کا حکم دیا گیا ہے (البقرۃ: ۱۸۷' ۲۲۳ ؛ النساء : ۴' ۲۵ ؛ النور: ۳۲ ؛ الروم: ۲۱ ؛ الحجرات: ۱۳) یہ تمام آیات جنس کی جادوئی کیفیت اور ایک صحتمند اور ترقی پذیر ثقافت و تہذیب کے پروان چڑھنے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

(۹) **چال چلن اور طرزِ عمل میں جمالیاتی پہلو:** قرآنِ حکیم کے قائم کردہ سماجی اور اخلاقی رویے میں خوش اَخلاقی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے کیونکہ انسان کی اپنی روح کے جائزہ لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے اَخلاقی رویے کا جائزہ لے۔ اُس کا ظاہری رویہ محض اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ اُس کی اندرونی زندگی کیسی ہے۔ انسان کے اخلاقی رویے اور معیار اُس کی انسانیت دوستی کے عکاس ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلیت کے اعتبار سے روحانی نظام کے بعد اخلاقی نظام آتا ہے۔ اِس حُجت اور قیل و قال کی تصدیق مذہب سے بھی ہوتی ہے جو انسان کے طرزِ عمل کی نفاست کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ہمارے پیارے نبی ﷺ اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی مجسم اخلاق تھے۔ اپنی خوش اخلاقی کے بارے میں آپ نے فرمایا:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ وَفِیْ رِوَایَۃٍ اِنَّمَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً مُّھْدَاۃً

"یہی بات ہے کہ مجھے اخلاق کی اعلیٰ ترین قدروں کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ مجھے (تمام مخلوقات کے لئے) نعمتِ رحمت و ہدایت سے نواز کر بھیجا گیا ہے۔"

مختلف مقامات پر قرآنِ حکیم آپ کو اِنہی خداداد صفاتِ رحیمانہ پر بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتا ہے:۔

(۱) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ (آلِ عمران:۱۵۹)

(۲) لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۝ (التوبۃ : ۱۲۸)

(۳) وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِينَ ۝ (الانبیاء : ۱۰۷)

(۴) وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ ۝ (القلم : ۴)

(i) ''یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ آپ اُن کے ساتھ نرم خو ہیں اور اگر آپ تُند خو' سخت طبع ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے منتشر ہو گئے ہوتے۔'' (آلِ عمران : ۱۵۹)

(ii) ''بے شک تمہارے پاس تمہاری ہی جنس میں سے ایک پیغمبر آئے ہیں' جو چیز تمہیں نقصان دیتی ہے' اُنہیں بہت گراں گزرتی ہے' تمہاری بھلائی کے حد درجہ خواہاں ہیں' اہلِ ایمان کے حق میں تو بڑے ہی شفیق و مہربان ہیں۔'' (التوبۃ : ۱۲۸)

(iii) ''اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔'' (الانبیاء : ۱۰۷)

مولانا اشرف علی تھانوی نے اس آیت سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ مقبولین کی برکات اُن کے قصد کے بغیر بھی عالم کو پہنچتی رہتی ہیں جیسے آفتاب کی شعاعیں بلا اس کے قصد و علم کے سب کو پہنچتی رہتی ہیں۔ (ماجدی ص ۶۷۴)

(iv) ''اور بے شک آپ اَخلاق کے اعلیٰ مرتبہ پر ہیں۔'' (القلم : ۴)

آپ کے وصال کے بعد بھی آپ کا رویہ لوگوں کے لئے معیار تھا۔ دشمنوں کے لئے سخت گیر جب تک کہ وہ آپ کی مخالفت پر کمربستہ رہیں۔ تاہم آپ منتقم مزاج نہ تھے۔ وہ مفتوح کے سامنے بامروّت اور غیر مسلموں کے لئے شفیق اور متحمل مزاج تھے۔
Damer بحوالہ ("Islam in the World" -- Dr. Zaki Ali, p. 13)

لین پول نے کہا ''ظلم محمد (ﷺ) کی سرشت میں ہی نہ تھا۔''

باسورتھ سمتھ کا بیان ہے ''اُنہوں نے عمر بھر کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔۔۔۔ کوئی مصافحہ کرتا تو نہ وہ اپنا ہاتھ الگ کرنے میں پہل کرتے اور نہ از خود اُس سے الگ ہوتے۔ گفتگو بہت شیریں اور نرم کرتے۔''

ہسٹوریننز ہسٹری آف دی ورلڈ میں ہے: ''پیمبر کا میلانِ طبع ہمیشہ نرمی ہی کی جانب رہتا۔''

یہ نرمی اور ملاطفت شریعت کی حدود کے اندر تھی۔ دین کی توہین یا احکامِ دین کے اجراء کی ضرورت کے وقت سختی اور سزا دینا بھی آپ کی سنتِ مبارکہ میں ہے۔

قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر انسانوں کو ترغیباً (رغبت دلاتے ہوئے) اور ترہیباً (ڈراتے ہوئے) حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ساتھیوں سے حُسنِ سلوک سے پیش آئیں۔ مثلاً ذیل کی آیات:

(۱) وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ : ۸۳)

(۲) اِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ○ (الحج : ۳۸)

(۳) اَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَاتَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ (القصص : ۷۷)

(۴) وَلَاتُصَعِّرْخَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلَاتَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًااِنَّ اللّٰہَ لَایُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ○ (لقمٰن : ۱۸)

(۵) اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَاالَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ○ (فُصِّلَت: ۳۴)

(۶) وَلَاتَلْمِزُوْا اَنْفُسَکُمْ وَلَاتَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَالْاِیْمَانِ (الحُجُرات : ۱۱)

(۷) وَیْلٌ لِّکُلِّ ھُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ ○ (اَلْھُمَزَۃ : ۱)

(i) "اور لوگوں سے (بالعموم) بھلی بات کہتے رہو۔" (البقرۃ : ۸۳)

(ii) "بے شک اللہ کسی دغا باز ناشکرے کو پسند نہیں کرتا۔" (الحج : ۳۸)

(iii) "جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ حُسنِ سلوک کیا ہے، تو بھی (بندوں کے ساتھ) حُسنِ سلوک سے پیش آ اور روئے زمین پر فساد مت پھیلا۔" (القصص : ۷۷)

(iv) "اور لوگوں سے اپنا رخ مت پھیر اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ بے شک اللہ کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔" (لقمٰن : ۱۸)

(v) "آپ نیکی سے (بدی کو) ٹال دیا کیجئے تو پھر یہ ہوگا کہ جس شخص میں اور آپ میں دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائے گا جیسا کوئی ولی دوست ہوتا ہے۔" (فُصِّلَت : ۳۴)

بدی کا بدلہ بدی میں دینے سے عداوت بڑھتی ہے اور نیکی کرنے میں (بہ شرطِ سلامتِ طبع) عداوت گھٹتی ہے۔ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ نے صاف بتا دیا کہ یہ لازمی نہیں کہ اس برتاؤ کے بعد وہ دشمن دوست بن ہی جائے، البتہ وہ دوست کے مشابہ ضرور ہو جائے گا۔ مشہور غیر مسلم لیڈر گاندھی جی نے جو اپنا فلسفہ شانتی اور اہمسا کا چلایا ہے، عجب نہیں کہ اُس کا اصل ماخذ یہی آیتِ قرآنی ہو۔ (تفسیر ماجدی اردو، ص ۹۶۰)

(vi) "اور ایک دوسرے کو طعنہ نہ دو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو۔ ایمان کے بعد گناہ کا نام ہی برا ہے۔"

مسلمان پر گناہ کا نام لگنا ہی بُرا اور قابلِ نفرت ہے اور اِن حرکتوں کے بعد یہی کہا جائے گا کہ یہ مسلمان، مسلمان ہو کر اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ فقہاء نے فرمایا کہ کسی کو عیب دار نام سے یاد کرنا صرف اُس صورت میں حرام ہے جب وہ دل آزاری کا موجب ہو، لیکن اگر کوئی شخص پکارا اور پہچانا ہی ایسے نام سے جاتا ہے اور اُس میں وہ اپنی کوئی توہین محسوس نہیں کرتا تو اُسے اُس کے ظاہر میں عیب دار نام سے یاد کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مثلاً حکیم نابینا، لنگڑے حافظ، گنجے وکیل وغیرہ۔

(vii) "کم بختی ہے پسِ پشت عیب جوئی کرنے والے کے لئے اور طعنہ دینے والے کے لئے۔"

قرآنِ مجید کی مندرجہ بالا ہدایات اور احکامات کی تعمیل میں رسولِ مکرم ﷺ نے لائحہ عمل اختیار کیا اور فرمایا:

(۱) لَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ (صحیح بخاری)

(۲) لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا (صحیح بخاری ومسلم)

(۳) اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِىْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِىْ عَلَى الْعَنْفِ (مسلم مشکوٰۃ)

(۴) اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِىْ شَىْءٍ اِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَىْءٍ اِلَّا شَانَهٗ (مشکوٰۃ)

(۵) اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

(۶) اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَىَّ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا (بخاری، مشکوٰۃ)

(۷) اِنَّ اَثْقَلَ شَىْءٍ يُوْضَعُ فِىْ مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ وَاِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِىَّ (ترمذی، مشکوٰۃ)

(۸) اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ قَائِمِ الَّيْلِ وَصَائِمِ النَّهَارِ (ابوداؤد، مشکوٰۃ)

(i) "اللہ اُس شخص پر رحم نہیں فرماتا جو بندوں پر ترس نہیں کھاتا۔" (صحیح بخاری)

(ii) "وہ شخص ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا۔" (بخاری، مسلم)

(iii) "یقیناً اللہ نرمی اور رحم والا ہے، وہ نرمی اور رحمدلی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔"

(iv) "کسی چیز میں نرمی اُسے خوش نما بنادیتی ہے اور اگر کسی چیز سے نرمی نکال لی جائے تو اُسے بدنما بنادیتی ہے۔"

(v) "نیکی حُسنِ خُلق کا (دوسرا) نام ہے۔"

(vi) "دراصل تم میں مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ وہ شخص ہے جس کے اخلاق اچھے ہوں۔"

(vii) "قیامت کے دن مؤمن کے میزان (عمل) میں بھاری ترین چیز عمدہ اخلاق ہوگا، اور اللہ تعالیٰ فحش گو، بیہودہ گو سے بغض رکھتا ہے۔"

(viii) "مؤمن یقیناً اپنی خوش خُلقی کی وجہ سے شب بھر کے عبادت گزار اور دن بھر کے روزہ دار کا مقام پالیتا ہے۔"

(۱۰) رہائش گاہ میں جمالیاتی پہلو: انسان کا سب سے مقدم اور پہلا دائرہ عمل اُس کا گھر ہوتا ہے جہاں اُسے اپنی رفیقۂ حیات اور بچوں سے برتاؤ کرنا ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر اُسے اُن سے محبت وشفقت ہوتی ہے اور وہ اُن کی خاطر ہر قسم کی قربانی دیتا ہے جو نہ صرف انسان کا جبلّاتی تقاضا ہے بلکہ گھر کے ہر قوام کے لئے مذہبی فریضہ بھی ہے۔ اِس سلسلے میں قرآن وحدیث کی ہدایات درجِ ذیل ہیں جن پر عمل کرنے سے ازدواجی زندگی میں حُسن ونکھار آجاتا ہے:۔

(۱) وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (النّسَاء : ۱۹)
(۲) وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (الرّوم:۲۱)
(۳) خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ (جامع ترمذی)
(i) ''اور بیویوں کے ساتھ خوش اُسلوبی سے گزر بسر کیا کرو۔''
(ii) ''اور اُس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اُس نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس کی بیویاں بنائیں تا کہ تم اُن سے سکون حاصل کرو اور اُس نے تمہارے (یعنی میاں بیوی کے) درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کر دی۔''

یہ آیت اسلام کے مجلسی وخانگی نظامِ زندگی کے لئے سنگِ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں تین باتیں بطورِ اصل بیان ہوئیں: (۱) مردوں کو بتایا گیا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہاری ہی ہم جنس مخلوق ہیں۔ ترکیبِ حیات میں تمہاری ہی مثل، تمہاری ہی جیسی خواہشیں، جذبات واحساسات رکھنے والی مخلوق جو بے روح نہیں مِنْ أَنْفُسِكُمْ (۲) اُن کے پیدا کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ تمہارے لئے سرمایہ راحت وتسکین اور دلی سکون کا باعث ہوں اور تمہارا دل اُن سے لگے اور جی اُن سے بہلے۔ (۳) تمہارے آپس کے تعلّقات کی بنیاد ہی باہمی محبت، خلوص وہمدردی پر ہونی چاہئے۔ اِن حقائق سے ثابت ہوا کہ عورت مرد کی کنیز نہیں جیسا کہ بعض جہلاء اور دیگر مذاہب نے سمجھا اور اِس صنفِ نازک کے حقوق کو پامال کیا۔
(iii) ''تم میں سے اچھا وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے حق میں اچھا ہے۔'' (الحدیث)

گھر وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنے آپ کو ناموافق حالات سے محفوظ رکھتا ہے اور جس میں وہ تمام سماجی پابندیوں اور دباؤ سے آزاد ہوتا ہے۔ گھر جسم کے لئے آرام کی جگہ اور دماغ کے لئے راحت وسکون کی جگہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں پر اپنی عنایات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا (النّحل : ۸۰)
''اور اللہ ہی نے تمہارے لئے تمہارے گھر جائے سکون بنائے۔''

جس طرح ہم بچپن سے کپڑے پہنے رہنے کے اِس قدر عادی ہو گئے ہوتے ہیں کہ ہمیں اُن کا وزن تک محسوس نہیں ہوتا، اِسی طرح مکان بھی چونکہ چھوٹا بڑا کوئی نہ کوئی اپنی حیثیت کے مطابق ہم میں سے ہر شخص رکھتا ہے، اس لئے اُس کا پورا اندازہ ہی ہمیں نہیں ہو پاتا کہ مکان کتنی بڑی نعمت ہے۔

رسولِ مکرّم ﷺ گھر میں کشادگی کو پسند فرماتے تھے اور اُسے اِس زندگی کی مسرّتوں کا ایک عنصر سمجھتے

تھے۔ چنانچہ فرمایا کہ خوشی و مسرّت میں چار چیزیں شامل ہیں:
(۱) اچھی بیوی (۲) کشادہ گھر (۳) اچھا پڑوسی اور (۴) سواری کے لئے ایک آرام دہ جانور۔
آپ اکثر خشوع و خضوع کے ساتھ یہ دعا مانگا کرتے تھے: "اے اللہ! میرے گناہ معاف فرما* میرے گھر کو کشادہ فرمادے اور مجھے (اپنے فضلِ خاص سے) روزی عطا فرما۔"

رسولِ اکرم ﷺ نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ اپنے گھروں کو اِس طرح پاک و صاف رکھیں کہ اُن سے اسلام کی جھلک نظر آئے کیونکہ اسلام نظافت (صفائی و پاکیزگی) کا دین ہے۔
["الحلال والحرام فی الاسلام" --- یوسف القرضاوی (انگریزی ترجمہ) ص ص ۹۶، ۹۷]

پُرتعیّش زندگی اور شرک سے متعلّق اشیاء: مسلمان اپنے گھر کو مختلف قسم کے پھولوں، منقش پارچہ جات اور دیگر سجاوٹ کی اُن چیزوں سے آراستہ کرسکتا ہے جن کی شریعت میں اجازت دی گئی ہے۔ اِس ضمن میں سورۃ الاعراف کی آیت ۳۲ صفحہ ۳۷ پر مع تفسیر دی جاچکی ہے۔

مسلمان کو اپنے گھر کی آرائش و تزیین، اپنے لباس، جوتوں اور اپنی ذات میں جمالیات کا رنگ بھرنے کی کھلی اجازت ہے، بشرطیکہ اُن میں خودنمائی، خود پسندی اور تکبر کا شائبہ تک نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
"جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی غرور ہوگا، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ ایک شخص نے پوچھا: اُس شخص کا کیا ہے جو خوبصورت لباس اور اچھے جوتے پہنے؟ آپ نے فرمایا: بے شک اللہ حسین ہے اور حسن و جمال کو پسند فرماتا ہے۔"

ایک اور حدیث کے مطابق ایک حسین و جمیل شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا: "مجھے حسن و جمال پسند ہے اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں، اُس کا کچھ حصّہ مجھے بھی اِس حد تک دیا گیا ہے کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ اچھے جوتے پہنے ہوئے ہو، تو اے اللہ کے رسول! فرمایئے کہ کیا یہ بات بھی تکبر میں شامل ہے؟" آپ نے فرمایا: "نہیں، غرور نام ہے حق و صداقت کو نہ ماننے کا اور دوسروں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کا۔" (ابوداؤد)

تاہم اسلام انتہا پسندی کے حق میں نہیں اور نبی مکرّم ﷺ نے اِس بات کو ناپسند کیا ہے کہ ایک مسلمان اپنے گھر کو تعیّشات، فضولیات اور اُن چیزوں سے بھر دے جن کی مذمّت قرآن میں آئی ہے، یا جن چیزوں کا کفر و شرک سے کوئی تعلق بنتا ہو جن کے خلاف وحدانیتِ الٰہی نے ہر ہتھیار کے ساتھ جنگ کی ہے۔"
["الحلال والحرام فی الاسلام" --- یوسف القرضاوی (انگریزی ترجمہ) ص ص ۹۷، ۹۸]

* ہر نبی گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے لہٰذا یہ دعا امت کی تعلیم کے لئے اور اپنے خالق کے حضور حد درجہ عاجزی اور انکساری کے اظہار کے لئے تھی۔

سونے اور چاندی کے برتن : اسلام نے مسلمان کے گھر میں سونے، چاندی کے برتنوں اور ریشمی بستروں کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ کی کہ جو کوئی اِس راستے سے ہٹے گا، اُسے قیامت کے دن سزا دی جائے گی۔ اُمِّ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔

''جو کوئی سونے چاندی کے برتن میں کھاتا پیتا ہے، وہ دراصل اپنے پیٹ کو جہنم کی آگ سے بھر رہا ہے۔'' (مسلم)

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حُذَیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے، ریشمی لباس پہننے اور ریشمی کپڑے پر بیٹھنے سے یہ کہتے ہوئے منع فرمایا : ''یہ چیزیں اِس دنیا میں غیر مسلموں کے لیے ہیں اور ہمارے لئے اگلے جہان میں۔''

مزید برآں یہ کہ جس چیز کو عملی طور پر استعمال کرنے سے روکا گیا، اُسے کسی کو بطورِ تحفہ دینے یا اُس کے ذریعے آرائش کرنے سے بھی روک دیا گیا۔

اِن ممنوعات کے پسِ پردہ کارفرما حکمت : یہ ممنوعات جن کا تعلّق برتنوں، بستروں اور اِسی قسم کی دوسری اشیاء سے ہے، مرد وزَن دونوں کے لئے منع ہیں۔ اس قانون کی وجہ گھر کو حد درجہ سامانِ تعیّش سے بچانا ہے۔ اِس سلسلے میں ابنِ قُدامہ واضح طور پر بیان کرتے ہیں:۔

''حدیثِ مبارکہ کی عمومیت کے باعث اِس ضمن مَرد اور عورت دونوں یکساں ہیں۔ اِس ممانعت کی وجہ ایک طرف تو فضول خرچی اور فخر وغرور کو توڑنا ہے تو دوسری طرف غریب و نادار لوگوں کی دل آزاری کرنے سے روکنا ہے۔ سونے، چاندی کا استعمال عورتوں کے لئے جائز ہے تاکہ وہ اپنے شوہروں کے لئے بناؤ سنگھار کریں۔ یہ ایک استثنائی صورت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ وجہ جو تم نے بیان کی ہے، درست ہے تو پھر یاقوت اور دوسری قیمتی دھاتوں سے بنی ہوئی چیزوں کی بھی ممانعت ہونی چاہئے تھی کہ وہ سونے چاندی سے زیادہ قیمتی ہیں۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ غریب لوگ اِن چیزوں سے آشنا نہیں ہوتے اور اگر وہ امیر لوگوں کو انہیں استعمال کرتے ہوئے دیکھ بھی لیں تو اُن کے جذبات مجروح نہ ہوں گے۔ مزید برآں اِن چیزوں کی کمیابی بذاتِ خود بتاتی ہے کہ یہ ممنوع ہیں۔'' (''المغنی'' بحوالہ اَلقرضاوی)

''سونا چاندی عالمگیر معیاری زَر ہیں جو قیمتوں کے تعیّن اور اقوامِ عالَم کے درمیان باہمی لین دین کو آسان بناتے ہیں اور اِس طرح صنعت وتجارت کو ترقی دیتے ہیں۔ یہ الٰہی عنایت ہے کہ اُس نے لوگوں کو اِنہیں بطور تبادلہ استعمال کرنے کا طریقہ بتایا۔ سونے چاندی کا صحیح اقتصادی استعمال یہ ہے کہ وہ آزادانہ گردش میں

ماتحت کا اپنے افسر کے ساتھ یا رعایا کا حاکم کے ساتھ رویّہ۔ مسلمان کا غیر مسلم کے ساتھ رویّہ۔ انکساری۔ ایثار۔ کسی چیز کی حاجت کا معنی۔ ضبطِ نفس۔ قناعت۔ توکل علی اللہ۔ فیّاضی۔ صبرو استقلال۔ راستبازی۔ عدل و انصاف۔ اعتبار اور بھروسہ۔ مظاہرِ قدرت میں تخلیق شدہ حُسن کا پیمانہ۔ سنہرا یا جمالیاتی تناسب۔ انسانی جسم میں تقابلی نسبت: انسانی ہاتھ' انسانی دانت' انسانی چہرہ۔ پھیپھڑوں میں سنہرا تناسب۔ DNA میں سنہرا تناسب۔ برف کے گالوں میں سنہرا تناسب۔ خلا میں سنہرا تناسب۔

ڈارون کا ''قانونِ ارتقاء'' فطرت میں ہم آہنگی اور تناسب کی وضاحت سے قاصر ہے۔ ''فطری انتخاب''۔ ڈارونزم کی تردید۔ نظریہ ارتقاء میں رنگ کی پیچیدگی۔ فطرت میں تناسب اتفاقی نہیں ہوسکتا۔ نتیجہ اور حرفِ آخر۔

۲۔ علمِ زراعت و نباتات (Agriculture and Vegetation) ۔۔۔ ۔۔۔ ۱۰۴

زراعت و نباتات اور قرآنِ حکیم۔ کاشتکاری سے متعلق قرآنی مصادر۔ بارش کے پانی کے لئے قرآنی اصطلاحات۔ سورۃ الانعام کی آیت ۹۹ علمِ زراعت کی کلیدی آیت۔ زراعت کی اہمیت۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں زرعی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی۔ سورۃ الرحمٰن کی آیت ۱۰ کے لفظ اَنام کی توضیح۔ مردہ زمین کا دوبارہ زندہ کرنا۔ عملِ تلقیح اور قرآنِ حکیم۔ ممنوعہ فصلیں۔ قابلِ کاشت زمین کا استعمال۔ دوسروں کو زمین کاشت کے لئے مستعار دینا۔ فصل کا ایک متناسب حصّہ لینا۔ بٹائی کا حصّہ لینے کی ممنوعہ شکل۔ زمین کرائے پر دینا۔ قیاسی استدلال کہ رقم کی شکل میں زمین کرائے پر نہیں دی جاسکتی۔ جاگیرداری نظام اور اسلام۔ مال و دولت میں عدمِ مساوات ایک فطری امر ہے۔ احادیث کی روشنی میں جاگیردارانہ نظام۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا زرعی زمین پر تصرّف کی میعاد کا نظام: اِقطاع۔ نظامِ حماس۔ سرکاری زمینداری۔ فَے۔ چند زرعی اصطلاحات قرآنِ حکیم کی روشنی میں۔ زرعی موسمیات۔ زرخیز کاری (تولیدی عمل)۔ پیوندکاری۔ باغبانی۔ ذاتی ملکیت کے حق اور مخالفت میں دلائل۔ کیڑے مکوڑے۔ حیاتِ انبیاء علیہم السلام۔ زمین پر قبضے کا نظام۔ قدرتی آفات۔ قومِ سبا اور اُس کا انجام۔ مستقبل کے لئے پس انداز کرنے اور قومی ضرورت کے لئے ذخیرہ اندوزی کرنے کا جواز۔ یوسف علیہ السلام اور تعبیرِ خواب۔ مویشیوں کو چرنے کے لئے چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑنا۔ عملِ زیرگی (Pollination)۔ دریا (نہریں)' بند اور چشمے۔ بنی نوعِ انسان کا رشتہ زمین سے۔ زمینی سائنس (زمین اور پانی کا باہمی تعلق)۔ زمین کی اقسام۔ زمین دوز آبپاشی کا نظام۔ زمین کی حیات پذیری کا راز۔ روٹی کی تعظیم و تکریم سے متعلق احادیث۔ قرآنِ حکیم میں چند مفید زرعی نکات۔ فضائی اثرات۔ بہ لحاظ عمر انسانی نام۔ زراعت اور جنگل بانی کا علم۔ زرعی اصلاحات اسلام کے تناظر میں۔ مزارعین کے حقوق کا تحفظ۔

رہیں اور گھر میں سکّوں کی طرح اُن سے ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے یا اِس سے بھی بدتر صورت کہ گھریلو استعمال کی چیزوں کے ساتھ انہیں بھی مقیّد کر کے رکھ دیا جائے۔''

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''اِحیاءِ علوم الدّین'' کی جلد چہارم میں ''شکر'' کے عنوان کے تحت اِس نکتے کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اِس طرح واضح کیا ہے :۔

''کوئی بھی شخص جو سونے چاندی کے سکّوں کو گلدانوں اور برتنوں کی شکل میں ڈھالتا ہے' کفرانِ نعمت کا مرتکب ہوتا ہے اور وہ اِن کے ذخیرہ اندوزی کرنے والے سے بھی بدتر ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسا کہ رئیسِ شہر کو شہر کی گلیوں کی خاکروبی پر' یا کپڑے سینے پر یا اُن کاموں پر لگا دیا جائے جو عام طور پر ادنٰی درجے کے لوگ کرتے ہیں۔ اُس کو قید کرنا بھی اُس کے لئے کم ذلت آمیز ہوگا۔ چینی مٹی' لوہے' سیسے اور تانبے جیسی چیزوں کو گلدان اور برتن بنانے میں استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن یہ حیثیتِ زرِ بدل وہ سونے چاندی کی جگہ نہیں لے سکتے۔ اگر کوئی شخص اِس نکتے کو اپنی عقل اور علم کے ذریعے تسلیم نہیں کرتا تو ہم اُسے یہی کہیں گے کہ ترجمانِ الٰہی نے اِس کو اس طرح بیان کیا ہے کہ:

''جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں کھاتا پیتا ہے' وہ دراصل اپنے پیٹ کو جہنّم کی آگ سے بھر رہا ہے۔''

<u>اسلام بتوں سے منع کرتا ہے:</u> اسلام نے مسلمان گھروں میں بت رکھنے سے منع کیا ہے۔ بتوں سے مراد ٹھوس تصویریں جن کی صوری شکل کو خراب یا بگاڑا نہیں کیا گیا۔ گھروں میں اُن کی موجودگی فرشتوں کے بھگانے کے لئے کافی ہے۔۔۔ وہ فرشتے جو اللہ کی رحمت اور اس کی خوشی کی نمائندگی کر رہے ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:۔

''یقینی بات ہے کہ فرشتے اُس گھر میں داخل نہیں ہوتے جہاں بت ہوں۔'' (بخاری' مسلم)

مسلمان کو بت تراشی سے بھی منع کیا گیا ہے خواہ یہ غیر مسلموں کے لئے ہی کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ :

(۱) ''قیامت کے دن شدید ترین سزا پانے والے صورت گر ہوں گے۔'' یا ایک اور روایت کے مطابق ''اللہ کی تخلیق کے نقال'' ہوں گے۔'' (بخاری' مسلم)

(۲) قیامت کے دن تصویر بنانے والے سے کہا جائے گا کہ وہ تصویر میں سانس بھی ڈال دے لیکن وہ ایسا کبھی نہ کر سکے گا۔'' (بخاری)

مطلب یہ کہ اُسے ذلیل کرنے کے لئے اُس سے اُس میں زندگی ڈالنے کو کہا جائے گا۔

بتوں کی ممانعت میں حکمت و دانائی : (۱) بتوں کی ممانعت کی ایک وجہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کا تحفظ کرنا ہے تاکہ بت پرستوں کے اعمال و عقائد سے دُور رہیں جو اپنے ہی ہاتھوں سے بُت اور مجسمے تراش کر اُنہیں تقدّس کا درجہ دیتے ہیں اور بہ طورِ عبادت اُن کے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔

''اسلام اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر ایمان کی حفاظت کے لئے بہت حسّاس اور شدید ہے۔ یہ احتیاط اُور حفاظتی تدبیر یقینی طور پر بالکل جائز اور صحیح بھی ہے۔ بُت پرستی کا آغاز اُس وقت ہوُا جب انسان نے اپنے فوت شدہ اور محترم آباء و اَجداد کو یاد رکھنے کے لئے اُن کی شکل کے بُت بنائے۔ رفتہ رفتہ اُنہوں نے اُن کی تعظیم کرنا شروع کر دی۔ اِس تعظیم میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ اُن بتوں کو معبود بنا دیا گیا اور اللہ کے ساتھ ساتھ اُن کی بھی پرستش شروع کر دی گئی' اُن سے مدد طلب کی جانے لگی' اُن کے غیظ و غضب سے خوف کھایا جانے لگا اور اُن سے نعمتوں کے نچھاور کرنے کی التجائیں کی جانے لگیں۔ وَدّ' سُواع' یَغُوث' یَعُوق اور نَسر نامی بتوں کو پوجنے والے قدیم معاشروں میں یہی کچھ ہوُا جن کا ذکر سورۂ نوح کی آیت ۲۳ میں آیا ہے۔''

''یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ مذہب جو ہر بدی کا راستہ روکتا ہے' اُس راہ پر بھی بند باندھتا ہے جس کے ذریعے کھلے طور پر یا چھپے طور پر شرک اور بُت پرستی لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں داخل ہو جائیں۔ اِنہی راستوں میں سے ایک راستہ بُت پرستوں اور اُن مذاہب کے پیروکاروں کی نقالی کا ہے جنہوں نے اپنے بزرگوں کے احترام و تکریم میں مبالغہ آرائی کی اور اُنہیں اُلوہیّت کا درجہ دے دیا۔''

(۲) بُت پرستی کی ممانعت کی ایک اور وجہ کا تعلق بُت تراش اور مجسمہ سازوں سے ہے۔ مجسمہ ساز اپنے کام میں فخر محسوس کرتے ہیں کہ اُنہوں نے گویا ایک ایسی چیز کی تخلیق کی ہے جس کا پہلے وجود ہی نہ تھا یا یہ کہ اُنہوں نے مٹی اور پتھر کو جان عطا کر دی ہے۔ جب کوئی مجسمہ ساز کافی محنت کے بعد بُت تراش دیتا ہے تو وہ اپنی کارکردگی' بُت کی اکملیّت اور خوبصورتی پر اتنا خوش ہوتا ہے کہ وہ اُس کے سامنے محویّت کے عالم میں گم کھڑا رہتا ہے اور اُس سے گویا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ بولو' بولو' بولتے کیوں نہیں؟ اِسی لئے رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا :

''بُت اور مجسمے بنانے والوں کو روزِ قیامت سزا دی جائے گی اور اُن سے کہا جائے گا کہ جو کچھ اُنہوں نے بنایا ہے' اُس میں جان ڈال کے دکھائیں۔'' (صحیح بخاری' صحیح مسلم)

ایک حدیثِ قُدسی میں رب تعالیٰ نے فرمایا:

''اُس سے بڑا خطا کار کون ہو سکتا ہے جو چاہتا ہے کہ کوئی چیز ویسی ہی تخلیق کرے جیسے میں تخلیق کرتا ہوں۔ تو پھر ذرا وہ ذرّہ (جیسی معمولی چیز) یا جَو کا ایک دانہ بنا کے دکھا دیں۔'' (ایضاً)

(۳) ''بت تراش اور مجسمہ ساز دیوی' دیوتاؤں اور بزرگوں کی عریاں اور شہوت انگیز تصویریں بناتے ہیں۔ایک مسلمان کو ایسے حیا سوز کاموں میں پڑنے کی اجازت نہیں ہے۔''

(۴) ''بت اور مجسمے عیاش زندگی کی علامت ہیں۔محلات میں رہنے والے اپنے خِلوت کدوں اور کمروں کو مختلف قسم کے نواد سے تیار شدہ اِن مجسموں سے بھر دیتے ہیں۔تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ وہ مذہب جو عیاشی اور تعیش کے خلاف ہمیشہ برسرِ پیکار رہا ہے' اپنے ماننے والوں کو اپنے گھروں میں بُت رکھنے سے روک دے۔''(الحلال و الحرام فی الاسلام --یوسف القرضاوی انگریزی ترجمہ ص ص ۹۸۔۱۰۲)

محبت اور رحم دلی کے جذبات نہ صرف انسانوں بلکہ جانوروں' درندوں اور مَردم خوروں میں بھی پائے جاتے ہیں۔یہ حیران کُن پہلو ایک غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) ہستی پر ہمارے ایمان کو حُسن اور نکھار بخشتا ہے جو اِس دنیا کو ایک خاص منصوبے کے تحت عمل میں لائی ہے۔کیمل یلدرم کہتے ہیں:۔
''کیا بچوں سے پیار و محبت کے پیچھے کوئی اندھا نظام کارفرما ہے جس میں جذباتی عوامل شامل نہیں؟ (مراد ڈارون کا نظریہ ''قدرتی انتخاب'' ہے) یہ کہنا واقعی مشکل ہے کہ ماہرینِ حیاتیات اور ڈارونزم کے حامی اِس سوال کا کوئی تسلی بخش جواب دے سکنے کے قابل ہوئے ہوں۔''

["The Theory of Evolution and Bigotry" (Eng. translation)... Cemal Yaldrim, p. 195].

گھر کے بعد ایک اور دائرہ ہے جہاں انسان اپنے والدین' بہن بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں سے رابطہ رکھتا ہے۔والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک کی اہمیت اِس حقیقت سے ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے خالصتاً اپنی عبادت کا حکم دیا ہے' وہاں والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کا حکم بھی ساتھ ہی دیا ہے (ملاحظہ ہوں آیات سورۃ البقرۃ:۸۳؛ سورۃ النساء:۳۶؛ سورۃ الاسراء:۲۳'۲۴؛ سورۃ العنکبوت:۸؛ سورۃ لقمان:۱۴'۱۵) اگر کسی مسلمان کے والدین کافر یا اسلام کے پکے دشمن ہی کیوں نہ ہوں' اُن کی اولاد پر اُن کی خدمت اور (جائز) اطاعت کے حقوق فرض رہیں گے۔

ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔
(۱)''بچہ جب اپنے والدین پر پیار بھری نگاہ ڈالتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہر نگاہ کے بدلے اُسے ایک حج مقبول کا ثواب عطا کرتا ہے۔''(بیہقی)
(۲)''تمہارے والدین تمہارے لئے جنّت بھی ہیں اور دوزخ بھی۔''(ابنِ ماجہ)

اِسی طرح انسان کو اپنے دیگر رشتہ داروں سے رشتے کی نزدیکی کے مطابق حُسنِ سلوک سے پیش آنا

چاہئے۔نبی مکرّم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

(۱) ''تم پر پہلا اور مقدم حق تمہاری والدہ کا ہے' اُس کے بعد تمہارے والد کا' پھر اُس کے بعد تمہارے قریبی رشتہ داروں کا۔'' (صحیح بخاری)

(۲) ''خونی رشتے کو توڑنے (قطع رِحمی کرنے) والا جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' (صحیح بخاری)

(۳) ''جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے اپنے رشتہ داروں سے مہربانی سے پیش آنا چاہئے۔''

(۴) ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ اُس کی عمر لمبی کی جائے اور اُس کے رزق میں وسعت دی جائے' اُسے صلہ رحمی کرنی چاہئے۔'' (یعنی رشتہ داری کو اچھے تعلقات کے ساتھ قائم رکھنا چاہئے۔)

رشتہ داروں سے حُسنِ سلوک سے پیش آنے کو اصطلاح میں ''صلہ رِحمی'' کہا جاتا ہے۔

گھر والوں کے بعد ہمسائیگی کا حلقہ آتا ہے۔ہمسایہ (= ہم + سایہ) کے حقوق کی اہمیت ذیل کی احادیثِ مبارکہ سے واضح ہوتی ہے:

(۱) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جبریل علیہ السلام مجھے ہمسائے کے حقوق کے بارے میں اِس قدر تاکید کرتے رہے کہ میں یہ خیال کرنے لگا کہ وہ اُسے عنقریب وارث بنادیں گے۔'' (صحیح بخاری)

(۲) ''تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک (کامل) ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک اُس کا ہمسایہ اُس کی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو۔'' (صحیح مسلم)

یہاں تک کہ اگر ہمسایہ غیر مسلم یا اسلام کا پکا دشمن ہو تو بھی اُس کی ہمسائیگی کے حقوق متاثر نہیں ہوں گے۔محدّثینِ کرام فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان' رشتہ دار ہمسائے کے اپنے ہمسائے پر تین حقوق ہیں' ایک مسلمان ہمسائے کے جس کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہیں' دو حقوق ہیں جبکہ غیر مسلم ہمسائے کا اپنے ہمسائے پر ایک حق ہے۔

ہمسائیگی کے بعد سماجی زندگی کا ایک وسیع حلقہ ہے جہاں انسان کو مختلف قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اِس سوال کے جواب میں کہ ہمیں اِن لوگوں سے کیسا برتاوا کرنا چاہئے' قرآنِ حکیم ہماری اس طرح رہ نمائی کرتا ہے:۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (اَلنِّساء : ۳۶)

''حُسنِ سلوک رکھو والدین کے ساتھ' قرابت داروں کے ساتھ' یتیموں' مسکینوں' پاس والے پڑوسی' دُور والے پڑوسی' ہم مجلس اور راہ گیر کے ساتھ اور جو تمہاری مِلک میں ہے۔''

تفسیر ''البحر المحیط'' میں ہے کہ جَارِذِی الْقُرْبٰی سے مراد مسلمان پڑوسی اور جَارُ الْجُنُب سے مراد غیر مسلم ہمسایہ ہے۔اَلصَّاحِبِ بِالْجَنْبَ میں ہم مجلسی یا صحبت میں وقت کی کوئی قید نہیں' خواہ ساتھ سالہا

سال کا ہو یا چند منٹ کا بہر حال اپنا حق رکھتا ہے۔ اس کی تعریف میں ہم سبق، ہم مدرسہ، ہم سفر، کھیل کود کے ساتھی، ریل، بس اور جہاز کے ساتھی، شریکِ تجارت وصنعت سب آ جاتے ہیں۔ اِبْنُ السَّبِیْل (مسافر، راہگیر) ضروری نہیں کہ مسافر مہمان ہی بن کر آئے۔ خاطر تواضع بہ قدرِ وسعت و ہمت ہر آیند و روند کی ضروری ہے۔

اس کے بعد حکومتی (سرکاری) حلقہ آتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر فرد یا تو حاکم ہے یا محکوم یا یوں کہئے کہ ہر انسان یا تو حکم دینے کی حیثیت میں ہوتا ہے یا حکم ماننے کی۔ پہلی صورت میں (اگر وہ حکم جاری کرنے کی حیثیت میں ہے) مندرجہ ذیل حدیث اُس کی راہ نمائی کرتی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں یا رعایا کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے:۔

''جس شخص کو مسلمانوں کی قیادت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے لیکن اگر وہ اُن کی خاطر تکلیف نہیں اُٹھاتا اور نہ ہی اُن کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے، وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔'' (صحیح مسلم)

ماتحت کا اپنے مالک کے ساتھ یا رعایا کا حاکم کے ساتھ کیسا رویہ ہونا چاہئے، ذیل کی حدیث راہ نمائی کرتی ہے:۔

اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَۃُ قِیْلَ لِمَنْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: لِلّٰہِ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِھِمْ

''دین خلوص اور وفاداری کا نام ہے۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! فرمایئے خلوص کس کے لئے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے لئے، اُس کے رسول کے لئے، اُن لوگوں کے لئے جو مسلمانوں کی قیادت کر رہے ہیں اور عام مسلمانوں کے لئے۔'' (صحیح مسلم)

آخر میں وہ حلقہ آتا ہے جس میں ایک مسلمان کو کسی غیر مسلم سے واسطہ پڑتا ہے۔ ایک مسلمان کا اُس کے ساتھ کیسا رویہ ہونا چاہئے؟ مندرجہ ذیل آیت رہنمائی کرتی ہے کہ کسی قوم یا فرد کے خلاف غصہ خواہ کتنا ہی جائز اور صحیح کیوں نہ ہو، ہمیں کسی بھی صورت میں سچائی اور انصاف کی راہ سے ہٹنا نہیں چاہئے اور اِسی میں جمالیات کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَایَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدۃ: ۸)

''اے ایمان والو! اللہ کے لئے پوری پابندی کرنے والے (اور) عدل کے ساتھ گواہی دینے والے رہو اور کسی جماعت کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم اُس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ انصاف کیا کرو کہ وہ تقویٰ سے بہت قریب ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ کو اس کی پوری خبر ہے کہ تم کیا کرتے رہتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ کافر کا کفر اُس سے انصاف کرنے اور اُس کے جائز حقوق کی ادائیگی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ اللہ اللہ! دنیا کا کونسا ایسا قانون ملے گا جس نے اپنے باغیوں تک کے حقوق کی یہ رعایت رکھی ہو!

انکساری: اِس کا متضاد نمود و نمائش، خود نمائی اور مصنوعی طرزِ زندگی ہے۔ انکساری کا مطلب ہے کہ انسان اپنے آپ کو اونچا نہ سمجھے بلکہ خود کو اپنے خالق کا ایک عاجز بندہ سمجھے اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں انکساری (کسرِ نفسی) سے کام لے۔ انسان دوستی کا یہ رویّہ انسان کی شخصیت کا مظہر ہے اور اُس کے چال چلن، اُٹھنے، بیٹھنے اور بولنے کی عکاسی کرتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر ترغیب دیتے ہوئے اور سمجھاتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ یہ صفت اللہ کے سچے اور سچے بندوں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

(۱) وَلَاتَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا (بنی اسرائیل: ۳۷ ؛ لقمان: ۱۸)

(۲) وَعِبَادُالرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان : ۶۳)

(۳) وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ٥ (الشعراء : ۲۱۵)

(۴) وَاقْصِدْ فِیْ مَشْیِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ اِنَّ اَنْكَرَالْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ٥ (لقمٰن: ۱۹)

(i) ''اور زمین پر اِترا کر نہ چلا کر۔''

(ii) ''اور (خدائے) رحمٰن کے (خاص) بندے وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں''

(iii) ''اور جو شخص مسلمانوں میں داخل ہو کر آپ کی راہ پر چلے تو آپ اُس کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی سے پیش آیئے۔''

(iv) ''اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز کو پست رکھ۔ بے شک سب سے بری آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔''

نیز نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص رب کے آگے عاجزی اختیار کرتا ہے، رب اُسے بلند کر دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو حقیر اور ادنیٰ سمجھتا ہے لیکن لوگوں کی نظر میں وہ بلند مقام کا حامل ہوتا ہے۔''

ایک حدیثِ قُدسی کے مطابق اللہ عزّ وجل نے فرمایا:۔

''تکبّر میری چادر ہے، جو کوئی اُسے مجھ سے چھینتا ہے میں اُسے جُھلسا دینے والی آگ میں ڈالوں گا۔''

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ ہمارے مسلمان بھائی ہی ہماری طرف سے عاجزی اور انکساری کے مستحق ہیں۔ جہاں تک ملحدین اور کافروں کا تعلق ہے تو اگر وہ مسلمانوں کے ساتھ حالتِ جنگ میں نہیں ہیں یا مومنین کے لئے کسی قسم کا فتنہ کھڑا نہیں کر رہے، اُن کے ساتھ مسلمانوں کا رویّہ با اخلاق، شائستہ اور مشفقانہ ہونا چاہئے جیسا کہ ہمارے پیغمبر ﷺ کی سنتِ مبارکہ اور اُن کے بعد خلفائے راشدین کا طریق کار رہا ہے۔

جذبہ ایثار (نفس کُشی): اِس کا مطلب ہے دوسروں کی ضروریات کی تکمیل کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینا تا کہ ایک محروم بھائی کو آرام وسکون مل جائے۔ اس کا متضاد خود غرضی ہے کہ بھائی کے پانچ ہزار ڈوبتے ہیں تو ڈوبنے دیں، اپنے پانچ روپے نہیں ڈوبنے چاہئیں۔ انصارِ مدینہ کی تعریف میں قرآن مجید فرماتا ہے کہ مفلسی کا ڈر اُنہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ وہ اپنا مال مہاجرینِ مکہ کے قدموں میں نچھاور کر دیں۔ چنانچہ فرمایا :۔

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَايَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ٥ (اَلْحشر : ۹)

"وہ (انصار) اُس سے محبت کرتے ہیں جو اُن کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اور اپنے دلوں میں اُس چیز کے بارے میں کوئی خلش نہیں پاتے جو (مہاجرین کو) دے دی جائے اور اُنہیں اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اُنہیں اُس چیز کی شدید حاجت ہو۔ اور جسے اپنے نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا تو وہی لوگ بامراد ہیں۔"

علامہ راغب اصفہانی "مفردات القرآن" میں کہتے ہیں کہ کسی چیز کی حاجت کا یہ معنی ہے کہ اُس سے محبت بھی ہو اور اُس کی ضرورت بھی ہو۔ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ مہاجرین سے محبت رکھنے پر صاف نصِ قرآنی ہے اور خبرِ متواتر سے یہ ثابت ہے کہ چاروں خلفائے راشدین مہاجر تھے تو اِن چاروں خلفاء سے محبت رکھنا کمالِ ایمان کی علامت ٹھہری۔ آیت کے آخر میں فعل مجہول (يُوْقَ) لا کر بتلا دیا گیا کہ نفسانی خواہش سے کوئی خود نہیں بچتا بلکہ بچا لیا جاتا ہے، وہی جسے اللہ بچانا چاہے۔

سُورۃُ الدَّھر میں اللہ کے اُن بندوں کی تعریف کی گئی ہے جو اللہ کی رضا کی خاطر بھوکوں اور ضرورت مندوں پر فیاض ہوتے ہیں۔ فرمایا :۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ٥ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ٥ (اَلدَّھر : ۸، ۹)

"اور وہ اللہ کی رضا کی خاطر مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے رہتے ہیں (اور کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں بس اللہ ہی کی خوشنودی کے لئے کھلاتے ہیں، نہ تم سے اِس کا عوض اور نہ قدردانی (شکر) چاہتے ہیں۔"

مسکین ویتیم تو اُس وقت مسلمانوں میں بھی تھے لیکن نزولِ آیت کے وقت اَسِیْر (قیدی) تو بہر حال مشرک ہی تھے (جصّاص عن القتادة؛ کبیر؛ بیضاوی) نکتہ اس سے یہ نکلا کہ غیر مسلم اسیروں کی امداد و اِعانت بھی

آخرت کے اجر کا موجب ہے۔ سبحان اللہ! ذرا غور تو کیجئے کہ اسلام نے کس طرح مؤمن کی زندگی اور اُس کی آخرت میں جمالیات کا رنگ بھر دیا ہے!

ضبطِ نفس: یہ عفو و درگزر کا دوسرا نام ہے اور اِس کا یہ مطلب ہے کہ دوسروں کی بُرائی اور شرارت سے جو اشتعال پیدا ہوتا ہے، اُسے ہمت و استقلال سے برداشت کیا جائے اور بدلہ نہ لیا جائے، اگرچہ ہم انتقام لینے کی پوری طرح قدرت رکھتے ہوں۔ قرآن مجید نے اِس صفت کو بہ نظرِ تحسین دیکھا ہے کہ یہ اللہ کے وفادار بندوں کی نمایاں خصوصیت ہے جس کے عوض اللہ اُن کی خطائیں اور گناہ معاف فرما دے گا۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

(۱) وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ (النُّور : ۲۲)

(۲) وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (الشُّورٰی : ۴۳)

(i) "اور چاہئے کہ معاف کرتے رہیں اور درگزر کرتے رہیں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کرتا رہے؟" (النّور : ۲۲)

عفو و درگزر کا یہ حکم مستحب ہے، وجوبی نہیں کہ بندے کو اُس کے حق کے ترک پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

(ii) "اور جو شخص صبر کرے اور معاف کر دے، یہ البتہ بڑے ہمّت کے کاموں میں سے ہے۔" (الشّوریٰ : ۴۳)

یعنی جائز حدود کے اندر انتقام لینے کی بھی پوری اجازت اسلام میں ہے لیکن اولیٰ و افضل معاف ہی کر دینا ہے۔ انسانی فطرت کی کیسی ٹھیک ٹھیک اور پوری رعایت ہماری شریعتِ مطہّرہ میں موجود ہے!!

یہ بات ذہن نشین رہے کہ عفو و درگزر کا مفہوم یہی ہے کہ انتقام لینے کی قدرت ہونے کے باوجود بدلہ نہ لیا جائے اور فراخ دلی سے معاف کر دیا جائے۔ نا اہلی، کمزوری اور کسی مجبوری کے تحت معاف کر دینا معاف کرنا نہیں کہلاتا بلکہ انتقام نہ لینے کا یہ ایک عذرِ لنگ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:۔

لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ

"طاقتور وہ نہیں جو اپنے مدِّ مقابل کو پچھاڑ دے، دراصل طاقتور تو وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔"

قناعت: اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی اپنی محنت اور جائز طریقوں سے کمائے، اُسی پر مطمئن رہے بجائے اس کے کہ دولتمندوں کی دولت پر حریصانہ نگاہ ڈالے یا اُن کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ قرآنِ حکیم اِس قسم کے رُجحان کی حوصلہ شکنی کرتا ہے اور ترغیب دیتا ہے کہ کارزارِ حیات میں کمر کس کر اتر جاؤ بجائے اس کے کہ اُن لوگوں سے حسد کرو جو دولت، رتبے، طاقت، اہلیت، عزت یا زندگی کی مسرّتوں کے حصول میں تم سے برتر ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَاتَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ (اَلنِّسَاء : ۳۲)
"اور اُس چیز کی آرزو نہ کیا کرو جس میں اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے۔"

یعنی عزت و شرف کا حقیقی معیار اور قربِ الٰہی کا صحیح راستہ انسان کی اپنی جدّ و جُہد میں پوشیدہ ہے۔ حصولِ کمال اور قربِ الٰہی کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ ذرا آگے بڑھو اور اپنے حُسنِ کردار اور خوبیٔ عمل سے بلند سے بلند مقام حاصل کر لو۔ اِس تعلیم پر عمل کرنے سے کیا حیاتِ انسانی میں جمالیات کا پہلو نکھر کر سامنے نہیں آ جائے گا؟ بجائے اس کے کہ دوسروں پر حسد کرنے اور کُڑھنے میں اپنی صحت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔

توکّل علی اللہ: توکل علی اللہ قرآنی اصطلاح ہے جس کا مطلب اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔ وہ شخص جس کا اللہ کی بے حد و بے حساب عنایات اور اُس کی پشت پناہی پر پختہ ایمان ہے اور وہ اِس بات سے مطمئن ہے کہ صرف وہی اُن کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے' تو ایسے شخص کو اعلیٰ درجے کا امن و سکون عطا کیا جاتا ہے جو دراصل زندگی کا ایک انمول خزانہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَاغَالِبَ لَکُمْ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَاالَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْ بَعْدِہٖ وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ (آلِ عمران: ۱۶۰)
"اگر اللہ تمہارا ساتھ دے تو تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہ تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ایسا ہے جو اُس کے بعد تمہارا ساتھ دے؟ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔" (آلِ عمران: ۱۶۰)

فیّاضی (سخاوت): اِس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خداداد دولت' صلاحیت اور طاقت جیسی نعمتوں کو صرف اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اُن میں اپنے اَبنائے جنس کو بھی حصّہ دار بنانا چاہئے۔ دولت کو ضرورتمندوں پر خرچ کرنا' لوگوں میں تعلیم کو عام کرنا' اپنی مہارت اور ہنرمندی سے دوسروں کی مدد کرنا' یہ سب فیّاضی کے زُمرے میں آتے ہیں۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں میں ایسے مخیّر لوگ موجود ہوتے ہیں جو اپنی دولت' علم و ہنر اور طاقت کو ضرورتمندوں اور مفلسوں پر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ اوّل الذکر (مسلمان) اللہ کی طرف سے ثواب پا کر فائدے میں رہتا ہے کیونکہ وہ اللہ کی رضا کی خاطر خرچ کرتا ہے جبکہ مؤخر الذکر (غیر مسلم) ایمان و ایقان کی دولت سے محرومی کی بنا پر گھاٹے میں ہے' اُس کے اِس فیّاضی کے عمل سے خالق خوش نہیں ہوتا۔

بس اُس کے لئے اتنا کافی ہے کہ اُسے دنیا میں فیاضی کی شہرت مل گئی اور واہ واہ ہوگئی۔

سُورَةُ البَقَرة کی آیت ۳ کے الفاظ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ (اور وہ ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں) کے متعلق تمام مفسّرینِ قرآن اِس بات پر متفق ہیں کہ اللہ کا خوف رکھنے والے بندے سونے اور سکّوں کی دولت کے علاوہ خداداد دیگر نعمتوں مثلاً علم' مہارت' طاقت' اولاد اور دیگر وسائل کو بھی لوگوں کی بہتری پر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بدلے میں زیادہ منافع دیئے جانے کی یقین دہانی مندرجہ ذیل آیات میں کرائی گئی ہے:۔

(۱) وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ○ (سورةُ البقرة: ۲۷۲)

(۲) اَلَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ○ (سُورةُ البَقَرة: ۲۷۴)

(i) ''اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو' سو اپنے لئے کرتے ہو اور تم اللہ ہی کی رضا جوئی کے لئے خرچ کرتے ہو اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو تم کو (سب) پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر (ذرّہ بھر) زیادتی نہ کی جائے گی۔''

تفسیر ابنِ جریر میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ مشرکین کو صدقات و خیرات نہیں دیتے تھے تو جب آیت وَ مَا تُنفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللهِ (اور تم اللہ ہی کی رضا جوئی کی خاطر خرچ کرتے ہو) نازل ہوئی تو آپ نے کفار و مشرکین کو بھی صدقات دینے شروع کر دیئے۔ مطلب یہ ہوا کہ جب اصل مقصد اپنے لئے آخرت کا نفع اور اجر کا حصول ہے تو وہ تو ہر حاجتمند کی امداد سے ہوسکتا ہے۔ صدقہ کو مسلمانوں ہی پر محدود رکھنے کی قید کیوں لگائی جائے۔ اسلام کی رواداری کا اِس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ دشمنوں پر بھی خرچ کرنے کو باعثِ اجر کہا گیا۔

(ii) ''جو لوگ اپنا مال رات اور دن (اور) پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے رہتے ہیں' اُن کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس اجر ہے' نہ اُن کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

ایک رُوح پرور ترغیب یہ ہے کہ جو بھی دولت راہِ خدا میں خرچ کی جاتی ہے' از روئے قرآن وہ اللہ پر قرض ہے جو قرض دینے والے کو دُگنا' چوگنا کر کے لوٹا دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ اُس کے گناہ بھی معاف کر دیئے جائیں گے۔ فرمایا گیا:

"(۴) **زمین کرائے پر دینا** : مسلمان زمیندار کے لئے چوتھا متبادل یہ ہے کہ وہ اپنی زمین ایک متعیّن رقم، سونے یا چاندی کے عوض کرائے پر دے دے۔ کچھ نامور فقہاء نے اِسے جائز قرار دیا ہے جبکہ کچھ فقہاء اُن مستند احادیث کی بناء پر اِسے حرام قرار دیتے ہیں جو رقم کی صورت میں زمین کو کرائے پر دینے سے روکتی ہیں۔ اِن احادیث کے راویان اُن دو صحابہ کے علاوہ جنہوں نے جنگِ بدر میں حصّہ لیا تھا، حضرات رافع بن خدیج، جابر، ابو سعید، ابو ہریرہ اور ابنِ عمر رضی اللہ عنہم ہیں۔ اُن سب کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے زرعی زمین کو رقم کی صورت میں کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے۔"

"اِس ممانعت سے استثناء فصل میں اُس شراکت داری کو حاصل ہے جس میں کل پیداوار کا ایک خاص حصّہ طے کرلیا جائے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا اہلِ خیبر کے ساتھ لین دین کے معاملہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ نے اُنہیں کُل پیداوار کے نصف پر زمین کاشت کرنے کے لئے دی تھی اور اس عمل کو اپنے وصال تک جاری رکھا تھا۔ آپ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین نے بھی پیداوار کے حصّے کی بنیاد پر زمین کو کرائے پر دینے کو جاری رکھا۔"

"ابتدائی دَور کے فقہاء کا ایک گروہ اِسی رائے کا حامل ہے۔ طاؤس جو یمن کے فقیہ تھے اور عظیم ترین مسلمان علماء میں سے تھے، سونے چاندی کے عوض زمین کو کرائے پر دینے کو سخت ناپسند کرتے تھے لیکن پیداوار کے ایک تہائی یا ایک چوتھائی حصّہ لینے کو جائز سمجھتے تھے۔ جب کسی نے اِس معاملے میں اُن سے بحث کی کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے تو آپ جواب دیتے: "معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جنہیں رسولِ اکرم ﷺ نے یمن کا حاکم مقرر فرمایا تھا، یہاں آئے اور اُنہوں نے پیداوار کے ایک تہائی اور ایک چوتھائی پر زمین کرائے پر دی اور ہم نے اب تک اِس عمل کو جاری رکھا ہوا ہے۔" تو یوں اُن کی رائے میں سونے یا چاندی کی شکل میں زمین کو کرائے پر نہیں دیا جاسکتا لیکن بٹائی کے حصّے پر دینے کو وہ جائز سمجھتے ہیں۔" (ایضاً ص ص ۲۸۳، ۲۸۴)

قیاسی استدلال کہ رقم کی شکل میں زمین کرائے پر نہیں دی جاسکتی: اسلامی اصولوں اور ٹھوس اور واضح متن کی بنیاد پر قیاسی استدلال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین کو پیسوں کی صورت میں کرائے پر دینا مطلقاً حرام ہے:

(الف) رسولِ اکرم ﷺ نے پیداوار کی ایک خاص مقدار کے عوض زمین کو کرائے پر دینے سے منع فرمایا ہے جیسے پیداوار کا ایک یا دو ٹن۔ لیکن فصل کے حصّے کے تناسب کی بنیاد پر جائز ہے جیسے پیداوار کا ایک تہائی یا ایک چوتھائی، یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک خاص تناسب کی بنیاد پر جو منصفانہ اور مساویانہ ہے کیونکہ اگر زمین پیداواری ہے، تو دونوں فریق منافع میں حصّہ دار ہوتے ہیں اور نقصان کی صورت میں بھی اگر کوئی آفت فصلوں پر نازل ہو جائے۔ تاہم اگر ایک فریق کو منافع کی ضمانت دی جائے جبکہ دوسرے کو اُس کی محنت و مشقت کا کوئی صلہ نہ ملے، تو

قرآنک انسائیکلوپیڈیا

اُردو ترجمہ

جلد اوّل

مؤلف

پروفیسر اشفاق احمد خانؒ